ظاہری وباطنی اصلاح کا بہترین ذریعہ
مجموعہ
تالیفاتِ مصلح الامۃ
عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ
ناشر
مکتبہ اشرفیہ
محمد علی روڈ، ممبئی ۳ فون: ۲۳۴۷۳۱۰۹

قال اللہ تعالیٰ

یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ

ترجمہ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کا ساتھ پکڑو

(وقال الشعرانی فی الیواقیت)

"تنابت عنھم رسائلھم بعد موتھم فی نصح المریدین"

یعنی ان حضراتِ مشائخ کی وفات کے بعد طالبین کی اصلاح کے باب میں ان کی تصانیف بھی ان کی قائم مقامی کرتی ہیں

بناءً علیہ

مجموعہ تالیفات مصلح الامہ

حصہ دوم

عارف باللہ حضرت مولانا و مرشدنا شاہ وصی اللہ صاحب

ناشر

مکتبہ اشرفیہ

۳۶، محمد علی روڈ، بمبئی ۳

۷۸۶

فہرست مضامین

مجموعۂ تالیفات مصلح الامۃ

حصّہ دوم

کاتبہ: عبدالرحمٰن جامی عفی عنہ

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہ

مُفتاح الرحمۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا کے متعلق چند دنوں سے حضرت والا نہایت اہتمام اور خاص شان سے گفتگو فرما رہے ہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعائیں جو آپ نے رزق کے متعلق یا صحت وعافیت کے متعلق یا اور دیگر دینی اور دنیوی حاجات کے متعلق اللہ تعالیٰ سے فرمائی ہیں انھیں ایک خاص ذوق وحال کے ساتھ اہلِ مجلس کو سنا رہے ہیں۔ اور کسی کسی دعا کی مختصر تشریح وتوضیح بھی فرماتے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ موثر اور دل نشین ہو گئی ہیں ایسی کہ عوام بھی اس کو سمجھ لیتے ہیں، اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ یوں دعا کا ایک مضمون حضرت والا مدظلہٗ العالی کے ایک سابق رسالہ "وصیۃ الاخلاق" میں کسی قدر تفصیل سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ جن حضرات کو مطالعہ کا شوق ہو وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

اس وقت آپ کے سامنے ہم جو چیز پیش کر رہے ہیں، اور جس مقصد کے پیشِ نظر پیش کر رہے ہیں اس کے متعلق خود حضرت والا کا ارشاد سنئے:۔

فرمایا کہ ہمارا یہ یقین ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتِ باری تعالیٰ سے جو نسبتِ عبودیت حاصل تھی اس کا تو کوئی فردِ بشر احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔ خدا تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں آپ کو عبد فرمایا ہے۔ عبدیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی کمال تھا۔ اس پر سب اہلِ حق کا اتفاق ہے، اس عبدیت کا جس چیز سے ظہور ہوا ہے تو وہ آپ کی یہی ادعیہ ہیں،

چنانچہ جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے تمام شعبوں کی تکمیل فرمائی اسی طرح سے آپ نے شعبۂ دعا کی بھی تکمیل فرمائی۔ یہ شعبہ ایک بحرِ زخار ناپیدا کنار ہے۔ اس کا احصار طاقت بشری سے باہر ہے، اور عبدیت کے لئے کمال افتقار واحتیاج لازم ہے، جس کا ثبوت ان ادعیہ سے ہوتا ہے۔

عقائد۔ عبادات۔ اخلاق معاملات۔ معاشرت دین ودنیا۔ معاش ومعاد اور ظاہر وباطن میں کوئی خیر وشر ایسی نہیں چھوڑی جس کے لئے آپ نے دعا یا تعوذ نہ کیا ہو۔ اس

میں جس طرح عبدیت کی تکمیل ہے، امت کو تعلیم بھی ہے۔

اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کہ سب ادعیہ کا احاطہ طاقت بشری سے باہر ہے تاہم علماء نے انہیں سے بہت سی دعاؤں کو محنت اٹھا کر ایک جگہ جمع بھی فرمادیا ہے۔ ہم اسوقت ان میں سے بھی صرف چند خاص خاص اور اہم دعائیں جو ہمارے ذوق کے مطابق ہیں، مع ترجمہ اور مختصر تشریح کے یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو ان سے نفع ہو، اور اس باب میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاسی اور اقتداء انہیں نصیب ہوکر ان کیلئے فلاح دارین کا ذریعہ بنے، نیز مقصد یہ ہے کہ ناظرین کو اولاً ان ادعیہ سے ذوق پیدا ہو تاکہ پھر وہ ہر دعا کو قلب کی شرکت کے ساتھ، اور ذوق وحال کو شامل کرکے مانگا کریں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا مقبول وہی ہے جو قلب کی شرکت کے ساتھ ہو —— حدیث شریف میں آتا ہے کہ:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَآءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ یعنی اللہ تعالیٰ غافل دل سے دعا قبول نہیں فرماتے"۔ —— یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یوں تو رسمی اور سرسری طور سے کوئی کام بھی نہیں کرنا چاہئے کہ یہ خلوص کے خلاف ہے چہ جائیکہ دعا جیسی عظیم الشان چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سنت اور اعلیٰ کمال ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک محبوب ترین عمل ہے، نیز ذریعۂ تقرب ہے، اس کو سرسری طور سے کرنا یہ تو بڑی ہی بے ادبی کی بات ہے اس لئے کہ دعا کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ۝ یعنی اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا کہ تم مجھکو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کر لوں گا، جو لوگ میری عبادت سے (جنمیں دعا بھی ہے) سرتابی کرتے ہیں، وہ عنقریب ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ۝ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّہُمْ یَرْشُدُوْنَ یعنی جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کرتے ہیں تو میں قریب ہی ہوں، منظور کرلیتا ہوں عرضی درخواست کرنے والے کی جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دیں، سو ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو قبول کیا کریں، اور مجھ پر

یقین رکھیں، امید ہے کہ وہ لوگ رشد حاصل کرسکیں گے»
سبحان اللہ اس آیت میں اَوّلاً تو یہ فرمایا کہ میں دعا کرنیوالونکی دعا کو قبول کرتا ہوں، پھر اس کے بعد کس قدر محبت اور شفقت کے عنوان سے اپنے احکام کے عمل پر ابھارتے ہیں۔

یہ فرماتے ہیں کہ جب میں تمھاری دعا قبول کرتا ہوں یعنی تمھاری بات مانتا ہوں تو تم بھی میری بات مانو، اور وہ یہ کہ میرے احکام یعنی شریعت کو دل سے قبول کرو۔ اور اس کی پیروی کرو۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ

یعنی اچھا یہ بتلاؤ کہ تمھارے یہ معبود بہتر ہیں یا وہ ذات جو بیقرار آدمی کی سنتا ہے جب وہ اسکو پکارتا ہے، اور اس کی مصیبت کو دور کر دیتا ہے، اور تمکو زمین میں صاحب تصرف بناتا ہے،» یہ سنکر اب بتلاؤ کہ کیا اللہ کے ساتھ شریک عبادت ہونے کے لائق کوئی اور معبود ہے، مگر تم لوگ بہت کم یاد رکھتے ہو۔

دیکھئے ان آیات میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی کیسی تاکید آئی ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے دعا نہ کرنے کو تکبر فرمایا۔ دوسری جگہ یہ فرماکر بندوں کو مطمئن کیا کہ ہم دعا کرنے والوں کی دعا کو قبول فرماتے ہیں۔

اسی طرح سے احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بندے کا دعا کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت ہی پسند ہے ـــــــ چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ:۔

مَنْ لَّمْ يَسْئَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں۔

اسی طرح سے ایک روایت میں آتا ہے:۔ اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ یعنی دعا عبادت کا مغز ہے،

نیز ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر روز جب تہائی رات باقی رہجاتی ہے تو ہمارے رب تبارک و تعالیٰ آسمانِ دنیا پر نزول فرماتے ہیں، اور اعلان فرماتے ہیں کہ ہے کوئی مجھ سے سوال کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں، اور ہے کوئی مجھ سے سوال کرنے والا کہ میں اسکو دوں، اور ہے

کوئی مجھ سے بخشش طلب کرنے والا کہ میں اس کو بخش دوں۔

اس روایت میں تو دعا، سوال، استغفار، تین ہی امور کا ذکر ہے لیکن ان ہی تینوں میں حصر نہیں ہے بلکہ بعض روایتوں میں دوسرے دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں۔

چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ:۔

هَلْ مِنْ تَائِبٍ فَاَتُوبَ عَلَيْهِ یعنی ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اسکی توبہ قبول کر دوں،

اور اسی طرح سے ایک اور روایت میں ہے مَنْ ذَا الَّذِیْ یَسْتَرْزِقُنِیْ فَاَرْزُقَهٗ یعنی ہے کوئی شخص جو رزق طلب کرتا ہے کہ میں اسکو رزق دوں۔ وَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَكْشِفُ الضُّرَّ فَاَكْشِفَ عَنْهُ یعنی اور کون شخص ہے جو مجھ سے اپنی پریشانی میں نجات چاہتا ہے کہ میں اسکی پریشانی کو دور کر دوں۔

اور ایک روایت میں آتا ہے کہ اَلَا سَقِیْمٌ یَسْتَشْفِیْ فَاُشْفٰی یعنی ہے کوئی بیمار جو مجھ سے شفا چاہتا ہے، تاکہ میں اسکو شفا دوں ـــــ ایک روایت میں اتنی زیادتی اور آئی ہے، وہ یہ کہ مَنْ یُّقْرِضُ غَیْرَ عَدِیْمٍ وَّلَا ظَلُوْمٍ یعنی کون ہے جو قرض دے ایک ایسی ذات کو جو نہ تو مفلس و نادار ہے کہ اصل رقم ہی واپس نہ کرے، اور نہ ظالم ہے کہ کم دے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس عنوان کے ذریعہ طاعت پر تحریض مقصود ہے، اور اس پر ثواب جزیل عطا فرمائے جانے کی جانب اشارہ ہے۔

فتح الباری میں ہے کہ حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ رات کے اس حصہ میں دعا مقبول ہوتی ہے، اور اگر کسی کو دعا مقبول ہوتی نہ معلوم ہو تو اس کا سبب شروطِ دعا میں خلل کا واقع ہو جانا ہے۔ مثلاً کھانے، پینے میں کوئی بے احتیاطی ہو گئی ہو، اسی وجہ سے دعا قبول نہیں ہوئی، یا دعا کرنے والے نے جلدی مچائی ہو گی کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یُسْتَجَابُ لِاَحَدِكُمْ مَا لَمْ یَعْجَلْ یعنی تم میں سے ہر شخص کی دعا قبول ہوتی ہے بشرطیکہ جلدی نہ مچائے۔ یا کسی گناہ کے کام کی دعا ہو گی یا قطع رحم کی ہو گی اسلئے قبول نہیں ہوئی ہو گی اور کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ دعا تو قبول ہو جاتی ہے مگر کبھی مطلوب کا ملنا اس بندے کی مصلحت یا حق تعالیٰ کی مرضی نہ ہونے کی وجہ سے مؤخر ہو جاتا ہے۔ اس لئے دوسری چیز مرحمت فرما دیتے ہیں اور یا اسکو

توشۂ آخرت بنا دیتے ہیں۔

ان احادیث سے بھی معلوم ہوا کہ دعا کی کس قدر اہمیت ہے ــــــــ

غرض انھیں نصوص کے پیش نظر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند دعائیں پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سے مستفید فرمائیں۔ آمین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے رزق کے متعلق کس طرح سوال فرما رہے ہیں ارشاد فرماتے ہیں:۔

(۱) اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ رِزْقًا طَيِّبًا وَّعِلْمًا نَّافِعًا وَّعَمَلًا مُّتَقَبَّلًا یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے رزق پاکیزہ، اور علم کارآمد، اور عمل مقبول"۔ یہ دعا کر کے آپ نے امت کو یہ تعلیم فرمائی کہ علم و عمل کے ساتھ ساتھ رزق طیب بھی اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرنا چاہیئے انھیں کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے، جب اُدھر ہی سے منظوری ہوتی ہے تب ہی انسان رزق کے باب میں بھی کامیاب ہوتا ہے۔ اس لئے رزق کو بھی اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرنا چاہیئے یعنی حصول رزق کا جس طرح سے ایک ذریعہ تجارت یا ایک ذریعہ زراعت یا ایک ذریعہ ملازمت ہے اسی طرح سے اس کا ایک سبب اقوی سبب اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا بھی ہے۔

علماء نے فرمایا ہے کہ رزق کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رزق مضمون ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے جس کی ذمہ داری لے لی ہے اور اسکے ضامن ہو گئے ہیں جس کا ذکر اس آیت میں ہے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا یعنی کوئی جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اسکی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ دوسری قسم رزق موعود ہے یعنی وہ رزق جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہے جس کا تذکرہ ان آیات میں ہے وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہونچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے۔

چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام میں آسانی کر دے گا (انھیں میں

سے رزق کا معاملہ بھی ہے)

اسی طرح ایک اور جگہ نہایت صریح لفظوں میں فرماتے ہیں کہ:۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى یعنی اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہئے، اور خود بھی اسکے پابند رہئے. ہم آپ سے معاش نہیں چاہتے، معاش تو آپ کو ہم دیں گے۔ اور بہتر انجام تو پرہیزگاری کا ہے۔

ان سب آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک اور متقی بندوں کیلئے رزق کا وعدہ فرمایا ہے، یہ رزق موعود ہے ـــــ اور تیسری قسم رزق مقسوم ہے جو کہ مضمون اور موعود دونوں کو شامل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر ایک کے لئے بقدر مقدر رزق تقسیم کیا جاچکا ہے۔ اتنا اس کو مل کر رہیگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو سید الاتقیاء ہیں، آپ کی نظر ان سب وعدوں پر تھی بلکہ آپ ہی سے تو خطاب تھا۔ مگر ان سب کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ سے رزق بھی طلب فرما رہے ہیں، یہ عبدیت ہے اور نزول ہے، جو کہ عروج سے افضل ہے۔

سمجھتے تھے کہ وعدہ جو فرمایا ہے، تو یہ مالک کا کرم ہے۔ باقی بندہ کا حق تو یہی ہے کہ وہ اپنے مولیٰ کے سامنے اپنے کو سراپا محتاج ہی ظاہر کرے۔

چنانچہ ایک اور دعا میں فرماتے ہیں کہ:۔

(۲) اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا مِنْ فَضْلِكَ وَلَا تَحْرِمْنَا رِزْقَكَ وَبَارِكْ لَنَا فِيْمَا رَزَقْتَنَا وَاجْعَلْ غِنَاءَنَا فِيْ أَنْفُسِنَا وَاجْعَلْ رَغْبَتَنَا فِيْمَا عِنْدَكَ. یعنی یا اللہ نصیب کر ہمیں اپنا فضل اور محروم نہ رکھ ہمیں اپنے رزق سے، اور برکت دے ہمیں اس رزق میں جو تونے ہمیں دیا، اور کر غنا ہماری ہمارے دلوں میں، اور کر دے رغبت ہماری اس چیز میں جو تیرے پاس ہے۔

ف ۔ سبحان اللہ اس دعا کی جامعیت ملاحظہ فرمائیے کہ اسمیں آپ دارین کی فلاح کا اللہ تعالیٰ سے سوال فرما رہے ہیں۔ یعنی پہلے تو یہ فرمایا کہ اے اللہ اپنا فضل عطا فرمائیے، اب ظاہر ہے کہ جب خدا تعالیٰ کا فضل ہی کسی کے شامل حال ہوگیا، تو پھر اب اس کو کمی کس چیز کی،

آگے رزقِ دنیا کو کس عنوان سے طلب کیا ہے، یعنی یہ فرمایا ہے کہ "اپنے رزق سے ہمیں محروم نہ فرمائیے بلکہ رزق دیجئے، اور جو کچھ عنایت فرمائیے اسمیں برکت بھی فرمائیے۔
آگے فرماتے ہیں کہ مجھے ظاہری غنیٰ اور امیری درکار نہیں ہے، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے دل کو غنی بنادیں، جیساکہ اور روایت میں آتا ہے کہ :- خَیْرُ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ یعنی بہترین غنیٰ دل کا غنیٰ ہے
اور آخر میں آخرت کو یاد کرکے فرماتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ ہم اس دنیا میں پھنس کر خدا کی جانب سے اور آخرت سے غافل ہوجائیں۔ اور بالکل مال ہی کے بندے ہوجائیں۔ اس لئے یہ فرمایا کہ میری قلبی رغبت کو اس چیز کی جانب پھیر دیجئے جو آپ کے پاس ہے۔ یعنی اجرِ آخرت جنت اور جزا اور مغفرت۔
اس دعا کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے رزقِ دنیا بھی طلب فرمایا ہے اور آخرت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔
چنانچہ جب آپ نے یہ دعا فرمائی تو یہ سنت ہوگئی۔ اب صالحینِ امت کو اپنے نبی کی اس سنت کا بھی اتباع کرنا چاہیئے ورنہ اتباع ناقص رہے گی۔
اور سنئے! ایک اور دعا میں ارشاد فرماتے ہیں :-
(۳) اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ اَوْسَعَ رِزْقِکَ عَلَیَّ عِنْدَ کِبَرِسِنِّیْ وَانْقِطَاعِ عُمُرِیْ وَاجْعَلْ خَیْرَ عُمُرِیْ اٰخِرَہٗ وَخَیْرَ عَمَلِیْ خَوَاتِمَہٗ وَخَیْرَ اَیَّامِیْ یَوْمَ اَلْقَاکَ فِیْہِ یَا وَلِیَّ الْاِسْلَامِ وَاَھْلِہٖ ثَبِّتْنِیْ بِہٖ حَتّٰی اَلْقَاکَ اَسْئَلُکَ غِنَایَ وَغِنَاءَ مَوْلَایَ۔
یعنی یا اللہ کرنا سب سے فراخ رزق میرا میرے بوڑھاپے اور میری عمر ختم ہونے کے وقت اور کرنا بہترین عمر میری آخر حصہ اس کا، اور بہترین عمل میرا پچھلے عمل کو، اور بہتر میرے دنوں کا وہ دن جسمیں تجھ سے ملوں، اے مددگار اسلام کے اور اہلِ اسلام کے ثابت قدم رکھ مجھکو اسلام پر یہاں تک کہ میں تجھ سے ملوں، مانگتا ہوں تجھ سے اپنی سیر چشمی اور اپنے متعلقین کی سیر چشمی!
دیکھئے! اسمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوڑھاپے میں وسعتِ رزق کی دعا مانگ رہے ہیں، یہ اس لئے کہ انسان رزق کا محتاج تو ہر زمانہ میں ہوتا ہے لیکن بوڑھاپے میں احتیاج اور بڑھ جاتی ہے، اس سبب سے کہ ایک جانب اپنے قویٰ اور اعضا کمزور ہوجاتے

ہیں، اور دوسری جانب بال بچے (پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں وغیرہ) زیادہ ہوجاتے ہیں۔ اور ان سب کی کفالت اسی سے متعلق ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اب اسوقت انسان کے پاس رزق کی وسعت ہوئی تو وہ عزت اور خوشی کے ساتھ سب کی کفالت کرسکتا ہے اور مطمئن ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر اس زمانہ میں اس کا ہاتھ تنگ ہوا تو نہ صرف یہ کہ ان سب کو فقر و فاقہ کی ہی تکلیف ہوگی بلکہ یہ شخص بھی اُن سب کی نظروں میں ذلیل ہوجائے گا۔ اس ذلت سے بچنے کیلئے آپ نے یہ دعا فرمائی۔ اور کیسی کچھ دعا فرمائی۔

سبحان اللہ! اوّلاً یہ دعا فرمائی کہ سب سے فراخ رزق میرا میرے بوڑھاپے میں اور آخر عمر میں عطا فرما ۔۔۔ اور پھر یہ دعا فرمائی کہ میری آخری عمر کو صرف دنیا ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ ہر اعتبار سے بہترین بنا۔ یعنی رزق بھی اسمیں فراخی کے ساتھ عطا فرما اور عمل بھی اسوقت کا میرا بہترین عمل بنا، اور اُس کے بعد فرمایا کہ میرا سب سے اچھا دن اُس دن کو بنا جس دن میں تجھ سے ملوں ۔۔۔ مطلب یہ کہ میرا خاتمہ بالخیر فرما، اور مجھے اپنی رضا عطا فرما تاکہ آپ کی رضا اور اپنی نجات کو پاکر میں یہ سمجھوں کہ بس یہی دن میرا سب سے بہترین دن ہے ۔۔۔ اس کے بعد یہ دعا فرمائی کہ اے اسلام اور اہل اسلام کے ولی مجھے آخر دم تک اسلام پر ثابت قدم رکھنا ۔۔۔ اور آخر میں یہ سوال کیا کہ میں ظاہری مالداری کا خواہاں نہیں ہوں بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اور میرے متعلقین کو آپ قلبی غنا یعنی سیرچشمی عطا فرمائیں تاکہ اس کے بعد مجھے اور میرے متعلقین کو ظاہری غنا کی قلت کا کچھ غم نہ ہو۔

اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر اور عمل کی خیریت کا اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے اس لئے کہ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ:۔

اِنَّ رَجُلاً قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ النَّاسِ خَیْرٌ قَالَ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَحَسُنَ عَمَلُہٗ، قَالَ فَاَیُّ النَّاسِ شَرٌّ قَالَ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَسَاءَ عَمَلُہٗ یعنی ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ سب سے اچھا شخص کون ہے؟ آپ نے فرمایا وہ شخص جسکی عمر زیادہ ہو اور عمل اچھے ہوں۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ اور سب سے بُرا شخص کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جسکی عمر زیادہ ہو اور عمل خراب ہوں۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ عمر کا بھی زیادہ ہونا انسان کیلئے مبارک ہوسکتا ہے

اگر اس کے اعمال صالح ہوں کیونکہ جب عمر زیادہ ہوگی تو اس میں اس کے اعمال حسنہ بھی زیادہ ہوں گے، اور اگر کسی کے اعمال بُرے ہوئے تو اس کی عمر کی زیادتی بھی وبال ہی ہوگی۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ میری عمر کے آخری حصہ کو بہترین، اور میرے اعمال کے آخری عمل کو بہترین عمل بنا تاکہ عمر اور عمل دونوں اعتبار سے میرا خاتمہ بخیر ہو جائے۔

اور سنئے! ــــ

جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اہل تقویٰ کے لئے رزق کا وعدہ فرمایا ہے اسی طرح جو لوگ ایمان اور عمل صالح اختیار کرتے ہیں ان کے لئے اسی دار دنیا میں اور دوسری چیزوں کا بھی وعدہ فرمایا ہے۔

چنانچہ آیت لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ کی ایک تفسیر علماء نے یہی فرمائی ہے کہ محسنین کے لئے اس دنیا میں حسنہ ہے، اور حسنہ کی تفسیر صاحب روح المعانی نے صحت اور عافیت سے فرمائی ہے یعنی محسنین کیلئے اس دنیا میں صحت اور عافیت ہے ــــ چنانچہ یہ لکھا ہے کہ:-

اِنَّ لِلْمُحْسِنِیْنَ جَزَاءً یَسِیْرًا فِی الدُّنْیَا وَهُوَ الصِّحَّةُ وَالْعَافِیَةُ وَ اِنَّمَا تُوَفّٰی اُجُوْرُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ یعنی محسنین کو اپنی نیکیوں کا کچھ تھوڑا سا بدلا اس دنیا میں بھی ملتا ہے، اور وہ صحت و عافیت ہے، باقی پورا پورا بدلہ تو ان کو آخرت ہی میں ملیگا۔

نیز صاحب روح المعانی نے آیت نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاءُ وَلَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۝ کے تحت حضرت سفیان بن عیینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ مُثَابٌ عَلٰی حَسَنَاتِهٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَالْفَاجِرُ یُعَجَّلُ لَهُ الْخَیْرُ فِی الدُّنْیَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ یعنی مومن اپنے حسنات پر دنیا اور آخرت دونوں جگہ ثواب دیا جاتا ہے، اور فاجر کے لئے اسکی بھلائیوں کا ثمرہ دنیا ہی میں دیدیا جاتا ہے، اور آخرت میں اسکے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔

پس مومن کو اس دنیا میں جو عافیت ملا کرتی ہے تو رزق اس کا فرد اعلیٰ ہے اسلئے

کہ اگر کسی کو رزق ہی حاصل نہ ہو تو پھر وہ عافیت ہی کیا ہے :
اسی کو سیدنا رفاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : ۔
" نعمتِ عافیت کی بڑی قدر کرو جس کی حقیقت یہ ہے کہ سانس بدون تکلیف کے آتا رہے، رزق بدون مشقت کے ملتا رہے، اور عمل صالح بدون ریا کے ہوتا رہے۔"

(البنیان المشید)

دیکھئے اِس سے معلوم ہوا کہ رزق کو بھی حصول عافیت میں دخل ہے۔
میں کہتا ہوں کہ حضرت سیدنا رفاعیؒ کا یہ ارشاد اس حدیث سے ماخوذ ہے : ۔
مَنْ اَصْبَحَ مِنْکُمْ اٰمِنًا فِیْ سِرْبِہٖ مُعَافًی فِیْ جَسَدِہٖ وَعِنْدَہٗ قُوْتُ یَوْمِہٖ فَکَاَنَّمَا حِیْزَتْ لَہُ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِہَا یعنی جس شخص نے تم میں سے صبح کی اِس حالت میں کہ اپنے نفس اور باطن کے اعتبار سے وہ مطمئن ہے، اور اُسے جسمانی عافیت بھی حاصل ہے، اور اس کے پاس اس دن کی روزی بھی موجود ہے، تو بس یہ شخص تو ایسا ہے کہ گویا اسکے لئے تمام دنیا ہی سمیٹ کر دیدی گئی ہے۔
اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رزق کے ساتھ عافیت کے لئے بھی بہت دعائیں کی ہیں ——— چنانچہ ایک دعا میں فرماتے ہیں : ۔
(۴) اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَاَھْلِیْ وَمَالِیْ
یعنی یا اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے معافی اور امن اپنے دین میں اور اپنی دنیا میں اور اپنے اہل میں اور اپنے مال میں۔
نہایت ہی مختصر مگر بہت جامع دعا ہے، فرما رہے ہیں کہ میں اپنے دین میں امن اور معافی چاہتا ہوں۔ یعنی جو کچھ عمل کروں وہ نفس و شیطان کی شرکت سے مامون رہے، اور انکی ادائیگی میں ہم سے جو کوتاہی ہو جائے اسکو آپ درگذر فرمائیں، اسطرح سے میں اپنی دنیا اور دین اور اپنے اہل اور اپنے مال کو تیری حفاظت میں دیتا ہوں۔
یعنی اِن سب میں مجھے لغزش سے بچائیے، اور ان تمام امور میں خیر و عافیت عطا فرمایئے
دیکھئے اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح سے تمام ضروری چیزوں کو جمع فرما دیا انسان کے لئے عافیت سے بڑھکر کیا شئے ہے اسی کو اللہ تعالیٰ سے ۔ دین میں دنیا میں اہل میں مال میں طلب فرما رہے ہیں

میں دعاؤں کا جو سلسلہ اس وقت آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ان میں سے ایک وہ دعا بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مؤمنین صالحین کی دعاؤں میں سب سے پہلے بیان فرمایا ہے،

۵ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

یعنی وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں بھی حسنہ عطا فرمائیے اور آخرت میں بھی حسنہ عطا فرمائیے، اور ہم کو عذاب جہنم سے بچائیے۔

اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں جس دعا کو سب سے مقدم فرمایا ہو اسکی کیسی کچھ اہمیت ہوگی، اسی اہمیت کی بنا پر حضرت مولانا تھانویؒ نے "مناجات مقبول" کی ابتدا بھی اسی دعا سے فرمائی کیونکہ اسمیں مختصر لفظوں میں دارین کی ہر نوع کی فلاح کو چاہا گیا ہے۔

حسنہ کے معنی خوبی اور بھلائی کے ہیں۔ یعنی ہر وہ چیز جو شریعت کے نزدیک بھلی ہو اسکو حسنہ کہا جاتا ہے۔ اس حسنہ کا حقیقی محل اور اصل موطن تو جنت ہے جو آخرت میں ملیگی لیکن اللہ تعالیٰ نے صالحین کا قول نقل فرمایا ہے کہ وہ ہم سے یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمکو دنیا میں بھی حسنہ عطا فرمائیے، اور آخرت میں بھی۔ اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچائیے۔

اللہ تعالیٰ کے اس طرح سے بیان کرنے سے معلوم ہوا کہ خود اللہ تعالیٰ کو بھی انکی یہ دعا بہت پسند ہوئی اس لئے ترغیباً للناس ان صالحین کی دعا کو ذکر فرمایا تاکہ ہر زمانہ میں اللہ کے نیک بندے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیا کریں۔ پس یہ دعا مقبول ہو چکی ہے اور مضمون اس کا شاہ کو پسند ہو چکا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نہایت ہی جامع دعا ہے، اور شاید ہی کوئی صالح ایسا ہوا ہو کہ جس نے یہ دعا نہ کی ہو اس لئے سالکین کو چاہئے کہ اس دعا کو حرز جان بنالیں۔ اور اگر اور کوئی دوسری دعا نہیں یاد ہے یا نہیں کرتے تو کم از کم اس کو تو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

یوں دارِ دنیا میں حسنہ بہت سی چیزیں ہیں لیکن سب کی اصل اور سب سے بڑھکر مومن کے حق میں جو چیز حسنہ ہے وہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ پھر اس کے بعد صحت ہے، عافیت ہے۔ نیز نصر ہے، غنیمت ہے، فتح ہے، ظہور ہے، تمکن ہے۔ صیت ہے اور شہرت ہے۔

اور آخرت کے حسنہ سے مُراد اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت ہے اور جنت و مغفرت ہے، اور ان سب سے بڑھکر اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے اور اسکی رُویت ہے۔ اور چونکہ آخرت کے حسنہ کی تکمیل اس پر موقوف تھی کہ انسان کو یہ تمام چیزیں بدون مشقت اٹھائے اور بدون جہنم کی تکلیف جھیلے حاصل ہو جائیں

یعنی جنت کا دخول جو کہ تبع الحسنات ہے اوّلیٰ ہو۔ اسی لئے آگے دعا میں یہ بھی فرمادیا کہ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ
یعنی دوزخ کی سختیوں اور اسکی رسوائیوں سے مجھے محفوظ رکھئے۔

اسی طرح سے ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

۶ ۔ اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی دِیْنِیْ بِالدُّنْیَا وَعَلٰی اٰخِرَتِیْ بِالتَّقْوٰی وَاحْفَظْنِیْ فِیْمَا غِبْتُ عَنْهُ وَلَا تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ فِیْمَا حَضَرْتُهٗ یَا مَنْ لَّا تَضُرُّهُ الذُّنُوْبُ وَلَا تَنْقُصُهُ الْمَغْفِرَةُ هَبْ لِیْ مَا لَا یَنْقُصُكَ وَاغْفِرْ لِیْ مَا لَا یَضُرُّكَ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ

یہ فرمایا کہ یا اللہ مدد کر میری میرے دین پر دنیا کے ساتھ، اور میری آخرت پر تقویٰ کے ساتھ مطلب یہ کہ مجھے دین کے ساتھ ساتھ دنیا بھی دیجئے لیکن نہ اس طرح کہ وہ مجھ پر حاوی ہوجاوے بلکہ اس طرح کہ وہ میرے دین کی معین ہوجائے " اور تو ہی محافظ رہ میری ان چیزوں کا جو میری آنکھ سے دور ہیں اور نہ حوالہ کر مجھے میرے نفس کے ان چیزوں میں جو میرے پیش نظر ہوں لے وہ کہ نہیں نقصان پہونچاتے اُسے گناہ، اور نہیں کمی کرتی اس کے ہاں مغفرت، دے مجھے وہ چیز کہ نہیں کمی کرتی تیرے ہاں کچھ، اور معاف کردے مجھے وہ چیز کہ نہیں نقصان پہونچاتی تجھے کیونکہ تو ہی دینے والا ہے۔

اس تمہید کے بعد آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

۷ ۔ اَسْئَلُكَ فَرَجًا قَرِیْبًا وَصَبْرًا جَمِیْلًا وَرِزْقًا وَّاسِعًا وَالْعَافِیَةَ مِنْ جَمِیْعِ الْبَلَاءِ وَاَسْئَلُكَ تَمَامَ الْعَافِیَةِ وَاَسْئَلُكَ دَوَامَ الْعَافِیَةِ وَاَسْئَلُكَ الشُّكْرَ عَلَی الْعَافِیَةِ وَاَسْئَلُكَ الْغِنٰی عَنِ النَّاسِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

یعنی مانگتا ہوں میں تجھ سے کشائش فوری، اور صبر جمیل، اور رزق واسع، اور امن جملہ بلاؤں سے۔ اور مانگتا ہوں میں تجھ سے پورا امن، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے بقا امن کی، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے شکر امن پر، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے سیرچشمی آدمیوں سے اور نہیں ہے پھرنا گناہوں سے اور نہ قوت عبادت کی مگر ساتھ اللہ برتر و بزرگ کے۔

اسی طرح سے ایک اور دعا میں فرماتے ہیں۔

۸ ۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ صَالِحِ مَا تُؤْتِی النَّاسَ مِنَ الْمَالِ وَالْاَهْلِ وَالْوَلَدِ غَیْرَ ضَالٍّ وَّلَا مُضِلٍّ ۔

یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے وہ اچھی چیز جو تو لوگوں کو دے، مال ہو یا بیوی ہو یا اولاد

کہ نہ گمراہ ہوں میں، اور نہ گمراہ کرنے والا۔

اس دعا میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صالح مال کا سوال کیا اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں اور سب چیزوں کی ضرورت ہے وہاں مال کی بھی ضرورت ہے۔ اگر مال کسی کے پاس نہ ہو تو دین کی بھی گاڑی نہیں چل سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مال کیلئے صالح ہونا ضروری ہے ورنہ وہی مال عذاب اور وبال بھی بن سکتا ہے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے۔

فرماتے ہیں:۔

۹ ۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اِمْرَأَةٍ تُشَيِّبُنِیْ قَبْلَ الْمَشِيْبِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ وَلَدٍ يَكُوْنُ عَلَیَّ وَبَالًا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ مَالٍ يَكُوْنُ عَلَیَّ عَذَابًا۔

یعنی اے اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری ایسی عورت سے کہ مجھے بوڑھا کر دے بوڑھاپے سے پہلے۔ اور پناہ چاہتا ہوں تیری ایسی اولاد سے کہ ہو مجھ پر وبال، اور پناہ چاہتا ہوں تیری ایسے مال سے کہ ہو مجھ پر عذاب۔ لیکن جب یہی بیوی، اولاد اور مال صالح ہوں گے تو پھر دین و دنیا دونوں جگہ کام آویں گے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ یعنی صالح مال انسان کیلئے کیا ہی عمدہ چیز ہے۔

اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

مال را گر بہر دین باشی حمول نعم مالٌ صالحٌ گفت رسول

یعنی مال کو اگر دین کے لئے جمع کرو تو کچھ بری بات نہیں اس لئے کہ جو مال خدا کی راہ میں خرچ ہو وہ مال صالح ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے نعم المال الصالح للرجل الصالح

دیکھئے ان روایات سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے رزق بھی طلب فرمایا، مال بھی طلب فرمایا اور صحت و عافیت بھی طلب فرمائی۔

عافیتِ دارین کے متعلق ایک مختصر دعا آپ یہ فرماتے ہیں کہ۔

۱۰ ۔ اَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَافِيَةَ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (مشکوٰۃ) یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے امن دنیا اور آخرت میں۔

اسی طرح سے طلب عافیت ایک جگہ اس عنوان سے فرما رہے ہیں:۔

۱۱ ۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ اِيْمَانًا دَائِمًا وَاَسْأَلُكَ قَلْبًا خَاشِعًا وَاَسْأَلُكَ يَقِيْنًا صَادِقًا

وَ اَسْئَلُكَ دِيْنًا قَيِّمًا وَ اَسْئَلُكَ الْعَافِيَةَ مِنْ كُلِّ بَلِيَّةٍ وَ اَسْئَلُكَ دَوَامَ الْعَافِيَةِ وَ اَسْئَلُكَ الشُّكْرَ عَلَى الْعَافِيَةِ وَ اَسْئَلُكَ الْغِنٰى عَنِ النَّاسِ ۔[۱۸۵]

یعنی اے اللہ مانگتا ہوں میں تجھ سے ایمان ہمیشہ رہنے والا، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے دل خشوع کرنے والا، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے یقین سچا، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے دین راست اور مانگتا ہوں میں تجھ سے امن ہر بلا سے، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے ہمیشہ رہنا امن کا، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے شکر امن پر، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے بے پروائی لوگوں سے یعنی سیر چشمی اور استغناء ۔

دیکھئے اس ایک دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی چیزوں کا اللہ تعالیٰ سے سوال کیا، پہلے ایمان دائم طلب فرمایا۔ پھر قلب خاشع کا سوال کیا اور یقین صادق کا، نیز دین قیم کی درخواست کی اور ہر مصیبت میں امن و اطمینان اور پھر اس امن کا دوام اور پھر اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر۔

غرض ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ ہی سے چاہا اور آخر میں یہ درخواست کی کہ آپ کی جانب یکسوئی کے ساتھ توجہ کرنے سے مانع مخلوق کے ساتھ تعلقات اور مخلوق پر نظر ہی ہوا کرتی ہے اس لئے مجھے ایسا کر دے کہ میں تیرے سوا سب سے بے نیاز ہو جاؤں اور جملہ مخلوق سے مجھے انقطاع کلی اور استغنائے تام نصیب فرما۔

اور سنئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک دعا میں فرماتے ہیں:۔

[۱۲] ۔ اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ لِيْ دِيْنِيَ الَّذِيْ هُوَ عِصْمَةُ اَمْرِيْ وَ اَصْلِحْ لِيْ دُنْيَايَ الَّتِيْ فِيْهَا مَعَاشِيْ وَ اَصْلِحْ لِيْ اٰخِرَتِي الَّتِيْ فِيْهَا مَعَادِيْ وَ اجْعَلِ الْحَيٰوةَ زِيَادَةً لِّيْ فِيْ كُلِّ خَيْرٍ وَ اجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِّيْ مِنْ كُلِّ شَرٍّ (م[۳۵])

یعنی اے اللہ درست رکھ میرا دین جو میرے حق میں بچاؤ ہے، اور درست رکھ میری دنیا جس میں میری معاش ہے، اور درست رکھ میری آخرت جہاں مجھے لوٹنا ہے، اور کر زندگی کو میرے لئے ترقی ہر بھلائی میں، اور کر موت کو میرے لئے چین ہر برائی سے۔

دیکھئے اس دعا میں دین دنیا اور آخرت اور پھر موت و حیات سب کو جمع فرما کر اس ایک ہی دعا کو انسان کی جملہ حوائج کے لئے جامع بنا دیا ہے۔ فرمایا کہ "میرے دین کی اصلاح

فرما دیجئے" اس لئے کہ وہی میرا بچاؤ ہے۔ اب اگر میرا ایمان اور وقار ہی درست نہ رہا تو ظاہر ہے کہ میں بڑی مصیبت میں پڑ جاؤں گا بلکہ ہلاک ہی ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد فرمایا کہ "اور میری دنیا کی بھی اصلاح فرمائیے جس میں کہ ہمارا رہنا سہنا ہے۔ کیونکہ اگر ہم دنیا میں رہتے ہوئے امور معاش کی جانب سے مطمئن نہ ہوئے تو ظاہر ہے کہ ہم ایسی حالت میں خدا کا حق کیا ادا کر سکتے ہیں۔ اور آخرت کے لئے کیا ذخیرہ فراہم کر سکتے ہیں اس لئے معاد کی درستگی کے ساتھ ساتھ معاش کی جانب سے بھی اطمینان نصیب ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے دین کے ساتھ ساتھ معاش کی بھی دعا فرمائی۔

آگے فرمایا کہ دنیا میں انسان کو زندگی جو عطا ہوتی ہے۔ اب اس کو انسان چاہے تو نیکیوں اور بھلائیوں میں صرف کرے، اور چاہے تو دوسری چیز میں صرف کرے۔ یہ انسان کا کام ہے اسلئے اس کی توفیق اللہ تعالیٰ ہی سے طلب فرمائی یعنی یہ عرض کیا کہ اے اللہ میری زندگی کو میرے لئے ہر خیر میں ترقی کا ذریعہ بنا یعنی نیکیوں کی توفیق فرما، اور خیر میں زیادتی فرما، پھر زندگی کے بعد چونکہ موت یقینی ہے اس لئے یہ فرمایا کہ میری موت کو میری ہر برائی کیلئے سبب سکون و راحت فرما یعنی موت ایسی حالت میں آوے کہ میں یہ سمجھ لوں کہ آج سے مصیبت کے دن ختم ہوئے اور اب آئندہ راحت ہی راحت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان کو حسنِ خاتمہ نصیب ہو۔ پس اس عنوان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے حسن خاتمہ طلب کیا گیا ہے۔

اب اعمال و اخلاق کے متعلق آپ کی دعا سنئے، اور یہ سمجھ لیجئے کہ اس راہ میں اعمال و اخلاق موجب قرب الٰہی ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے لئے کیسے اعمال و اخلاق اختیار کرنے چاہئیں۔ یہ سالکینِ راہ کے لئے ایک مشکل چیز ہے۔

دیکھئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اعمال پسندیدہ اور اخلاقِ برگزیدہ اختیار فرماتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ تضرع و زاری بدرگاہِ واہب العطیات بھی کرتے ہیں جیسا کہ آپ کی ادعیہ سے معلوم ہوتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

عـ۱۳ - اِهْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ اِنَّهٗ لَا یَهْدِیْ لِصَالِحِهَا وَلَا یَصْرِفُ سَیِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ (عـ۱۰۳)

یعنی اے اللہ ہدایت کر مجھکو اچھے اعمال اور اخلاق کی کیونکہ نہیں ہدایت کرتا ہے عمدہ اعمال

واخلاق کی اور نہیں دور کرتا ہے بُرے اعمال واخلاق کو کوئی سوائے تیرے۔

دیکھئے باوجودیکہ آپ ایک اولوالعزم پیغمبر اور تمام انبیاء علیہم السلام کے سردار ہیں آپ کی عبادات، آپ کے اعمالِ صالحات، آپ کے اخلاق اور پھر ان سب میں آپ کی حُسنِ نیت آپ کا ارادہ، آپ کا صدقِ عزم ان سب امور کا تو پوچھنا ہی کیا۔ پھر بھی ان سب کے باوجود آپ حق تعالیٰ ہی سے ہدایت طلب فرما رہے ہیں (اعمال واخلاق حسنہ کی۔ اور بُرے اعمال و بُرے اخلاق سے صَرف) یعنی ہٹنے اور بچنے کو اُدھر ہی سے طلب فرما رہے ہیں۔

بس یہی اصل ہے اس راستے کی کہ بندہ تضرع وزاری والحاح کو اپنی خو بنالے یعنی ان سب چیزوں کا سوال برابر اللہ تعالیٰ سے کرتا رہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہی میں کرتا رہے۔ پھر جب اس کے بعد اُدھر ہی سے ہدایت توفیق حُسنِ نیت، قوت عبادت اور طاقت اجتناب معاصی یہ سب امور عطا ہوتے ہیں تب بندے کا کام بنتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اس طرح سوال فرمایا تو اب تو یہ طریقہ مسنون ہوگیا لہذا اب سالکین راہ کے لئے بھی ضروری ہوگیا کہ وہ بھی اگر کسی عمل صالح کو کرنا چاہتے ہیں یا کسی سیئہ ورذیلہ سے بچنا چاہتے ہیں تو وہ بھی یہ طریقہ اختیار کریں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کو اپنا وظیفہ بنائیں، اور اسکے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کریں

یہاں ایک بات اور کہتا ہوں کہ اس دعا میں جب آپ نے یہ فرمایا کہ اِھْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ تو دعا کا مضمون ختم ہوگیا تھا۔ مگر اس کے بعد آگے یہ بھی فرمایا کہ لَا یَھْدِیْ لِصَالِحِھَا وَلَا یَصْرِفُ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ تو اسمیں توحید افعالی کی تعلیم فرمائی جس کی تعریف امام غزالیؒ یہ فرماتے ہیں کہ:۔

ھُوَ اَنْ یَّرَی الْاَشْیَاءَ کُلَّھَا مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی رُؤْیَۃً تَقْطَعُ الْاِلْتِفَاتَ اِلَی الْاَسْبَابِ یعنی توحید یہ ہے کہ انسان تمام امور کو خدا تعالیٰ کی جانب سے دیکھے، اس طرح سے کہ اسباب کی جانب التفات بالکل نہ رہ جائے۔ پس مومن جب اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ اختیار کرتا ہے تو کبھی شیطان یا خود اس کا نفس اسکی نظروں میں اسے کمال بنا کر پیش کرتا ہے اور یہ سبب بن جاتا ہے اس شخص کے عُجب میں مبتلا ہوجانے کا، جس کی وجہ سے یہ ایک جانب یہ عمل بھی کرتا جاتا ہے اور دوسری جانب اس کی برکات سے محروم بھی رہتا ہے۔

اس نقصان سے بچانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دعا فرمائی اِهْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ تو اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ اِنَّہٗ لَا یَھْدِیْ لِصَالِحِھَا وَلَا یَصْرِفُ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ آپ نے اس جزو کا اضافہ فرما کر امت کو عجب جیسے مہلک رذیلہ سے بچایا اس لئے کہ عُجب اسی وقت ہوتا ہے جب انسان کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اس کا عمل ہے۔ لیکن جب آدمی یہ سمجھ لے کہ ہر چیز کی توفیق حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ملا کرتی ہے۔ اور بدون ان کی توفیق کے ہم نہ کوئی عمل کر سکتے ہیں اور نہ اپنا کوئی خلق سنوار سکتے ہیں۔ اس استحضار کے بعد اللہ تعالیٰ کی اس طرح سے معرفت ہونے کے بعد پھر انسان عجب میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

طریق میں یہ عقبہ بہت سخت ہے ابتدائے احوال میں مشائخ تک اسمیں مبتلا رہتے ہیں، اور بہت دنوں کے بعد اس سے نجات ملتی ہے لیکن جب اس سے رہائی مل جاتی ہے تو آدمی راحت پاجاتا ہے، اور اس سے مشقتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا واقعہ کتابوں میں لکھا ہے " فرماتے ہیں کہ :-

میں ایک شب اپنے وِرد سے سو گیا جس کی وجہ سے میری طبیعت بہت مکدر ہوئی کیونکہ میں ان دنوں ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے اعمال پر اعتماد کرتے تھے، یعنی جن کی نظر اپنے عمل پر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے میں چند فرائض سے سو جانے کی سزا میں مبتلا کیا گیا، بہت پریشان ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہو گی کہ یا الٰہی ! یہ کیا ماجرا ہے ؟ اب تو نوافل سے گذر کر فرائض کی نوبت آنے لگی۔ اتنے میں باطن سے آواز آئی کہ اے ابراہیم ! ہمارے بندے بن جاؤ۔ راحت پاجاؤ گے (یعنی اپنے ارادہ و اختیار کو ختم کر دو اور ہمارے ارادے اور اختیار سے کام کرو) ہم سُلا دیں تو سو رہو اور اٹھا دیں تو اٹھ جاؤ۔ بس ان دونوں کے درمیان تمہارے اختیار میں کچھ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک دشوار گزار گھاٹی ہے جس میں سالکین کا ابتلاء ہوتا ہے اور مخلصین ہی محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سے نکلتے ہیں۔

اسی رذیلہ سے نکلنے کا طریقہ نہایت ہی آسان اور مختصر لفظوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا ہے۔ یعنی انسان اللہ تعالیٰ سے صالح اعمال اور حُسن اخلاق کی دعا بھی کرے، اور اس کا بھی خیال رکھے کہ اگر ان میں سے کچھ حصہ حاصل بھی ہو جائے تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھے، اور اپنا کوئی کمال نہ سمجھے ـــــ سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے۔

اگر یہی ایک مضمون ہمارے قلب میں راسخ ہو جائے تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ عُجب کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکے۔

اسی کو صوفیہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اس دعا کا اوّل حصہ یعنی اِھْدِنِی لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ یہ تو سلوک ہے۔ اور آخری حصہ یعنی اِنَّہٗ لَایَھْدِیْ لِصَالِحِھَا وَلَا یَصْرِفُ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ یہ جذب ہے۔

چنانچہ سلوک کے بعد جبتک اُدھر ہی سے جذب نہ ہو، یہ راہ طے نہیں ہوتی۔ پس یہ جذب فرمانا وصول الی اللہ کے لئے بمنزلہ علت تامہ کے جزو اخیر کے ہے۔ اور اس کا جزو اوّل اتباع ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۔۔۔ چنانچہ بزرگان دین کے اس قسم کے ارشادات سنتا تھا:

مثلاً شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

پندار سعدی کہ راہِ صفا ۔۔۔ تواں رفت جز برپئے مصطفےٰ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید ۔۔۔ کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

کسانیکہ زیں راہ برگشتہ اند ۔۔۔ برفتند و بسیار سرگشتہ اند

دریں بحر جز مرد داعی نہ رفت ۔۔۔ گم آں شد کہ دنبال راعی نہ رفت

فرماتے ہیں کہ اے سعدی یہ گمان نہ کرنا کہ راہِ صفا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلے بغیر طے کی جا سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو شخص راہ اختیار کرے گا اس کی رسائی منزل تک ہرگز نہ ہو سکے گی۔ جو لوگ اس راستہ سے بھٹکے ہیں وہ گمراہی میں بڑھتے ہی چلے گئے ہیں۔ بالآخر بہت ہی حیران و سرگرداں ہوئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اس بحر میں سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی چلا نہیں ہے، آپ ہی چلے ہیں اس لئے آپکا اتباع ضروری ہے۔ اب جو شخص اتباع سنت نہیں کرے گا وہ گمراہ ہوگا۔ اور ہلاک ہو جائے گا جیسے وہ بھیڑ بکری جو چرواہے کے پیچھے پیچھے چلے تو راستہ بھٹک کر طعمۂ گرگ ہو جاتی ہے۔

قطب العالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ ؎

ہر کہ در راہ محمد رہ نیافت ۔۔۔ تا ابد گردے ازیں درگہ نیافت

یعنی جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کو اپنا راستہ نہیں بنایا اس نے خدا تعالیٰ کی درگاہ کے راستہ کی گرد کو بھی نہیں پایا۔

مفتاحُ الرَّحمۃ

(۳)

میں بزرگوں کے ان ارشادات کو اتباع باطنی نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب میں پڑھا کرتا تھا اور خوش ہوتا تھا، اب اس حدیث سے جو کہ برابر معمول ہے یہ سمجھ میں آیا کہ سالکین کا ایسی حدیثوں کو معمول بنانا بھی پیروی باطنی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور اسی سے اعمال و اخلاق کی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیروی نصیب ہوگی۔ آپ نے دل سے تو کیا زبان سے بھی ایک مرتبہ بھی نہ کہا ہوگا کہ اِهْدِنِي لِصَالِحِ الْأَعْمَالِ وَالْأَخْلَاقِ إِنَّهُ لَا يَهْدِي لِصَالِحِهَا وَلَا يَصْرِفُ سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ

اور سنئے ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

۱۴　اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي … إِلَيْكَ رَبِّ فَحَبِّبْنِي وَفِي نَفْسِي لَكَ فَذَلِّلْنِي وَفِي أَعْيُنِ النَّاسِ فَعَظِّمْنِي وَمِنْ سَيِّئِ الْأَخْلَاقِ فَجَنِّبْنِي (ابن ماجہ) اے میرے رب اپنا بنالے مجھے، اور میرے دل میں اپنے مقابلہ میں فرماں برداری ڈال دے، اور لوگوں کی نظر میں عظمت دے، اور برے اخلاق سے بچائے رکھئے مجھے

سبحان اللہ! کیا دعا ہے اور کیسی عبودیت ہے۔ اِلَيْكَ رَبِّ فَحَبِّبْنِي میں جو لطف ہے وہ ترجمہ میں کہاں، فرماتے ہیں کہ اپنی جانب مجھے محبوب بنا لیجئے، اور میرے نفس میں اپنا انقیاد اور تابعداری اسطرح سے ڈال دیجئے کہ میں ہر آن آپ کا محتاج اور آپ کا تابع و فرمانبردار بنا رہوں اور اپنے کو آپ کے آگے انتہائی ذلیل اور محتاج بنا کر پیش کروں لیکن میری یہ ذلت صرف آپ ہی کے مقابلہ میں ہو، اور لوگوں کی نظروں میں مجھے با وقار بنائیے۔ اس لئے کہ اور لوگ بھی اگر مجھے حقیر و ذلیل سمجھیں گے تب تو میں بالکل ہی بے وقعت ہو جاؤنگا۔ باقی اس کا ذریعہ چونکہ یہی ہے کہ انسان کے اخلاق اچھے ہوں اسلئے آپ سے کہتا ہوں کہ میرے اخلاق اچھے کر دیجئے اور برے اخلاق سے مجھے بچائیے۔

اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو تواضع حاصل کرنیکا طریقہ سکھایا ہے، اور تواضع میں یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی نگاہوں میں تو چھوٹا ہوتا ہے اور دوسروں کی نگاہوں میں بڑا ہوتا ہے — یہ عزت نفس ہے جو کہ شرعاً مطلوب ہے۔

چنانچہ ایک دوسری دعا میں یہ الفاظ موجود ہیں اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَّفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا یعنی اے اللہ مجھے اپنی آنکھوں میں چھوٹا دکھائیے، اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا دکھائیے۔

ایک مولوی صاحب نے مجھ سے اس پر اشکال کیا کہ اس دعا میں تو اللہ تعالیٰ سے بڑائی کو بھی چاہا گیا ہے حالانکہ بڑائی اچھی چیز نہیں ہے، یہ تو کبر ہے۔ میں نے کہا کہ یہاں مجموعہ مراد ہے یعنی اپنی نظروں میں چھوٹا اور دوسروں کی نظروں میں بڑا ہونا چاہا گیا ہے جس کا دوسرا نام تواضع ہے جو ایک محمود صفت ہے بلکہ جملہ فضائل کی اصل ہے اور اسی کا یہ خاصہ ہے کہ انسان اپنے کو کمتر سمجھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ دوسروں کی نظروں میں اس کی وقعت بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

اور سنئے اپنی ایک اور دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ

ع۱۵ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ التَّوْفِیْقَ لِمَحَابِّکَ مِنَ الْاَعْمَالِ وَصِدْقَ التَّوَکُّلِ عَلَیْکَ وَحُسْنَ الظَّنِّ بِکَ (ع۱۱۷) یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے توفیق تیرے پسندیدہ اعمال کی، اور سچے توکل کی تجھ پر، اور نیک گمان کی تیرے ساتھ۔

دیکھئے اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کا سوال فرمایا۔ ایک تو یہ کہ پسندیدہ اعمال کی توفیق ہو۔ مطلب یہ کہ اعمال میں سے کارآمد وہی عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو۔ ہم کوئی عمل اپنے طور پر کریں اور وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو تو یہ تو بڑے گھاٹے کی بات ہے کہ ہم نے اسمیں تعب اور مشقت بھی اٹھائی اور مقصد بھی حاصل نہ ہوا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ ہی سے یوں دعا کی کہ مجھے ایسے اعمال کے کرنے کی توفیق عطا فرمائیے جو آپ کے نزدیک پسندیدہ ہوں۔

اور دوسری چیز جو اسمیں ہے وہ یہ کہ آپ نے اللہ تعالیٰ پر صدق توکل پیدا ہو جانے کی دعا فرمائی کیونکہ بندے کو جب اللہ تعالیٰ پر توکل ہو جاتا ہے تو وہ اِدھر اُدھر نظر کرنے کی زحمت سے بچ جاتا ہے اور ہر کام کے پورا ہونے پر اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے کو بہت سی زحمتوں سے بچا لیتا ہے۔

یہاں صدق توکل کا لفظ اختیار فرمایا۔ اور ایک مقام پر ان لفظوں میں دعا فرمائی ہے

ع۱۶ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِمَّنْ تَوَکَّلَ عَلَیْکَ فَکَفَیْتَہٗ وَاسْتَھْدَاکَ فَھَدَیْتَہٗ وَاسْتَنْصَرَکَ

فَنَصَرْتَهُ (ع ۱۶۷) یعنی کر دے مجھے ان لوگوں میں سے کہ انھوں نے توکل کیا تجھپر پس تو کافی ہوگیا انھیں، اور انھوں نے ہدایت مانگی تجھ سے پس تو نے ہدایت کر دی انھیں اور انھوں نے مدد چاہی تجھ سے پس تو نے مدد کر دی انکی

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ پر توکل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو کافی ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود بھی ارشاد فرمایا ہے اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ بس پھر جب اللہ تعالیٰ ہی کسی کی کفایت فرمالیں تو اسکو ہدایت دیدیں، نصرت دیدیں اور جو چاہیں عطا فرمائیں ان کیلئے کیا مشکل ہے لیکن اسکے لئے یہ ضروری ہے کہ بندے کو اعتقاد تام حاصل ہو اور اسپر یقین حاصل ہو، اور اللہ تعالیٰ سے اسکو پورا پورا حسن ظن ہو اسی لئے صدق توکل کے بعد اس کی بھی دعا مانگو کہ آپ کیساتھ حسن ظن بھی کامل مجھے حاصل ہو اور اس میں شک نہیں کہ جیسا گمان ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ رکھے گا اُدھر سے بھی ویسا ہی معاملہ اسکے ساتھ کیا جائے گا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ یعنی بندہ میرے ساتھ جیسا گمان رکھے گا میرا معاملہ اپنے ساتھ ویسا ہی پائے گا۔

ایک دعا میں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ

ع ۱۶۸ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ یعنی اے اللہ جس کو آپ عطا فرمانا چاہیں اسکو کوئی منع کرنیوالا نہیں، اور جس کو آپ نہ دینا چاہیں اس کو کوئی دینے والا نہیں، اور کسی غنی کا غنا آپ کے مقابلہ میں اس کو کوئی منفعت نہیں پہونچا سکتا۔

اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ تعلیم فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں عطا و منع ہے۔ وہی جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں ؎

تو وہ داتا ہے کہ جو چاہے کرے جسکو چاہے دے، جسے چاہے نہ دے

اور جس کو وہ دینا چاہیں تو ساری دنیا بھی اگر اسکو روکنا چاہے تو نہیں روک سکتی اور جس کو وہی نہ دینا چاہیں تو اگر سارا عالم ملکر چاہے کہ اس کو دیدے تو نہیں دے سکتا۔ آپنے یہ تعلیم فرمائی کہ یہی عقیدہ رکھنا چاہیئے۔

چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کا یہی حال ہوتا ہے۔ اس کا نام توحید افعالی

ہے یعنی یہ کہ معطی اور مانع اسی طرح سے ضار و نافع یہ حضرات صرف خدا کی ذات کو سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ ان کے قلوب میں ایسا راسخ ہوتا ہے کہ پھر اسکے مقابلہ میں سلاطین دنیا کو بھی یہ حضرات خاطر میں نہیں لاتے۔ انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان ہے۔ اولیاء نے بھی انکی پرواہ نہیں کی۔

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی نے ان سے بادشاہ کے پاس سفارش کرنے کی درخواست کی، انھوں نے بادشاہ کے نام جو خط لکھا اس کا مضمون ملاحظہ ہو۔ لکھا کہ:۔

رَفَعْتُ قَضِيَّتَهٗ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ اِلَيْكَ فَاِنْ اَعْطَيْتَهٗ شَيْئًا فَالْمُعْطِيْ هُوَ اللّٰهُ وَ اَنْتَ الْمَشْكُوْرُ وَاِنْ مَنَعْتَهٗ فَالْمَانِعُ هُوَ اللّٰهُ وَ اَنْتَ الْمَعْذُوْرُ

یعنی میں اس شخص کا معاملہ اولاً خدا تعالیٰ کی جناب میں پھر (سبب کے درجہ میں) تیری جانب راجع کرتا ہوں، اب اگر تو اسکو کچھ دیدے تو میں یہ سمجھونگا کہ معطی حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہیں اور تو بھی مستحق شکریہ ہے اور اگر تو نے اس کو کچھ نہ دیا تو پھر بھی میں یہ سمجھونگا کہ مانع حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں اور تو معذور ہے۔

سبحان اللہ! کس قدر توحید میں یہ حضرات مستغرق رہتے ہیں کہ سفارش بھی کردی توحید بھی باقی رکھی۔

اور سنئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک دعا میں فرماتے ہیں کہ:۔

ع ۱۸ اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعْصِيَتِكَ وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهٖ جَنَّتَكَ وَمِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَيْنَا مَصَائِبَ الدُّنْيَا وَمَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا اَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَرْحَمُنَا۔ (ع ۱۵۲) یعنی اے اللہ دے ہمیں حصہ اپنے خوف سے اتنا کہ حائل ہو جائے بذریعہ اس کے ہم میں اور تیرے گناہوں میں۔ اور اپنی عبادات سے اتنا کہ پہنچادے تو ہمیں بذریعہ اسکے اپنی جنت میں، اور یقین سے اتنا کہ سہل کردے تو اس کی وجہ سے ہمپر دنیا کی مصیبتیں اور کارآمد کر ہماری سنوائیاں اور ہماری بینائیاں اور ہماری قوت جبتک ہمیں زندہ رکھے اور کرنا اس چیز کو باقی بعد ہمارے۔ اور ہمارا انتقام لے اس سے جو ہمپر ظلم کرے۔ اور مدد دے

ہمیں اسپر جو ہم سے دشمنی کرے، اور مت کر ہماری مصیبت ہمارے دین میں اور مت کر دنیا کو مقصود اعظم ہمارا، اور نہ انتہا ہمارے معلومات کی، اور منتہا ہمارے رغبت کی، اور نہ مسلط کر ہمپر اسکو جو ہمپر رحم نہ کرے۔

اس دعا کے ایک ایک لفظ پر غور فرمایئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس کس طرح سے اللہ تعالیٰ سے دینی و دنیاوی راحت و سکون طلب فرمارہے ہیں۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے خشیت کا سوال اس لئے مطلوب ہے کہ اسکی وجہ سے آدمی گناہوں سے بچتا ہے اس لئے سوال فرماتے ہیں کہ اے اللہ آپ مجھے اپنے خوف کا کم از کم اتنا حصہ تو بخش دیجئے جو ہم سے آپکی معصیت نہ ہونے دے بلکہ ارادۂ گناہ پر ہی آپ کا خوف سامنے آجائے اور ہم کو اس سے روکدے، اور اپنی طاعت سے کم از کم اتنی طاعت کی توفیق عطا فرمایئے جس کی وجہ سے آپکی جنت میں داخل ہونیکا مستحق ہوسکوں، اور مجھے اپنے وعدوں پر اتنا یقین عطا فرمایئے جسکی وجہ سے دنیا کی ساری پریشانیاں مجھ پر سہل ہوجائیں یعنی اس یقین کیوجہ سے ان سبکو آپ ہی کیطرف سے سمجھوں یوں کہ آپ نے جس طرح سے انھیں بھیجا ہے اس طرح سے آپ ہی اسے دور بھی فرما سکتے ہیں۔ اور ان کے بھیجنے میں بھی ہمارے لئے کوئی مصلحت رہی ہوگی۔

آگے فرمایا کہ آپ نے مجھے سمع۔ بصر اور قلب ان سب دولتوں سے نوازا ہے تو آپ ہی انھیں کارآمد بھی بنایئے یعنی مدۃ العمر ہمارے ان سب قویٰ کو محفوظ رکھئے، اور ہم کو ان سے منتفع فرمایئے۔ کسی عضو میں کوئی ضعف خلل اور فتور نہ ہو۔ نیز یہ بھی کہ آپ ان کو اپنی طاعت اور مرضیات میں لگایئے۔ اور نامرضیات و معصیت سے انھیں بچایئے۔ زندگی میں بھی ان سب کو خیر کا مصدر اور اس کا سرچشمہ بنایئے، اور بعد مرنے کے بھی ان کے آثار کو باقی رکھئے۔

آگے فرماتے ہیں کہ ہم کمزور ہیں آپ ہی ہمارے ناصر و مددگار ہیں لہٰذا جو ہم پر ظلم کرے یا ہم سے دشمنی کرے تو آپ ہی ہماری کیجئے اور اس سے ہمارا انتقام لیجئے۔ اور ایک گذارش یہ ہے کہ تکوینی طور پر اگر ہمارے لئے آپ کی جناب سے مصیبت ہی مقدر ہو تو وہ مصیبت تو آکر رہے گی۔ مگر آپ سے یہ درخواست ہے کہ اس مصیبت کو ہمارے دین میں نہ کیجئے، اور دین میں مصیبت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر انسان کو اجر نہ ملے۔ کیونکہ جس مصیبت پر اجر ملے تو حقیقۃً وہ مصیبت ہی نہیں ہے۔ البتہ اگر دنیا میں پریشانی اٹھانی پڑے اور آخرت

کے اجر سے بھی وہ خالی رہے تو بیشک وہ مصیبت ہے۔ اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تمامتر فساد کی جڑ اور جملہ خطایا کی اصل حب دنیا ہے اور اس کی جانب میلان انسان کا طبعی ہے، اور دنیا میں رہ کر استعمال دنیا سے چارہ بھی نہیں اس لئے نہ تو ہم دنیا سے بچ سکتے ہیں اور نہ اس کو اپنے دل سے بالکلیہ نکال سکتے ہیں۔ مگر ہاں اسکی درخواست کرتے ہیں کہ اسکی تحصیل ہمارا مقصود اعظم نہ بنجائے اور یہ دنیا ہماری معلومات کی انتہا نہ ہوجائے، اور ہمارے رغبات کی منتہا ہوکر نہ رہ جائے کہ ہم اسی میں بالکل لت پت ہوکر تیری یاد سے غافل ہوجائیں۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک اہم گذارش یہ بھی ہے کہ ہمارے اوپر کسی ایسے کو مسلط نہ فرما دیجئے گا جو کہ ہم پر رحم نہ کرے کیونکہ جب وہ رحم نہ کریگا تو ظلم کریگا، اور طرح طرح کی ایذائیں پہونچائے گا جو سبب بنے گا ہمارے تشتت قلبی کا۔ اب خواہ یہ مسلط ہونے والا ہمارا خارجی دشمن ہو یعنی شیاطین الجن یا شیاطین الانس میں سے کوئی ہو یا داخلی دشمن ہو یعنی ہمارا نفس ہو۔ اس لئے کہ نفس کو بھی حدیث شریف میں دشمن ہی کہا گیا ہے۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ إِنَّ أَعْدَى عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ یعنی تمہارے دشمنوں میں سے سب سے بڑا دشمن تمہارا وہ نفس ہے جو کہ تمہارے پہلو میں ہے۔

سبحان اللہ! کس قدر جامع دعا ہے، انسان دنیا میں معصیت سے محفوظ رہے مصائب دنیا اسے پریشان نہ کریں، اور ایسے اعمال واخلاق کی اسے توفیق ہو جو زندگی میں بھی اسے نیک نام رکھیں اور مرنے کے بعد بھی اسکی یاد کو باقی رکھیں، ظالم ودشمن سے اطمینان حاصل ہو، دینی مصیبت سے محفوظ رہے، دنیا اپنے درجہ سے زیادہ حیثیت نہ حاصل کرے اور کسی ظالم و بے رحم کا انسان پر تسلط نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں جب کسی کو حاصل ہوجائیں تو اس سے بڑھ کر دینی ودنیوی راحت و سکون اور کیا ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ قُلْ هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝ یعنی آپ کہئے کہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور تمکو کان، آنکھ اور دل دیئے تملوگ بہت کم شکر کرتے ہو ــــ اس سے معلوم ہوا کہ سمع بصر اور قلب کا انسان میں ہونا اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ یہاں حق تعالیٰ نے اس کا امتنان فرماکر شکایت فرمارہے ہیں کہ میں نے کیسی کیسی نعمتوں سے تم کو نوازا مگر تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو۔ یعنی

قاعدہ ہے کہ کسی منعم کے انعام پر اس کا شکر ادا کیا جاتا ہے مگر تم کو دیکھتا ہوں کہ ہمارے انعامات سے متمتع تو ہو رہے ہو لیکن ہمارا شکر نہیں ادا کرتے۔ اب حق تعالیٰ کا یہ ارشاد سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسکی جانب کس طرح صرف نظر فرما سکتے تھے۔ پس آپ نے ان کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ ہی سے سوال فرمایا اور یوں درخواست کی کہ

ع۱۹　اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا اَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا (ع۵۲)

یعنی اے اللہ کار آمد رکھ ہماری شنوائیاں اور ہماری بینائیاں اور ہماری قوت جبتک ہمیں زندہ رکھیں آپ، اور کر ان سکے خیر کو باقی ہمارے بعد ــــ کار آمد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جو عضو جس کام کے لئے موضوع ہے ہم اسکو اسی میں لگا دیں۔ یعنی آپکی مرضیات میں انکو استعمال کریں کہ یہی ان کا شکر ہے۔

سبحان اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح سے ہم کو ہمارے جوارح سے منتفع ہونے کا طریقہ بتایا ــــ اور وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کریں کہ ہمیں ان جوارح اور اعضاء سے نفع بخشے ــــ اور اسکے لئے آپ اللہ تعالیٰ ہی سے منتفع ہونیکی توفیق طلب فرما رہے ہیں ــــ چنانچہ یہ فرمایا کہ تاحیات ہمیں ہمارے سمع و بصر اور ہمارے جملہ قویٰ سے منتفع فرما اور ان سے ایسا کام لے لے کہ وہ ہمارے مرنے کے بعد بھی ہم کو نیک نام رکھیں۔

چنانچہ ایک اور دعا میں آپ نے یہ فرمایا کہ:-

ع۲۰　وَبَارِكْ لَنَا فِيْ اَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ط (ع۴۹) یعنی اے اللہ برکت دے ہماری شنوائیوں میں اور ہماری بینائیوں میں، اور ہمارے دلوں میں، اور ہماری بیویوں میں، اور ہماری اولاد میں۔ اور توبہ قبول کر ہماری کیونکہ تو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

دیکھئے اس دعا میں سراپا عبدیت اور کمال افتقار الی اللہ کا اظہار فرما رہے ہیں کہ سمع بصر، قلوب اور ازواج و ذریات کے لئے برکت طلب فرمایا پھر اسکے بعد یہ بھی فرمایا کہ وَتُبْ عَلَيْنَا ہماری توبہ قبول فرما لیجئے، یہ اعلیٰ درجہ کی عبدیت ہے۔

پس ایک سالک کی بھی یہی شان ہونی چاہئے کہ وہ مالک کے سامنے اپنے کو سرتاپا محتاج اور گنہ گار سمجھے اور ہر امر میں انہیں سے استعانت اور توفیق طلب کرے۔

اور سنئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا میں یہ فرمایا:-

۲۱ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ عِیْشَةً نَقِیَّةً وَّمِیْتَةً سَوِیَّةً وَّمَرَدًّا غَیْرَ مُخْزِیٍّ وَّلَا فَاضِحٍ
یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے زندگی صاف اور موت ڈھنگ کی اور انتقال جس میں رسوائی اور فضیحت نہ ہو۔

سبحان اللہ! کیسی عمدہ دعا ہے انسان کے تمام حالات کے لئے جامع ہے کیونکہ ہر انسان کو یہی تین حالات پیش آتے ہیں زندگی موت اور مابعد الموت۔ اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں حالتوں کی خوبی کا اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے فرماتے ہیں کہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں صاف زندگی کا۔

علماء نے لکھا ہے کہ عِیْشَةً ای حیاۃً یعنی عیشہ کے معنیٰ حیات کے ہیں نَقِیَّةً ای زکیۃً راضیۃً مرضیۃً یعنی نقیۃ کے معنیٰ ہیں پاکیزہ اور صاف کے یعنی ایسی زندگی جو صاف و پاکیزہ ہو اور جسے پاکر صاحب عیش راضی ہو اور وہ اس کے نزدیک پسندیدہ ہو یا جس میں اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوں اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو۔ اور مِیْتَةً کے معنیٰ ہیں حالت موت کے اور سَوِیَّةً کے معنیٰ ہیں معتدلہ کے۔ مطلب یہ کہ سوال کرتا ہوں میں تجھ سے ایسے موت کا جو معتدل ہو یعنی ارذل عمر کو نہ پہونچ جاؤں اور نہ اتنا بوڑھا ہو جاؤں کہ بوڑھاپے کی مشقت مجھے جھیلنی پڑے۔ مطلب یہ کہ میری عمر اتنی زیادہ نہ ہو جائے کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا جواب دیدیں اور میں اپنے ہر کام میں دوسروں کا محتاج ہو جاؤں۔ چنانچہ عوام میں یہ جو رائج ہے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ چلتے پیر کھ اٹھالے (یعنی چلتا پھرتا دنیا سے اٹھالے) یہ اسی حدیث کا ترجمہ ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ مَرَدًّا غَیْرَ مُخْزِیٍّ وَّلَا فَاضِحٍ یعنی دنیا سے آخرت میں انتقال جو میرا ہو تو اس حال میں ہو کہ نہ تو وہاں رسوائی کا منہ دیکھنا پڑے اور نہ کسی قسم کی فضیحت اٹھانی پڑے یعنی اس طرح سے جاؤں کہ نہ تو وہاں ذلیل ہوں اور نہ کسی قسم کی مصیبت اور بلا میں پڑوں اور نہ اس حالت میں وہاں میری بیشی ہو کہ میرے عیوب اور میرے گناہ دوسروں پر ظاہر ہوں اور میری فضیحت ہو جائے

دیکھئے اس ایک ہی دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری ساری ضروریات کا احاطہ فرما دیا ہے یعنی اچھی زندگی کا بھی سوال فرمایا کیونکہ اگر زندگی ہو اور اچھی نہ ہو یعنی کلفتوں اور مصائب سے پُر ہو یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معاصی سے لبریز ہو تو پھر وہ زندگی ہی کیا۔ اسی طرح

آگے ڈھنگ کی موت کا بھی سوال فرمایا ہے کیونکہ موت ایک تو خود ہی وحشت کی چیز ہوتی ہے اور اس پر بھی اگر وہ بے ڈھنگی ہوئی تب تو یہ مصیبت بالائے مصیبت ہوگی۔ اسی طرح آپ نے تیسرا سوال یہ فرمایا کہ آپ کی جانب لوٹ کر جانا تو برحق ہے اور وہاں سب اولین وآخرین کا سامنا ہوگا لہٰذا اے اللہ میں تجھ سے آخرت کی ایسی پیشی اور حاضری چاہتا ہوں کہ جس سے نہ تو میں ذلیل ہوں اور نہ میرے عیب اور گناہ دوسروں پر کھولیں کہ وہ میرے لئے سبب رسوائی بنے۔

مجھے یہ دعا بہت پسند ہے آپ بھی اس دعا کو معمول بنائیں یعنی روزانہ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے زندگی اور موت کی خیریت کا سوال تو ضرور ہی کر لیا کریں۔

(نصیحت)

فرمایا کہ نوجوانوں کو معاملات اور اخلاق کی درستی کی طرف متوجہ کرنا چاہئے اور اس کی نگرانی رکھنا چاہئے آج سب سے اہم چیز معاملات کی اصلاح ہے کیونکہ سارے جھگڑے اسی فساد (بد معاملگی) سے پیدا ہو رہے ہیں لیکن معاملات سے بھی اہم اخلاق کی اصلاح ہے اس لئے کہ اخلاق کی اصلاح کی صورت میں بد معاملگی کی نوبت ہی نہ آئے گی کیونکہ بد اخلاقی ہی کی فرع بد معاملگی ہے (جب اصل ہی نہ موجود ہوگی تو فرع کا تحقق کیونکر ہوگا)

فرمایا کہ اہل اسلام کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کا انتظام کریں اور ہر شخص کے ذمہ لازم کر دیں کہ وہ اپنے بچوں کو اتنی مقدار میں تعلیم دین ضرور دلائے جس سے وہ اپنی آئندہ زندگی میں اپنے دین و ایمان سے ناواقف نہ رہیں اور جو بچے دنیوی تعلیم مثلاً (انگریزی یا ہندی) حاصل کر رہے ہیں ان کے لئے بھی ان کے اوقات تعلیم کے علاوہ کوئی وقت مقرر کیا جائے جس میں وہ دین سیکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

فرمایا کہ :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اُمت کی اصلاح کیلئے حق تعالیٰ کی جانب سے مامور تھے اس لئے جہاں آپ نے اعمال واخلاق کی تعلیم فرمائی وہیں آپ نے اللہ تعالیٰ سے ہر قسم کی حاجات دینی و دنیوی اور حالی و مالی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی فرمائی جس سے مقصد اپنی عبدیت کا اظہار بھی تھا اور اُمت کو تعلیم بھی دینی تھی کہ وہ اپنی تمام حاجات کو اللہ تعالیٰ سے مانگا کریں اور اپنے قول و فعل اور حال کی درستگی کا اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص خاص دعاؤں کو میں پیش کروں گا۔ اس وقت آپ کے سامنے ایک دعا پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ انْعَشْنِیْ وَاَحْیِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَاھْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ اِنَّہٗ لَا یَھْدِیْ لِصَالِحِھَا وَلَا یَصْرِفُ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ۔

یعنی یا اللہ رفعت دے مجھے اور زندہ رکھ مجھے اور رزق دے مجھے اور ہدایت کر مجھ کو اچھے اعمال اور اخلاق کی کیونکہ نہیں ہدایت کرتا ہے عمدہ اعمال اور اخلاق کی اور نہیں دور کرتا ہے بُرے اعمال اور اخلاق کو کوئی بجز تیرے۔

سبحان اللہ کیا عبدیت ہے پہلے یہ فرمایا کہ کسی کو رفعت دینا زندگی بخشنا اور رزق عطا فرمانا یہ سب تصرفات آپ ہی کے قبضہ میں ہیں۔ لہٰذا میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے آپ رفعت دیجئے زندگی بخشئے اور رزق عطا فرمائیے ان حاجات کو طلب فرما کر فرمایا کہ اور ہدایت کر مجھ کو اچھے اعمال اور اخلاق کی اسلئے کہ آپ ہی ہادی مطلق ہیں۔ نہیں ہدایت کرتا ہے عمدہ اعمال اور اخلاق کی اور نہیں ہٹا سکتا ہے۔ بُرے اعمال اور اخلاق کو کوئی سوائے تیرے۔

یہاں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صالح اعمال واخلاق کی دعا فرمائی ہے ایک اور موقع پر آپ نے منکرات اخلاق اور اعمال سے استعاذہ فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ مُنْکَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَھْوَاءِ وَالْاَدْوَاءِ (ص۴۰)

یعنی اے اللہ میں تیری پناہ پکڑتا ہوں ناپسندیدہ اخلاق اور اعمال سے اور نفسانی خواہشوں اور بیماریوں سے ان دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اعمال واخلاق کی اصلاح کا کس درجہ اہتمام ہے چنانچہ باوجود اس کے کہ آپ ایک اولوالعزم پیغمبر اور تمام انبیاء علیہم السلام کے سردار ہیں آپ کی عبادات آپ کے اعمال صالحہ آپ کے اخلاق اور پھر ان سب میں آپ کی حسن نیت آپ کا ارادہ اور آپ کا صدق عزم اِن سب امور کا تو پوچھنا ہی کیا پھر بھی آپ اعمال اور اخلاق حسنہ کی ہدایت کو حق تعالیٰ ہی سے طلب فرما رہے ہیں اور بُرے اعمال اور بُرے اخلاق سے بچنے کو اُدھر ہی سے مانگ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس راہ میں اعمال واخلاق موجب قرب الٰہی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے لئے کیسے اعمال اور کیسے اخلاق اختیار کرنا چاہیے یہ سالکین راہ کے لئے ایک مشکل چیز ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ان ادعیہ کے ذریعہ اس کی جانب رہنمائی فرمائی وہ یوں کہ دیکھئے آپ اعمال پسندیدہ اور اخلاق برگزیدہ بھی اختیار فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ تضرع وزاری بھی بدرگاہ واہب العطیات فرماتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بس یہی اصل ہے اس راستہ کی کہ بندہ تضرع وزاری اور الحاح کو اپنی خو بنالے یعنی ان چیزوں کا سوال برابر اللہ تعالیٰ سے کرتا رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے الفاظ میں کرتا رہے۔ پھر جب اُدھر ہی سے ہدایت۔ توفیق۔ حسن نیت۔ قوت عبادت اور طاقت اجتناب معاصی یہ سب امور عطا ہوتے ہیں تب ہی بندہ کا کام بنتا ہے۔

فائدہ:۔ اور میں نے خو بنانے کو اس لئے کہا کہ محض ایک دو دفعہ بھی سرسری طور پر صرف زبان سے ان کلمات کے کہہ لینے سے کشود کار نہیں ہوگا اس لئے کہ ان کی حیثیت تلاوت قرآن کی سی نہیں ہے کہ آپ بدون فہم معنی ان کلمات کو زبان پر جاری فرمالیں اور آپ کو ثواب مل جائے یا ایمان میں ترقی ہوجائے بلکہ ان کی حیثیت دعا اور درخواست کی ہے اس کے مضمون کو سمجھ کر اور حق تعالیٰ کے سامنے سراپا احتیاج عاجز اور ذلیل بن کر بندہ کو پیش کرنا چاہیئے اور یہ مقام جب ہی حاصل ہوگا کہ آپ حق تعالیٰ کی عظمت اور قدرت اور عنایت کو پیش نظر رکھ کر اُن سے اپنی حاجات کو طلب کریں اور برابر طلب کرتے رہیں یہاں تک کہ خدمتِ شاہ میں عرض حال اپنی خو بن جائے کیونکہ جب وہ

دیکھ لیں گے کہ اُس نے اپنے کو میرے آگے گرا دیا ہے اور مجھے ہی اپنا حاجت روا اور ملجا اور ماویٰ سمجھتا ہے اور میرے علاوہ کسی دوسرے پر اُس کی نظر نہیں رہ گئی ہے تو وہ بھی متوجہ ہو جائیں گے اور جب انھیں کی توجہ ہو جائے گی تب ہی کام بنے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ثُمَّ تَابَ عَلَیْہِمْ لِیَتُوْبُوْا یعنی اللہ تعالیٰ نے پھر ان کے حال پر توجہ فرمائی تاکہ وہ آئندہ بھی رجوع رہا کریں اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہوتی ہے بندہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ تقدس کی جانب رجوع ہو لیکن کام جو بنتا ہے تو اسی وقت جب کہ اُدھر سے توجہ ہو جائے۔

اسی مضمون کو شیخ سعدیؒ نے نہایت ہی عمدہ ادا کیا ہے فرماتے ہیں کہ:۔ ؎

چہ خوش گفت درویش کوتاہ دست کہ شب توبہ کرد و سحر گہ شکست

گر او توبہ بخشد بماند درست کہ پیمانِ ما بے ثبات است وسست

یعنی اس عاجز درویش نے کیا خوب بات کہی جو کہ رات کو توبہ کرتا تھا اور بوقت سحر وہ ٹوٹ جاتی تھی اس نے یہ کہا کہ (یہ ہماری توبہ اس لئے ٹوٹ جاتی ہے کہ) جس طرح ہم ضعیف و ناتواں ہیں ہمارا عہد و پیماں بھی سست اور بے ثبات ہے ہاں جب حق تعالیٰ ہی توبہ کی توفیق عطا فرمائیں اور اُسکو قبول فرمائیں اور ہمارے حال زار پر توجہ فرمائیں تو چونکہ وہ قوی اور باقی ہیں اس لئے ان کی عطا فرمائی ہوئی توبہ بھی درست اور پائیدار ہوگی اسی لئے میں نے کہا کہ ان ادعیہ کو سالکین کو دل سے مانگنا اور اس پر دوام کرنا اور غایت تضرع اور الحاح کے ساتھ درگاہ واہب العطیات میں اپنی حاجات کو پیش کرنا یہی راہ ہے اور یہ اس لئے کہ آپ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اسی طرح سوال فرمایا ہے چنانچہ جب آپ کا یہ عمل تھا تو پھر تو یہ طریقہ مسنون ہو گیا لہذا سالکین راہ کے لئے بھی یہ ضروری ہو گیا کہ وہ اگر کسی عمل صالح کو کرنا چاہتے ہیں یا کسی سیئہ اور رذیلہ سے بچنا چاہتے ہیں تو وہ بھی یہی طریقہ استعمال کریں۔

پس مشائخ کو چاہئے کہ اپنے پاس آنے جانے والوں کو یہی وظیفہ مسنونہ بتائیں اس لئے کہ میں تو بصیرت کے ساتھ اس کو سمجھ چکا ہوں کہ اس دور ضلالت میں اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی سے مفر نہیں ہے اس لئے کہ سعادت حقیقیہ کی تحصیل اتباعِ سنت ہی کے ساتھ وابستہ ہے اور فلاح دارین کا حصول طریق نبوی میں منحصر ہے۔

میں بزرگانِ دین کے اس قسم کے ارشادات سنتا تھا شلاً شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

مپندار سعدیؔ کہ راہ صفا
تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

کسانیکہ زیں راہ برگشتہ اند
برفتند وبسیار سرگشتہ اند

دریں بحر جز مرد داعی نہ رفت
گم آں شد کہ دنبالِ راعی نہ رفت

فرماتے ہیں کہ اے سعدیؔ یہ نہ سمجھنا کہ راہِ صفا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے بغیر طے کی جا سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کے خلاف اگر کوئی شخص راستہ اختیار کرے گا تو اُس کی رسائی کبھی بھی منزل تک نہ ہو سکے گی جو لوگ اس راستے بھٹکے ہیں وہ گمراہی میں بڑھتے ہی چلے گئے ہیں اور آخر کار بہت ہی زیادہ حیران و پریشان ہوئے ہیں یہ اس لئے کہ اس بحر میں سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی چلا نہیں آپ ہی چلے ہیں اس لئے آپ کا اتباع ضروری ہے۔ جو شخص اتباعِ سنت نہیں کرے گا وہ گمراہ ہوگا جس طرح ہے کہ وہ بھیڑ بکری جو چرواہے کے پیچھے پیچھے نہ چلے تو راستہ بھٹک کر لقمۂ گرگ ہو جاتی ہے یا مثلاً حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ ؎

ہر کہ در راہِ محمد رہ نیافت تا ابد گردے ازیں درگہ نیافت

یعنی جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کو اپنا راستہ نہیں بنایا اس نے بارگاہِ خداوندی کے راستہ کی گرد کو بھی نہیں پایا۔

تو میں بزرگوں کے اِن ارشادات کو اتباعِ باطنی نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کی ترغیب میں پڑھا کرتا تھا اور خوش ہوتا تھا (اس لئے کہ دیکھتا تھا کہ لوگ اِن اشعار کو سن کر خوب خوب جھومتے ہیں تو خیال ہوتا تھا کہ اس کو سمجھتے بھی ہوں گے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جسے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ پئے مصطفےٰ رفتن اور راہِ صفا اور رہ پیمبر اور حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ راہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں اور جس کے اتباع کو ضروری قرار دے رہے ہیں لوگوں کے قلوب میں اس کا صحیح خطور بھی شاید نہ ہوا ہو)۔

اب اس قسم کی حدیث سے جو کہ برابر معمول ہے یہ سمجھ میں آیا کہ سالکین کا ایسی حدیثوں کو اپنا معمول بنانا (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ادعیہ سے تمسک کرنا اور زبان سے ان کے الفاظ کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ عمل اور اپنا حال بھی اسی کے مطابق بنانا) یہی وہ پیروی باطنی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس کو یہ حضرات مشائخ فرمارہے ہیں۔

یہاں ایک بات اور کہتا ہوں اور وہ یہ کہ اِهْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ پر دعا کا مضمون ختم ہوگیا تھا مگر آپ نے یہ جو فرمایا کہ لَا یَهْدِیْ لِصَالِحِهَا وَلَا یَصْرِفُ سَیِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ اس میں آپ نے توحید کی تعلیم فرمائی جس کی تعریف امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ یوں فرماتے ہیں کہ:۔

"هو ان یری الاشیاء کلها من الله تعالی رویة تقطع الالتفات الی الاسباب"

یعنی توحید یہ ہے کہ انسان اپنے تمام امور کو خدا تعالیٰ کی جانب سے دیکھے اس طرح سے کہ اسباب کی جانب اصلا التفات نہ رہ جائے اور اس کا نفع یہاں یہ ہے کہ انسان اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ اختیار کرنے کے بعد جب یہ بھی سمجھے گا کہ اس کی توفیق خدا نے دی ہے۔ بدون اس کی توفیق کے نہ ہم کوئی عمل کرسکتے ہیں اور نہ اپنا خلق سنوار سکتے ہیں تو پھر اُسے اللہ تعالیٰ کی ایک گونہ معرفت حاصل ہوجائے گی اور عُجب سے وہ محفوظ رہے گا۔

سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے۔ اگر اسی ایک دُعا کا مضمون ہمارے قلوب میں راسخ ہوجائے تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ عُجب کا حسن اور ہمارے اعمال صالحہ اور اخلاق ہوجائیں اور قربِ الٰہی کا ذریعہ بن جائیں۔

اسی مضمون کو جو اس حدیث میں ہے صوفیہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اس کا اوّل حصہ یعنی اللهم اغنتی واحینی وارزقنی واهدنی لصالح الاعمال الاخلاق یہ تو سلوک ہے اور اس کا آخری حصہ یعنی انہ لا یهدی لصالحها ولا یصرف سیئها الا انت یہ جذب ہے۔ چنانچہ سلوک کے بعد جب تک ادھر ہی سے جذب نہ ہو وصول نہیں ہوتا۔ تاہم جذب تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن سلوک تو ہمارے اختیار میں ہے۔ جس کا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ان ادعیہ کے ذریعہ اُمت کو بتایا اور وہ یہی ہے کہ طاعت اور عبادت بھی کریں لیکن نہ سمجھیں کہ ہم اپنی قوت بازو سے خدا تک پہنچ جائیں گے بلکہ اُن کے آگے تو سر ہی ڈال دیں اور صالح اعمال واخلاق کی توفیق اور ان کی جانب ہدایت بھی انھیں سے طلب کریں۔

(اصلی کام)

(بہ تحریر خاص)

اصل کام یہ ہے کہ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح و درست کیا جائے [اور اسیکو نسبت کہا جاتا ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہے جس کے متعلق صاحب فتح الباری فرماتے ہیں کہ یہ فرض ہے۔

محبة الله على قسمين فرض وندب فالفرض المحبة التي تبعث على امتثال اوامره والانتهاء عن معاصيه والرضا بما يقدره فمن وقع في معصية من فعل محرم او ترك واجب فلتقصيره في محبة الله حيث قدم هوى نفسه عليه (فتح الباری ج ۱ ص ۲۶)

اللہ تعالیٰ کی محبت کے دو درجے ہیں فرض اور مستحب، فرض وہ محبت ہے جو اللہ تعالیٰ کے اوامر کو بجالانے اور معاصی سے بچنے اور اور اسکی تقدیر پر راضی رہنے کا محرک اور باعث بنے چنانچہ جو شخص کسی حرام میں مبتلا ہوتا ہے یا کسی واجب کو ترک کرتا ہے تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کی محبت میں تقصیر کی وجہ سے (یعنی یا تو اللہ تعالیٰ کی محبت سے بالکل خالی ہوتا ہے یا محبت کی اس میں کمی ہوتی ہے) اسی لئے تو اپنی خواہش کو احکام خداوندی پر مقدم کرتا ہے۔

اور چونکہ یہ محبت حاصل ہوتی ہے بزرگان دین کی صحبت سے اسی لئے ان حضرات سے تعلق پیدا کیا جاتا ہے اور ان کے یہاں آیا جاتا ہے۔ از ناقل]

اور یہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صحیح کرنا جب ہی ہو سکتا ہے کہ اس کے سب احکام کی پیروی کی جائے اور اس میں یہ بھی داخل ہے کہ بلوغ کے بعد سے جو احکام فوت ہوئے ہوں ایک ایک کرکے انکو ادا کیا جائے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ان احکام کا علم ہو لہذا علم کی تحصیل لازمی ٹھہری پس خلاصہ طریق کا علم و عمل ہے۔

فرمایا کہ اس زمانہ میں تصوف کے انکار اور اس میں داخل ہونے والوں کے عدم نفع سب کا سبب جہل ہے۔ یہ مضمون ہر شخص اپنے پاس نقل کرکے رکھے اور اس کی کثرت سے اشاعت کی جائے۔

۸ ربیع الثانی ۶۳ھ تال نرجا

خوفِ آخرت
از افاضات
مصلح الامّت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہ

خوفِ آخرت ؎

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

فرمایا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام امت کے مقتدا اور پیشوا ہیں۔ ان حضرات کے اقوال و افعال و احوال امت کے لئے سند اور دلیل اور نمونہ ہیں اس لئے کہ ہم کو ان حضرات کی اقتداء اور تاسی کا حکم ہے۔ چنانچہ جس طرح ہم اور تمام معاملات میں انبیاء علیہم السلام کی اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں اسی طرح آخرت سے متعلق جو احوال ان حضرات کے تھے ہمارے لئے اس میں بھی پیروی ضروری ہے اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے احوال کو کوئی امتی پہونچ نہیں سکتا تاہم اپنے کو ان احوال سے متصف کرنا اور ان حضرات کے احوال کو اپنا نصب العین بنانا ہمارے لئے ضروری ہے۔ آج جو گمراہی ہو گئی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں نے آخرت سے متعلق احوال میں انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے قطع نظر کر لیا ہے۔ نہ عوام ہی جانتے ہیں نہ علماء ہی ان کو بتلاتے ہیں حالانکہ خوف و رجا اور جنت اور دوزخ کے حالات کا علم بنیادی چیزیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب اصولی اور بنیادی چیزوں کا علم رخصت ہو جائے گا تو گمراہی تو عام ہو ہی جائے گی۔ گمراہی کو دور کرنے کے لئے ہی تو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے تھے۔ پس جس شعبہ میں ان کی سیرت کو ترک کیا جائے گا وہ شعبہ فاسد ہو جائے گا

سنیئے :۔ اللہ تعالیٰ کا خوف یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا خوف، اللہ تعالیٰ کے غضب کا خوف، اس کے دوزخ اور اس کے عذاب کا خوف، یہ خوف ہر زمانہ میں

؎ مورخہ ۴ رصفر ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۵ رمئی ۱۹۶۶ء یوم چہارشنبہ۔ بمقام کراچی بمبئی نمٹ سلیمان کمشری بلڈنگ

شعار عباد اللہ الصالحین رہا ہے۔ جس سے مراد انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیرو اور تمام اولیاء کرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا خوف ان سب حضرات کا شعار رہا ہے۔
اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں " یَرْجُوْنَ رَحْمَتَہٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَہٗ" یعنی اللہ تعالیٰ کے جو خاص بندے ہیں ان کا حال بیان فرماتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اسی طرح ایک جگہ پہلے کفار کا حال بیان فرمایا کہ آخرت میں پہونچ کر تو یہ لوگ بھی اعتراف ذنب (گناہوں کا اقرار) کرینگے لیکن اس سے کیا نفع ؟ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ، لیکن مومن کے بارے میں فرمایا کہ ان کی مغفرت ہوگی اس لئے کہ یہ اپنے رب سے غائبانہ ڈرتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ ؕ

اس سے معلوم ہوا کہ کام آنے والی چیز آخرت کا وہ خوف ہے جو دنیا میں ہو۔ چنانچہ مومنین کے وصف میں " یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ " فرمایا گیا ہے یعنی اللہ اور آخرت پہ غائبانہ طور سے ایمان لاتے ہیں۔ آنکھوں سے نہیں دیکھا مگر دل سے تصدیق کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر " یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ " بھی فرمایا ہے۔ پس جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے یہ لوگ اس سے کیوں نہ خوف کریں گے۔ انبیاء علیہم السلام نے سب سے زیادہ خوف کیا ہے اس لئے کہ یہ خوف ایمان کی فرع ہے۔ جس درجہ ایمان ہوگا اسی درجہ خوف ہوگا۔ اور انبیاء علیہم السلام کے ایمان کا کہنا ہی کیا اس لئے ان کا خوف بھی سب سے زیادہ ہوا پھر اس کے بعد حضرات صحابہ کا خوف تھا اور اسی طرح اس کے بعد اولیاء اللہ کا جس پر ان کے اقوال و احوال شاہد ہیں۔
سب سے پہلے خاتم الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوف کا نمونہ پیش کرتا ہوں۔ سنئے۔ فرماتے ہیں :۔

اَسْئَلُكَ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ	مانگتا ہوں میں تجھ سے بحق تیرے اس نور ذات
اَشْرَقَتْ لَهُ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ	کے کہ اس سے روشن ہیں سب آسمان و زمین

وَبِكُلِّ حَقٍّ هُوَ لَكَ وَبِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ أَنْ تُقِيْلَنِيْ وَأَنْ تُجِيْرَنِيْ مِنَ النَّارِ بِقُدْرَتِكَ

اور صدقہ ہر اس حق کا جو تیرا ہے اور بذریعہ اس حق کے جو مانگنے والوں کا تجھ پر ہے یہ کہ درگذر کرے تو مجھ سے اور یہ کہ پناہ دے تو مجھے دوزخ سے اپنی قدرت سے

اسی طرح اپنی ایک اور دعا میں فرماتے ہیں کہ

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ

یا اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری رضا کے ساتھ تیری ناخوشی سے اور تیرے عفو کے ساتھ تیری سزا سے۔ اور پناہ چاہتا ہوں تیری تجھ سے نہیں کر سکتا ہوں میں تیری تعریف تو اسی تعریف کے لائق ہے کہ خود کی ہے تو نے اپنی ذات کی۔

اسی طرح ایک اور دعا تعوذ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

أَعُوْذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ أَضَاءَتْ لَهُ السَّمٰوَاتُ وَأَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ أَنْ تُحِلَّ عَلَيَّ غَضَبَكَ وَتُنْزِلَ عَلَيَّ سَخَطَكَ وَلَكَ الْعُتْبٰى حَتّٰى تَرْضٰى وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ

پناہ چاہتا ہوں تیری ذات گرامی کے نور کی جس سے روشن ہیں آسمان اور چمک رہی ہیں اس سے ظلمتیں اور درست ہیں اس سے کام دنیا اور آخرت کے اس سے کہ اتارے تو مجھ پر اپنا غصہ اور نازل کرے تو مجھ پر ناخوشی اپنی۔ اور تیرا ہی حق ہے تجھ کو منایا جانا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے۔ اور نہیں ہے پھیرنا گناہ سے اور طاقت عبادت کی مگر تیری مدد سے

غرض احادیث اس قسم کی دعاؤں سے پُر ہیں ان سے اللہ تعالیٰ کی خشیت کا جو آپ کے قلب اطہر میں تھی کچھ سُراغ لگتا ہے۔ اسی طرح سے ایک اور اولو العزم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّأَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِيْنَ ۝

وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ۝ وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ۝ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۝ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝

(ترجمہ) اے میرے پروردگار مجھکو حکمت عطا فرما اور مجھکو نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرما۔ اور میرا ذکر آئندہ آنے والوں میں جاری رکھ۔ اور مجھکو جنت النعیم کے مستحقین میں سے کر۔ اور میرے باپ کی مغفرت فرما کہ وہ گمراہ لوگوں میں ہے۔ اور جس روز سب زندہ ہوکر اٹھیں گے اس روز مجھکو رسوا نہ کرنا۔ جس دن کہ نہ مال کام آویگا اور نہ اولاد ہاں جو اللہ کے پاس پاک دل لیکر آوے گا۔

دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جنت کا کس طرح سے سوال کیا کہ یا اللہ تو مجھے اس کے وارثوں میں سے بنادے اور کس طرح دوزخ سے پناہ مانگی فرمایا کہ اُس دن کی رُسوائی سے بچائیو جس دن مال اور اولاد کچھ کام نہ آئیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد نبوت آپ ہی کے خاندان میں محصور ہو گئی تھی جو نبی بھی آئے آپ ہی کے خاندان سے آئے تو جب اپنے مورثِ اعلیٰ کو اِن حضرات نے اس طریقے پر پایا تو پھر سب نے اسی کو اپنا شعار بنالیا جس طرح کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح سے آخرت کا خوف کرتے دیکھا تو امت محمدیہ کے صالحین نے بھی اس کو اپنا شعار بنالیا۔

امام اعظمؒ (امام ابوحنیفہ) نے ایک بار عشاء کی نماز پڑھی۔ امام نے سورۂ زلزلت پڑھی جس کے آخر میں ہے: فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ آخرت میں اسے دیکھ لے گا، اسی طرح جو شخص ذرہ برابر بُرائی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔ نماز ختم ہونے پر سب لوگ تو گھر چلے گئے لیکن امام صاحبؒ عشاء کے بعد سے لے کر صبح تک انھیں آیتوں کو دُہراتے رہے اور اپنی داڑھی کو پکڑ کر روتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ اے وہ ذات جو ذرّہ برابر نیکی کا بدلہ نیکی سے دے گی اور ذرّہ برابر بدی کا بدلہ سزا اور عذاب دے گی یہ بھی میرا ایک چھوٹا سا عمل ہے کہ میں شب کی تنہائیوں میں

تجھ سے رُو رُو کر فریاد کر رہا ہوں کہ میرے اس عمل کو بھی قبول فرمالیجئے اور اپنے عبد نعمان کو دوزخ سے نجات دیجئے۔ انھیں امام کا دوسرا واقعہ ہے کہ دوزخ کے خوف سے رات بھر روتے تھے اور زار و قطار روتے تھے۔ رونے کی آواز کی وجہ سے پڑوسی جاگ جاتے تھے اور انھیں رحم آجاتا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ یا اللہ ان کے دل میں اطمینان ڈال دیجئے تاکہ یہ اتنا نہ رویا کریں۔

دیکھا آپ نے امام صاحب مسئلہ مسائل کے تو امام ہی ہیں۔ ان کے اندر یہ چیزیں بھی تھیں۔ ایک عالم سے لوگوں نے پوچھا کہ مزاج کیسا ہے؟ انھوں نے اس کے جواب میں ایسی عمدہ بات کہی کہ میں نے جب اس کو سُنا تو یاد ہی کر لیا۔ انھوں نے کہا مؤمن کا مزاج کیا پوچھتے ہو اس کا کیا مزاج ہے۔ مؤمن تو دنیا میں بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ رہتا ہے کچھ خبر نہیں کہ کس کروٹ اونٹ بیٹھے گا۔ جب قیامت میں اللہ تعالیٰ کے رضا کی خبر سُن لیں گے تب مزاج کا حال بتائیں گے۔

آپ سے کہتا ہوں کہ کیا بات اثر لینے کی نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور بزرگوں کے حالات لوگوں کو سُناؤ کیوں اثر نہ ہوگا ضرور اثر ہوگا۔ قرآن و حدیث دنیا میں اثر ہی لینے کے لئے ہے اور اس میں اللہ و رسول نے جنت اور دوزخ کا جو تذکرہ کیا ہے لوگوں نے اس سے اثر لیا ہے۔ باقی کسی چیز کو معطل چھوڑ دیا جائے گا تو وہ فاسد ہو ہی جائے گی جس طرح کہ آج لوگوں نے آخرت کے احوال کو اور قیامت کے احوال کو پیش نظر رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ ترغیب اور ترہیب کے مضامین سے اثر لینا ترک کر دیا ہے تو دینی تباہی میں پڑ گئے۔ اس لئے کہ دین اصل میں نام ہے قلب کی حیات اور بیداری کا اور وہ ہوتی ہے فکرِ آخرت سے یہی وجہ ہے کہ ظاہرِ دین یعنی نماز، روزہ، وعظ و جلسہ مکتب و مدرسہ سب کچھ موجود ہے اور پہلے سے زیادہ موجود ہے لیکن اہل احساس سمجھ رہے ہیں کہ ان میں جان نہیں ہے صرف دین کی صورت موجود ہے روح ختم ہو چکی ہے۔ اسی کو کہہ رہا ہوں کہ کام صرف ظاہر سے نہیں ہوگا بلکہ قلب میں حیات کو پیدا کرنا ہوگا اور یہ چیز پیدا ہوگی خوف اور رجاء سے اور خوف و رجا قلب میں آئے گا اہل خوف اور اہل رجاء کے حالات اور افعال پیش نظر رکھنے سے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ایک بزرگ نے کچھ لڑکوں کو اِدھر اُدھر ہنستے ہوئے پھرتے دیکھا تو فرمایا کہ ان کو دیکھو ابھی موت باقی ہے، پل صراط باقی ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا باقی ہے، اور یہ لوگ ہنس رہے ہیں۔ میں نے جب یہ واقعہ حضرتؒ سے سُنا تو اپنے دل میں کہا کہ ہم نے مدرسہ میں بھی ان چیزوں کو پڑھا تھا لیکن جب حضرتؒ سے اس طریقہ سے سُنا تب ان پر ایمان لانے کی حقیقت سمجھ میں آئی۔ بات یہ ہے کہ خوف و رجا، خشیت و محبت یہ سب قلب کی صفات ہیں یعنی ان کا محل قلب ہے لسان کی صفت نہیں۔ لہذا ان کی حقیقت اسی وقت سمجھ میں آتی ہے جب قول کے ساتھ ساتھ قلب کا حال بھی شامل ہو جائے۔ اسی کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ صرف تقریر سے کام نہیں چلے گا بلکہ قلب میں داعیہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے کسی کی جوتیاں سیدھی کرنی ہوں گی۔ خود سمجھ لو کہ جب آج قرآن موجود ہے، حدیث موجود ہے مگر گمراہی ویسی ہی ہے تو اب سمجھنا ہی پڑے گا کہ کیا بات ہے۔ اور وہ بات یہی ہے کہ قلبی داعیہ ہمارے اندر سے گم ہو گیا ہے اوپر اوپر کی چیزیں رہ گئی ہیں اور جو ان سب کی اصل ہے اس کو ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ آخرت کا خوف ذرا سا بھی پیدا ہو جائے تو سب کچھ کرا دے گا۔ آخرت بہت بڑی چیز ہے بس وہاں کا ثواب بھی بڑا ہے جس کے دل میں آخرت آ گئی بس دُنیا غائب غلّہ ہو گئی۔ پھر جو کام اور لوگ نہیں کر سکتے یہ شخص کرے گا۔ کیونکہ کسی کام کا محرک اس کا داعیہ ہی ہوا کرتا ہے۔ ؎

ناصحا منع بر ونت چہ اثر خواہد داد
اندرون دل من ولولہ فرمائے ہست

اے ناصح تیرا ظاہری طور پر منع کرنا بھلا کیا اثر کر سکتا ہے جبکہ میرے دل کے اندر ایک ولولہ فرما موجود ہے۔

اللہ کے نیک بندوں نے اس زمانے میں بھی یہ داعیہ، ولولہ اور خوفِ آخرت پیدا کیا ہے۔ تھانہ بھون میں ایک مرتبہ حضرتؒ نماز پڑھ کر مسجد سے باہر تشریف لائے ابھی کچھ لوگ اندر نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ اندر سے کسی صاحب کے رونے کی آواز آئی وہ کچھ ایسے زور سے روئے کہ حضرت پر بھی ان کے رونے کا اثر پڑ گیا

دریافت فرمایا کون صاحب ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت شاہ صاحب ہیں۔ فرمایا ان کو یہاں بلا دیجئے۔ جب وہ آئے تو حضرت نے اُن سے پوچھا کہ شاہ صاحب کیا بات ہے کیوں روئے۔ کہا دوزخ کے خوف سے۔ حضرت نے انھیں بٹھایا اور گلاس میں پانی منگوایا اور اس کو دم کر کے فرمایا کہ لیجئے اس کو پی لیجئے معلوم نہیں کہ کیا پڑھ کر پھونک دیا کہ پیتے ہی سکون ہوگیا۔ یہ شاہ صاحب حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرّہٗ کے مرید تھے۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ میں نے آخرت کا اور دوزخ کا ایسا خوف تو اس زمانہ میں دیکھا نہیں۔

ان تمام واقعات کے پیش کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ کام اس زمانہ میں بھی ہوگا مسلمانوں کو متاثر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن طریقہ سے۔ کوئی کیسا ہی بدعمل مسلمان ہو اس کا ایمان اللہ پر رسول پر قرآن وحدیث پر تو ہوتا ہی ہے۔ اسی طرح سے مشائخ کو بھی لوگ کچھ کم نہیں مانتے۔ آپ ان کے سامنے کتاب وسنت سے اسی قسم کے مضامین بیان کریں اور بزرگانِ دین کے خوفِ آخرت سے متعلق واقعات بیان کریں اور پہلے خود اُن سے متاثر ہوکر بیان کریں تو ان کی مجال ہے کہ اثر قبول نہ کریں۔

فیض رحمانی کے نزول کا ذریعہ

واقعات شرعیہ اور نوازل حادثہ کی تحقیق میں اول اور اولیٰ چیز جس سے فیض رحمانی کا نزول کیا جاسکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت اور تمسک بحبل التقویٰ ہے قال اللہ تعالیٰ اتقوا ویعلمکم اللہ اور جو شخص اپنے فہم و ذہن پر اس کے تحقیق میں اعتماد کرے حالانکہ وہ معاصی میں ہے تو وہ مستحق خذلان ہے یعنی اس کے لئے نزول فیض رحمانی نہ ہوگا اس لئے کہ ——— اس نے ایسی چیز پر اعتماد کیا جس پر اعتماد روا نہیں اس لئے وہ اس آیت کا مصداق ہوگا اللہ تعالیٰ نے جس کو نور نہیں عطا فرمایا اس کو کیسے نور ملے۔ (وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ)

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

دیکھا جاتا ہے کہ آج مدارس کی کمی نہیں ہے گاؤں گاؤں مدرسے کھلے ہیں ہر ہر بستی میں اہل علم موجود ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ علم عام ہوتا عمل عام ہوتا لوگوں کے دینی اور دنیوی حالات درست ہوتے لیکن باوجود اس کے لوگوں میں دین کا نام نہیں ہے۔ کوئی بستی ٹھیک نہیں ہے یہی نہیں کہ دین درست نہیں، دنیا بھی برباد ہی ہے اور عام حالات یہی ہے اور یہ حالت روز بروز بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔

میری سمجھ میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اول تو ایسے مصلحین جو کتاب وسنت پر قوم کے حالات مطابق کرنے کی اہلیت اور فکر رکھتے ہوں نہیں ہیں۔ اور جس میں یہ بات ہوتی ہے وہی جانتا ہے کہ قوم کتنی اپنی مرکز سے ہٹی ہوئی ہے اور ان کو کتنا بُعد اپنے مرکز سے ہوگیا ہے، اور ان کو کس طرح سے مرکز کے قریب کیا جاسکتا ہے اور یہ کام کتنا دشوار ہے اور اس میں کس قدر اہمیت ہے اور اس میں صرف علم کی ضرورت ہے یا عمل کی بھی اور اگر عمل کی ضرورت ہے تو صرف ظاہری یا باطنی بھی اور اگر باطنی بھی درکار ہے تو ناقص یا کامل یہ چیزیں اہلیت ہی سے معلوم ہوسکتی ہیں ورنہ صرف صوری وظاہری نماز روزہ کو لوگ دین سمجھتے ہیں اور ہر ایک کے پاس دین کی ایک ناتمام حقیقت موجود ہوتی ہے جس کو وہ کُل دین سمجھتا ہے پس ان کی مثال بالکل ویسے ہی ہے جیسے اندھوں کے پاس کوئی ہاتھی آگیا تھا جس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے سب نے اپنی اپنی تحقیق بگھاری جس کا ہاتھ اس کی دُم پر پڑا اس نے کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے موڑھل اور دوسرے نے اس کے کان ٹٹول کر کہا کہ نہیں ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے سوپ (چھاج) اور جس نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اس نے کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے تخت اور ایک نے اس کے پیر پکڑ پائے تو کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے کھمبا تو دیکھئے اندھاپن بھی کتنی بری بلا ہے کہ اتنا بڑا صحیح وسالم ہاتھی کتنے ناتمام جزوں میں تقسیم ہوگیا۔

اسی کو مولنٰا رومؒ فرماتے ہیں ؎

اشتباہ از دیدہ بینا نہ بود   نیک و بد در دیدشاں یکساں نبود

ہمسری با انبیاء بر داشتند اولیاء را ہمچوں خود پنداشتند

(ترجمہ) یعنی اشقیاء کے لیے چشم بینا نہیں تھی اس لیے نیک و بد دونوں انکی نگاہوں میں یکساں معلوم ہوتے تھے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برابری کا دعوی کرتے تھے۔ اور اولیاء کو اپنی ہی طرح سمجھتے تھے پس جس طرح ان اندھوں نے ہاتھی کے صرف ایک عضو کو لیا اور اسی پر کل کا حکم لگا دیا جو صحیح نہ تھا اسی طرح آج دین کے بارے میں لوگوں کا حال ہے کہ اسکی حقیقت سے تو ہیں ناآشنا اور بعض ظاہری چیزوں کو لے کر اسی کو کل دین سمجھتے ہیں اور جو اصلی دین کی راہ دکھلاتے ہیں ان کی نہیں سنتے بلکہ ان کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا سبب ان کا اصلی راہ کو چھوڑ دینا ہوتا ہے اور اپنی بداعمالیوں اور قلبی امراض میں ابتلا اور انہماک سبب بنتا ہے اصلی راہ کو چھوڑنے کا اور جب اصلی راہ کو چھوڑ چکے ہیں تو اس کے بعد پھر صحیح راہ پر لگنا اور حقیقی دین اختیار کرنا ان کے لئے نہایت دشوار ہوتا ہے اور صرف یہی نہیں کہ اس پر آنا نہیں چاہتے بلکہ جو لوگ ان کے سامنے دین پیش کرتے ہیں تو ان سے انھیں نفرت اور ان کی باتوں سے وحشت ہونے لگتی ہے اور اس کے مصداق ہو جاتے ہیں ؂

ناصحا مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے میں اُسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

اصلی راہ دکھانیوالے چونکہ کم ہیں اس لئے یہ گمراہی بڑھتی جارہی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کہیں کوئی کہیں اللہ کا بندہ کچھ کام کرنیوالا ہوا بھی تو عوام کو ان کا جہل ان کی تعلیم کے اثر کو قبول کرنے سے مانع ہوتا ہے یہ اپنے جہل کو مرض ہی نہیں سمجھتے اور اس کو دور کرنا ہی نہیں چاہتے۔ جیسے عالم علم کو کمال سمجھتا ہے۔ یہ جہل کو کمال سمجھتے ہیں اور اپنے جہل میں عناد تک پہونچ جاتے ہیں اور ارباب جہل و عناد کی تقلید فطرت کو فاسد کر دیتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی اہل کے کہنے کے مطابق راستہ نہیں چلتا تو قوم کے جو سردار ہوتے ہیں جو اپنے ہوائے نفسانی کی پیروی کرتے ہیں اور احکام الٰہی کی بالکل پروا نہیں کرتے ان کے چھوٹے انکی تقلید کرتے ہیں چھوٹے اور بڑے دونوں فاسد الاخلاق اور فاسد الطبیعۃ ہو جاتے ہیں اس حالت پر پہونچ کر علماء کا کہنا کیسے سن سکتے ہیں اصلاح بالکل ختم ہو جاتی ہے اس جہل کے نتائج اور ثمرات میں سے یہ ہے کہ آج جاہلوں میں کبر استنکاف اور عار وغیرہ وہ تمام امراض پیدا ہوگئے ہیں جو کسی زمانہ میں کفار کے اندر موجود تھے اور جس طرح سے انھوں نے اپنی انھیں بداخلاقیوں کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ اور ان کا انکار کیا اسی طرح جہلا بھی انھیں صفات بد کی وجہ سے عالم دین اور عالم شریعت کا مقابلہ کرتے

ہیں اور حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ ہے اور یہ سمجھتے بھی نہیں کہ ہم یہاں تک پہونچ گئے ہیں کیا اس حالت میں ایمان سالم ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ غلط ہے؟ کیا آج مسلمانوں کے عوام میں یہ چیزیں موجود نہیں ہیں؟ اور کیا یہ بات ٹھکرا دینے کی ہے؟ اور اس آواز پر التفات نہ کرنا انصاف و دیانت ہے۔

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اس کا سبب ان کا اصلی راہ کو چھوڑ دینا ہوتا ہے اور اپنی بداعمالیوں اور قلبی امراض میں ابتلا اور انہماک سبب ہوا اصلی راہ چھوڑنے کا۔

ان بداعمالیوں اور قلبی امراض میں سے حُبّ دنیا کا استیلاء قلوب پر اس طرح ہے کہ اس میں دوسرے کی گنجائش بھی باقی نہ رہے یہ بھی داخل ہے محبت کی یہ خاصیت ہے کہ اس میں محبوب کے علاوہ دوسرے کی گنجائش باقی نہیں رہجاتی جس کو ذرا البصیرت سے حصہ ملا ہے وہ ان کے حالات میں غور کر کے یہ سمجھ سکتا ہے کہ اسی حُبّ دنیا کے استیلاء نے ان کو آخرت سے بالکل بیگانہ بنا دیا ہے کہ اس کی ان کے قلوب میں گنجائش ہی باقی نہیں رہی ان میں یہ ہمت نہیں رہگئی کہ دنیا کے ساتھ آخرت کا تعلق باقی رکھ سکیں اس قدر دنی الہمت و پست حوصلہ ہو گئے ہیں۔

یہ عالی ہمتی کی بات ہے کہ دنیا کے ساتھ آخرت کا تعلق بھی باقی و قائم رکھا جائے اور اس کے حقوق میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے دیجائے کہ عظیم کے سامنے حقیر کی حیثیت ہی کیا ہے اس کا مقتضا یہ تھا کہ دنیا کا گذر ہی ان کے دل میں نہ ہوتا کہ آخرت کریم ہے اور دنیا لئیم آخرت اس دل میں آنا نہیں چاہتی جس میں دنیا ہو کیونکہ یہ کریم ہے اور کریم لئیم کے یہاں نہیں جاتا۔ یہ بزرگوں کا ارشاد ہے۔ آخرت باقی ہے اور دائم ہے اور دنیا فانی اور زائل ہے۔ فانی اور باقی میں نسبت ہی کیا ہے؟ ان میں تو ایسی نسبت بھی نہیں ہے کہ دریا میں سوئی ڈالنے سے اس میں پانی کا جو قطرہ لگ جائے اس کو جو نسبت دریا کے ساتھ ہے دنیا کو [illegible]ت کے ساتھ یہ نسبت بھی نہیں کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی اور قطرہ و سمندر دونوں کے دونوں فانی ہیں اور فانی کو فانی کے ساتھ تو کچھ نسبت ہوتی بھی ہے اور یہاں ایک فانی ہے اور دوسری باقی اس لئے یہاں تو وہ نسبت بھی نہیں اور جب یہ نسبت نہیں ہے تو یہ کہا جائے گا کہ یہاں موجود اور معدوم کی نسبت ہے یعنی ایک موجود دوسری معدوم۔

اب کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس نسبت کو نہ سمجھا جائے۔ ایک تو دنیا قلیل پھر اس کی عمر کے

مقابلہ میں آدمی کی عمر اقل قلیل۔ لہذا اس کے تمتعات بھی اس دنیا میں جو ہیں وہ بھی اقل قلیل ہیں تو اس تمتع پر نظر کرکے تمتعات آخرت کو نظر انداز کر دینا کس قدر ضعف ایمان ہے۔

فکر آخرت جو مومن کے دل میں ہوتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے عصائے موسیٰ علیہ السلام کہ اس نے ساحرین کے سب عصا کو ایک دم نگل لیا تھا اور اس کے آگے وہ سب ختم ہو گئے تھے۔ اسی طرح مومن کے قلب میں جب فکر آخرت پیدا ہوجاتی ہے تو دنیا کے سب ہموم وغموم اس کے قلب کے آس پاس بھی نہیں آنے پاتے اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

آسکے غیر مرے خانۂ دل میں کیسے کہ خیالِ رُخِ دلدار ہے درباں اپنا

یہ فکر لوازم ایمان سے ہے۔ اب خیال فرمائیے کہ ایسا شخص کیسے دنیا میں منہمک ہو سکتا ہے اور کیسے اس کے شہوات ولذات کو ترجیح دے سکتا ہے؟ اب جو ترجیح ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ فکر آخرت دل میں نہیں ہے اور نہ اس کو پیدا کرنا چاہتے ہیں، اسی وجہ سے کسی کام کے نہیں رہ گئے۔ خدا کے نظر اعتبار سے ساقط ہو گئے۔ دنیا بھی چاہتے ہیں تو بھی نہیں ملتی کیونکہ انھوں نے اپنے خدا کو ناراض کر لیا جس کے قبضہ میں دنیا اور آخرت دونوں ہیں اور مومن جب آخرت کو چھوڑتا ہے تو اس کی دنیا بھی چلی جاتی ہے اور خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ کا مصداق ہوجاتا ہے۔ پس اب اسی پر کلام کو ختم کرتا ہوں کہ آخرت باقی ہے۔ اس کا بیان کما حقہ تو وہی کر سکتی ہے جو باقی ہے فانی سے اس کا ذکر کیا ہو سکے۔

آخرت کا ذکر جب آگیا تو قرآن وحدیث سے ترغیب وترہیب یعنی جنت ودوزخ ونیز اہل جنت واہل دوزخ کا بیان بھی کر دینا ضروری معلوم ہوا لہذا بغیر استیعاب کے اس کا کسی قدر بیان اپنی فہم کے موافق کیا جاتا ہے۔ قرآن عظیم میں حسب تصریح اکابر علماء جو پنجگانہ علوم عظیم الشان بیان ہوئے ہیں منجملہ ان کے موت اور ما بعد الموت وحشر ونشر حساب ومیزان، جنت ونار بھی ہے اور یہ سب غیب اور اس پر ایمان ایمان بالغیب ہے۔ اور ایمان بالغیب اس دار دنیا میں مومن کا کمال ہے اس لئے مومن کو اس کا علم اور علم ہی نہیں بلکہ اس کا استحضار اور استحضار ہی نہیں بلکہ ایقان علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین ضروری ہے اور اسی ایقان واذعان کے تفاوت سے مومن کے مراتب اور درجات میں تفاوت ہے۔ جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا یقین زائد اور اس لئے ان کا درجہ سب سے اعلیٰ اور ارفع ہوتا ہے ان کے بعد حضرات صحابہ رضوان اللہ عنہم کا ان کے بعد حضرات تابعین کا علیٰ ہذا القیاس۔

اسی ضرورت پر نظر کرکے ہم جنت و دوزخ کے متعلق جو قرآن وحدیث میں ترغیب وترہیب وارد ہوئے ہیں، بیان کرتے ہیں تاکہ جنت کا شوق بلکہ اس کا عشق دل میں پیدا ہوجائے، خوف تو کسی چیز سے بدون دیکھے بھی محض اخبار سے پیدا ہوسکتا ہے اور عشق اکثر دیکھنے سے کسی چیز کے ہوتا ہے، مگر احیاناً بدون دیکھے محض اس کی خبریں سننے سے بھی ہوجاتا ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے ؎ الاذن تعشق قبل العین احیاناً

؎ اشتاقہ قبل رویتہ کما
تہوی الجنان بطیب الاخبار

اللہ تعالیٰ نے جنت کی ایسی تعریف فرمائی ہے کہ اہل ایمان کو اس کا مشتاق بنادیا ہے یہاں تک کہ اس کی طلب میں ان اعمال کو کرنے لگے جو اس تک پہونچادیں، چنانچہ اس آیت وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ میں عرفہا لہم کی تفسیر اس سے بعض نے کی ہے۔ لہٰذا ان آیات و احادیث کو بیان کرتے ہیں تاکہ ایمان میں تازگی پیدا ہو کر دوزخ سے خوف اور جنت کا شوق پیدا ہو، گوش ہوش سے سنئے:-

عن اسامة بن زيد يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الا هل مشمر للجنة فان الجنة لاخطر لها هي ورب الكعبة نور يتلألأ وريحانة تهتز وقصر مشيد ونهر مطرد وثمرة نضيجة وزوجة حسناء جميلة وحلل كثيرة ومقام ابد في دار سليمة وفاكهة وخضرة وحبرة ونعمة في محلة عالية بهية قالوا نعم يا رسول الله نحن المشمرون لها قال قولوا ان شاء الله
رواه البخاري

حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سنو!
ہے کوئی جنت کی تیاری کرنے والا، اور وہ جنت ایسی ہے کہ اس کا خیال بھی کسی کے دل میں نہ گذرا ہوگا رب کعبہ کی قسم سلامتی کے گھر میں ایک چمکتا ہوا نور ہے (اس میں) خوشبودار لہلہاتے ہوئے درخت ہیں، قلعی چونہ کے محل ہیں، جاری نہریں ہیں، پختہ پھل ہیں (اور بہت اچھی خوبصورت بیویاں ہیں، اور بیشمار کپڑوں کے جوڑے ہیں) ہمیشہ ہمیش کا ٹھکانا ہے، میوے اور پھل ہیں، سبزہ اور شادابی ہے، چیزوں کے انبار ہیں، نعمتیں ہیں، بلند اور روشن مقام ہیں

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اس کے لئے تیاری کرنے والے ہیں، آپ نے فرمایا کہ انشاء اللہ بھی کہو۔ (تفسیر مظہری)

عن ابی هریرة عن النبی صلے اللہ علیه وسلم قال لما خلق الله الجنة قال لجبریل اذهب فانظر الیها فذهب و نظر الیها والی ما اعد الله لاهلها فیها ثم جاء فقال ای رب وعزتك لا یسمع بها احد الا دخلها ثم حفها بالمكاره ثم قال یا جبریل اذهب فانظر الیها فذهب فنظر الیها ثم جاء فقال ای رب وعزتك لقد خشیت ان لا یدخلها احد الحدیث (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا تو جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ جاؤ اسکو دیکھو، جبریلؑ گئے اور جنت کو نیز ان تمام چیزوں کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے اسمیں مہیا فرما رکھی تھیں تو واپس آکر عرض کیا کہ اے پروردگار قسم ہے آپ کی عزت کی (وہ تو ایسی عمدہ جگہ ہے کہ) جو شخص بھی اسکو سن پائیگا وہ اسمیں داخل ہی ہو جائیگا، پھر اللہ تعالیٰ نے اسکو مکروہات کی باڑھ سے گھیر دیا اور جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ اب جا کر جنت کو دیکھو، جبریلؑ پھر گئے، اور دیکھکر آئے اور عرض کیا کہ اے پروردگار قسم ہے آپ کی عزت کی اب تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس میں شاید ہی کوئی داخل ہو سکیگا

(یعنی جس طرح دنیا میں کسی باغ کی حفاظت کے لئے اسکو خار دار جھاڑ جھنکاڑ سے روندھ دیتے ہیں اسیطرح اللہ تعالیٰ نے جنت کو مکروہات سے گھیر دیا ہے یعنی اس کے داخلہ کے لئے دشوار ناگوار اور نفس پر شاق گزرنے والے اعمال کا دنیا میں انسان کو مکلف کر دیا ہے مثلاً نماز کے لئے سردی میں ٹھنڈے پانی سے وضو اور غسل کرنا تہجد کے لئے نرم نرم اور گرم گرم بستر کو چھوڑنا۔ گرمیوں میں شب چھوٹی ہونے کے باوجود جماعت صبح حاصل کرنے کے لئے اپنی میٹھی نیند کو قربان کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہی سب احکام شرعیہ اور عبادات شاقہ جو نفس کے خلاف اور ناگوار طبع ہوتے ہیں جنت میں داخلہ کے لئے بمنزلہ باڑھ کے ہیں، پس جس کو جنت مطلوب ہے اس کے لئے ان خاروں پر سے گزرنا بھی ناگزیر ہے، مومن کو چونکہ جنت اور درجات جنت مطلوب و محبوب و مقصود ہیں اس لئے اس کی راہ و طلب میں جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے مومن اس کو بخوشی قبول کرتا ہے۔ اس کو اس راہ کی تکالیف بھی اسیطرح محبوب ہوتی ہیں جیسی خود جنت، اور جو شخص ان سے گھبراتا ہے سمجھنا چاہئے کہ وہ طالب جنت ہے ہی نہیں، کسی کا خوب شعر ہے ؎

رنج راحت شد چو شد مطلب
گرد گلہ توتیائے چشم گرگ

یعنی جب کسی کا مطلوب و مقصود اعلیٰ ہوتا ہے تو اس کے حصول کی تکالیف بھی راحت معلوم ہوتی ہیں چنانچہ بھیڑیا گوشت کی لالچ میں بکریوں کے گلہ کی گرد بھی سرمے کی طرح آنکھوں میں لگانا پسند کر لیتا ہے اسی کو ایک اردو شاعر نے کہا ہے ؎

متاع جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے

جنت ایسی چیز نہیں ہے کہ کوئی اس کی رغبت و خواہش نہ کرے مگر جو لوگ جنت کو مفت سُفت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے لئے تکالیف برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ اس سے گھبراتے ہیں، ذیل کی آیت میں اللہ تعالیٰ اسکو بوالہوس قرار دیتے ہیں۔ اور انکی اس حالت پر نکیر فرماتے ہیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۤءُ وَالضَّرَّاۤءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝

دوسری بات سنو! کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ تم کو ہنوز ان لوگوں کا سا کوئی عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں، ان پر ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور ان کو یہاں تک جنبش ہوئیں کہ پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد کب ہو گی، یاد رکھو! بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد نزدیک ہے۔ (بیان القرآن)

اس پر قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ:۔

فیه اشارة الی ان الوصول الی الله تعالیٰ والفوز بالكرامة عنده برفض الهوىٰ واللذات ومكابدة الشدائد والرياضات كما قال عليه الصلوٰة والسلام حفت الجنة بالمكاره وحفت النار بالشهوات (بیضاوی ص۱۳۳)

اسمیں اشارہ اس طرف ہے کہ حق تعالیٰ تک پہونچنا اور ان کے نزدیک اکرام و عزت پانا صرف خواہشات و لذات کے ترک کرنے اور مشقتوں کے جھیلنے ہی سے ممکن ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ جنت ناگواریوں سے اور دوزخ شہوات و خواہشات سے گھیر دی گئی ہے۔

نیز ترمذی (باب الزہد) کی ایک حدیث ہے کہ:۔

من خاف ادلج ومن ادلج بلغ المنزل الا! ان سلعة الله غالية الا ان سلعة الله هي الجنة (مشکوٰۃ. باب البکاء والخوف)

جس کے دل میں ڈر ہوگا وہ منہ اندھیرے ہی سفر شروع کردے گا، اور جو ایسے تڑکے روانہ ہوجائیگا وہی منزل پر پہونچ سکے گا۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کا سودا بڑا بیش قیمت ہے سنو! اللہ تعالیٰ کا سودا جنت ہے (مشکوٰۃ، باب البکاء والخوف)

اور سچ پوچھئے تو جنت کی نعمتیں حیات دنیویہ میں مجاہدات و ریاضات کی مشقتیں جھیلنے کے بعد ہی کچھ مزہ دیں گی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن یہ حدیث پڑھائی کہ جب تمام مستحقین جنت، جنت میں پہونچ جائیں گے تب بھی جنت کچھ خالی رہیگی تو وہ عرض کریگی کہ آپنے مجھے بھرنے کا وعدہ فرمایا تھا، اُسے پورا فرمادیجئے، تو حق تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا فرماکر اُسے جنت میں داخل فرمائیں گے، اس پر حضرت مولانا تھانوی رحؒ نے دریافت کیا کہ حضرت پھر وہ تو بڑے مزے میں رہینگے اتنی سہولت میں جنت پاجائیں گے، فرمایا اجی کیا خاک لطف آئیگا۔ لطف تو ہمیں آئے گا کہ جنت میں داخل ہوکر یہ پڑھیں گے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ۝

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بڑا قدر داں ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں نہ ہم کو کوئی تکلیف پہونچے گی اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہونچے گی (بیان القرآن)

انھیں مجاہدات میں سے ایک مجاہدہ جنت کا شوق اور انتظار بھی ہے، میں نے تفسیر حقانی میں دیکھا ہے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ جنت اور اسکی نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں تو روح کو اشتیاق اور انتظار اس عالم کا ہوجاتا ہے، اور اس قفس عنصری میں اس کے تڑپنے کی مثال یہ دی ہے کہ جیسے ایک طوطا کسی پنجرہ میں بند ہو اور دوسرے طوطے درخت پر بول رہے ہوں تو ان کی بولی سنکر یہ بھی اپنے پنجرہ میں پھڑپھڑاتا ہے اور چاہتا ہے کہ کیسے میں اس سے رہا ہوجاؤں اور کس طرح درخت پر چلا جاؤں ۔۔۔ سبحان اللہ! طائر روح کے قفس عنصری میں مقید ہونے اور اس سے نکلنے کی تمنا اور خواہش کی کیسی عمدہ تصویر ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ۔۔۔ راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

روی مسلم عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حفت الجنۃ بالمکارہ وحفت النار بالشہوات (تفسیر مظہری)

مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت گھیر دی گئی ہے مکروہات سے، اور جہنم گھیر دی گئی ہے شہوات سے۔

قرآن شریف وحدیث میں جنت و دوزخ کا جو ذکر آیا ہے یہاں اس کا استیعاب و استقصاء مقصود نہیں ہے بلکہ ان میں سے چند آیات واحادیث رغبت و رہبت پیدا کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں۔

پہلے جنت کے متعلق سنئے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُھَا کَافُوْرًا۔ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِھَا عِبَادُ اللّٰہِ یُفَجِّرُوْنَھَا تَفْجِیْرًا۔ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا۔ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا۔ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا۔ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا۔ فَوَقٰھُمُ اللّٰہُ شَرَّ ذٰلِکَ الْیَوْمِ وَلَقّٰھُمْ نَضْرَۃً وَّسُرُوْرًا۔ وَجَزٰھُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّۃً وَّحَرِیْرًا۔ مُتَّکِئِیْنَ فِیْھَا عَلَی الْاَرَآئِکِ لَا یَرَوْنَ فِیْھَا شَمْسًا وَّلَا زَمْھَرِیْرًا۔ وَدَانِیَۃً عَلَیْھِمْ ظِلٰلُھَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُھَا تَذْلِیْلًا۔ وَیُطَافُ عَلَیْھِمْ بِاٰنِیَۃٍ مِّنْ فِضَّۃٍ وَّاَکْوَابٍ کَانَتْ قَوَارِیْرَا۔ قَوَارِیْرَا مِنْ فِضَّۃٍ قَدَّرُوْھَا تَقْدِیْرًا۔ وَیُسْقَوْنَ

جو نیک ہیں وہ ایسے جام شراب پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی یعنی ایسے چشمے سے جس سے خدا کے خاص بندے پئیں گے جس کو وہ بہا کر لیجائیں گے وہ لوگ واجبات کو پورا کرتے ہیں اور ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی عام ہوگی اور وہ لوگ خدا کی محبت سے غریب اور یتیم و قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور وہ لوگ کھانا کھلا کر زبان سے یا دل سے یوں کہتے ہیں کہ) ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں، نہ ہم تم سے بدلہ چاہیں اور نہ شکریہ، ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں، سو اللہ تعالیٰ انکو اس دن کی سختی سے محفوظ رکھے گا اور ان کو تازگی اور خوشی عطا فرمائے گا اور انکی پختگی کے بدلہ میں ان کو جنت اور ریشمی لباس دیگا اس حالت میں کہ وہ وہاں مسہریوں پر تکیہ لگائے ہوں گے نہ وہاں تپش پاویں گے اور نہ جاڑا اور یہ حالت ہوگی کہ درختوں کے سایہ ان پر جھکے ہونگے اور ان کے میوے ان کے اختیار میں ہونگے اور ان کے پاس

فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ۝ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ۝ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَنْثُورًا ۝ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ۝ عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ۝ إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ۝

چاندی کے برتن لائے جائیں گے اور آبخورہ جو شیشے کے ہوں گے وہ شیشے چاندی کے ہوں گے جن کے بھرنے والوں نے مناسب انداز سے بھرا ہوگا اور وہاں ان کو ایسا جام شراب پلایا جائیگا جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی یعنی اسکا چشمے سے جو وہاں ہوگا جس کا نام سلسبیل ہوگا اور ان کے پاس ایسے لڑکے آمد ورفت کریں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اے مخاطب اگر تو ان کو دیکھے تو یوں سمجھے کہ موتی ہیں جو بکھر گئے ہیں، اور اے مخاطب اگر تو اس جگہ کو دیکھے تو تجھکو بڑی نعمت اور بڑی سلطنت دکھائی دے، ان جنتیوں پر باریک ریشم کے سبز کپڑے ہوں گے اور دبیز ریشم کے بھی، اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے، اور ان کا رب ان کو پاکیزہ شراب پینے کو دے گا (ان سب نعمتوں کو دیکر اہل جنت سے مسرت روحانی بڑھانے کے لئے کہا جاویگا کہ) یہ تمہارا صلہ ہے اور تمہاری کوشش مقبول ہوئی۔ (بیان القرآن)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ۝ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ۝ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝ وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ ۝ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ۝

نیک لوگ بڑی آسائش میں ہوں گے مسہریوں پر دیکھتے ہوں گے اے مخاطب تو ان کے چہروں میں آسائش پہچانے گا ان کے پینے کو شراب خالص سربمہر جس پر مشک کی مہر ہوگی ملیگی، اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہئے اور اس شراب کی آمیزش تسنیم کے پانی سے ہوگی یعنی ایک ایسا چشمہ ہے جس سے مقرب بندے پئیں گے (بیان القرآن)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

يَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنتُمْ تَحْزَنُونَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا

اے میرے بندو تم پر آج کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہوگے یعنی وہ بندے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے تھے

مُسْلِمِیْنَ۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّۃَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ تُحْبَرُوْنَ۔ یُطَافُ عَلَیْھِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَھَبٍ وَّاَکْوَابٍ وَفِیْھَا مَا تَشْتَھِیْہِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ وَاَنْتُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ

اور فرمانبردار تھے تم اور تمہاری بیبیاں خوش بخوش جنت میں داخل ہو جاؤ۔ ان کے پاس سونے کی رکابیاں اور گلاس لائے جائیں گے اور وہاں وہ چیزیں ملینگی جن کو جی چاہیگا۔ اور جن سے آنکھوں کو لذت ہوگی اور ان سے کہا جاوے گا کہ تم یہاں ہمیشہ رہوگے (بیان القرآن)

صاحب روح المعانی نے یطاف علیھم بصحاف کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

والصحاف جمع صحفۃ قیل ھی کالقصعۃ قیل اعظم الاوانی الاکل الجفنۃ ثم القصعۃ ثم الکیلۃ

صحاف صحفہ کی جمع ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ قصعہ کی طرح ہوتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ کھانے کے برتنوں میں سب سے بڑے پیالے کو جفنہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد قصعہ ہوتا ہے اور اس سے چھوٹے کا نام کیلہ ہے

اس کے ذرا آگے فرماتے ہیں کہ :۔

ولما کانت اوانی الماکول اکثر بالنسبۃ لاوانی المشروب عادۃ جمع الاول جمع کثرۃ والثانی جمع قلۃ۔ وقد تظافرت الاخبار بکثرۃ الصحاف اخرج ابن المبارک وابن ابی الدنیا فی صفۃ الجنۃ والطبرانی فی الاوسط بسند رجالہ ثقات عن انس قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول ان اسفل اھل الجنۃ اجمعین درجۃ لمن یقوم علی راسہ عشرۃ الاف خادم بید کل واحد صحفتان واحدۃ من ذھب واخری من فضۃ فی کل واحدۃ لون

اور چونکہ عادۃً کھانے کے برتن پینے کے برتنوں سے زیادہ ہوا کرتے ہیں اس لئے اول کے لئے جمع کثرت کا صیغہ لائے اور ثانی کے لئے جمع قلت کا۔ اور (جنت میں) پیالوں کی کثرت کے بارے میں بکثرت روایتیں آئی ہیں (چنانچہ) ابن المبارک اور ابن ابی الدنیا جنت کی صفت میں اور طبرانی نے اوسط میں ایسی سند سے جس کے رواۃ ثقہ ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپ فرماتے تھے کہ کل اہل جنت میں سب سے کم درجہ کا ایسا شخص ہوگا کہ اس کے سرہانے کی جانب دس ہزار خادم ہوں گے اور ہر ایک خادم کے ہاتھ میں دو دو پیالے ہوں گے ایک سونے کا اور ایک چاندی کا، ہر ایک پیالے کا رنگ یعنی جنس کھانے کی دوسری سے مختلف ہوگی

لیس فی الاخریٰ مثلہ یاکل من اٰخرھا مثل مایاکل من اولھایجد لاٰخرھامن الطیب واللذۃ مثل الذی یجد لاولھا ثم یکون ذلک کرشح المسک لایبولون ولایتغوطون ولایمتخطون اخوانا علی سرر متقابلین

(اور وہ شخص ان پیالوں میں سے) اٰخروالے سے بھی اسی شہوت کے ساتھ کھائیگا جس طرح کہ پہلے والے سے اور آخری پیالے میں بھی وہی خوشبو اور لذت پاویگا جیسی اول میں پائی تھی، پھر یہ سب (کھایا ہوا) مشک جیسی خوشبو والا پسینہ ہوکر خارج ہوجائیگا، وہاں نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ کی حاجت ہوگی نہ ناک وغیرہ نکلے گی، بس سب کے سب بھائی بھائی ہوکر آمنے سامنے (یعنی باہم متقابل) تختوں پر مسند نشین ہوں گے۔

وفی حدیث رواہ عکرمۃ ان ادنی اھل الجنۃ منزلۃ واسفلھم درجۃ لرجل لایدخل بعدہ احد یفسح لہ فی بصرہ مسیرۃ عام فی قصور من ذھب وخیام من لؤلؤ لیس فیھا موضع شبر الا معمور یغدی علیہ کل یوم ویراح بسبعین الف صحفۃ فی کل صحفۃ لون لیس فی الاخریٰ مثلہ شھوتہ فی اٰخرھا کشھوتہ فی اولھا لونزل علیہ جمیع اھل الارض لوسع علیھم مما اعطی لاینقص ذلک مما اوتی شیئًا وروی ابن ابی شیبۃ ھذا العدد عن کعب ایضًا واذاکان ذلک للادنی فما ظنک بالاعلیٰ۔ رزقنا اللہ تعالیٰ مایلیق بجودہ وکرمہ۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ اہل جنت میں سے سب سے کم درجہ والا اور سب سے نچلے درجہ والا شخص کہ اب اس کے بعد کوئی شخص نہ داخل ہوگا، ایسا ہوگا کہ اس کو اتنے طویل رقبہ کے اندر سونے کے محلات اور موتی جڑاؤ خیمے جن میں ایک بالشت بھر جگہ بھی سجاوٹ سے خالی نہ ہوگی ملینگے کہ ایک جانب سے دوسری جانب کے فاصلہ کی مسافت ایک سال کی ہوگی۔ اور روزانہ صبح وشام ستر ہزار پیالے اس پر پیش کئے جائیں گے، ہر پیالے کا رنگ یعنی جنس کھانے کی دوسرے سے مختلف ہوگی۔ اس کی رغبت اور خواہش آخری پیالے کی جانب بھی بالکل ویسے ہی ہوگی جیسی کہ اول کی جانب۔ اور اگر تمام روئے زمین کے لوگ اسکے یہاں چلے جائیں تو جو کچھ وہ دیا جائیگا سب کو کافی ہوجائیگا اور اسکے دئے ہوئے میں کچھ بھی کمی نہ ہوگی۔ اور ابن ابی شیبہ نے بھی یہی تعداد حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ سو جب یہ تعداد (پیالوں کی)، سب سے کم درجہ والے کی ہے تو اعلیٰ درجہ والے کے بارے میں تم کیا سمجھتے ہو کہ کتنا کچھ اسکو ملیگا۔ اللہ تعالیٰ ہمکو بھی وہ کچھ عطا فرماوے جو اس کے جود وکرم کے شایان شان ہو۔

نیز وفیہا ما تشتہیہ الانفس وتلذ الاعین وانتم فیہا خالدون کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:۔

(وفیہا) ای فی الجنۃ (ما تشتہیہ الانفس) من فنون الملاذ (وتلذ الاعین) ای تستلذ وتقر بمشاہدتہ وذکر ذلک الشامل لکل لذۃ ونعیم بعد ذکر الطواف علیہم باوانی الذہب الذی ہو لبعض من التنعم والترفہ تعمیم بعد تخصیص کما ان ذکر لذۃ العین التی ہی جاسوس النفس بعد اشتہاء النفس تخصیص بعد تعمیم۔

وقال بعض الاجلۃ ان قولہ تعالیٰ یطاف علیہم بصحاف دل علی الاطعمۃ واکواب علی الاشربۃ ولا بعد ان یحمل قولہ سبحانہ وفیہا ما تشتہیہ الانفس علی المنکح والملبس ما یتصل بہما لیتکامل جمیع المشتہیات النفسانیۃ فبقیت اللذۃ الکبریٰ وہی النظر الیٰ وجہ اللہ تعالیٰ الکریم فکنی عنہ بقولہ عز وجل وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ ولہذا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ

اور اسمیں یعنی جنت میں وہ چیزیں ہونگی جن کو نفس پسند کریگا یعنی قسم قسم کی لذات ہونگی اور ایسی چیزیں ہوں گی جن سے آنکھیں لطف اندوز ہونگی۔ اس کے مشاہدے سے اس کو ٹھنڈک پہونچے گی۔ اور یہاں یہ فرمانا کہ فیہا ما تشتہی الآیہ ہر لذت اور نعمت کو شامل ہے اور اس سے پہلے جن چیزوں کا ذکر فرمایا ہے، خاص خاص چیزیں ہیں اور یہاں اور عام مرغوبات کو بیان فرمادیا ہے جن میں وہ پہلے بھی داخل ہوگئیں جس طرح کہ آنکھ جو کہ نفس کا جاسوس ہے اس کی لذت کا تذکرہ نفس کی مرغوبات کے بعد عام کے بعد خاص کا ذکر کرنا ہے۔

بعض اکابرین نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یطاف علیہم بصحاف تو کھانے کی چیزوں پر دلالت کرتا ہے، اور اکواب پینے کی چیزوں پر، اور بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وفیہا ما تشتہیہ الانفس نکاح اور لباس وغیرہ پر دلالت کرے تاکہ نفس کے جملہ مطلوبات و مرغوبات کا کامل ذکر ہوجائے (کیونکہ طعام لباس اور نکاح اور مکان ہی نفس کے خاص خاص مرغوبات ہیں) اس کے بعد ایک سب سے بڑی نعمت باقی رہجاتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے تو وتلذ الاعین میں اسکی جانب اشارہ فرمایا اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جیسا کہ نسائی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے خوشبو دار عورتیں

فیما رواہ النسائی عن انس رضی حبب الی الطیب والنساء وجعلت قرۃ عینی فی الصلوۃ ویوافق ھذا قول الامام جعفر الصادق رضی شتان بین ماتشتہی الانفس وبین ماتلذ الاعین لان جمیع مافی الجنۃ من النعیم والشہوات فی جنب ماتلذ الاعین کاصبع تغمس فی البحر لان شہوات الجنۃ لہا حد ونہایۃ لانہا مخلوقۃ ولاتلذ عین فی الدار الباقیۃ الا بالنظر الی الباقی جل وعز ولاحد ولاصفۃ ولانہایۃ . انتھی۔ (وانتم فیہا) ای فی الجنۃ (خالدون) دائمون ابد الابدین ولودوابذلک انماما للنعمۃ وکمالاً للسرور فان کل نعیم زائل موجب لکلفۃ الحفظ وخوف الزوال ومستعقب للتحسر فی ثانی الاحوال وللہ در القائل ؎

واذ نظرت فان بؤسا زائلا
للمرء خیر من نعیم زائل

(روح المعانی صفحہ ۲۵ ج ۹)

محبوب ہیں اور میرے آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے، اور یہ قول حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے بھی موافق ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ماتشتہی الانفس (یعنی نفس کی خواہشات) اور ماتلذ الاعین (یعنی جس شئی سے آنکھ لطف اندوز ہوگی)، ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہوگا کیونکہ جنت کی تمام نعمتیں اور وہاں کی جملہ محظوظات آنکھ کی لذت کے مقابلہ میں ایسی ہونگی جیسے سمندر میں کوئی انگلی ڈبو کر نکالے اور یہ اس لئے کہ بہرحال جنت کی نعمتوں کے لئے ایک حد اور نہایت ہے کیونکہ وہ مخلوق ہے اور آنکھ کی جو لذت ہوگی وہ دار باقیہ میں اللہ عزوجل کی جانب نظر کرنے کی ہوگی جو کہ باقی ہے اور اسکی کوئی حد ونہایت نہیں اور نہ اس کا وصف ہی بیان ہوسکتا ہے۔ اور تم اسمیں ہمیشہ ہمیش ابدالآباد تک رہوگے۔ اور یہ مدا جو کہی گئی تو تمام نعمت کے طور پر اور تکمیل سرور کیلئے، اس لئے کہ ہر وہ نعمت جو زائل ہوجانے والی ہو اسمیں فی الحال تو حفاظت کی کلفت، زوال کا خوف اور انجام کار حسرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے ؎

اور اگر تم غور کرو تو انسان کیلئے وہ مصیبت جو زائل ہوجانیوالی ہے اس راحت سے کہیں اچھی ہے جو زوال پذیر ہو۔

ایک اور جگہ مؤمنین کو جنت کی بشارت دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور خوشخبری سنا دیجئے آپ اے پیغمبر ان لوگوں کو جو ایمان

اَنَّ لَہُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُؕ کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْہَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًاۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِہًاؕ وَلَہُمْ فِیْہَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَہَّرَةٌ وَّھُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ

لائے اور کام کئے اچھے اس بات کی کہ بیشک ان کیواسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہونگی اُن کے نیچے سے نہریں جب کبھی دئے جائینگے وہ لوگ اُن بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار میں یہی کہیں گے کہ یہ تو وہ ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پیشتر اور ملے گا بھی ان کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا، اور اُن کے واسطے اُن بہشتوں میں بیویاں ہونگی صاف پاک کی ہوئی، اور وہ لوگ اُن بہشتوں میں ہمیشہ کو بسنے والے ہوں گے (بیان القرآن) اس آیۃ کی تفسیر میں قاضی صاحبؒ نے تفسیر مظہری میں بہت احادیث ذکر کی ہیں جن کو ہم درج کرتے ہیں :۔

قال ابن عباسؓ ومجاھد متشابہا فی الالوان مختلفا فی الطعوم۔ و قال الحسن وقتادۃ متشابہا یشبہ بعضہا بعضا فی الجودۃ یعنی ثمار الجنۃ کلہا خیار لا رد فیہا۔

حضرت ابن عباسؓ و حضرت مجاہد نے (و اُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِہًا) کی تفسیر میں فرمایا کہ اہل جنت کو جو پھل دیئے جائینگے وہ رنگ میں تو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونگے لیکن مزہ میں مختلف ہوں گے، حضرت حسن و قتادہ کا قول ہے کہ متشابہ ہونیکا مطلب یہ ہے کہ عمدگی اور خوبی میں ایک دوسرے کے متشابہ ہوں گے۔ یعنی جنت کے تمام پھل عمدہ اور اچھے ہی ہوں گے ان میں کوئی ردی اور خراب نہ ہوگا۔

روی البغوی بسندہ عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اھل الجنۃ یاکلون و یشربون ولا یبولون ولا یتغوطون ولا یمتخطون ولا یبزقون یلھمون الحمد والتسبیح کما یلھمون النفس۔ طعامھم جشاء ورشحھم المسک۔ رواہ المسلم۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کھائینگے بھی اور پیویں گے بھی مگر پیشاب اور پاخانہ نہ کریں گے اور نہ ناک سنکینگے اور نہ تھوکیں گے حمد اور تسبیح ان کے دلوں میں اس طرح سے ڈالدیجائیگی جیسے سانس (یعنی بلا تعب و مشقت ہمہ وقت حمد و تسبیح کرتے رہینگے) انکی غذا (ہضم ہوکر) ڈکار ہوجاویگی اور انکا پسینہ مشک ہوگا۔

روی الترمذی عن ابن مسعودؓ

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت

قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان الجنة طیبة التربة وعذبة الماء وانها قیعان وان غراسها هذه یعنی التسبیح والتحمید والتکبیر

گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کی مٹی خوشبودار اور اس کا پانی نہایت شیریں ہے۔ اور جنت ایک (چٹیل) میدان ہے اور اس کے درخت بھی سبحان اللہ الحمد للہ، اللہ اکبر کہنا ہے (یعنی جس قدر بندہ تسبیحات کہے گا اسی قدر اس کے لیے جنت میں باغات تیار ہوں گے۔

روی الترمذی عن ابی هریرة رض قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان فی الجنة مائة درجة ما بین کل درجتین مائة عام (تفسیر مظهری)

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں سو درجے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان سو سال (کی مسافت) کا فاصلہ ہے۔

وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ نساء من حور العین مُطَهَّرَةٌ من الغائط والبول والحیض والبصاق والمخاط والمنی وکل قذر ومن مساوی الاخلاق فان التطهیر یستعمل فی الاجسام والافعال والاخلاق وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ دائمون لا یموتون فیها ولا یخرجون منها - لما ذکر الله سبحانه نعماء الجنة ازال عنهم خوف الزوال فانه منغص للنعمة -

نیز وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ کی تفسیر میں قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں، اور اہل جنت کیلئے جنت میں عورتیں ہونگی حور عین میں (یعنی سفید رنگ بڑی آنکھوں والی جو پاخانہ پیشاب حیض اور تھوک اور رینٹ اور منی اور ہر قسم کی گندگی سے پاک ہونگی اور روی گندے اخلاق سے بھی پاک ہونگی کیونکہ تطہیر کا استعمال جسطرح اجسام میں ہوتا ہے اسیطرح افعال و اخلاق میں بھی ہوتا ہے اور اہل جنت اس میں ہمیشہ ہمیش رہینگے نہ مریں گے اور نہ اس سے نکلیں گے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کے ذکر کے بعد (ھُمْ فِيهَا خالدون سے) اس کے زوال کا خوف دور کر دیا کیونکہ یہ (خوف زوال نعمت) نعمت کو مکدر اور کرکرا کر دیتا ہے۔

روی البغوی بسنده من طریق البخاری عن ابی هریرة رض قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان اول زمرة تدخل الجنة علی صورة القمر

بغوی نے اپنی سند سے جو امام بخاری کے طریق سے ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پہلے جماعت جو جنت میں داخل ہوگی اسکی صورت ایسی ہوگی جیسے چودھویں رات کا چاند پھر وہ

لیلۃ البدر ثم الذین یلونھم علی اشد کوکب دری فی السماء اضاءۃ لا یبولون ولا یتغوطون ولا یتفلون ولا یمتخطون امشاطھم الذھب ورشحھم المسک ومجامرھم الالوۃ وازواجھم الحور العین علی خلق رجل واحد علی صورۃ ابیھم آدم ستون ذراعا فی السماء۔ متفق علیہ۔

لوگ جو ان کے بعد داخل ہوں گے، انکی صورت ایسی ہوگی جیسے آسمان کا کوئی نہایت ہی روشن ستارہ ہو اہل جنت نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ کریں گے نہ تھوکیں اور نہ ناک سنکیں گے انکی کنگھیاں سونے کی ہونگی اور ان کا پسینہ مشک ہوگا ان کے انگیٹھی (کا ایندھن) اگربتی ہوگی اور حورعین ان کی بیویاں ہونگی۔ اہل جنت سب ہم عمر ہوں گے اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی صورت پر ہوں گے ساٹھ ساٹھ ہاتھ کے ہوں گے آسمان میں۔

عن ابی سعید الخدریؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اول زمرۃ تدخل الجنۃ یوم القیامۃ صورۃ وجوھھم صورۃ القمر لیلۃ البدر والزمرۃ الثانیۃ علی لون احسن الکواکب فی السماء لکل رجل منھم زوجتان علی کل زوجۃ سبعون حلۃ یُری مخ سوقھن دون لحومھا ودمائھا وحللھا (رواہ الترمذی)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا ان کا چہرہ چودہویں رات کے چاند کی طرح ہوگا، اور دوسرا گروہ تو ان کا چہرہ آسمان کے سب سے اچھے اور روشن ستارے کی طرح ہوگا اہل جنت میں ہر ہر شخص کو دو، دو بیویاں ملیں گی اور ہر ہر بیوی کے لئے ستر جوڑے کپڑے ہوں گے (ان کا جسم ایسا گورا اور شفاف ہوگا کہ) ان کے ساق کا مغز ان کے گوشت اور خون اور کپڑوں کے اوپر سے دکھائی دیگا۔ روح المعانی میں ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ ہر شخص کو ستر حوریں ملیں گی، یہ روایت "ترغیب الجنۃ" کے ختم پر آگے مفصل آتی ہے

وعن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو ان امرۃ من نساء اھل الجنۃ اطلعت علی الارض لاضاءت ما بینھما ولملئت ما بینھما ریحا۔ ولنصیفھا علی راسھا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اہل جنت کی عورتوں میں سے کوئی عورت زمین پر نظر ڈالدے تو زمین و آسمان کے درمیان ساری فضا کو منور کردے اور خوشبو سے بھردے اور اسکی وہ اوڑھنی جو اسکے سر پر ہوگی دنیا اور دنیا کی ساری چیزوں

خیر من الدنیا وما فیھا (رواہ البخاری)

سے بہتر ہے۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

وروی عن ابی ھریرۃ رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اھل الجنۃ جرد مرد کحلی لا یفنی شبابھم ولا یبلی ثیابھم وروی مسلم نحوہ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اہل جنت صاف جسم والے بے ریش سرمگیں آنکھوں والے ہوں گے نہ انکی جوانی کبھی ختم ہوگی اور ان کے کپڑے ہی پرانے ہوں گے۔

وعن علیؓ قال ان فی الجنۃ لسوقا لیس فیھا بیع ولا شری الا الصور من الرجال والنساء واذا اشتھی الرجل صورۃ دخلھا وان فیھا لمجمع حور العین ینادین بصوت لم یسمع الخلائق مثلھا نحن الخالدات فلا نبید ابدا ونحن الراضیات فلا نسخط ابدا فطوبی لمن کان لنا وکنا لہ او نحن لہ۔ (رواہ البغوی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا کہ جنت میں ایک بازار ہوگا کہ اس میں اور کسی چیز کی خرید و فروخت نہ ہوگی بجز اس کے کہ اس میں مردوں اور عورتوں کی صورتیں ہونگی، جب کوئی شخص کسی صورت کی خواہش کرے گا (کہ میں ویسا ہوجاؤں) تو ویسا ہی ہوجاویگا۔ اور اس بازار میں ایک جگہ ہوگی جہاں تمام حوریں جمع ہونگی۔ وہ ایسی اچھی آواز سے پکاریں گی کہ مخلوق نے ایسی آواز نہ سُنی ہوگی اور کہیں گی، کہ ہم سب ہمیشہ رہنے والی ہیں کبھی فنا نہ ہونگی اور ہم سب نعمت والی ہیں کبھی محتاج نہ ہونگی۔ اور ہم خوش رہنے والی ہیں کبھی ناخوش نہ ہونگی، خوشی ہو اس کے لئے جو ہمارے لئے ہو اور ہم اس کے لئے ہوں۔

وروی مسلم عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی الجنۃ لسوقا یاتونھا کل جمعۃ فتھب ریح الشمال فتحثو فی وجوھھم وثیابھم فیزدادون حسنا وجمالا فیرجعون الی اھلیھم وقد ازدادوا حسنا وجمالا فیقول لھم اھلوھم واللہ لقد ازددتم بعدنا حسنا

امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں ایک بازار ہوگا کہ ہر جمعہ کو اہل جنت اس میں جائیں گے تو جانب شمال سے ایک ہوا چلے گی جس سے ان کے چہرے اور کپڑوں میں خوشبو بس جائیگی پس یہ لوگ اس حالت میں اپنے گھر والوں کے پاس واپس ہوں گے کہ ان کے حُسن و جمال بڑھ چکے ہوں گے۔ اور ان کے گھر والوں کے حسن و جمال بھی بڑھ چکے ہوں گے۔ تو انکے گھر والے کہیں گے بخدا ہمارے پاس سے جانے کے بعد آپ کا

جمالا فیقولون و انتم واللہ لقد ازددتم بعدنا حسنا وجمالاً۔

حسن وجمال تو بہت بڑھ گیا۔ اس پر وہ لوگ کہیں گے بخدا ہمارے جانے کے بعد تمہارا حسن وجمال بھی بڑھ گیا ہے۔

قلت ولما کان مطمح نظر اھل الدنیا فی النعماء منحصر علی المساکن والمطاعم والمناکح اقتصر اللہ تعالیٰ ونبیہ صلی اللہ علیہ وسلم غالباً فی الذکر علیھا وفی الحقیقۃ نعماء اھل الجنۃ اجل واعلیٰ۔

صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ چونکہ اہل دنیا کا مطمح نظر نعمتوں کے بارے میں صرف مکانات اور کھانے اور عورتوں پر منحصر ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ تر جنت کے بیان میں انہی پر اکتفا فرمایا ہے (ورنہ) دراصل جنت کی نعمتیں اس سے کہیں اعلیٰ اور ارفع ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ نعمائے جنت جزاء و بدلا ہیں ان کے اعمال کی جو اپنے اجسام و اعضاء سے کئے ہیں جسم کو بھی اس کے مناسب بدلا دیا گیا جیسا کہ اس کے خلاف میں جسم کو عذاب و سزا دی گئی، ایک دوسری جزا روح کو دی گئی اس کے اعمال وایمان کے صلہ میں کیونکہ اس نے بھی اس دار دنیا میں معرفت اور وصول الی اللہ حاصل کیا تھا وہ رویت و نظر الی وجہ اللہ ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے شہوت کے متعلق نہایت ہی عمدہ کلام فرمایا ہے اس موقع پر اس کا بیان کر دینا بھی کچھ بے محل نہ ہوگا، فرماتے ہیں کہ:۔

"انسان میں جو شہوت پیدا کی گئی ہے تو یہ فی نفسہ کوئی ذلیل اور بری چیز نہیں ہے اسی شہوت پر حق تعالیٰ نے دارین کی بقا کی بنیاد رکھی ہے جس طرح دنیا میں شہوت نہ ہو تو نسل نہیں چل سکتی اور طعام و شراب کی شہوت اسی کے لئے ہے۔ اسی طرح آخرت کی بقا بھی شہوت پر ہے کہ یہ نہ ہو تو جنت کے نعمائے حسیہ کی جو ترغیب و تحریص کی گئی ہے وہ کیسے متصور ہوسکے گی، یہ تحریص و ترغیب وارد ہے تو اس پر ایمان لانا ضروری ہوا اگرچہ اس کے ضمن میں اپنی خواہش کی تکمیل بھی ہے اس کا حصول ایمان بالغیب ہوا اور ایمان بالغیب مؤمن کا کمال ہے تو یہ شہوت بھی ذریعہ بنی کمال ایمان کا،

یہاں سے وہ مسئلہ بھی نکل آیا جو مشائخ بیان کرتے ہیں کہ شیخ کامل رذائل کا ازالہ نہیں کرتا، بلکہ امالہ کرتا ہے یہ شہوت اپنے محل میں صرف ہونے کی وجہ سے ذریعہ کمال بننے

سے کیسی محمود ہوئی، مذموم یہ ہے کہ محل غیر مشروع میں اس کو استعمال کیا جائے"

عن ابی ھریرۃ رضـ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ تعالیٰ اعددت بعبادی الصالحین ما لا عین رأت و لا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر واقرأوا ان شئتم فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین۔
متفق علیہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنے صالحین بندوں کے لئے ایسی نعمتیں تیار کر رکھا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے قلب پر اس کا گذر ہوا، اور تم چاہو تو یہ آیت پڑھو فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَہُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ (ترجمہ) سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانۂ غیب میں موجود ہے۔

وعنہ مرفوعا موضع سوط فی الجنۃ خیر من الدنیا وما فیہا۔
متفق علیہ

اور انھیں حضرت ابوہریرہ رضـ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جنت میں ایک کوڑے کی جگہ دنیا اور اسکی تمام چیزوں سے بہتر ہے

وعن ابی سعید مرفوعاً یقول اللّٰہ احل علیکم رضوانی فلا اسخط بعدہ ابدا۔ متفق علیہ

اور ابوسعیدؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت کو خطاب کر کے فرمائیں گے کہ میں نے تم لوگوں پر اپنی رضا و خوشی کو نازل کر دیا تو اب کبھی تم سے ناخوش نہ ہونگا

وروی مسلم فی حدیث طویل عن جابر بن عبد اللہ مرفوعا فیرفع الحجاب فینظرون الی وجہ اللہ فما اعطوا شیئاً احب الیہم من النظر الی ربہم ثم تلا رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم للذین احسنوا الحسنیٰ و زیادۃ۔

اور مسلم نے ایک لمبی حدیث میں حضرت جابر ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ پھر حجاب اٹھا دیا جائیگا تو لوگ اللہ تعالیٰ کے چہرہ کو دیکھیں گے تو جتنی چیزیں اہل جنت کو عطا ہونگی انہیں سب سے زیادہ محبوب ان لوگوں کو اپنے رب کا دیدار ہوگا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ (ترجمہ) جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کیواسطے خوبی ہے اور مزید براں بھی، میں کہتا ہوں کہ للذین احسنوا الحسنیٰ کے بعد جو زیادۃ کا نظم فرمایا ہے

جس کی تفسیر" النظر الی وجہ اللہ" ہے تو یہ علاوہ ہے، اس طرح کہ اعمال حسنہ کے مقابلہ میں تو حسنہ ہے اور یہ مزید براں ہے لہذا یہ علاوہ ہوا اور علاوہ ہمیشہ کم اور ادنیٰ ہوتا ہے، اور یہاں علاوہ "النظر الی وجہ اللہ" ہے تو کیا یہ نعم العلاوہ کہنے کا مصداق نہ ہوگا اس لئے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

لہذا اب آیت مبارکہ کی تلاوت کرتا ہوں للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ

وعن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادنی اھل الجنۃ منزلۃ لمن ینظر الی جنانہ وازواجہ ونعیمہ وخدمہ وسررہ مسیرۃ الف سنۃ واکرمھم علی اللہ من ینظر الی وجہہ غدوۃ وعشیۃ ثم قرأ وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ۔ رواہ احمد والترمذی۔

(تفسیر مظہری ص۱۲۵ ج۱)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت میں سب سے ادنیٰ درجہ والا ایسا شخص ہوگا کہ اپنے باغات اور ازواج و نعمتوں اور خادموں اور تختوں کو ہزار سال کی مسافت (تک پھیلا ہوا) دیکھے گا، اور اہل جنت میں سے وہ شخص جو عند اللہ مکرم ہوگا اللہ تعالیٰ کے چہرہ کو صبح وشام دیکھتا رہیگا، اس کے بعد آپ نے تلاوت فرمایا:۔ وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ (ترجمہ) بہت سے چہرے اس روز بارونق ہونگے اپنے پروردگار کیطرف دیکھتے ہونگے (تفسیر مظہری)

وعن الحسن قال سألت عمران بن حصینؓ اباھریرۃ عن تفسیر "ومساکن طیبۃ" فقالا علی الخبیر سقطت سألنا عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال قصر من لؤلؤۃ فی الجنۃ۔ فی ذلک القصر سبعون دارا من یاقوتۃ حمراء فی کل دار سبعون بیتا من زمرد خضراء فی کل بیت سبعون سریرا علی کل

حضرت حسن سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ میں نے حضرت عمران بن حصین وحضرت ابوہریرہؓ سے "ومساکن طیبۃ" کی تفسیر پوچھی ان دونوں نے کہا تو نے خوب باخبر سے دریافت کیا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفسیر پوچھی تھی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں موتی کا ایک محل ہوگا اس محل میں سرخ یاقوت کے ستر گھر ہوں گے اور ہر گھر میں سبز زمرد کی ستر کوٹھریاں ہونگی اور ہر کوٹھری میں ستر تخت ہوں گے اور ہر تخت پر ستر فرش ہوں گے ہر رنگ کے، ہر فرش پر حورعین میں سے ایک عورت ہوگی۔ ہر

سریر سبعون فراشا من کل لون علی کل فراش امرأۃ من الحور العین من کل بیت سبعون مائدۃ فی کل مائدۃ سبعون لونا من کل طعام. فی کل بیت سبعون وصیفا ووصیفۃ فیعطی المومن من القوۃ فی کل غداۃ ما یاتی علی ذلک کلہ۔

کوٹھری میں ستر دستر خوان ہوں گے، اور ہر دستر خوان میں ستر قسم کے کھانے ہونگے اور کوٹھری میں ستر خادم اور خادمہ ہوں گے۔

تو مومن کو اتنی قوت عطا کی جاوے گی کہ وہ ہر صبح کو ان سب پر دور کرے گا۔

عن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عدن دار اللہ تعالیٰ لم ترہا عین ولم تخطر علی قلب بشر لا یسکنہا غیر ثلاثۃ. النبیون والصدیقون والشہداء یقول اللہ سبحانہ طوبی لمن دخلک (روح المعانی ص ۱۳۱)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عدن (جس کا ذکر فی جنات عدن میں ہے) اللہ تعالیٰ کا گھر ہے کہ جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ بشر کے قلب پر اس کا گذر ہوا اس میں بجز تین قسم کے لوگوں کے کوئی نہ رہیگا، انبیاء اور صدیقین اور شہداء اللہ سبحانہ فرمائیں گے بشارت ہو اسکے لئے جو اس میں داخل ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الترھیب من النار

عن ابی ھریرۃ رضؓ قال فلمّا خلق اللہ النار قال یا جبرئیل اذھب فانظر الیھا قال فذھب فنظر الیھا ثم جاء فقال ای رب وعزتك لا یسمع بھا احد فیدخلھا فحفھا بالشھوات ثم قال یا جبرئیل اذھب فانظر الیھا فذھب فنظر الیھا فقال ای رب وعزتك لقد خشیت ان لا یبقی احد الا دخلھا وقال اللہ تعالیٰ وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو پیدا فرمایا تو فرمایا اے جبرئیل جاؤ ذرا جہنم کو دیکھو، وہ گئے اور دیکھکر واپس آئے اور عرض کیا اے پروردگار قسم ہے آپ کی عزت کی (وہ تو ایسی بری جگہ ہے کہ) یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص اس کو سُن لے اور پھر اس میں داخل ہو جائے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو شہوات کی باڑھ سے گھیر دیا اور پھر جبرئیلؑ سے فرمایا کہ اے جبرئیل اب جاکر کے دیکھو، حضرت جبرئیل گئے اور دیکھا اور آکر عرض کیا کہ اے پروردگار قسم ہے آپکی عزت کی مجھے تو اب اندیشہ ہو رہا ہے کہ اسمیں داخل ہونیسے کوئی بھی بچے گا نہیں یعنی سب ہی لوگ داخل ہو جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہی ہے کہ بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے (یعنی اس کے وعدے خواہشات نفسانی اور لذات کے باغات پھول اور پھل رکھدیئے، کہ ان کو دیکھکر انسان ان کی طرف کو بڑھتا ہے اور بالآخر جہنم میں داخل ہو جاتا ہے

کیونکہ براہ راست آگ میں جانا کس کو پسند ہے البتہ خواہشات اور لذات چونکہ سب کو محبوب ہیں اس لئے انسان ان کا مرتکب ہوتا ہے جو سبب بنتا ہے دخولِ نار کا، پس یہ سب دنیوی حظوظ گویا جہنم کی باڑھ ہیں کہ ان میں پھنس کر آدمی جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے) اعاذنا اللہ تعالیٰ عنہا۔

دوزخ کی صفت اور اہل دوزخ کے متعلق وعیدیں قرآن شریف سے سنئے:۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ وَّظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِیْنَ وَكَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ وَكَانُوْا یَقُوْلُوْنَ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَیُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ فَمَالِــُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ فَشٰرِبُوْنَ عَلَیْهِ مِنَ الْحَمِیْمِ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِیْمِ هٰذَا نُزُلُهُمْ یَوْمَ الدِّیْنِ

(سورۂ واقعہ)

اور جو بائیں والے ہیں وہ بائیں والے کیسے بُرے ہیں، وہ لوگ آگ میں ہوں گے اور کھولتے ہوئے پانی میں اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ فرحت بخش ہوگا، وہ لوگ اس کے قبل بڑی خوشحالی میں رہتے تھے اور بڑے بھاری گناہ پر اصرار کرتے تھے اور یوں کہا کرتے تھے کہ جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں رہ گئے تو کیا ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی، آپ کہہ دیجئے کہ سب اگلے اور پچھلے جمع کئے جائیں گے ایک معین تاریخ کے وقت پر پھر (جمع ہونے کے بعد) تم کو اے گمراہو جھٹلانے والو درختِ زقوم سے کھانا ہوگا پھر اس سے پیٹ بھرنا ہوگا پھر اس پر کھولتا پانی پینا ہوگا پھر پینا بھی پیاسے اونٹوں کا سا۔ ان لوگوں کی قیامت کے روز یہ دعوت ہوگی۔

اسی طرح سورہ غاشیہ میں فرماتے ہیں کہ:۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصْلٰى نَارًا حَامِیَةً تُسْقٰى مِنْ عَیْنٍ

آپ کو اس محیط عام واقعہ کی کچھ خبر پہونچی ہے، بہت سے چہرے اس روز ذلیل، مصیبت جھیلتے خستہ ہوں گے آتشِ سوزاں میں داخل ہوں گے، کھولتے

آنِيَةٍ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ۝

(سورۃ غاشیۃ)

ہوئے چشمہ سے پانی پلائے جائینگے، ان کو بجز ایک خار دار جھاڑ کے اور کوئی کھانا نصیب نہوگا جو نہ فربہ کریگا اور نہ بھوک کو رفع کریگا۔

ایک اور جگہ عذاب کا تذکرہ ان لفظوں میں فرماتے ہیں کہ:۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ طَعَامُ الْأَثِيمِ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ إِنَّ هَٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ ۝

(سورۃ دخان)

بیشک زقوم کا درخت بڑے مجرم کا کھانا ہوگا جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا وہ پیٹ میں ایسا کھولیگا جیسا تیز گرم پانی کھولتا ہے، اس کو پکڑو پھر گھسیٹتے ہوئے دوزخ کے بیچ وبیچ تک لیجاؤ پھر اس کے سر پر تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑ دو (اور اس سے استہزا کیا جاویگا کہ لے چکھ تو بڑا معزز مکرم ہے یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے۔

(بیان القرآن)

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي عَذَابِ جَهَنَّمَ خَالِدُونَ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا هُمُ الظَّالِمِينَ وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ إِنَّكُمْ مَاكِثُونَ ۝

(سورۃ زخرف)

بیشک نافرمان لوگ عذاب دوزخ میں ہمیشہ رہینگے وہ ان سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اسی میں مایوس پڑے رہیں گے، اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن یہ خود ہی ظالم تھے اور پکاریں گے کہ اے مالک تمہارا پروردگار ہمارا کام ہی تمام کردے۔ وہ جواب دیگا کہ تم ہمیشہ اسی حال میں رہوگے

(بیان القرآن)

اسی طرح ایک اور مقام پر جہنمیوں کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ:۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ

اور جس شخص کا پلہ ہلکا ہوگا سو یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنا نقصان کرلیا اور جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہینگے ان کے چہروں کو آگ جھلستی ہوگی اور اسمیں ان کے منہ بگڑے ہوں گے، کیوں کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر

فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّيْنَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُوْنَ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۞	سنائی نہیں جایا کرتی تھیں اور تم ان کو جھٹلایا کرتے تھے وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہماری بدبختی نے ہم کو گھیر لیا تھا اور ہم گمراہ لوگ تھے اے ہمارے رب ہم کو اس سے نکال دیجئے پھر اگر ہم دوبارہ کریں گے تو ہم بیشک

پورے قصوروار ہیں۔ ارشاد ہوگا اسی میں راندے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو۔ (بیان القرآن)

دوزخیوں کا سارا عذاب ایک طرف ہوگا اور حق تعالیٰ کا اُن سے یہ اعراض فرمانا ایک طرف ہوگا۔ اس کی تکلیف انھیں سب عذابوں سے بڑھکر ہوگی جس طرح مومن اللہ تعالیٰ کے دیدار کے آگے جنت کی سب نعمتوں اور لذتوں کو بھول جائیں گے، اسی طرح سے کافر کو بھی حق تعالیٰ کی ناراضی اور اعراض سے جو تکلیف ہوگی وہ دوزخ کی ساری تکالیف سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔

چنانچہ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :۔

لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ اس کی تفسیر میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فوائد موضح القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

فائدہ لایکلمھم اللہ کی دھمکی سے یہ امر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر کسی کے دل میں محبت الٰہی خوب راسخ ہے اگر سردست محسوس نہ ہو تو اس کو بجھا اخگر بریز خاکستر سمجھنا چاہئے۔ قیامت کو جب کل موانع دور ہوں گے تو اس کا ظہور کامل ہوگا کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو پھر کفار کو یہ دھمکی ایسی ہوگی کہ کوئی اپنے دشمن کو ناخوشی اور اعراض سے ڈرانے لگے جو بالکل بے سود ہے محبانِ جان نثار اعراض محبوب کو درد جاں گداز سمجھتے ہیں نہ اعداء۔ پس معلوم ہوا کہ قیامت کو ہر سینہ اللہ کی محبت سے لبریز ہوگا کہ یہ بے التفاتی عذابِ دوزخ سے بھی بدرجہا زیادہ ان کو جانکاہ معلوم ہوگی۔

(حاشیہ ترجمہ مولانا دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ) پ۳

اب احادیث میں جہنم اور اہل جہنم کا جو ذکر آیا وہ سنئے :۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال نارکم جزء من سبعين جزءا من نار جهنم (متفق عليه)	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری آگ جہنم کی آگ سے ستر حصوں میں سے صرف ایک حصہ ہے۔

وعن النعمان بن بشیرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھون اھل النار عذابا من لہ نعلان وشراکان من نار یغلی منہما دماغہ کما یغلی المرجل ما یری ان احدا اشد منہ عذابا وانہ لاھونھم عذابا۔ متفق علیہ

حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوزخیوں میں سے سب سے کم عذاب جس کو ہوگا اس کا یہ حال ہوگا کہ اس کو دو جوتے اور دو تسمے آگ کے پہنادئے جائیں گے جس کی وجہ سے اس کا دماغ مانند ہانڈی کے جوش ماریگا اور یہ معلوم ہوگا کہ اس سے بڑھکر کسی کو عذاب نہیں ہو رہا ہے حالانکہ اس کو سب سے کم عذاب ہو رہا ہوگا۔

وعن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اوقد علی النار الف سنۃ حتی احمرت ثم اوقد علیہا الف سنۃ حتی ابیضت ثم اوقد علیہا الف سنۃ حتی اسودت فھی سوداء مظلمۃ

حضرت ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ ایک ہزار سال تک جہنم کو دھونکا گیا ہے یہاں تک کہ وہ بالکل سُرخ ہوگئی۔ پھر ایک ہزار سال تک اور دھونکا گیا یہاں تک کہ سفید پڑ گئی پھر ایک ہزار سال اور دھونکا گیا یہاں تک کہ بالکل سیاہ ہوگئی۔ پس اب وہ ایک نہایت ہی سیاہ اور بہت ہی تاریک چیز ہے (رواہ الترمذی)

وعن النعمان بن بشیرؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انذرتکم النار انذرتکم النار فما زال یقولھا حتی لو کان فی مقامی ھذا اسمعہ اھل السوق وحتی سقطت خمیصۃ کانت علیہ عند رجلیہ۔ (تفسیر مظہری بحوالہ دارمی)

حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں تم کو نار سے ڈراتا ہوں، میں تم کو نار سے ڈراتا ہوں۔ اس کلمہ کو آپ زور زور سے اور مسلسل فرماتے تھے کہ اگر اس جگہ آپ ہوتے جہاں اس وقت میں ہوں تو اہل بازار آپ کی آواز سُن لیتے، اسی طرح آپ برابر فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ کے جسم مبارک پر جو چادر پڑی ہوئی تھی وہ آپ کے قدموں پر آگری۔

اما انکم لو اکثرتم ذکر ھاذم اللذات لشغلکم

ابو سعیدؓ سے مروی ہے کہ اے لوگو! اگر تم لذتوں کو توڑنے والی شے یعنی موت کو کثرت سے یاد کرتے تو

عما ادی الموت فاکثروا ذکر ھاذم اللذات الموت فانہ لم یات علی القبر یوم الا تکلم فیہ فیقول انا بیت الغربۃ وانا بیت الوحدۃ وانا بیت التراب وانا بیت الدود فاذا دفن العبد المؤمن قال لہ القبر مرحبا واھلا اما ان کنت لاحب من یمشی علی ظھری الی فاذا ولیتک الیوم وصرت الی فستری صنیعی بک فیتسع لہ مد بصرہ ویفتح لہ باب الی الجنۃ واذا دفن العبد الفاجر او الکافر قال لہ القبر لا مرحبا ولا اھلا اما کنت لابغض من یمشی علی ظھری الی فاذ ولیتک الیوم وصرت الی فستری صنیعی بک فیلتئم علیہ حتی یلتقی علیہ وتختلف اضلاعہ ویقبض لہ سبعون تنینا لو ان واحدا منھا نفخ فی الارض ما انبتت شیئا ما بقیت الدنیا فینھشنہ ویخدشنہ حتی یفضی بہ الی الحساب انما القبر روضۃ من ریاض الجنۃ او حفرۃ من حفر النار (ت) عن ابی سعید (جامع الصغیر ص ۱۵۷ ج ۱)

وہ تم کو ان تمام مشاغل سے روکدیتی جن میں پھنسا ہوا میں تم کو دیکھ رہا ہوں۔ لھذا لذات کا خاتمہ کر دینے والی چیز یعنی موت کو بکثرت یاد کیا کرو کیونکہ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جس میں قبر یہ صدا نہ لگاتی ہو کہ میں مسافرت کا گھر ہوں۔ اور میں تنہائی کا گھر ہوں اور میں خاک کا گھر ہوں اور میں کیڑے مکوڑے کا گھر ہوں۔ پس جب کوئی مومن بندہ دفن کیا جاتا ہے تو قبر اس کو خوش آمدید اور اہلاً وسہلاً کہتی ہے (یعنی اس کے آنے پر خوشی کا اظہار کرتی ہے) اور کہتی ہے کہ سن تو روئے زمین پر چلنے والو میں سب سے زیادہ مجھے محبوب تھا۔ آج جبکہ میں نے تجھے پایا ہے اور تو میرے پاس آگیا ہے تو اب میرا برتاؤ بھی اپنے ساتھ دیکھے گا۔ یہ کہکر اس کے لئے تاحد نظر وسیع اور کشادہ ہوجائے گی اور اس کے لئے جنت کی جانب ایک دروازہ کھولدیا جائیگا۔ اور جب کوئی فاجر یا کافر انسان دفن کیا جاتا ہے تو اس سے قبر کہتی ہے کہ تو تیرے لئے خوش آمدید ہے اور نہ اہلاً وسہلاً ہے بلکہ میری پشت پر چلنے والوں میں سب سے زیادہ مبغوض میرے نزدیک تو ہی تھا لہذا آج جبکہ میں نے تجھ پر قابو پالیا ہے اور تو میرے پاس آگیا ہے تو پھر میرا معاملہ اپنے ساتھ دیکھیگا یہ کہکر اس کو دبوچے گی یہاں تک کہ بالکل مل جائیگی جس کی وجہ سے اسکی پسلیاں ادھر کی ادھر ہوجائینگی اور اسپر لمبے ستر زہریلے سانپ مسلط کر دیئے جائیں گے کہ اگر ایک بھی اُن میں سے زمین میں پھونک مار دے تو تاقیام دنیا زمین کوئی شے نہ اگائے۔ پھر وہ سانپ اسکو ڈسیں

اور نوچیں گے یہاں تک کہ قیامت کے دن حساب کی پیشی ہو جائے گی۔ بلاشبہ قبر یا تو جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے اور یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

عن ابی الدرداء یلقی علیٰ اھل النار الجوع فیعدل ماھم فیہ من العذاب فیستغیثون بالطعام فیغاثون بطعام من ضریع لا یسمن ولا یغنی من جوع فیستغیثون بالطعام فیغاثون بطعام ذی غصۃ فیتذکرون انھم کانوا یجیزون الغصص فی بالشراب فیستغیثون بالشراب فیدفع الیھم الحمیم بکلاب الحدید فاذا دنامن وجوھھم شوی وجوھھم فاذا دخل بطونھم قطع ما فی بطونھم فیقولون ادعوا خزنۃ جھنم عساھم یخففون عنا فیقولون لھم الم یاتکم رسلکم بالبینات قالوا بلیٰ قالوا فادعوا وما دعاء الکافرین الا فی ضلال فیقولون یا مالک لیقض علینا ربک فیجیبھم انکم ماکثون قال الاعمش نبئت ان بین دعائھم واجابۃ مالک لھم مقدار الف عام فیقولون ادعوا ربکم فلا تجدونی

حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ جہنمیوں کو ایسی زور سے بھوک لگے گی کہ تنہا اسی کی تکلیف اس عذاب کے برابر ہوگی جس میں وہ مبتلا ہوں گے پس وہ کھانا مانگیں گے تو ان کو کھانے کے لئے خاردار جھاڑی ملیگی جو نہ فربہ کریگی نہ بھوک ہی کو دفع کریگی۔ پھر وہ کھانا مانگیں گے تو ان کو ایسا کھانا ملے گا جو گلے میں پھنسے گا اور حلق کے نیچے نہ اترے گا تو وہ یاد کریں کہ دُنیا میں اس طرح سے کھانا جب پھنستا تھا تو وہ اس کو پانی سے اُتار لیا کرتے تھے۔ لہذا پانی دیا اور کوئی چیز پینے کی طلب کریں گے تو اُن کو نہایت گرم کھولتا ہُوا پانی لوہے کے آنکڑوں سے پکڑ کے دیاجائیگا ایسا کہ جب اُن کے مُنہ کے قریب پہنچے گا تو اس کو جُھلسا دے گا اور جب اُن کے پیٹ میں پہنچے گا تو اس کے اندر کی چیزوں کو کاٹ کر رکھدیگا، اسپر وہ کہیں گے کہ خزنہ جہنم کو بلاؤ شاید وہ ہم سے عذاب کی تخفیف کر دے۔ یہ سُن کر لوگ کہیں گے کہ کیا تم لوگوں کے پاس تمہارے پیغمبر دلائل لیکر نہیں آئے تھے کہیں گے بیشک آئے تھے، وہ لوگ کہیں گے پھر اب پکارو اور کافروں کا درخواست کرنا محض بے اثر ہے، اس کے بعد کہیں گے کہ اچھا مالک کو (یعنی داروغہ جہنم کو مدد کے لئے) تو بلاؤ، اس سے کہیں گے اے مالک اب تو تمہارا رب ہمارا فیصلہ کر دے۔ وہ کہیں گے کہ یونہی پڑے

خیرا منه فیقولون رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا وَکُنَّا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ ۝ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ فیجیبهم اِخْسَئُوْا فِیْهَا وَلَا تُکَلِّمُوْنَ فعند ذلک یئسوا من کل خیر و عند ذلک یاخذون فی الزفیر و الحسرۃ والویل (جمع الفوائد)

رہو۔ حضرت اعمش فرماتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ اُن کی درخواست اور مالک کے جواب میں ایک ہزار سال کی مدت گذر جائے گی۔ پھر اس کے بعد وہ لوگ کہیں گے کہ اپنے رب ہی کو پکارو دیکھو اس سے بھی کوئی خیر پاؤ گے۔ چنانچہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر ہماری شقاوت غالب آئی اور ہم گمراہ قوم تھے اے رب ہمارے ہم کو اس نجات دیجئے اب ایسا نہ کریں گے اگر کریں گے تو ہم سے بڑھکر کوئی ظالم نہیں۔ اللہ تعالیٰ جواب دینگے دور ہو، اسی میں ذلیل و خوار ہوکر پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو۔ اس کے بعد ہر قسم کی بھلائی سے مایوس ہوجائیں گے اور اس وقت چیخ پکار اور اپنے اوپر ویل و حسرت کریں گے۔

اب میں اخیر میں مکتوباتِ معصومیہ سے حضرت معصوم قدس سرہٗ کے مکتوبات کا ایک جزو جو ہمارے ساری ترغیب و ترہیب کی روح و جان ہے جس سے سب غفلت کے پردے یکسر ھباءً منثورا ہوجاتے ہیں، درج کرتے ہیں: ۔

حق سبحانہٗ باآں بزرگی و کبریائی بندہا را از کمال بندہ نوازی بجناب قدس خویش بر زبان انبیاء علیہم الصلوٰۃ و البرکات دعوت فرمودہ دراہِ وصول را بیان و روشن ساخت افسوس است کہ ازیں قسم دعوت چشم پوشیدہ واعراض نمودہ در دعوتِ نفس و شیطان درآید واز دولتِ قرب و لذتِ وصال محروم گشتہ بعذابِ حرمان گراید و آں لذت زیادہ از لذات جنات النعیم است و ایں بدتر از عذاب جحیم ففروا الی اللہ انی لکم منہ

اللہ تعالیٰ نے باوجود اس بزرگی اور کبریائی کے (جو اسے حاصل ہے)، اپنے بندوں کو اپنی کمال بندہ نوازی سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اپنی بارگاہ عالی جاہ کی جانب دعوت فرمائی ہے اور وصول الی اللہ کے طریق کو نہایت ہی واضح اور روشن فرمادیا ہے۔ پھر اس کے بعد افسوس ہے کہ کوئی اسکی دعوت سے تو چشم پوشی اور روگردانی کرے اور نفس و شیطان کی دعوت کو اختیار کرے اور (حق تعالیٰ کے)، قرب اور لذتِ وصال سے محروم ہوکر عذابِ حرمان میں مبتلا ہوجائے (حالانکہ وہ) لذت (یعنی قرب و وصال) جنت کی نعمتوں سے کہیں بالاتر ہے اور یہ عذاب (یعنی محرومی)

نذیر مبین (مکتوب معصومیہ ص۱۰۲ مکتوب ۱۱۶) رزق) جہنم کے عذاب سے بدرجہا بڑھ کر ہے تو تم اللہ ہی کی طرف دوڑو۔ میں تمہارے واسطے اللہ کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس ترغیب و ترہیب سے ہم مسلمانوں کو کامل حصہ نصیب فرماکر ایمان میں جلاء و تازگی و قوت عطا فرمائے جس سے شکوک شبہات و وساوس سے نجات میسر ہو۔ آمین۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مقام فتح پور تال نرجا

۴ر جمادی الثانیہ ۱۳۷۵ھ

تحصیل کمال کا وقت جوانی ہے

فرمایا کہ اب اتنے دنوں کے بعد اس بڑھاپے میں جبکہ کسی چیز کی تحصیل کا وقت باقی نہیں رہا یہ بات سمجھ میں آئی کہ انسان کو کسی کمال کی تحصیل سے جو چیز مانع ہوتی ہے وہ اس کا کبر و عار ہے، کیونکہ یہی چیز اس کو کسی کامل کے آگے جھکنے سے منع کرتی ہے، ورنہ ہر ہی زمانہ میں اہل کمال رہتے ہیں جن سے کمال حاصل کیا جاسکتا ہے مگر اسی عار و استکبار کی بنا پر ان کے سامنے جھکتے نہیں اس لئے کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا کورے کے کورے ہی رہ جاتے ہیں آدمی جب اپنی خودی و تکبر کو چھوڑتا ہے تب کچھ حاصل ہوتا ہے ؎ ہر کجا پستی است آب آنجا رود

میں حضرات اہل علم کو خصوصاً اس جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج علماء اور طلبہ کو کوئی کمال جو نہیں حاصل ہو رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ان کا عار اور تکبر ہے، یہی ان کی راہ مارے رہتا ہے اس کو اگر سمجھ لیں اور ہمت کر کے اس کو ترک کر دیں تو کمال کے درجہ کو پہونچ سکتے ہیں، چنانچہ جن لوگوں کو کمال حاصل ہوا ہے وہ اپنے کو مٹانے اور کسی کے آگے خود کو گرانے اور اپنے کبر و عار کو ختم کرنے ہی سے حاصل ہوا ہے!

وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ

وصی اللہ عفی عنہ

اعترافِ ذنوب

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

الاعتراف والاستغفار من الذنوب من اعظم سنن النبی الکریم

(گناہوں سے استغفار اور اس کا اعتراف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ترین سنت ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مشکوٰۃ شریف سے دو حدیثیں نقل کرتا ہوں۔ یہ دونوں حدیثیں ماخذ ہیں صوفیہ کے کلام کی کہ وہ بعض اوقات مذنب کو عابد پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ العاصی خیر من المدعی۔ آگے فائدہ میں اس پر مبسوط کلام کروں گا۔

حدیث شریف سنئے:۔

عن جندب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدث ان رجلا قال واللہ لا یغفر اللہ لفلان وان اللہ تعالیٰ قال من ذا الذی یتالی علی اللہ انی لا اغفر لفلان فانی قد غفرت لفلان واحبطت عملک او کما قال رواہ مسلم

(مشکوٰۃ شریف)

حضرت جندب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث بیان فرمائی ہے ایک آدمی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فلاں کی مغفرت نہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کون ہے وہ شخص جو مجھ پر قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں کی مغفرت نہ کرونگا۔ سنو کہ میں فلاں کی مغفرت کرتا ہوں اور تیرے اعمال حبط کرتا ہوں۔ اسکو مسلم نے روایت کیا ہے۔

یہ حدیث پھر بھی مجمل ہے۔ دوسری حدیث جو ذیل میں درج ہے وہ مفصل ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان رجلین کانا فی بنی اسرائیل متحابین احدھما مجتھد فی العبادۃ والاخر یقول مذنب فجعل یقول اقصر عما انت فیہ فیقول خلنی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں دو شخص تھے جو آپس میں محبت رکھتے تھے۔ ایک عبادت میں اجتہاد یعنی کوشش کرتا تھا اور دوسرا یہ کہتا تھا کہ میں گنہگار ہوں۔ یہ کوشش کرنے والا گنہگار سے کہتا تھا کہ تم جس میں ہو اسکو کم کرو وہ کہتا تھا کہ

وربی حتی وجدہ یومًا علی ذنب استعظمہ فقال اقصر فقال خلنی وربی ابعثت علی رقیبًا فقال واللہ لا یغفر اللہ لک اذا ولا یدخلک الجنۃ فبعث اللہ الیہما ملکا فقبض ارواحہما فاجتمعا عندہٗ فقال للمذنب ادخل الجنۃ برحمتی وقال للاخر اتطیع ان تحظر علی عبدی رحمتی فقال لا یارب قال اذھبوا بہ الی النار۔

(رواہ احمد)

مجھ کو اور میرے رب کو چھوڑ دو (میں جانوں وہ جانے یہ بطور محبت و رجاء و نیاز کے کہتا تھا) یہاں تک کہ اسکو ایک گناہ پر پایا جس کو بڑا سمجھا پس کہا اس کو چھوڑ دو اس نے کہا مجھکو اور میرے رب کو چھوڑ دو (میں جانوں وہ جانے) کیا تو میرے اوپر نگہبان مقرر ہوا ہے اس نے کہا اللہ تعالیٰ تجھکو کبھی نہیں بخشے گا اور جنت میں داخل نہیں کریگا۔ اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتہ بھیجا۔ انکی ارواح کو اس نے قبض کیا پس خدا کے پاس دونوں مجتمع ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے گنہگار سے فرمایا میری رحمت سے جنت میں داخل ہوجا اور دوسرے سے کہا کہ تم کو قدرت ہے کہ میری رحمت کو میرے بندے پر روک لو اس نے کہا نہیں حکم فرمایا کہ اس کو جہنم میں لے جاؤ۔

(فائدہ) صوفیائے کرام اخلاق پر بہت زور دیتے ہیں اور اس میں کبر و عجب اصل ہے جو عبادت سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے لئے لازم ہے دوسروں کی تحقیر۔ یہ ایسا رذیلہ ہے کہ اس کے اتصاف کے ساتھ کوئی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں انسان نہیں پا سکتا۔ اس لئے عبادت سے زیادہ قابل ازالہ اور اصلاح یہ رذائل ہیں صوفیہ کے کلام میں یہ بکثرت موجود ہیں ان میں ایک یہ ہے ؎

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ
رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

نیز یہ ہے کہ ؎

ازیں نوع طاعت نیاید بکار ... برو عذر تقصیر طاعت بیار

اسی طرح حضرت حافظ کا یہ شعر بھی ہے ؎

ترسم کہ صرفۂ نبرد روز بازخواست
نانِ حلال شیخ ز آبِ حرام ما

میں حضرات صوفیہ کے ان ارشادات کا ماخذ بیان کرتا ہوں وہ ماخذ یہی احادیث ہیں جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں ان میں ان کا نتیجہ و انجام بیان ہوا ہے کہ ان کو دوزخ کا حکم ہوگیا اور مذنب کو جنت کا صوفیہ سچے جو متبع سنت ہیں وہ سالکین راہ کو اس مزلۃ اقدام سے بچاتے ہیں ان کا کیا ہی احسان و کرم ہے اور کیسے اس راہ کے سالک ہیں۔ جزاھم اللہ تعالیٰ۔

اور یہ سمجھ لیجئے کہ کوئی قدم بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کے درگاہ میں معتبر اور مقبول نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الطریق کلھا مسدودۃ الا من اقتفی اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی مطلب ہے اس کا جو شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز بر پے مصطفےٰ

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسوۂ حسنہ قائم فرمادیا تاکہ مذنبین کو اسی راہ سے لے چلیں وہ یہ کہ آپ نے ذنب کا اعتراف قولاً و عملاً و حالاً فرمایا ہے۔ یہ آیت شریفہ اعترفوا بذنوبھم پر عمل ہے یہ آیت مذنبین کے حق میں بیر نظری ہے تاکہ سب کے لئے یہ سنت و طریق ہوجائے اور شیطان اور اس کے اثرات یعنی کبر و نخوت سے ان کا قدم دور رہے۔ یہ بیر قدمی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذنبین کے لئے اعترافِ ذنب کا اسوہ قولاً جو بیان فرمایا تو اس میں اسی قسم کی احادیث داخل ہیں جو شروع میں بیان ہوئیں کیونکہ ان ارشادات سے آپ کی غرض ہی یہ ہے کہ اعترافِ ذنب کی تحسین لوگوں کے ذہن نشین فرمائیں باقی آپ نے اعتراف کا عملی اور حالی اسوہ بھی قائم فرمایا۔ میری مراد اس سے وہ حدیث ہے جس میں آپ نے اس طرح دعا فرمائی ہے کہ۔

وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل المشفق المقر المعترف بذنبی اسألك مسألة المسکین وابتھل الیك ابتھال المذنب الذلیل وادعوك دعاء الخائف الضریر ودعاء من خضعت لك رقبته وفاضت لك عبرته وذل لك جسمه ورغم لك انفه

اور میں ہوں مصیبت زدہ محتاج فریادی پناہ جو ترساں و ہراساں اقرار کرنے والا ماننے والا اپنے گناہ کا۔ سوال کرتا ہوں تجھ سے سوال بیکس کا سا گڑگڑاتا ہوں تیرے سامنے گڑگڑانا گناہگار ذلیل کا سا۔ اور طلب کرتا خوف زدہ آفت رسیدہ کا سا اور طلب کرنا اس شخص کا سا کہ جھکی ہوئی ہو تیرے سامنے گردن اسکی اور بہ رہے ہوں آنسو اس کے اور فروتنی کئے ہوئے ہو تیرے سامنے اور رگڑتا ہو تیرے سامنے ناک اپنی۔

(مناجات مقبول دوشنبہ)

دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم باوجودیکہ سید الانبیاء ہیں مگر کس قدر تواضع کے کلمات فرما رہے ہیں۔ حق تعالیٰ کے سامنے اپنے کو فقیر۔ وجل۔ معترف بذنب۔ مسکین۔ مذنب ذلیل سبھی کچھ فرما رہے ہیں تو یہ آپ کی غایت تواضع تھی اور امت کو تعلیم دینا مقصود تھا کہ وہ لوگ یہ دیکھیں کہ جب ایسی ذات جو کہ معصوم ہے اللہ تعالیٰ کے آگے اس طرح تضرع و زاری کے ساتھ دعا کر رہی ہے تو جو لوگ کہ معصیت سے پُر ہیں اور شب و روز گناہ میں منہمک رہتے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ کے سامنے کس درجہ گڑگڑانا چاہیئے۔ تمام انبیاء علیہم السلام

کی یہی سنت رہی ہے اور ہر زمانہ میں صالحین کا یہی شعار رہا ہے (چنانچہ بعض بزرگانِ دین کے واقعات ہم آگے بیان کریں گے) یہاں یہ سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر تواضع اور انکساری کے ساتھ جو یہ کلمات فرمائے اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان حضرات کے یہاں ایک تو ہوتا ہے عروج اور ایک ہے نزول۔ چنانچہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نزول عروج سے بڑھا ہوا ہوتا ہے اسلئے کہ اس میں عبدیت کی شان ظاہر ہوتی ہے اور عبدیت سب مقامات سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔ کسی نے حضرت سے دریافت کیا کہ حضرت مشہور ہے کہ سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ بغداد کی جامع مسجد میں منبر پر بیٹھ کر یہ فرمایا کہ میرا یہ قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے اللہ تعالیٰ نے اس آواز کو سب اولیاء اللہ کے کانوں تک پہونچا دیا۔ چنانچہ سب نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ بلی علی الرأس والعین یعنی ہمارے سر آنکھوں پر ہے تو اس سے تو سلسلۂ قادریہ کی افضلیت دوسرے سلاسل پر معلوم ہوتی ہے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا کہ نہیں تو اس سے فضیلت کیسے ثابت ہو گئی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس کلمہ سے حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا عروج میں ہونا معلوم ہوتا ہے اور جملہ اولیاء اللہ کا نزول میں اور نزول عروج سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ مسئلہ سب صوفیہ کے نزدیک مسلم ہے۔

اسی طرح ان حضرات کے یہاں یہ بھی دستور ہے کہ شیخ جب طالبین کی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو اپنے مقام سے نزول کرتا ہے اور ان کی استعداد کے مطابق کلام کرتا ہے ورنہ اگر وہ اپنے ہی مقام پر رہے اور اپنے حال کے مطابق کلام کرے تو طالبین کو نفع نہ ہوگا اس لئے کہ طالب شیخ کے احوال کا تحمل ہی نہیں کر سکتا۔

بس اسی طرح یہاں سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب امت کی اصلاح پیش نظر ہوئی تو آپ نے اپنے اعلیٰ وارفع مقام سے نزول فرمایا اور یہ نزول عروج سے جو امر اکہلاتا ہے کہیں بڑھ کر ہے۔ چنانچہ آپ نے امت کی استعداد اور ان کی صلاحیت اور ان کے احوال ملحوظ فرما کر اسی کے اعتبار سے تعلیم فرمائی اس طرح یہ دعا سب کے لئے سنت ہو گئی اور اس طرح سے ہر شخص کو اتباع سنت کا شرف حاصل ہو گیا اور امت باوجود مختلف مراتب پر شامل ہونے کے اسکو حرز جان بنانے کی مکلف ہے۔ ظاہر ہے جب کہ تواضع تمام خصائل کی اصل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق ہی کے سکھانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے تو اب اگر آپ صرف زبان سے یہ فرما دیتے کہ لوگو تواضع اختیار کرو تو کسی کی سمجھ ہی میں نہ آتا کہ تواضع کیا چیز ہے اور کیسے اختیار کی جاتی ہے اس لئے آپ نے یہ کیا کہ اپنے آپ کو عاصیین اور مذنبین کی صف میں رکھ کر اللہ تعالیٰ سے انابت اور استغفار کیا اور اس کے لئے جن جن کلمات کا اختیار کرنا ایک

مذنب کے شایانِ شان ہوسکتا تھا آپ نے وہ سب کچھ استعمال فرمائے اور زبان سے کہنے کے ساتھ ساتھ اپنے حال اور انداز سے سراپا مظہر بھی بن گئے اس لئے کہ آپ معلم تھے اگر آپ اس طرح سے تعلیم نہ فرماتے تو امت کو اس کا علم ہی مشکل تھا۔

یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل اور حال سے اعترافِ ذنب کا جو اُسوہ مذنبین کیلئے قائم فرمایا تو اس کے ذریعہ آپ نے ہمارے حال پر احسان عظیم فرمایا اس لئے کہ یہ خیال ہوسکتا تھا کہ مذنب بوجہ مجرم ہونے کے حق تعالیٰ کے آگے لب کشائی کی ہمت ہی نہ کرسکتا اور اعترافِ ذنب کے وقت اسکی زبان لڑکھڑا جاتی جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

احب مناجاۃ الحبیب باوجہٖ ولکن لسان المذنبین کلیل

لیکن آپ کے تعلیم فرمانے کے بعد اب یہ کہنا صحیح نہیں کہ مذنبین کی زبان کلیل ہے اس لئے کہ کلام کرنے کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں یعنی کبھی انسان خود اپنی زبان سے کہتا ہے اور کبھی ایک بات کو دوسروں کی زبان پر بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ صاحب اعتصام نے ایک موقع پر صاحب رسالہ قشیریہ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ اور یہ فرمایا ہے کہ علامہ قشیری یہ کلام لسان صوفیہ پر فرمارہے ہیں یعنی اس پر تمام صوفیاء کا اتفاق ہے اور ان سب کی طرف سے یہ کلام ہے۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کلمات کو مذنبین کا سا حال طاری کر کے گویا ان کی لسان پر ارشاد فرمایا تو اب اگر کوئی مذنب ان کلمات کو کہے گا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لسان پر متکلم ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ آپ کی لسان کلیل نہیں تھی لہٰذا ان کلمات کی ادائیگی کے وقت مذنب کی لسان کو بھی کلیل نہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ وہ کلام اپنی زبان سے نہیں کر رہا ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لسان پر تکلم کر رہا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کے بعد اب کسی کا یہ خیال کرنا صحیح نہیں رہا کہ وہ مذنب ہے اور اس کی وجہ سے اس کی زبان کلیل ہے۔ پس شاعر نے اُس شعر میں جو مضمون ادا کیا ہے وہ اس اعتبار سے صحیح نہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعا فرما دینے کے بعد اب کسی مذنب کی لسان کلیل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ معصوم ہونے کے بعد بھی آپ سے اس قسم کے الفاظ جو صادر ہوئے تو یا تو غایت تواضع اور کسر و انکسار کی بنا پر صادر ہوئے یا یہ بات تھی کہ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام یہ سمجھتے تھے کہ طریق یہی ہے اسی سے طریق میں داخل ہوتا ہے ؎

بدرگاہ لطف و بزرگیش بر بزرگان نہادہ بزرگی زسر

بندہ اپنے مولا کے ساتھ جس قدر عجز و انکسار اور تواضع کرے کم ہی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو چونکہ حق تعالیٰ کی کامل معرفت ہوتی ہے اس لئے ان کے سامنے یہ حضرات اپنے کو قصوروار اور گنہگار ہی سمجھتے ہیں اب آپ سے کہتا ہوں جب نبوت کا یہ طریق ہے تو ولایت تو بہرحال نبوت ہی کی فرع ہے اور اس کے تابع ہے کوئی مستقل چیز نہیں ہے اس لئے کسی ولی کی مجال نہیں کہ اس راستہ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید　　　　که هرگز بمنزل نه خواهد رسید

اور یہ جو میں نے کہا کہ راہ یہی ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ سب سے پہلے عجب و پندار جس ذات نے کیا تھا وہ ابلیس تھا کہ اس نے اپنے کو حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں انا خیر کہا۔ اسی طرح سے فرعون نے بھی اسی کا اتباع کیا اور غایت تکبر اور ترفع میں آکر انا ربکم الاعلیٰ کہا اور اس صفت میں ابلیس سے بھی بڑھ گیا کیونکہ ابلیس نے جو کلمہ کہا تھا وہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں کہا تھا اور اس بدبخت نے تو براہِ راست حضرت حق جل وعلا سے مقابلہ کیا اور اپنے کو رب اعلیٰ کہا چنانچہ اس کلمہ کی وجہ سے دونوں کا جو حشر ہوا وہ معلوم ہی ہے یعنی یہ کہ ابلیس ملعون ہوا اور فرعون بھی مردود و مطرود ہوا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے سامنے ایک جانب تو یہ نقشہ موجود تھا اور دوسری جانب حق تعالیٰ کی عظمت اور انکی بڑائی کے آگے یہ حضرات اپنا وجود ہی کچھ نہیں سمجھتے تھے اس لئے ان حضرات نے عجب کو تو ترک فرما ہی دیا تھا مزید یہ کیا کہ اپنے کو حق تعالیٰ کے سامنے نہایت ہی عاجز اور مسکین مذنب اور ذلیل حقیر اور معترف بالذنب کی حیثیت سے پیش کیا جس کا منشا ایک تو ابلیس کا واقعہ بنا اور دوسرے یہ کہ ان حضرات کو حق تعالیٰ کی کامل معرفت ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کی عظمت اور ان کا جلال ان کے قلوب پر مستولی رہتا ہے۔ چنانچہ جس قدر عظمت قلب میں ہوتی ہے اسی قدر انسان اپنے کو حق تعالیٰ کے سامنے حقیر و فقیر سمجھتا ہے۔ اسی سے خیال فرمائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں حق تعالیٰ کی کیسی کچھ عظمت تھی۔ اس کا تو ہمیں اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ایک باطنی شے ہے۔

باقی یہ کہ قلب مومن چونکہ اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلاصہ کائنات اور سبب تخلیق عالم ہیں اس لئے آپ کے قلب انور پر حق تعالیٰ کی جیسی کچھ تجلی ہوتی ہوگی ظاہر ہے اس کا سراغ آپ کے ان کلمات ہی سے لگتا ہے جو آپ نے استعمال فرمائے —— مثلاً یہی فرمایا کہ:۔ انا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الخ حضور کے ان کلمات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے مواقع میں آدمی اَنَا کا استعمال کر سکتا ہے اور یہ وہ اَنَا نہیں ہے جو مذموم ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر مرقاۃ سے اس بحث کو نقل کروں۔ حضرت ملا علی قاریؒ نے اس مقام پر نہایت ہی عمدہ کلام فرمایا ہے۔ جو تحقیق بلیغ ہونے کے علاوہ

پُرلطف اور کیف آور بھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم میں سے آج کون شخص روزہ دار ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اَنَا (میں)، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا کہ اچھا آج تم میں سے جنازہ کے پیچھے کون چلا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے پھر عرض کیا کہ میں، پھر آپ نے فرمایا کہ اچھا آج تم میں سے کس نے کسی مریض کی عیادت کی ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میں نے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس انسان میں یہ تمام خصلتیں جمع ہوں وہ جنتی ہے۔

حضرت ملا علی قاریؒ نے علامہ طیبی کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ (قال ابوبکر اَنَا) میں جو اَنَا آیا ہے تو اس سے اخبار میں تعیین مقصود تھی۔ کچھ اپنے کو لگانا اور جتانا مقصود نہ تھا۔ جیسا کہ مقام مفاخرت میں لوگ یہی کرتے ہیں اور حضرات صوفیہ کے نزدیک اَنَا کا یہی استعمال منع ہے ورنہ تو لفظ اَنَا خود نص میں وارد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے کہنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے قل انما انا بشر مثلکم۔ یعنی فرمادیجئے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں۔ اسی طرح ارشاد ہے کہ وما انا من المتکلفین علاوہ اس کے اور بھی بہت سی نصوص ہیں جن میں اَنَا کا لفظ آیا ہے اور وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی پر نکیر منقول ہے جنھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور جب حضور نے دریافت فرمایا کہ کون، تو کہا کہ (میں)، تو یہاں نکیر اس وجہ سے تھی کہ مقام اخبار میں انھوں نے تعیین نہیں کی تھی یعنی جب حضور نے دریافت فرمایا تھا کہ کون تو انھیں اپنا نام بتلانا چاہیئے تھا۔ محض (میں) کہہ دینے سے تعیین تو نہیں ہوئی اس سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کوئی پکارنے والا پکار رہا ہے تو محض اس اتنے پر دلالت تو کنڈی کھٹکھٹانے سے بھی ہو گئی تھی۔ نیز لفظ 'اَنَا' میں تو عموم ہے یعنی ہر شخص اَنَا کہہ سکتا ہے۔ آگے خود صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ 'اَنَا' اپنی ذات کے اعتبار سے تو مذموم نہیں ہے۔ مگر اسکی مذمت جو کی جاتی ہے تو اس وقت جبکہ اس کے ذریعہ سے فخر کی باتوں کی خبر دے۔ جیسے ابلیس نے انا خیر منہ کہا تھا یا فرعون نے انا ربکم الاعلیٰ کہا۔ چنانچہ اسی قبیل سے ہے اگر کوئی شخص آج یوں کہے انا العالم۔ انا الزاھد۔ انا العابد۔ کیونکہ اس میں وہ متبع ہوگا۔ ابلیس اور فرعون کا بخلاف اس کے کہ اگر کوئی یوں کہے انا الفقیرُ۔ الحقیرُ۔ العبدُ۔ المذنبُ یا اس کے مثل اور کوئی لفظ کہے تو یہ تواضع شمار ہو گی جو کہ سنت ہے اور یہ شخص اس باب میں متمسک بالسنۃ ہوگا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع سلوک میں بھی ضروری ہے اور متبع سنت اس لئے ہوگا کہ حضور نے بھی اپنے متعلق یہی فرمایا تھا۔ انا البائس الفقیر الخ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلمات کا منشاء تجلی اعظم تھی۔ دوسرے کو وہ

کہاں نصیب۔ انبیاء علیہم السلام کا سا حال دوسرے کا ہونا تو محال ہی ہے۔ بایں ہمہ مومن کے لئے ان کلمات کو اپنی زبان سے کہنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ راہ یہی ہے۔ چنانچہ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ طریق میں پہلا قدم نفس کا فنا ہے۔ اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمل اور حال کے ساتھ پیش فرما رہے ہیں۔ یہی اَنَا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے فنا ہے اب یہ چاہو کہ محض اپنی کوشش سے بدون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے حق تعالیٰ تک پہونچ جاؤ تو یہ ناممکن ہے ؎

مپندار سعدی کہ راہ صفا | تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ
خلاف پیمبر کسے رہ گزید | کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

اور یہ سمجھئے کہ راستہ بالکل بند ہے اور وہ اخبار دیکھنے سے نہیں کھلے گا بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں ملیگا۔ بدون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کے کامیابی ناممکن ہے۔

قال اللہ تعالیٰ۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ وقال اللہ تعالیٰ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ وقال تعالیٰ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ

مگر اتباع کرنے والے اور اتباع کی ڈینگ مارنے والے ان دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے وہ انانیت جو ابلیس اور فرعون نے کی تھی۔ انبیاء علیہم السلام کو تو اس سے نفرت تھی اس لئے آپ کے بعد پھر تمام ہی صوفیہ اس پر تل گئے کہ اس خودی کو اپنے اندر سے ہٹا کر رہیں گے کیونکہ انھوں نے ابلیس اور فرعون کو دیکھا تھا کہ وہ اسی انانیت کے ہاتھوں تباہ ہوئے۔ لہذا ان حضرات نے اس سے عبرت حاصل کر کے یہ نصیحت گرہ باندھ لی تھی کہ اس راہ نہیں چلنا ہے اور اس کے ساتھ اتصاف تو بجائے خود رہا اس کے شبہ وشائبہ سے بھی یہ لوگ بمراحل دور رہے۔

مولانا رومؒ نے بھی مثنوی میں اس مضمون کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ؎

زاں انائے بے انا خوش گشت جاں | شد جہاں از من انائے ایں جہاں
از انا چوں رست اکنوں شد انا | آفریں ہا بر انائے بے عنا

مضمون کی پاکیزگی میں کیا کلام ہے مگر بالکل چیستاں بن کر رہ گیا ہے۔ برخلاف اس کے علماء نے جو کلام فرمایا ہے وہ کتنا صاف اور واضح ہے اسی طرح مثنوی کا ایک اور شعر بھی بہت مشہور ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت فرعونے انا الحق گشت پست | گفت منصورے انا الحق گشت مست

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے حالات مختلف ہیں دیکھئے جس کلمہ کو فرعون کہہ کر مردود ہوا منصور نے بھی اسی کلمہ کو کہا مگر وہ مجذوب اور محب خدا قرار پائے۔ مولانا روم نے اس شعر میں انا کی دو قسموں کو خوب

اچھا بیان فرمایا ہے لیکن حدیث کی شرح میں علماء کا جو کلام نقل کیا گیا ہے وہ اس سے بڑھ گیا ہے۔ حضرتؒ فرماتے تھے۔ فرعون اور منصور کے ان اقوال میں فرق نہایت عمدہ القا ہوا۔ وہ یہ کہ فرعون نے جو انا کہا تو اس سے اس کا مقصد حق کی نفی اور انا کا اثبات تھا۔ چنانچہ اس نے انا ربکم الاعلیٰ جو کہا تو اس کی غرض یہ تھی کہ جو ذات کہ رب اعلیٰ کا مصداق ہو سکتی ہے وہ میں ہوں۔ میرے علاوہ کوئی دوسرا رب اعلیٰ نہیں اور منصور نے جو انا الحق کہا تو اس سے ان کا مقصد انا کی نفی اور حق کا اثبات تھا۔ یعنی میں کچھ نہیں ہوں۔ بس حق ہی حق ہے غرض علماء جب تصوف کے مسائل بیان کرنے پر آتے ہیں تو ایسا ایسا بیان فرماتے ہیں اور قرآن و حدیث سے اسکو مستنبط فرماتے ہیں کہ آنکھ کھل جاتی ہے۔ آپ قرآن و حدیث نہیں جانتے اور نہ اسکو سمجھنے کی آپ کو فکر ہے اس لئے آپ کو تصوف سے حصہ نہیں ملا کیونکہ تصوف تو قرآن و حدیث ہی میں ہے۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس دعا کے ذریعہ امت کو جو تعلیم فرمائی تو امت نے بھی دل سے اسکی تلقی بالقبول کی۔ چنانچہ مشائخ نے ہر زمانہ میں آپ کی اس دعا اور مخصوص حال کی یاد تازہ فرمائی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حال کی تفسیر حال ہی سے کی۔ اور جس طرح علماء ظاہر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اقوال کی شرح فرمائی ہے اسی طرح حضرات مشائخ نے آپ کے حال کی شرح فرمائی ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ حال کی شرح حال ہی سے کی بھی جا سکتی ہے قول و فعل اس کے لئے کافی نہیں۔ چنانچہ دوسروں کے اندر حال اپنے حال ہی کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہے یا پھر اس شخص کے قال سے بھی حال پیدا ہو سکتا ہے جو خود صاحب حال ہے۔ اب میں آپ کے سامنے بزرگوں کے چند واقعات پیش کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کو بھی کیسا مضبوط پکڑا ہے۔ اگر وقتاً فوقتاً یہ حضرات اسکو نہ دہراتے ہوتے تو حال کے ساتھ اتصاف تو الگ رہا اس کا علم بھی ہم سے رخصت ہو جاتا۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حال کی شرح جسے آپ نے انا البائس الفقیر میں معلوم کیا۔ خاندان نبوت ہی کے ایک اعلیٰ فرد اور ایک صاحب سلسلہ بزرگ کے واقعہ سے سنئے:۔

اصمعی کہتے ہیں کہ ایک شب میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا۔ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ کعبہ کے پردوں سے لپٹ کر یہ اشعار پڑھ رہا تھا ؎

يَا مَنْ يُجِيبُ دُعَاءَ الْمُضْطَرِّ فِي الظُّلَمِ	يَا كَاشِفَ الضُّرِّ وَالْبَلْوٰى مَعَ السَّقَمِ
قَدْ نَامَ وَفْدُكَ حَوْلَ الْبَيْتِ وَانْتَبَهُوْا	وَأَنْتَ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ لَمْ تَنَمِ
أَدْعُوْكَ رَبِّيْ حَزِيْنًا هَائِمًا قَلِقًا	فَارْحَمْ بُكَائِيْ بِحَقِّ الْبَيْتِ وَالْحَرَمِ
إِنْ كَانَ جُوْدُكَ لَا يَرْجُوْهُ ذُوْ سَفَهٍ	فَمَنْ يَجُوْدُ عَلَى الْعَاصِيْنَ بِالْكَرَمِ

یعنی اے وہ ذات جو رات کی تاریکیوں میں مضطر کی دعا قبول فرماتے ہیں اور مصیبت اور غم کو ہمارے دور فرمادیتے ہیں۔ آپ کے پاس آیا ہوا وفد بیت اللہ کے اردگرد پھرا بھی اور پھر کر سو گیا اور پھر وہ لوگ بیدار بھی ہو گئے۔ مگر اے حی و قیوم آپ ایسے ہیں کہ آپ کبھی نہیں سوتے۔ اے رب میں آپ کو اس حال میں پکارتا ہوں کہ الم رسیدہ ہوں پریشان حال ہوں اور قلق والا ہوں۔ لہذا میرے رونے پر اپنے بیت اور حرم کے صدقہ میں رحم فرمائیے، آپ کے بخشش کی کوئی بیوتوف یا مذنب اگر بالفرض امید نہ کرے تو پھر گنہگاروں پر اور کون بخشش اور جود کریگا۔ یہ تو پھر بخشے ہی نہ جائیں گے۔ حالانکہ گنہگار ہی زیادہ ہیں۔

یہ اشعار پڑھے اور پھر خوب ہی روئے۔ پھر اس کے بعد اس طرح دعا کی :-

أَلَا أَيُّهَا الْمَقْصُودُ فِي كُلِّ حَاجَتِي　　شَكَوْتُ إِلَيْكَ الضُّرَّ فَارْحَمْ شِكَايَتِي
أَلَا يَا رَجَائِي أَنْتَ تَكْشِفُ كُرْبَتِي　　فَهَبْ لِي ذُنُوبِي كُلَّهَا وَاقْضِ حَاجَتِي
أَتَيْتُ بِأَعْمَالٍ قِبَاحٍ رَدِيَّةٍ　　وَمَا فِي الْوَرَى عَبْدٌ جَنَى كَجِنَايَتِي
أَتُحْرِقُنِي بِالنَّارِ يَا غَايَةَ الْمُنَى　　فَأَيْنَ رَجَائِي ثُمَّ أَيْنَ مَخَافَتِي

یعنی اے وہ ذات جو کہ ہر حاجت میں مقصود ہے۔ میں نے آپ کی طرف اپنی تکلیف بیان کردی۔ پس میری تکلیف کو دور فرمادیجئے۔ اے وہ ذات جس سے میری امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ ہی میرے رنج و غم کو دور کرسکتے ہیں۔ لہذا میرے سب گناہوں کو بخش دیجئے اور میری حاجت روائی فرمائیے میں آپ کے دربار میں نہایت ہی ردی اور قبیح اعمال لیکر حاضر ہوا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کی مخلوق میں مجھ جیسا گنہگار بندہ کوئی اور نہ ہوگا۔ بایں ہمہ اے میری امیدوں کی انتہا اور میری آرزوؤں کے منتہا کیا آپ مجھے آگ میں جلائیں گے۔ اگر بالفرض ایسا ہوا تو پھر میری امید کیا کام آئی اور میرا خوف کیا کام آیا۔ یہ کہا اور زمین پر بیہوش ہو کر گر پڑے۔

اصمعی کہتے ہیں کہ میں نے اس جوان کو قریب سے جاکر دیکھا تو حضرت زین العابدین علی بن حسین بن علی ابن ابی طالبؓ تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے ان کا سر مبارک اپنی گود میں رکھا اور خود بھی رونے لگا۔ میرے آنسوؤں کے چند قطرے آپ کے رخسار پر گرے۔ جسکی وجہ سے آپ نے آنکھ کھول دی اور فرمایا یہ کون ہے جو میرے اور میرے رب کے درمیان حائل ہو گیا ہے اور مجھ پر ہجوم کر رکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا غلام اصمعی ہے اور کہا کہ اے ہمارے سید آپ تو اہل بیت نبوت اور معدن رسالت سے ہیں پھر اس قدر جزع فزع کیسی ؟ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے کہ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ

اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْراً۔ یعنی اللہ تعالیٰ۔ اے اہل بیت ارادہ کرتا ہے کہ تم سے گندگی دور کر دے اور تم کو پاک کر دے۔ پاک کرنا۔ آپ نے فرمایا۔ اے اصمعی کیا بات کہتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کو مطیعین کے لئے پیدا کیا ہے اگرچہ وہ عبد حبشی ہی کیوں نہ ہو اور دوزخ کو عاصیین کے لئے پیدا کیا ہے اگرچہ وہ حر قرشی ہی کیوں نہ ہو اور کیا اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا ہے کہ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَا اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فِیْ جَھَنَّمَ خٰلِدُوْنَ۔ یعنی جب نفخ صور ہوگا تو اس دن باہم نسب کام نہ آئے گا اور نہ اس کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا بلکہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کی نیکیوں کا پلہ ہلکا ہوگا۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو خسارہ میں ڈال رکھا ہے جو کہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

سبحان اللہ کس قدر پاکیزہ حال تھا آپ کے قلب اطہر کا اور اس میں بھی کس درجہ متبع سنت تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال کی تصویر بعد والوں کو اپنے حال سے دکھلا دی اور جس حال سے خود متصف تھے نہ معلوم کتنے لوگوں کو متصف اور متاثر کر دیا ہوگا۔ چنانچہ یہ سلسلہ برابر چلتا ہی رہا۔

شیخ سعدیؒ بوستاں میں لکھتے ہیں کہ:۔

عبد القادر گیلانی را دیدند رحمۃ اللہ علیہ در حرم کعبہ روئے بر حصار نہادہ بود و می گفت۔ حضرت عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں نے دیکھا کہ حرم شریف کی کنکریوں پر پیشانی رکھے ہوئے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ اے خداوند بخشائے واگر مستوجب عقوبتم مرا روز قیامت نابینا برانگیز تا در روئے نیکاں شرمسار نہ باشم۔ اے خداوندا مجھے بخش دیجئے اور اگر میں سزا ہی کا مستحق ہوں تو مجھے روز قیامت نابینا اٹھائیو۔ تاکہ نیکوں کے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔

سبحان اللہ خوف و رجا کے جو الفاظ سننے میں آتے ہیں ان حضرات کے عمل سے اس کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ کتنے زبردست اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ چنانچہ انھیں کا وہ واقعہ ہے کہ بغداد کی جامع مسجد میں منبر پر بیٹھ کر فرمایا تھا کہ میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے اور تمام اولیاء اللہ نے اس کلمہ کو سنا اور اپنی اپنی جگہ سے فرمایا کہ بلکہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ ایسا تو حضرت کا مرتبہ تھا اور خشیت کا یہ عالم تھا کہ حرم شریف میں کنکریوں پر پڑے ہوئے رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اے اللہ میرے گناہ بخش دے حضرت کے اس حال سے پتہ چلتا ہے کہ طاعت نے اپنا اثر کیا تھا اور اس کے ذریعہ سے حق تعالیٰ کی پوری معرفت قلب میں آگئی تھی اور اس کے آگے اپنے کو انتہائی قصوروار اور گنہگار سمجھ رہے تھے۔ اور حقیقی

طاعت کا یہی اثر ہوتا ہے اور اگر طاعت کے بعد تواضع فروتنی کسروانکسار اور فنائیت نہ پیدا ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ عبادت میں اخلاص ہی نہیں ہے۔ ایسوں ہی کے متعلق مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ایں کہ می بینی خلافِ آدم اند نیستند آدم غلافِ آدم اند

یعنی آدم علیہ السلام کی صفات تواضع۔ فروتنی۔ انکسار۔ عاجزی۔ انابت۔ توبہ واستغفار اور اعتراف ذنب تھیں لہٰذا جس آدمی میں یہ صفات نہ ہوں تو بھلا وہ کیا آدمی ہے۔ کیونکہ فی الواقع آدمی وہی ہے جو صفات آدم کا حامل ہو اور باپ کی میراث سے جسے حصہ ملا ہو ورنہ تو محض آدمی کی صورت پر سمجھا جائے گا اور سیرت سے عاری ہوگا اور یہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شیر کی کھال پہن لے تو بظاہر شیر معلوم ہوگا حقیقتاً شیر نہ ہوگا۔

آگے فرماتے ہیں ؎

میم واؤ میم نوں تشریف نیست لفظ مومن جز پئے تعریف نیست

یعنی کوئی نام ہو مومن ہو یا کچھ اور محض تعریف کے لئے ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا مومن حقیقتاً اسکو کہا جائے گا جس میں خاص قسم کی صفات ہوں باقی منافق پر مومن کا اطلاق کیا جانا ایسا ہی ہے جیسے شیر کی کھال پہننے والے کو شیر کہہ دیا جائے یا آدمی کی صورت رکھنے والے کو آدمی کہا جائے۔ اب اس زمانہ میں اس قسم کے لوگ بہت ہو گئے ہیں۔ کیسا کیسا اپنا نام رکھتے ہیں اور صفات غائب ہیں۔ انہی لوگوں کے متعلق مولانا فرماتے ہیں ؎

کار شیطاں می کند نامش ولی گر ولی این ست لعنت بر ولی

یہ کہہ رہا ہوں کہ حضرت شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے جو ماننے والے ہیں ان پر تو شیخ کی یہ سیرت حجت ہی ہے اگر کسی کو اس میں سے کچھ حصہ نہیں ملا تو اسکو کچھ نہیں ملا اور وہ ناحق ماننے کا دم بھرتا ہے۔ بزرگوں کے یہ واقعات اس لئے بیان کر رہا ہوں تاکہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کلام سیرت اور آپ کے حال قلبی کا کچھ اندازہ ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ خوف اور خشیت کیا چیز ہے اور اللہ تعالیٰ سے بندوں کو کس طرح ڈرنا چاہیئے۔

اب لوگ ہم ہی سے آکر کہتے ہیں کہ بس قرآن کافی ہے۔ میں انھیں یہ جواب دیتا ہوں کہ ہاں بیشک کافی ہے مگر آپ نے اس کو کافی بنایا کب ہے؟ آخر اسی قرآن میں تو یہ بھی ہے کہ "یرجون رحمتہ ویخافون عذابہ" آپ نے صرف اس کا ترجمہ دیکھ لیا ہوگا مگر اس کے مصداق کو کب سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ تو معلوم ہوتا ہے بزرگوں کی سیرت سے اور میں یہ کہتا ہوں کہ کیا یہ خوف وغیرہ زبان کی صفت ہے یا قلب کا حال ہے۔ پھر آپ نے اسکی کتنی خدمت کی ہے۔ اور قلب کی جانب توجہ کرنے کی فرصت کہاں

آپ کو ملی ہے؟

اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دل کا کام بھی زبان سے لے لیں اور حال کی جگہ قال پیش کریں تو اس سے کام نہیں چلے گا۔ بزرگوں نے خود بھی حال پیدا کیا ہے اور پھر اسکو دوسروں میں منتقل فرمایا ہے اور کسی چیز کی اشاعت کا یہی طریقہ بھی ہوتا ہے یعنی جب بڑے یہ چاہتے ہیں کہ چھوٹوں سے کچھ کام کرائیں تو پہلے اسکو خود کرنے لگتے ہیں چنانچہ یہی مسنون بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ دعا فرمائی اللھم لا مانع لمن اعطیت ولا معطی لمن منعت۔ تو صحابہ نے بھی اس دعا کو سنا اسکی وجہ سے سب کے اندر یقین پیدا ہو گیا کہ بیشک مومن کا سب کام خدا کی ہی اعانت سے ہوتا ہے اسی طرح حضرت جیلانیؒ نے سب کے سامنے جو یہ عمل کیا تو اسی لئے کہ حاضرین اپنے اپنے یہاں جا کر اسکو نقل کریں اور تمام عابدین کیلئے شیخ کا یہ عمل تازیانہ کا کام کرے یعنی وہ یہ سمجھیں کہ جب اتنے بڑے کامل شیخ کی نظر اپنی طاعت پر نہیں ہے تو ہم لوگ بھلا کیا اپنی طاعت پر نظر کریں اور شیخ سعدی نے اس حکایت کو تو اپنی کتاب ہی میں لکھ دیا تاکہ ہر دور میں اس کا تذکرہ کم از کم لسان پر تو جاری رہے کیونکہ جب زبان پہ بار بار آتا رہیگا تو امید کی جاسکتی ہے کہ ایک نہ ایک دن قلب میں بھی اتر جائے ورنہ اگر کتاب ہی میں نہ ہوگا تو پھر زبان پر بھی نہ آسکے گا۔ بس جب تک دیکھنے والے موجود ہوں گے اس وقت تک تو چرچا رہے گا اور ان کے بعد ختم ہو جائے گا کیونکہ قاعدہ ہے کہ صلاح کی باتیں صالحین کی ذات ہی تک رہتی ہیں اور جب یہ لوگ نہیں رہ جاتے تو باتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں غرض شیخ حرم کعبہ میں جو اس طرح روئے تو حاضرین کے قلوب کو ہلا دیا اور اپنے اس ایک رونے سے نہ جانے کتنی مخلوق کو خالق سے ملا دیا۔ یہ واقعہ گو دیکھنے میں ایک چھوٹا سا واقعہ تھا مگر اثر کے لحاظ سے اس وقت کے سب لوگوں کو اور بعد میں بھی کتنے لوگوں کے لئے خدا تک پہونچنے کا ذریعہ بن گیا۔

آپ سے کہتا ہوں کہ جب یہ حال پیدا ہو جائے تو آپ کہیں بھی رہیں کچھ ڈر نہیں ہے۔ ہوائی جہاز میں اڑیں کہیں چلے جائیں کچھ مضائقہ نہیں لیکن جب تک قلب میں یہ کیفیت اور حال نہ پیدا ہو جائے آدمی کے الجھ جانے کے لئے ایک معمولی سا کانٹا بھی کافی ہے اور دنیا کی تو ہر چیز ہی کانٹا ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کسی کو اس سے محفوظ فرمالیں۔

اور میں نے یہ جو کہا کہ جب بڑے کوئی کام چھوٹوں سے لینا چاہتے ہیں تو پہلے خود اسے کرتے ہیں تاکہ اصاغر اکابر کی تقلید کریں کیونکہ دستور ہے کہ اصاغر اپنے اکابر کی تقلید کیا کرتے ہیں اور جب پیر ہی کسی کام کو نہیں کرتا تو مرید بھی نہیں کرتے بلکہ اسکی ذراسی غفلت کی وجہ سے دوسرے لوگ بہت دور جا پڑتے ہیں ہم نے خود دیکھا

کہ مدرسہ دیوبند کے دارالحدیث کی عمارت بن رہی تھی، بنیادیں کھودی جاچکی تھیں کہ اچانک اس قدر بارش ہوئی کہ ساری بنیادیں پانی بھر گیا جسکی وجہ سے دوسری عمارت کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا۔ حضرت مولانا دیوبندی تشریف رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت مہتمم صاحب نے آکر حضرت دیوبندی سے صورت حال عرض کی حضرت نے طلبہ سے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ خود برتن لے کر پانی میں گھس پڑے اور باہر پھینکنے لگے۔ آپ کی دیکھا دیکھی سب ہی طلبہ پانی میں گھس پڑے اور چند گھنٹوں میں سارا پانی باہر نکال کر پھینک دیا۔

بہر حال یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنے بڑوں کی تقلید کرتا ہے اچھی چیزوں میں بھی اور بری چیزوں میں بھی، چنانچہ مشہور ہی ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تواضع اور انکسار اختیار فرمایا تو حضرت زین العابدین نے بھی اسی کو اختیار فرمایا اور پھر حضرت جیلانی رح کے واقعہ میں بھی آپ نے اسے ملاحظہ فرمایا اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کا واقعہ سنئے۔ لوگ ان سے خفا تو ہیں لیکن دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا معاملہ کیسا درست کئے ہوئے تھے۔ عبداللہ سہمی روایت کرتے ہیں کہ ثمامہ بن کلثوم نے بیان کیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سب سے آخری جو خطبہ تھا وہ یہ تھا۔

> " فرمایا کہ اے لوگو میں اب تک تمہارا والی تھا اور یہ سمجھ لو کہ مجھ سے بہتر والی تمہیں اب نہیں ملے گا۔ آئندہ جو بھی والی ہوگا وہ بدتر ہی ہوگا۔ یہ فرما کر یزید سے مخاطب ہو کر کہا کہ سنو ! جب میری موت ہو جائے تو میرے غسل کا منتظم کسی سمجھدار شخص کو بنانا اور خزانہ شاہی کھول کر اس میں سے وہ رومال نکال لینا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کپڑا اور کچھ موئے مبارک اور چند ٹکڑے ناخن مبارک کے بندھے ہوئے رکھے ہیں۔ پھر ان ٹکڑوں کو میری ناک، منہ اور آنکھوں میں رکھدینا اور اس کپڑے کو میرے کفن کے اندر جسم سے ملاکر رکھدینا اور والدین کے متعلق اللہ تعالیٰ کی وصیت کو یاد رکھنا اور جب میرا جنازہ قبرستان لیجاکر قبر میں رکھ چکنا تو پھر معاویہ کو ارحم الراحمین کے سپرد کردینا۔

سبحان اللہ دیکھا آپ نے یہ ہیں حضرت معاویہ رض اور یہ ہے ان کی وصیت۔ زندگی میں بھی ان کی عجیب حالت رہتی تھی، جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرات شیخین رض کا دور یاد فرماتے تھے تو بہت روتے تھے یہ فرماتے تھے کہ معاویہ تو دنیا میں بالکل گھر کر رہ گیا ہے اور میں نے کسی کتاب میں یہ بھی دیکھا ہے کہ فرماتے تھے کہ اللہ ابوبکر رض پر رحم کرے وہ تو دنیا سے بالکل پاک وصاف تشریف لے گئے یعنی نہ انھوں نے دنیا کا قصد کیا اور نہ دنیا نے ہی ان کا قصد کیا۔ اسی طرح اللہ عمر رض پر رحم کرے کہ انھوں نے بھی دنیا کا قصد نہیں کیا لیکن دنیا

نے ان کا قصد کیا اور رہا معاویہ تو وہ تو دنیا میں بالکل لت پت ہی ہو گیا۔ یہ فرماتے اور زار و قطار روتے یہاں تک کہ آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔ آخر تھے تو حضور کے صحابی ہی۔ آپ کی تعلیمات اور آپ کی دعا کا اثر قبول کئے ہوئے تھے یعنی خوف و خشیت کی جو تفسیر حضور کے عمل سے دیکھی تھی اپنی سیرت میں بھی اسکو جاری فرمایا تھا۔ یہ تو خوف کا حال تھا جو ساری زندگی رہا لیکن آخری حالت میں رجا کو غالب کیا چنانچہ مقام رجا میں ہی یہ فرمایا تھا کہ قبر میں معاویہ کو ارحم الراحمین کے حوالہ کر دینا۔ مطلب یہ کہ وہاں کا معاملہ تو ارحم الراحمین ہی کے رحم و کرم سے طے ہوگا۔ عمل وغیرہ وہاں کچھ کام نہ بنا سکیں گے۔

غرض یہی تواضع اور انکسار۔ توبہ و انابت اور استغفار ہر زمانہ میں بزرگوں کا شعار رہا ہے چنانچہ شیخ سعدی نے گلستاں میں ایک باب ہی اخلاق درویشاں کا قائم فرمایا ہے اور اس میں بزرگوں کے ایسے ایسے واقعات لائے ہیں کہ سبحان اللہ کیا کہنا۔ طریق کو بالکل سمجھا دیا ہے اور بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعہ سے ولی کامل بنا دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ درویشے را دیدند کہ سر بر آستانہ کعبہ می مالید و می نالید۔ یعنی ایک درویش کو بزرگوں نے دیکھا کہ کعبہ کی چوکھٹ پر سر رگڑ رہا تھا اور رو رہا تھا و می گفت یا غفور یا رحیم تو دانی کہ از ظلوم و جہول چہ آید اور یہی کہتا تھا کہ اے غفور اے رحیم تو جانتا ہے کہ ظلوم و جہول سے کیا ہو سکتا ہے سوائے ظلم اور جہالت کے مطلب یہ کہ آپ نے تو خود ہی اپنے کلام میں انسان کو ظلوم و جہول فرمایا ہے تو میں بھی اسی کا ایک فرد ہوں اس لئے ظلم و جہالت میں مبتلا ہوں ؎

عذر تقصیر خدمت آوردم　　　کہ ندارم بہ طاعت استظہار

یعنی میں آپ کی خدمت میں اپنی کوتاہی کا عذر لے کر آیا ہوں اس لئے کہ طاعت کا تکیہ اور سہارا میرے پاس کچھ نہیں ہے ؎

عاصیاں از گناہ توبہ کنند　　　عارفاں از عبادت استغفار

جو گنہگار ہیں وہ تو اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور جو عارف ہیں وہ اپنی عبادت سے بھی استغفار کرتے ہیں۔ کیونکہ عارف ہونے کے سبب یہ سمجھتے ہیں کہ میری عبادت اس ذات کے شایان شان نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ عبادت ہی کیا ہوئی۔ گناہ ہوا۔

عابداں جزائے طاعت خواہند و بازرگانان بہائے بضاعت۔ جو عابد لوگ ہیں وہ تو اپنی طاعت کا بدلہ چاہتے ہیں اور جو سوداگر ہیں وہ اپنی پونجی کی قیمت چاہتے ہیں۔

من بندہ امید آوردہ ام نہ طاعت۔ بدریوزہ آمدہ ام نہ بہ تجارت مجھ غلام کے پاس کوئی طاعت نہیں ہے اس لئے امید لیکر حاضر ہوا ہوں۔ سائل اور بھکاری بنکر آیا ہوں تاجر بنکر نہیں۔ لہذا میرے ساتھ وہ

معاملہ فرمائیے جو آپ کے شایان شان ہے نہ وہ کہ جس کے ہم مستحق ہیں ؎

گر کشی در جرم بخشی روئے سر بر آستانم   بندہ را فرماں نہ باشد ہرچہ فرمائی بر آنم

یعنی آپ چاہیں تو مار ڈالیں یا میرا جرم بخش دیں میرا سر بہر حال آپ کے آستانہ پر ہے اور غلام کے لئے تو حکم چلانا ہوتا نہیں جو کچھ آپ کا حکم ہو گا میں اس پر راضی ہوں ؎

بر در کعبہ سائلے دیدم   کہ ہمی گفت و می گرستی خوش
من نہ گویم کہ طاعتم بپذیر   قلم عفو بر گناہم کش

میں نے کعبہ کے دروازہ پر ایک سائل کو دیکھا کہ یہی کہہ رہا تھا اور رو رہا تھا کہ میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ میری طاعت قبول فرمائیے بلکہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ معافی کا قلم میرے گناہوں پر کھینچ دیجئے۔

اور سنئے بزرگوں نے جب راستہ کا سراغ لگایا کہ طریق نام ہے تواضع کا اور فنا کا تو پھر اللہ کے بندوں نے اپنے کو ایسا ایسا مٹایا ہے کہ جسکی نظیر ملنی مشکل ہے۔ یعنی اس امر کے پیش نظر رکھنے کے بعد انھوں نے اپنے کو سب سے حقیر اور کمتر جانا ہے اور باوجود محفوظ ہونے کے اور کثرت طاعت کے خود کو گنہگار ہی سمجھا ہے۔

چنانچہ حضرت ذوالنون مصریؒ کا قصہ بوستاں میں مذکور ہے کہ ایک سال مصر کے دریائے نیل میں پانی نہیں تھا جسکی وجہ سے قحط کے آثار ظاہر ہوئے کچھ لوگ کہسار کی طرف بارش طلب کرنے کے لئے نکلے بہت روئے دھوئے مگر آسمان کو ان کے حال زار پر رونا نہ آیا یعنی بارش نہ ہوئی۔ حضرت ذوالنون مصری کو بھی مخلوق کی اس پریشانی کی اطلاع کی گئی اور عرض کیا گیا کہ آپ بھی اللہ تعالیٰ سے دعا فرما دیجئے کہ مقبول خدا ہیں اور مقبولین کی دعا رد نہیں ہوتی۔ شیخ لکھتے ہیں کہ میں نے سنا کہ یہ سن کر حضرت ذوالنون مدین کی طرف روانہ ہو گئے چنانچہ ان کا شہر مصر سے باہر نکلنا تھا کہ بارش شروع ہو گئی اور انہیں مدین پہنچکر اس کی اطلاع ہوئی کہ بارش ہو چکی ہے اور دریا پانی سے لبریز ہو گیا۔ کسی عارف نے ان سے تنہائی میں پوچھا کہ آپ کے مصر سے چلے جانے میں کیا راز تھا فرمایا کہ میں نے سنا تھا کہ قحط جو ہوتا ہے تو وہ برے لوگوں کے افعال بد کی وجہ سے ہوتا ہے اور میں نے جہانتک غور کیا اپنے سے زیادہ کسی کو اس بستی میں گنہگار نہ پایا۔ اس لئے میں ہی وہاں سے چلا گیا کہ خواہ مخواہ میری نحوست کا خمیازہ یہ لوگ کیوں بھگتیں۔ سبحان اللہ دیکھا آپ نے یہ ہے آپ کے اسلاف کی سیرت اور یہ وہی حضرت ذوالنون ہیں جن کی شکایت کسی نے بادشاہ وقت سے کر دی تھی۔ اس نے انھیں بلوا بھیجا۔ لیکن جب ان سے گفتگو کی تو

ان کے علم و فضل کا اُسے اندازہ ہوا۔ پھر بڑی عزت کے ساتھ پیش آیا اور یہ کہا کہ جس مجلس میں اولیاء اللہ کا ذکر کیا جاوے اور ذوالنون مصری کا ذکر نہ کیا جائے تو بڑے ظلم کی بات ہے۔

حضرت تھانویؒ سے کسی نے عرض کیا کہ حضرت ذوالنون مصریؒ نے یہ جو فرمایا یہ تو بظاہر خلاف معلوم ہوتا ہے حضرت نے فرمایا کہ شاید صحیح کہتے ہوں حضرت سے دریافت کرنے کی تو ہمت پڑی نہیں کہ آخر اس کا کیا مطلب ہے، مگر بعد میں سمجھ میں آگیا وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے معارف اور فضل و احسانات جو ان حضرات پر ہوتے ہیں اس کے مقابلہ میں باوجود طاعت وغیرہ کرنے کے یہ لوگ اپنے کو واقعی قصور وار ہی سمجھتے ہیں کیونکہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ توحید وہ دَین ہے کہ اس سے آدمی کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا بلاشبہ ان بزرگوں کا بڑا احسان ہے کہ راستہ کو بالکل واضح کردیا۔

ان واقعات کے سننے سے آپ کو بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انا البائس الفقیر کے ذریعہ جو تعلیم امت کو دی تھی امت نے اسے سیکھا اور اس امر میں بھی متبع سنت ہوئی اور آپ تو تھے معصوم پھر بھی جو اس طرح سے دعا مانگی تو مقصود اس سے یہی تھا کہ امت کو اعتراف ذنب کا طریقہ تعلیم فرمائیں چنانچہ اگر آپ عمل کرکے خود نہ بتلا دیتے اور محض قال پر اکتفا فرماتے تو کسی کو اس کا خاص طریقہ ہی نہ معلوم ہوتا مگر آپ کی تعلیم کے بعد اب سب کے لئے آسان ہوگیا۔ اور امت کو یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ اسی طرح طے کیا جاتا ہے ورنہ تو ہم لوگ اعتراف ذنب کی فضیلت سنتے لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ یہی کرتے کہ زبان سے کہہ لیتے کہ یا اللہ ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ مگر یہ بات کہ اعتراف میں قلب کا کیا حال ہونا چاہیئے اور طرز اعتراف کیا ہونا چاہیئے یہ سب کچھ سمجھ میں نہ آتا مگر جب آپ نے خود مناجات کرکے اعتراف ذنب کا طریقہ بتایا تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ امت کو خواہ عاصی ہو یا مطیع عابد ہو یا مذنب سبھی کو اعتراف ذنب کرنا چاہیئے اور یہ سب کے لئے لازم ہے اور اس میں انتہائی تضرع وزاری اور غایت مسکنت و انکساری ہونی چاہیئے اور یہ بھی سنت ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

پے نہ بردے ہیچ کس تا منزل حق الیقیں
گر نہ بودے ذات پاکت اندریں رہ مقتدا

اور اس میں شک نہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عملی تعلیم نہ فرماتے تو کسی کی سمجھ میں نہ آتا کیونکہ یہ مشکل چیز تھی بالخصوص عابدین کے لئے کہ کریں عبادت اور سمجھیں اپنے آپ کو مذنب یہ بہت مشکل تھا کسی فقیر اور محتاج کو خود کو محتاج سمجھنا آسان ہے مگر کسی مالدار کا اپنے آپ کو فقیر سمجھنا بہت

مشکل ہے۔ اسی طرح کسی گنہگار کا اپنے کو خطاکار سمجھنا نہایت آسان بات ہے مگر کسی عابد کا اپنے کو گنہگار سمجھنا اور اپنی عبادت سے صَرفِ نظر کر لینا آسان کام نہیں ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب کسی کو اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت ہی حاصل ہو جائے اور وہ یہ سمجھے کہ میری کوئی عبادت اللہ تعالیٰ کی جناب کے شایانِ شان نہیں یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہی اس کے شاملِ حال ہو جائے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کو چونکہ اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت ہوتی ہے اس لئے باوجود عبادت اور غایت قرب بلکہ عصمت کے بھی وہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا بیحد محتاج اور خود سراپا خطاکار ہی سمجھتے ہیں اور دوسروں کی تعلیم کے لئے اس طرح دعائیں کر کے اپنا عجز و انکسار اپنی مسکنت و افتقار کو ظاہر فرماتے ہیں چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے جو سچے جانشین ہوتے ہیں ان کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پورے مطیع ہوتے ہیں اور اپنا سارا وقت اسی کی طاعت اور رضا کے کاموں میں صرف کرتے ہیں (مگر اپنے کو قصوروار ہی سمجھتے رہتے ہیں) یہ بھی عجیب بات ہے کہ کام کرتے تو ہیں یہ حضرات جنت کا اور ڈرتے ہیں دوزخ سے اور جو لوگ کہ شب و روز معصیت میں منہمک رہتے ہیں انھیں دوزخ بھولکر بھی یاد نہیں آتی۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ منافق کہ جہنم میں جائے گا (اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ) مگر اس کو اس کا خطرہ تک نہیں گذرتا اور باوجودیکہ نفاق سے پُر ہوتا ہے۔ مگر اپنے اوپر نفاق کا شبہ تک نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے مؤمن نفاق سے بری ہوتا ہے۔ مگر ہر وقت وہ اپنے اوپر نفاق کا خوف ہی کرتا رہتا ہے

بہرحال حقیقی طاعت کا یہی اثر ہوتا ہے کہ انسان خود اپنے میں کوئی کمال نہیں دیکھتا۔ ورنہ تو اگر طاعت کے بعد تواضع فروتنی اور کسر و انکسار نہ پیدا ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کی عبادت میں اخلاص نہیں ہے جیسا کہ مجتہد فی العبادۃ کا حال اور انجام ابتداء مضمون کی حدیث میں آپ نے دیکھا۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہاں اس عابد سے جو کچھ کلام صادر ہوا تو وہ کبر کی بناء پر اور غضباً للنفس ہوا ورنہ تو اگر بغض فی اللہ کے سبب ہوتا تو اس کے ساتھ بھی اچھا ہی معاملہ ہوتا مگر چونکہ وہ مغرور بالعباد تھا۔ مذنب تائب کو حقیر سمجھنے والا تھا اس لئے سزا پا گیا۔ یہیں سے کہا گیا ہے کہ وہ معصیت جو انسان میں ذلت اور استصغار پیدا کرے اس طاعت سے کہیں بہتر ہے جو عُجب اور استکبار پیدا کرے۔

نیک لوگوں میں خواہ عالم ہوں یا عابد بس یہی روگ لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ ظاہری نیکی ہی ان کے لئے وبالِ جان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس علم و عبادت کا ایسا نشہ ہوتا ہے کہ اسکی وجہ سے آدمی نہ اپنی ہی رعایت کرتا ہے نہ دوسرے کی بلکہ اس کا ضرر لازمی بھی ہو جاتا ہے اور متعدی بھی۔ اسی کی تائید میں آپ کے سامنے حضرت سیدنا رفاعیؒ کا قول نقل کرتا ہوں جو اپنے وقت کے

درویش کامل تھے۔

فقہاء کے درجات قائم کر کے فرماتے ہیں کہ تیسرا درجہ اس شخص کا ہے جس نے مشکل مسائل کو حل کیا۔ منقولات و معقولات کی باریک باتیں معلوم کیں۔ مناظرہ کے دریاؤں میں گھس گیا اور ان تمام باتوں میں اس کی نیت یہ ہے کہ علم حاصل کر کے شریعت کی مدد کریگا مگر اس کے اندر غرور علم ہے۔ علم کی وجہ سے دوسروں کو اپنے سے کم سمجھتا ہے، جب کسی مسئلہ میں شریعت کی حمایت کو کھڑا ہوتا ہے اس وقت اگر کوئی اس کی دلیل پر اعتراض کر دے تو اپنے نفس کی حمایت میں ایسا مغلوب ہو جاتا ہے کہ حد سے نکل جاتا ہے اور مدمقابل کے خلاف دلیلیں قائم کرنے لگتا ہے اسکو برا کہنے لگتا ہے اور بعض اوقات اسکو کافر بنا دیتا ہے اس پر طعن کرنے لگتا ہے۔ اور ایسا حملہ کرتا ہے جیسا درندہ شکار پر حملہ کیا کرتا ہے۔ شریعت کے مقرر کردہ حد کی بالکل رعایت نہیں کرتا۔ نہ اپنے حالات میں نہ اس مدمقابل کے معاملات میں۔"

(انتہیٰ)

بس مجھے یہاں یہی دکھلانا ہے کہ ایسا شخص اپنی بھی رعایت نہیں کرتا اور نہ اپنے مدمقابل کی یعنی ضرر اس کا لازمی بھی ہوتا ہے اور متعدی بھی۔

حدیث میں جو واقعہ مذکور ہوا اسی نوع کا ایک واقعہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے بوستاں میں بھی لکھا ہے اس کو میں کچھ شرح کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں اور اس قسم کی باتیں وضاحت کے ساتھ اسلئے بیان کرتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اخلاق کسے کہتے ہیں اور بداخلاقی میں کیا نقصان ہے اور ہمارے اسلاف کس چیز کو دین سمجھتے تھے آج کل جیسا معاملہ نہیں تھا کہ لوگ صرف بزرگوں کے بدن پر گرنا چاہتے ہیں اور ان کی تعلیمات کی جانب اصلا التفات نہیں کرتے۔ یہ بوستاں ہے۔ شیخ نے اس میں حکایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عابد ناپارسا بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شنیدستم از راویانِ کلام ... کہ در عہد عیسیٰ علیہ السلام
یکے زندگانی تلف کردہ بود ... بجہل و ضلالت سر آوردہ بود
دلیرے سیہ نامۂ سخت دل ... ز ناپاکی ابلیس از وے خجل

اہل تاریخ سے میں نے سنا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ایک شخص تھا جس نے اپنی زندگی برباد کر رکھی تھی یعنی جہالت اور گمراہی میں تمام عمر گذار دی تھی جبری

بیباک، قاسی القلب اور اعمالنامہ اس کا بالکل سیاہ ایسا کہ اسکی ناپاکی کے آگے ابلیس بھی شرمندہ تھا۔ اس کے یہ اوصاف شیخ بیان کر رہے ہیں اور آگے دیکھئے گا کہ اسی نے میدان مار لیا اور ایسی پاکی میں آگیا کہ ابلیس اس کے حال کو دیکھ کر منہ کے بل گر گیا ہوگا اور اپنے پنجہ سے اس کے چھوٹ جانے پر ساری عمر رویا ہوگا۔ معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار کا ہے۔ اس شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف ایک بار اور وہ بھی دور سے دیکھا تھا اور اس کی یہ حالت ہوئی کہ کامیاب ہوگیا اور آگے آتا ہے کہ اس پارسا کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ جانے کتنی بار تشریف لائے ہونگے لیکن اس کا دوسرا ہی انجام ہوا اس کے بعد شیخ اس کی کچھ اور بدحالی بیان کر کے فرماتے ہیں کہ ؎

شنیدم کہ عیسیٰ درآمد ز دشت ... بمقصورۂ عابدے برگذشت
بزیر آمد از غرفہ خلوت نشیں ... بپائش در افتاد سر بر زمیں
گنہگار برگشتہ اختر ز دور ... چوں پروانہ حیران و ریشاں ز نور
تامل بحسرت کناں شرمسار ... چوں درویش در دست سرمایہ دار

میں نے سنا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنگل سے تشریف لا رہے تھے آپ کا گذر ایک عابد کے عبادت خانہ پر ہوا۔ آپ کو دیکھ کر عابد خلوت نشیں بالاخانہ سے نیچے آیا اور حضرت کے قدموں پر اپنا سر رکھدیا اور ادھر وہ بدنصیب گنہگار دور ہی سے ان دونوں کے معاملہ کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا جس طرح کہ پروانہ نور اور روشنی کو دیکھ کر بیتاب ہو جاتا ہے دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا اور حسرت کی نگاہوں سے ان کو اس طرح تکتا تھا جیسے کوئی غریب کسی امیر کے ہاتھ کو بہ نظر حسرت تک رہا ہو۔ پھر کچھ دور چل کر شیخ فرماتے ہیں کہ وہ زار و قطار رو رہا تھا اور یہ دعا کر رہا تھا ؎

گناہم بہ بخش اے جہاں آفریں ... کہ گر بامن آید فبئس القریں

یعنی اے پروردگار میرے گناہ کو بخش دے کیونکہ قیامت میں بھی اگر وہ گناہ میرے ساتھ رہا تو نہایت ہی برا ساتھی ہوگا۔ یہ تو اس گنہگار کا حال تھا۔ اب پارسا کا حال سنئے:۔

دریں گوشہ نالاں گنہگار پیر ... کہ فریاد حالم رس اے دستگیر
وزاں نیمہ عابد سر پُر غرور ... ترش کردہ بر فاسق ابروز دور
کہ ایں مدبر اندر پئے ما چرا است ... نگوں بخت ناداں چہ ہم جنس ماست

ادھر تو اس گوشہ میں بڈھا گنہگار رو رہا تھا اور کہتا تھا کہ اے خدا میری دستگیری فرما اور دوسری جانب وہ عابد جس کا سر غرور سے پُر تھا دور ہی سے اس گنہگار غریب کو دیکھ دیکھ کر چیں بجبیں ہو رہا تھا اور

کہتا تھا کہ یہ بدبخت ہمارے پیچھے کیوں لگا ہے۔ جاہل ہے۔ بدنصیب ہے ہم سے اسکو نسبت ہی کیا۔ ذرا آگے چل کر شیخ نے اس کا یہ مقولہ بھی نقل کیا جو اس نے انتہائی تکبر اور غرور میں کہا۔ کہتا تھا ؎

ہمی رنجم از طلعت ناخوشش مبادا کہ در من فتد آتشش

بہ محشر کہ حاضر شود انجمن خدایا تو با او مکن حشر من

یعنی میں اس کے بُرے دیدار سے اس لئے رنجیدہ ہوتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی آگ میں سے کچھ مجھ پر بھی پڑ جائے، ہوا اے خدا محشر کے روز جبکہ ساری دنیا حساب وکتاب کے لئے جمع ہوگی تو میرا حشر اس کے ساتھ نہ کیجیو۔

دیکھئے یہی وہ حالت ہے جس کے متعلق سیدنا رفاعیؒ نے فرمایا ہے کہ انسان کبھی نہ اپنی رعایت کرتا ہے نہ اپنے مقابل کی۔ یہاں بھی اس عابد ناپارسا نے نہ اپنی رعایت کی کیونکہ سر میں پندار رکھا اور گنہگار کی تحقیر کی اور نہ اس کی رعایت کی بلکہ جو منہ میں آیا کہا۔ ان سب کا رذائل ہونا ظاہر ہے۔ آگے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

دریں بُد کہ وحی از جلیل الصفات درآمد بعیسیٰ علیہ الصلاۃ

کہ گر عالم است آں وگر وے جہول مرا دعوتِ ہر دو آمد قبول

عفو کردم از وے عمل ہائے زشت درآرم بفضل خودش در بہشت

وگر عار دارد عبادت پرست کہ در خلد باوے بود ہم نشست

بگو ننگ از و در قیامت مدار کہ آنرا بجنت برند ایں بنار

کہ آنرا جگر خوں شد از سوز و درد گر ایں تکیہ بر طاعتِ خویش کرد

ندانست در بارگاہِ غنی کہ بے چارگی بہ نہ کبر و منی

یعنی وہ اپنے غرور ہی میں مست تھا کہ حق تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی آگئی کہ اگر یہ عالم ہے تو کیا اور وہ جاہل ہے تو کیا میں نے دونوں کی دعا قبول کرلی۔ وہ دعا یہ تھی ؎

گناہم بہ بخش اے جہاں آفریں کہ گر بامن آید فبئس القرین

اس گنہگار سے تو اس کے بُرے اعمال کو معاف کردیا اور محض اپنے فضل وکرم سے جنت میں داخل کردیا اور فرمایا ان عابد صاحب کو اگر اس بات سے عار ہے کہ اس کے ساتھ جنت میں رہیں تو ان سے کہدو کہ قیامت میں عار کا بالکل اندیشہ نہ کریں۔ اس کو جنت میں لیجائیں گے اور تم کو جہنم میں۔ اس لئے کہ اس غریب کا تو دل پارہ پارہ اور جگر بالکل خون ہوگیا ہے اور انہوں نے اپنی طاعت پر تکیہ کیا تھا۔ کیا یہ

اتنی بات بھی نہیں جانتے کہ غنی کے دربار میں بیچارگی ہی بھلی ہے کبر اور انانیت سے ؎

کرا جامہ پاک است و سیرت پلید ... در دوزخش را نیاید کلید
بریں آستاں عجز و مسکینیت ... بہ از طاعت و خویشتن بینیت
چوں خود را ز نیکاں شمردی بدی ... نمی گنجد اندر خدائی خودی
اگر مردی از مردی خود مگوئی ... نہ ہر شہ سوارے بدر بردہ گوئی
پیاز آمد آں بے ہنر جملہ پوست ... کہ پنداشت چوں پستہ مغزے در اوست
دریں نوع طاعت نیاید بکار ... برو عذر تقصیر طاعت بیار
نخورد از عبادت براں بے خرد ... کہ با حق نکو بود با خلق بد

(ترجمہ) جس شخص کا ظاہر اچھا ہے اور باطن خراب ہے اس کے لئے (دوزخ کے دروازے) پہلے سے کھلے ہوئے ہیں۔ دوزخ اس کے انتظار میں ہے (لہذا) دوزخ کا دروازہ کھولنے کے لئے کنجی کی حاجت نہیں ہے۔ اس درگاہ میں تو عاجزی اور مسکنت ہی چاہئے نہ کہ طاعت اور خود بینی۔ کیونکہ تو نے اگر اپنے کو پارسا گمان کیا تو نہایت برا ہے اس لئے کہ خدائی کے اندر خودی کا گذر نہیں۔ اگر تم عقلمند ہو تو اپنی بڑائی مت ہانکو اس لئے کہ ہر شہسوار کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جولان گاہ میں گیند آگے لیجائے۔

جو شخص اپنے متعلق یہ خیال کرے کہ وہ مانند پستہ کے مغز ہی مغز ہے تو جان لو کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ ایسا شخص مہمل ہے اور مانند پیاز کے ہے تہ بہ تہ چھلکا ہی چھلکا ہے۔ اس قسم کی عبادت (جس کے بعد عجب پیدا ہو جائے) کچھ کام نہیں آتی بلکہ دراصل طاعت کرکے اپنی تقصیر کی معذرت پیش کرنی چاہیئے (تاکہ کچھ کام دے جائے) دیکھو وہ عابد اسی حقیقت سے بے خبر تھا اس لئے اپنی عبادت کے ثمرات نہ پاسکا کیونکہ حق تعالیٰ کے ساتھ اس کا معاملہ درست تھا (کہ عابد تھا) مگر مخلوق کے ساتھ برا تھا (کہ کبر میں مبتلا تھا) آگے شیخ بطور تنبیہ کے فرماتے ہیں ؎

سخن ماند از عاقلاں یادگار ... ز سعدی ہمیں یک سخن یاد دار
گنہ گار اندیشہ ناک از خدائے ... بہ از پارسائے عبادت نمائے

(ترجمہ) قاعدہ ہے کہ عاقلوں کی باتیں یاد رکھی جاتی ہیں لہذا تم بھی سعدی سے یہی ایک بات یاد رکھ لو کہ جس گنہگار کو خوف خدا ہو اور وہ اپنے معاصی کی وجہ سے لرزاں اور ترساں ہو اور مغفرت کے باب میں صرف خدا پر اس کی نظر ہو (وہ عاصی) اس پارسا سے بہتر ہے جس کو اپنی

عبادت پر ناز ہو اور اس وجہ سے خوفِ خدا اس کو نہ ہو۔

میں نے یہ پورا واقعہ جو آپ کو سنایا تو مقصد اس سے یہی اس کا آخری شعر تھا کہ ؎

گنہگار اندیشناک از خدائے   بہ از پارسائے عبادت نمائے

اس کے متعلق کچھ تفصیل سے کہنا چاہتا ہوں سنئے۔

شیخ سعدیؒ مقابلہ فرماتے ہیں کہ یہ عبادت پرست ایسا ہے کہ سلوک کو تو اس سے زیادہ اس گنہگار نے سمجھا کیونکہ عبادت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ کی معرفت ہو اور معصیت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ سے دور کر دیتی ہے۔ چونکہ اس پارسا کی عبادت ریائی تھی اور اس نے اس کے اندر کبر شامل کر لیا تھا۔ اس لئے یہ عبادت بھی خدا سے بُعد کا ذریعہ بن گئی۔ اور اس گنہگار نے چونکہ حق تعالیٰ کا خوف کیا اور خدا کی پکڑ سے ڈرا اپنے گناہوں پر نادم ہوا اور حق تعالیٰ کے سامنے رویا۔ ان سب آثار نے اسکو حق تعالیٰ سے قریب کر دیا۔ عبادت کرنے کے بعد اگر عبادت پر نظر ہو اور خود پسندی پیدا ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ شخص عبادت پرست ہے۔ خدا پرست نہیں۔ عابد پارسا نہیں ہے بلکہ عابد ناپارسا ہے اور ان صفات میں اولادِ آدم میں سے ہونے کے باوجود ابلیس کا متبع ہے کیونکہ طاعت میں ریا اور کبر ابلیس کی صفت ہے۔ اول بانی ریا و کبر کا ابلیس ہے اور اول العابدین انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور سب سے بڑی صفت ان میں تواضع اور خلوص ہوتی ہے۔ اب عابدین میں جو ریا اور کبر ہوتا ہے وہ ابلیس کے اغواء سے ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ دشوار گذار گھاٹی ہوتی ہے عابدین کے لئے۔ اس سے مفر کی کوئی صورت نہیں بجز اس کے کہ انبیاء کی سچی پیروی ان کے اخلاق وعادات میں، ریاضات و مجاہدات میں اختیار کی جائے۔ یہی مطلب ہے اس شعر کا ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز بر پئے مصطفٰے

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اور ابلیس چونکہ اپنے ریا و کبر اور حسد کی بنا پر مردود بارگاہ ایزدی ہوا تھا اس لئے اولادِ آدم کو اغواء کرتا ہے اور ان میں یہ صفات بد پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ جو میں نے کہا کہ ریا اور کبر کا بانی ابلیس ہے تو اس کے متعلق سنئے۔

تکبر کے بارے میں تو نص ہی ہے کہ ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین اور ریا کے بارے میں سنئے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ جنات چند ہزار سال سے زمین میں متصرف تھے اور آسمان پر بھی جاتے تھے۔ جب ان کا فساد اور خوں ریزی بڑھی تو ملائکہ نے

بحکم الٰہی بعض کو قتل کیا اور بعض کو جنگل پہاڑ اور جزائر میں منتشر کر دیا۔ ابلیس ان میں بڑا عالم اور عابد تھا۔ اس نے جنات کے فساد سے اپنی بے بوثی ظاہر کی۔ فرشتوں کی صفائی سے یہ بچ گیا اور انھیں میں رہنے لگا۔ اور اس طمع میں کہ تمام جنات کی جگہ اب صرف میں تمام روئے زمین پر متصرف بنایا جاؤں۔ عبادت میں بہت کوشش کرتا رہا اور خلافت ارض کا خیال پکاتا رہا۔ جب حکم الٰہی حضرت آدم کی نسبت خلافت کا ظاہر ہوا تو ابلیس مایوس ہوا اور اپنی عبادت ریائی کے رائگاں جانے پر جوش حسد میں سب کچھ کیا اور ملعون ہوا۔ اسی واقعہ کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

صد ہزاراں سال ابلیس لعیں | بود ز ابدال و امیر المومنین
پنجہ زد با آدمے نازے کہ داشت | گشت رسوا ہم چو سرگیں وقت چاشت
پنجہ با مرداں مزن اے بوالہوس | بر تر از سلطان چہ می رانی فرس

یعنی لاکھوں سال ابلیس لعین بزرگ اور افضل اہل ایمان رہا حتیٰ کہ ناز و عجب میں آکر حضرت آدم کا مخالف اور مقابل بن بیٹھا۔ اور ایسا رسوا ہوا جیسے تیز دھوپ کے وقت گوبر۔ واقعی مردانِ خدا کا مقابلہ و دعویٰ مساوات کبھی نہ کرنا۔ بھلا بادشاہ سے آگے گھوڑا چلانا کیا زیبا ہے۔ اسی طرح یہ حضرات بوجہ قرب و قبول مثل بادشاہ کے ہیں۔ ان سے سبقت کا دعویٰ خسران محض ہے۔

اسی طرح حسد کا بانی بھی ابلیس ہے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ور حسد گیرد ترا در رہ گلو | در حسد ابلیس را باشد غلو
کو ز آدم ننگ دارد از حسد | با سعادت جنگ دارد از حسد
عقبۂ زیں صعب تر در راہ نیست | اے خنک آنکس حسد ہمراہ نیست

یعنی اگر راہ حق میں حسد تیرا گلوگیر ہو جائے تو سمجھ لے کہ حسد طریقہ ابلیس کا ہے اور وہ اس صفت میں کمال رکھتا ہے کہ اسکو آدم علیہ السلام سے بوجہ حسد ہی کے عار ہوا تھا اور واقع میں اس حسد کی بدولت اپنی ہی منفعت اور سعادت سے مخالفت کرتا تھا۔ اس راہ سلوک میں بھی حسد سے بڑھ کر کوئی امر مانع نہیں کہ اس کے سبب سے ناقصین کمال حاصل کرنے سے رہ گئے۔ کامل کا اتباع کرنے کو خلاف شان سمجھا بالخصوص اپنے شیخ کے خلیفہ سے کہ وہ اپنا پیر بھائی ہوتا ہے رجوع کرنا تو غالب طبائع کے خلاف ہوتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم بوجہ پیر بھائی ہونے کے مساوات کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ پھر اس سے کس طرح التجا کریں اور تکمیل بدون کسی کامل کی اتباع کے ممکن نہیں۔ وہ شخص بڑا خوشحال ہے جس کے پاس حسد نہیں ہے۔

دیکھئے جس طرح یہاں شیطان کو آدم علیہ السلام سے عار ہوا وہی عار اس عبادت پرست کو بھی گنہگار سے ہوا تھا اسی لئے میں نے کہا کہ یہ شخص اپنی ان تمام صفات میں ابلیس کا پیرو ہے۔ اور وہ گنہگار حضرت آدم علیہ السلام کے نقش قدم پر چلا کیونکہ خطا آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی تھی مگر انھوں نے اس کے بعد کس قدر ندامت اور شرمساری کا ثبوت دیا۔

صاحب روح المعانی نے بھی ابلیس کے قصہ کی تفسیر کرتے ہوئے نہایت ہی عمدہ اور خوب کلام فرمایا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس موقعہ پر اسکو بھی بیان کردوں۔

فرماتے ہیں کہ :۔

ثم الظاهر ان كفره عن جهل بان استرد سبحانه تعالى منه ما اعار من العلم الذى كان مرتديا به حين كان طاؤس الملائكة و اظافير القضا اذا حكت ادمت وقسى القدر اذا رمت اصمت ؎

وكان سراج الوصل ازهر بيننا
فهبت به الريح من البين فانطفى

ظاہر تو یہی ہے کہ ابلیس کے کفر کا منشا اس کا جہل ہوا جس کی صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ علم اس کو مرحمت فرمایا تھا جسے وہ چادر بنائے ہوئے تھا جب کہ فرشتوں کے درمیان طاؤس بنکر رہتا تھا۔ وہ علم اس سے سلب فرمالیا اور قضا کے ناخن جب گڑائے جاتے ہیں تو زخمی بنا دیتے ہیں۔ اور قدر کی کمان جب تیراندازی کرتی ہے تو بہرا بنا دیتی ہے۔ شیطان زبان حال سے کہتا تھا کہ ؎ وصل کا چراغ ہمارے اور ہمارے محبوب کے درمیان روشن تھا کہ اچانک فراق کی ہوا چلی اور وہ بجھ گیا۔

وقيل عناد حمله عليه حب الرياسة والاعجاب بما اوتى من النفاسة ولم يدر المسكين انه لو امتثل ارتفع قدره وسما بين الملاء الاعلى فخره ولكن ؎

اذا لم يكن عونا من الله للفتى
فاول ما يجنى عليه اجتهاده

ایک قول یہ ہے کہ اس کے کفر کا سبب اس کا عناد بنا تھا جس پر حب جاہ اور جس شرف سے مشرف تھا اس پر اعجاب نے اس کو ابھارا تھا اور مسکین نے یہ بھی نہ جانا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کا امتثال کرلیتا تو اس کی قدر اور بڑھ جاتی اور عالی مرتبت ملائکہ میں اس کا شہرہ اور بلند ہو جاتا لیکن بات یہ ہے کہ جب کسی شخص کے شامل حال اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوتی تو اول وہ چیز جو اسکو نقصان پہونچاتی ہے وہ خود اس کا اجتہاد ہوتا ہے (یعنی اسکی فہم ماری جاتی ہے)

آگے فرماتے ہیں کہ :۔

وکم ارقت ھٰذا القصۃ جفوننا و
ارقت من العیون عیوننا۔ فان ابلیس
کان منذ فی دلال طاعتہ یختال فی
رداء مرافقتہ ثم صار الی ما تریٰ
واجریٰ مابہ القلم جریٰ ؎
وکنا ولیلیٰ فی صعود من الھویٰ
فلما توافینا ثبتُّ و زلت

(روح المعانی صـ۲۱۳ ج۱)

اور اس واقعہ نے نہ جانے کتنی آنکھوں سے ہمیشہ ہمیش کیلئے نیند ہی کو اڑا دیا اور ان کے لئے پلک جھپکانے کو حرام کردیا اور نہ معلوم کتنی چشم ہیں جنھوں نے اس قصہ کو سنکر چشمے جاری کر دیئے اس لئے کہ شیطان ایک زمانہ تک اپنی طاعت کے غرور و ناز میں تھا اور حق تعالیٰ کے تعلق کی چادر میں اتراتا پھرتا تھا لیکن اس کے بعد اس کا جو حشر ہوا وہ تم کو معلوم ہی ہے۔ تقدیر کا لکھا سامنے آیا اور اس کا مصداق ہوگیا کہ :-

ہم اور لیلیٰ عشق و محبت کے پہاڑ پر چڑھے چلے جارہے تھے پس جس وقت کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے ہی رہے تھے میں تو ثابت رہا اور وہ پھسل گئی

ابلیس کا یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ یہی سب سے پہلا قصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بیان فرمایا ہے اس لئے اس میں بڑی ہدایت رکھی ہے اور اللہ کے بہت سے بندوں نے اس قصہ سے ہدایت حاصل کی ہے۔ جیساکہ صاحب روح المعانی نے لکھاہے کہ نہ معلوم کتنی آنکھوں سے اس واقعہ نے نیند کو اڑا دیا اور نہ معلوم کتنی آنکھوں نے اسکی وجہ سے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے لیکن یہ سب اسی وقت تھا جب قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھا پڑھایا جاتا تھا۔ اب ہم لوگ بھی ان آیات پر سے گذرتے ہیں مگر ذرا قلب میں حرکت نہیں پیدا ہوتی حالانکہ کبر و عجب جیسے رذائل کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ ابلیس عجب و پندار میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوگیا اور حضرت سیدنا آدم علیہ السلام نے توبہ و انابت کی تو قصور معاف ہوگیا اور مقبول و محبوب ہو گئے۔

(احقر جامع عرض کرتا ہے کہ اگر انسان یہی خیال کرلے کہ میں آدم زادہ ہوں اور حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کی صفت تواضع اور اعتراف ذنب تھی اور تکبر و انانیت تو شیطان کی صفت ہے لہذا مجھے اپنے باپ کی صفت اختیار کرنی چاہیئے نہ کہ ان کے دشمن کی۔ یہ تو غیرت کے بھی خلاف ہے یہ مراقبہ پیش نظر رکھے تو امید ہے کہ ان رذائل سے بچنا اس کے لئے بہت کچھ آسان ہو جائیگا اس لئے کہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کے طریقہ پر رہنا پسند کرتا ہے۔ شر میں تو آدمی اسی اصول کو مضبوطی سے پکڑے رہتا ہے مگر خدا معلوم کہ خیر میں اس کا یہ جذبہ کیوں سرد پڑجاتا ہے۔)

الاعتراف والاستغفار من الذنوب من اعظم سنن النبی الکریم

(گناہوں سے استغفار اور اس کا اعتراف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ترین سنت ہے)

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی ابلیس اور آدم کے اس واقعہ کے سلسلہ میں خاقانی کے کچھ اشعار پڑھا کرتے تھے جس سے لوگوں کو بڑا ہی لطف آتا تھا اور مجمع جھوم جاتا تھا۔ حضرت یہ پڑھتے تھے کہ ؎

ابلیس گفت طاعت من بیکرانہ بود	سیمرغ وصل را دل و جاں آشیانہ بود
آدم ز خاک بود و من از نور پاک او	گفتم کہ من یگانہ و او خود یگانہ بود
در لوح بُد نوشتہ کہ ملعون شود یکے	بردم گماں بہ ہرکس و برخود گماں بود
او خواست تا فسانۂ لعنت کند مرا	کرد آنچہ خواست آدم خاکی بہانہ بود
خاقانیا تو تکیہ بر طاعات خود مکن	کیں پند بہر دانش اہل زمانہ بود

ابلیس نے کہا کہ میری طاعات کثیر تھیں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے میرے دل و جان سے زیادہ قریب تھے۔ آدم تو مٹی سے بنائے گئے تھے اور میری تخلیق حق تعالیٰ کے نور سے ہوئی تھی اور میں اپنے ہی کو یگانہ سمجھتا تھا لیکن واقعہ یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام ہی یگانہ اور مقرب تھے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ یگانہ تھے اپنی توحید میں اور افسوس کہ لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ایک ذات ملعون ہوگی مگر میں نے ہر ایک کو اس کا مصداق گمان کیا مگر اپنی طرف خیال نہیں گیا اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ مجھے لعنت کا فسانہ بنا دیں چنانچہ بنا دیا باقی آدم خاکی کا واقعہ تو بس ایک بہانہ ہی تھا۔ اے خاقانی خبردار تم اپنی طاعت پر کبھی تکیہ نہ کرنا کیونکہ ابلیس کا یہ واقعہ اہل دنیا کی عبرت ہی کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔

دیکھئے اس سے بھی معلوم ہوا کہ طاعات پر تکیہ کرنا اور اس پر نظر کرنا یہ صفت ابلیس کی تھی جیسا کہ یہاں اس عابد نا پارسا نے کیا اور اپنے کو پارسا سمجھا اور دوسرے کو بہ نظر تحقیر دیکھنا یہ شیطان کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ جو ذات کہ ملعون ہوگی وہ میں نہیں ہوں بلکہ انسان اور فرشتوں ہی میں سے کوئی ہوگا حالانکہ خود ہی ہونے والا تھا اور اپنے سے بے خوف تھا اور فرشتے جو کہ اس سے محفوظ تھے ان میں سے ہر ہر فرد اپنے ہی متعلق یہ اندیشہ رکھتا تھا کہ کہیں

وہ بس ہی نہ ہوں۔

بالکل یہی حال یہاں اس عابد ناپارسا اور گنہ گار اندیشہ ناک کا تھا کہ عابد کو گرفت کا مطلق خوف نہیں تھا بلکہ وہ اسکی جانب سے مطمئن تھا اور گنہگار کو مواخذہ خداوندی کا خوف تھا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اسی واقعہ کو بیان کر کے عابدین کا ناز ہی ختم کر دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ واقعی مربی ہیں کیونکہ بزرگوں کا یہی کام ہے کہ وہ لوگوں کی تربیت کریں اور جس جانب سے گمراہی کو آتا دیکھیں اس پر تنبیہ کریں۔

یہاں ایک اور بات یہ سمجھ لیجئے کہ شیخ سعدیؒ عاصی جری اور بیباک کا حکم نہیں بیان فرما رہے ہیں۔ چنانچہ گنہگار کی صفت یہاں اندیشناک بیان کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس گنہگار کو اپنے گناہ پر اندیشہ نہ ہو اس کا دوسرا حکم ہے۔ جیسا کہ ایک شخص کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ مرتے وقت اس نے اپنے محبوب مجازی کو مخاطب کر کے یہ کہا کہ اے محبوب تیری رضا معبود جلیل کی رضا سے مقدم ہے۔ توبہ توبہ یہ تو صریح کفر ہے۔ اسی طرح سے ایک شخص مرتے وقت یہی کہہ رہا تھا کہ یہ کپڑا چار روپیہ گز اور یہ کپڑا تین روپیہ گز ہے "انا للّٰہ" تو اس کا ذکر نہیں بلکہ گفتگو اندیشہ کرنے والے گنہگار کی ہے۔ کیونکہ جب اسکو اندیشہ ہے تو خوف ہے اور جب خوف ہے تو ایمان ہے اور جب ایمان ہے تو نجات بھی ہے۔ تو اسکی یہ نجات دراصل اسکے ایمان کی وجہ سے ہوئی اور عابد ناپارسا کے ایمان میں یہی کسر تھی، جبھی تو وہ ریاکار اور منکر ہوا۔ چونکہ اس نے عبادت مخلوق کے دکھانے کے لئے کی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذرا سا بھی حصہ اسکو نہیں ملا۔ کیونکہ اگر معرفت ہوتی تو اس قسم کی ڈینگ سے اس کو باز رکھتی۔ اہل معرفت کے پیش نظر تو حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہوتا ہے کہ وَ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ یعنی ظالمین کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس کروٹ ان کو سونا ہے۔ بزرگان دین پر یہ آیت نہایت سخت ہوئی ہے اسکی وجہ سے ان کا پتہ پانی ہو گیا ہے۔ اگر اس عابد کو طاعت سے کچھ بھی فیض ہوا ہوتا تو ایسی بات زبان سے نہ نکالتا کہ اس کو مدبر کہا اور یہ کہدیا کہ

ع خدایا تو با او مکن حشر من

تو دیکھئے شیخ کے بیان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مطلق گنہگار کو مطلق عابد سے نہیں بڑھا رہے ہیں بلکہ یہاں وہ گنہگار مراد ہے جس نے خدا کا خوف کیا تواضع اختیار کی۔ اپنے گناہوں پر نادم اور شرمسار ہوا۔ آخرت کا یقین کیا اور نہایت ہی خلوص کے ساتھ حق تعالیٰ سے دعا کی جو قبول ہو گئی۔ اس لئے اس کی مغفرت ہو گئی اور عابد سے وہ عابد مراد ہے جس نے ریا اور تکبر اختیار کیا اور عبادت نے اس کے نفس میں ذرا بھی تواضع اور جھکاؤ نہیں پیدا کیا تو ایسے گنہ گار کو ایسے عابد پر

شیخ بڑھا رہے ہیں ورنہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ کفرؔ دون کفر ہوتا ہے اور معصیۃؔ دون معصیۃ ہوتی ہے یعنی گناہ گناہ میں فرق ہوتا ہے چنانچہ بعضے گناہ ایسے ہیں کہ ان کا انجام جہنم ہی ہے۔ شیخ اس کی فضیلت نہیں بیان کر رہے ہیں کیونکہ یہ نص کے بھی خلاف ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ○

آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن و کافر اور اسی طرح سے مومن عاصی (نافرمان) اور مومن طائع (فرمانبردار) برابر نہیں یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ کلبی سے روایت ہے کہ عتبہ وشیبہ وولید بن عتبہ۔ ان سب نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت حمزہؓ اور دوسرے مومنین سے کہا کہ واللہ ما انتم علی شیٔ ولئن کان ما تقولون حقا لحالنا افضل من حالکم فی الآخرۃ کما ھو افضل فی الدنیا فنزلت الآیۃ ام حسب الذین اجترحوا السیئات الآیۃ

یعنی عتبہ وشیبہ اور ولید نے حضرت علیؓ وحضرت حمزہؓ اور دوسرے مسلمانوں سے بربنائے غایت کبر کے یہ کہا کہ تمھارا دین کچھ نہیں۔ آخرت وغیرہ کچھ نہیں اور اگر بالفرض تمھاری ہی بات صحیح ہوئی یعنی مرنے کے بعد پھر زندگی ہوگئی تو آخرت میں بھی ہمارا حال تم لوگوں کے حال سے اچھا ہوگا۔ جیسا کہ آج دنیا میں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس کے بعد صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ یستنبط منھا بتباین حالی المومن العاصی والمومن الطائع فرماتے ہیں کہ یہ آیت اگرچہ کفار کے بارے میں نازل ہوئی یعنی مومن اور کافر برابر نہیں تاہم اس سے مومن عاصی اور مومن طائع کا حکم بھی معلوم کیا جا سکتا ہے یعنی یہ دونوں بھی برابر نہیں اور اس کے بعد فرماتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے عُباد کو دیکھا گیا ہے کہ اس آیت کی تلاوت کے وقت روتے تھے یہاں تک کہ اس آیت کا نام ہی مبکاۃ العابدین (یعنی عابدین کو رلانے والی آیت) پڑ گیا۔ روایت میں ہے کہ حضرت تمیم داری نے سورہ جاثیہ کی تلاوت کی۔ جب اس آیت پر پہونچے تو اس کو دہراتے رہے اور روتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اور وہ مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی طرح سے بشیر جو ربیع بن خیثم کے مولیٰ ہیں بیان کرتے ہیں کہ ربیع نماز پڑھ رہے تھے اور اس آیت پر سے گزرے پس صبح تک اسی کو بار بار دہراتے رہے۔ حضرت فضیل ابن عیاض اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتے تھے جب اس آیت پر سے گزرتے تھے کہ اے نفس کاش کہ تو یہ جان لیتا کہ ان دو فریقوں میں سے تو کس میں سے ہے۔ آیت میں علاوہ ایمان وکفر کے مقابلہ کے چونکہ یہ بھی احتمال ہے کہ صالحین اور طالحین کا باہم مقابلہ

ہوا اسی لئے بزرگان دین اسکی تلاوت کے وقت روتے تھے۔ صاحب روح المعانی آگے فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سے مغرورین کو (جوکہ شب و روز فسق و فجور میں مبتلا رہتے ہیں) زبان قال و زبان حال سے یہ کہتے سنا ہے کہ ہم قیامت کے دن بہت سے عابدین سے اچھے ہی رہیں گے۔ یہ انکی صریح گمراہی اور نفس کا بھلاوا ہے اس زمانہ میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے اب اس قسم کی آیات کو تلاوت کرکے رونا اور اللہ تعالیٰ سے خوف کرنا یہ سب تو ختم ہوگیا بس یہ رہ گیا ہے کہ جہاں کوئی عالم ہوا اور اس نے کچھ دین کا کام کرنا شروع کیا تو دیکھا جاتا ہے کہ ہر محفل اور ہر ہوٹل میں اسی کی غیبت شکایت اور اسی کا برائی سے تذکرہ رہتا ہے۔ دراصل ابلیس ایسے لوگوں کی طرف سے سوءظن پیدا کرادیتا ہے تاکہ لوگ دین ہی نہ سیکھ سکیں اور اس میں اپنا معین بہت سے شیاطین الانس کو بنالیتا ہے جو ایمان کے حق میں رہزن ہوتے ہیں۔ اب ان چوروں اور ڈاکوؤں کو کوئی کہنے والا نہیں یہ باتیں میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ مگر کسی سے آپ سنئے گا بھی نہیں کس قدر ستم کی بات ہے کہ عابدین تو اس کی وجہ سے رو رہے ہیں اور فاسقین کا کل وقت دینداروں کی برائی کرنے اور ان پر قہقہہ لگانے میں صرف ہورہا ہے آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں یعنی ان دو جماعتوں کو جو لوگ برابر سمجھ رہے ہیں تو یہ فیصلہ ان کا صحیح نہیں عاصی اور طائع دونوں کیسے برابر ہوسکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے یہ فرماکر نیک لوگوں کا آنسو پونچھا ہے ورنہ تو یہ فاسق لوگ عابدین کو اُڑا ہی دیتے بیشک اللہ تعالیٰ ہی اپنی قوت سے ان کو دنیا میں رکھتے ہیں ورنہ تو دوسرے قسم کے لوگ ان حضرات کے اکھاڑنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ نیک لوگوں کے لئے دنیا میں بڑی مشکلات ہیں۔ کمبخت کافر تو توہین کرتے ہی ہیں فاسق لوگ بھی انہی کی راہ چلنے لگتے ہیں۔ اس آیت میں نہایت ہی تعزیت اور تسلی ہے اللہ والوں کو چنانچہ حق تعالیٰ کی اسی عنایت کے تصوّر سے ان حضرات کو مزا آجاتا تھا اور رات رات بھر اسی کی لذت میں گزار دیتے تھے غرض ان مغرورین کا اپنے کو صالحین سے بہتر تبلانا نص کے بالکل خلاف ہے مگر یہ لوگ نص کو کیا جانیں انکی نص تو ان کا نفس ہے اللہ تعالیٰ تو ارشاد فرماتے ہیں کہ دونوں برابر نہ ہوں گے۔ اب اگر یہاں لوگ اپنے فسق و فجور کی وجہ سے صالحین پر غالب نظر آئیں اور قیامت میں بھی ان مجرمین ہی کا حال افضل ہو تو پھر تو قیامت کے کوئی معنیٰ ہی نہ ہوئے۔

دیکھئے جب یہ امر منصوص ہے کہ اہل طاعت اور اہل معصیت یہ دونوں برابر نہیں تو ظاہر ہے کہ شیخ سعدی رح بھی مطلقاً گنہ گار کو اہل طاعت پر کیسے فضیلت دے سکتے ہیں شیخ نے یہاں جو عاصی اور عابد کا مقابلہ کیا اور عاصی کی تعریف کی تو یہ دوسری ہی بات تھی وہ یہ کہ یہاں معصیت

کے ساتھ خوف بھی تھا جو کہ ایک قلبی عمل اور باطنی طاعت ہے اسکی وجہ سے اسکی نجات ہوگئی اور اس عابد میں عبادت کے ساتھ ساتھ کبر و ناز پیدا ہوگیا تھا۔ اس چیز نے اس کا بیڑا غرق کردیا تو دراصل شیخ نے یہاں خوف و خشیت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر نظر وغیرہ جیسی طاعات کی مدح فرمائی ہے اور کبر و عجب و ریا جیسی برائی کی مذمت کی ہے۔ عابد کی عبادت بری نہ تھی مگر اس کا کبر یقیناً برا تھا کیونکہ اس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ لا تدخل الجنته من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر (مشکوٰۃ ص۴۳۱) اور ظاہر ہے کہ کبر شیطان کی صفت ہے اس لئے کہ وہ بھی بہت عبادت گزار تھا لیکن اپنے اس رذیلہ کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام سے بگڑ گیا اور اسکی وجہ سے رسوا ہوا۔

مولانا رومؒ نے مثنوی میں اسی کبر و ناز کی تباہی کا ایک اور واقعہ بیان کیا ہے اور وہ قصہ ہے بلعم باعور کا جو کہ بہت عابد و زاہد شخص تھا مستجاب الدعوات تھا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخالف ہوگیا اور ان کے ساتھ مقابلہ کر بیٹھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بزرگی تو کیا باقی رہتی ایمان بھی سلب ہوگیا۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

بلعم باعور را خلق جہاں　　سغبہ شد مانند عیسیٰ زماں
سجدہ ناوردند کس را دون او　　صحت رنجور بود افسون او
پنجہ زد با موسیٰ از کبر و کمال　　آن چناں شد کہ شنیدستی تو حال

دیکھو بلعم باعور کے تمام لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح فریفتہ اور معتقد تھے اور اسکی سی تعظیم کسی کی نہ کرتے تھے اور بیمار اس کی جھاڑ پھونک سے صحت پاتے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جب مخالفت کی تو وہ حال ہوا جو تم نے کسی عالم سے سنا ہوگا (کہ ایمان بھی سلب ہوگیا اور ظاہراً بھی ذلیل و خوار ہوگیا) پس مخالفت اہل اللہ کی ایسی وبال کی چیز ہے آگے فرماتے ہیں کہ اس مخالفت پر کچھ ایک ہی دو کو سزا نہیں ہوئی بلکہ ؎

صد ہزار ابلیس و بلعم در جہاں　　ہم چنیں بودست پیدا و نہاں
ایں دو را مشہور گردانید الہ　　تاکہ باشد ایں دو بر باقی گواہ
رہزناں را در بیاباں چوں کشند　　یک دو تن را سوئے دہ زیں شاں کشند
تا ببینند اہل دہ گیرند پند　　رویت ایشاں بود شاں ہم چو بند

لاکھوں ابلیس اور بلعم کی مثل دنیا میں ہو چکے ہیں کچھ مشہور اور کچھ غیر مشہور جن میں سے ان دو کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ مشہور کردیا تاکہ بقیہ امثال پر بطور نظیر کے ہو جاویں جیسا کہ ناظمان سلطنت کا قاعدہ ہے کہ جب رہزنوں کو جنگل میں قتل کرتے ہیں تو ایک دو کی لاش کو بستی میں لاتے ہیں تاکہ بستی

والے انکو دیکھیں اور عبرت حاصل کریں اور ان کو دیکھنا ایسے افعال سے بندش کے طور پر ہوجاوے ؎

ایں دو دار پرچم بکوئے شہر برد | کشتگان قہر را نتواں شمرد
نازنینی تو ولے در حد خویش | اللہ اللہ پا منہ زاندازہ بیش
گر زنے بر نازنیں تر از خودت | در تگ ہفتم زمیں زیر آردت

عالم میں ایسے چور بہت ہوئے ہیں صرف ان دو کا پرچم شہر میں لے آئے ورنہ کشتگان قہر کا شمار نہیں ہوسکتا چنانچہ حضرت مولانا روم نے ہی ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ طریق میں کشتوں کے پشتے لگے ہوئے ہیں کوئی یہاں گرا پڑا ہے کوئی کچھ دور آگے چل کر کوئی کچھ اور دور چل کر غرض یہ راستہ کشتگان قہر سے پٹا پڑا ہے آگے بطور نصیحت کے فرماتے ہیں کہ ہم نے مانا کہ تم بھی نازنیں ہو اور بوجہ طاعت و تقوی کے محبوب ہو لیکن اپنے اندازہ پر یعنی ان کے درجہ پر نہیں ہو لہٰذا خدارا اپنی حد سے قدم آگے مت رکھنا اور ان کا مقابلہ مت کرنا اور اگر تم ایسے شخص پر جو تم سے زیادہ مقبول و محبوب ہے حملہ کروگے تو تم کو قعر زمین ہفتم کے نیچے پہونچادے گا۔ (کلید مثنوی صـ۲۰۶ جلد اول حصہ دوم)

بہر حال وہ گنہ گار اپنی تواضع اور کسر و انکسار کی وجہ سے کامیاب ہوگیا اور وہ عابد اپنے عجب و استکبار کی وجہ سے ناکام رہا۔ علماء نے فرمایا ہے کہ تمام اخلاق کی اصل تواضع ہے۔ تواضع جب انسان میں آجاتی ہے تو اس کے اور دوسرے اخلاق بھی درست ہوجاتے ہیں اور سارے رذائل کی جڑ تکبر ہے۔ تکبر جب کسی میں پیدا ہوجاتا ہے تو اس کے دوسرے اخلاق بھی خراب ہوجاتے ہیں اسی طرح بزرگوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ابلیس کو خدا تعالیٰ کی محبت نہ تھی۔ اسکو کبر جو ہوا تو محبت ہی کے نہ ہونے سے محبت کے ساتھ کبر اور حکم سے سرتابی جمع نہیں ہوسکتی۔ حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی | مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

یہی وجہ ہے کہ مولانا روم نے مثنوی میں عشق و محبت کا بیان بہت زیادہ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ؎

ہر کہ را جامہ ز عشقے چاک شد | او ز حرص و عیب کلی پاک شد

اس میں یہ بیان فرمارہے ہیں کہ طریق قطع تعلقات ماسوا اور زوال حرص دنیا کا ذریعہ عشق ہے۔ اسکی بدولت آدمی حرص اور جمیع نقائص بلکہ تمام اخلاق ذمیمہ سے بالکل پاک ہوجاتا ہے حضرت مولانا تھانوی نے اسکی شرح کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اخلاق ذمیمہ کے دو علاج ہیں ایک جزئی یعنی خاص وہ یہ کہ ہر ہر خلق کا جدا جدا علاج کیا جاوے جیسا کہ احیاء العلوم وغیرہ میں لکھا ہے اسکو طریق سلوک کہتے ہیں۔ دوسرا کلی یعنی عام وہ یہ کہ ذکر و شغل سے یا جس طرح شیخ کامل تجویز کرے، حق سبحانہ و تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا کی

جاوے جب اس کا غلبہ ہوگا اپنی ہستی وخودی مضمحل ہونا شروع ہوگی اور سب اخلاق ذمیمہ جو کہ اس خودی اور دعویٰ ہستی سے پیدا ہوتے ہیں زائل ہو جائیں گے اسکو طریق جذب کہتے ہیں اور طریق اول گو بے خطر ہے مگر طویل ہے اور طریق ثانی گو خطرناک ہے مگر قریب ہے اور ہر شیخ کا مذاق مختلف ہوتا ہے مولانا پر چونکہ مذاق ثانی غالب ہے اس لئے اُسی کی تعلیم فرماتے ہیں اور اس کی طرف رغبت دلاتے ہیں اور اسکی مدح کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ :

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　　　اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت وناموس ما　　　　اے تو افلاطون وجالینوس ما

یعنی اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں اور تجھ سے سب امراض کا علاج ہو جاتا ہے۔ تجھ سے نخوت وناموس کا دفعیہ ہوتا ہے یعنی عار وننگ کے دفع کرنے میں بہ نسبت دوسرے اخلاق ذمیمہ کے اسے ایک خاص خصوصیت حاصل ہے کیونکہ عشق کے لئے ذلت لازم ہے کہ ذلت وناموس ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ طریق جذب میں یہ جو فرمایا کہ ذکر وشغل کے ذریعہ حق تعالیٰ کی محبت پیدا کیجائے اور جب محبت پیدا ہو جائے گی تو وہ سارے اخلاق ذمیمہ کو قلب سے نکال پھینکیں گی تو یہ عشق کامل کے اثر کا بیان ہے یعنی جب عشق ومحبت کا استیلاء قلب پر ہو جاتا ہے تو پھر وہ ماسوا کو قلب سے نکال پھینکتی ہے اور تمام چیزوں کو جلا کر رکھ دیتی ہے ورنہ تو عشق جب تک ناقص رہتا ہے خطرے سے خالی نہیں ہے چنانچہ بزرگان سلف رحمہم اللہ عشق کو خطرناک فرماتے ہیں مگر اسکی وجہ نہیں بیان فرماتے غور کرنے سے سمجھ میں آیا کہ خطرناک اسی وجہ سے ہے کہ بہت سے خطرناک حالات سے عبور کرنا ہوتا ہے ایسے کہ غیر مبتلا کے لئے اس کا سمجھنا بھی دشوار ہے۔ چنانچہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اسکی وجہ سے انسان میں عجب و پندار اور اہل کمال سے مساوات کا دعویٰ پیدا ہو جاتا ہے اس لئے کہ عشق کی وجہ سے ناقص پر جب اس کا مخصوص سرور اور حظ طاری ہوتا ہے تو اس حالت میں وہ اپنی حد پر قائم نہیں رہتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اس راہ میں میں سب پر فوقیت لے گیا ہوں چنانچہ ناقص کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مدعی کمال ہو۔ یہی خطرناک حالت ہے اور غلط اس لئے ہے کہ گو اسے عشق ومحبت کی سرشاری حاصل ہے اور اسکی وجہ سے وہ اپنے طور پر یہ بھی سمجھ رہا ہے کہ مجھے کوئی دولت حاصل ہوگئی ہے۔ تو سمجھے مگر اسے اس کا کیا حق پہونچتا ہے کہ وہ اہل کمال سے مساوات کا دعویٰ بھی کرنے لگ جائے یا اپنے آپ کو سب سے اونچا دیکھے اُس کو اپنی حد پر رہنا چاہیے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

نازنینی تو ولے در حد خویش اللہ اللہ پا منہ زاندازہ بیش

میں کہتا ہوں کہ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے سالک کو چاہئے کہ حق تعالیٰ کی محبت کے ساتھ ساتھ ذکر و شغل سے بھی محبت کرے۔ کیونکہ جب ان سے محبت پیدا ہوجائے گی تو پھر راستہ بالکل آسان اور بے خطر ہوجائے گا اس لئے ذکر و شغل اور اعمال صالحہ اس طرح سے کرنا چاہئے کہ ان اعمال سے محبت ہوجائے اور جب ان سب سے محبت ہوجائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ سے بھی محبت ہوجائے گی کیونکہ جنھیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے وہ لوگ کچھ آسمان پر نہیں چلے جاتے بلکہ یہیں رہتے ہیں اور ان اعمال سے ان کو خاص محبت اور تعلق ہوجاتا ہے لہٰذا جب تک یہ نہ پیدا ہوجائے حالت بیشک خطرناک ہے کیونکہ خطرناک وہی محبت ہے جو اعمال کے واسطے سے نہیں ہے اور جو محبت کہ اعمال کے واسطے سے ہوتی ہے اس میں کچھ بھی خطرہ نہیں ہوتا۔ آج جو لوگ نہیں پہونچ رہے ہیں اعمال کے ذریعہ سے تو اسی لئے کہ ان سے محبت نہیں ہے اور جب ان سے محبت نہیں ہوتی تو پھر خدا تعالےٰ سے بھی نہیں ہوپاتی یہ جو بات کہہ رہا ہوں اس کو خوب سمجھئے۔ نہایت ہی کام کی بات کہہ رہا ہوں حق تعالیٰ سے براہ راست محبت خطرناک ہے اسکو اہل محبت سمجھتے ہیں مگر اعمال کے ذریعہ سے جو محبت اور معرفت ہوتی ہے اس میں خطرہ نہیں رہتا بہرحال میں یہ بیان کر رہا تھا کہ گنہگار کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اپنے گناہوں پر جری ہو اور ایک وہ جو جری نہ ہو۔ ابلیس اپنی معصیت پر جری تھا اور چونکہ خود اپنی دولت کھوچکا تھا اس لئے دوسروں کو بہکانا اور ان میں کبر و غرور پیدا کرنا اسکی عام عادت تھی۔ چنانچہ اس عابد کے اندر بھی اس نے اپنی ہی صفات پیدا کردی تھیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت ہی مبغوض اور ناپسندیدہ ہیں۔ عبادت خدا کے یہاں بہت ہے۔ کثرت عبادت کو وہاں پوچھتا کون ہے۔ اسی لئے اللہ کے جو نیک بندے ہوتے ہیں وہ بہت کچھ کرنے کے بعد بھی نظر اس پر سے ہٹائے رہتے ہیں ایسے ہی شخص کو فقیر الی اللہ کہتے ہیں۔ اسی طرح سے یہ حضرات دوسروں کے عیوب سے بھی صرف نظر کئے رہتے ہیں باقی یہ درجہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے کہ آدمی کو اپنی معرفت ہوجانے اور طاعت کرنے کے بعد اس پر تکیہ نہ ہو بلکہ توکل حق تعالیٰ کے فضل پر ہو یہ بہت مشکل کام ہے۔ ایک غریب شخص اگر اپنے آپ کو مالدار نہ سمجھے تو چنداں کمال نہیں لیکن مال دار ہوکر انسان اپنے آپ کو فقیر سمجھے بلاشبہ یہ بڑا مشکل ہے مشائخ نے فرمایا ہے کہ بزرگوں کے اندر دو صفات نہایت ہی عمدہ ہوتی ہیں اور وہی ان کے سارے کمالات کی اصل ہیں ایک تواضع اور دوسرے توکل۔ چنانچہ ہمیشہ سے صالحین کی یہی سیرت رہی ہے

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریست — راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

یعنی اپنے تقویٰ و دانش پر اعتماد کرنا طریقت میں کفر کی بات ہے۔ سالک اگر سو ہنر بھی رکھتا ہو یعنی طاعت کی کثرت رکھتا ہو تب بھی اسکو توکل ہی کرنا چاہئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ حضرت حافظؒ کے اس شعر کو اپنے وعظ میں لائے ہیں اگر حضرت کے وعظ میں صرف یہی شعر ہوتا تو بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ حضرت نے طریقت سے سب کچھ بیان فرما دیا اس لئے کہ یہ پورے طریقت کا خلاصہ ہے۔ شیخ سعدیؒ نے بھی اسی تکیہ سے منع فرمایا ہے چنانچہ عابد ناپارسا کی حکایت میں فرماتے ہیں ؎

کہ آنرا جگر خوں شد از سوز و درد — گر این تکیہ بر طاعت خویش کرد

یعنی عابد نے چونکہ اپنی طاعت پر تکیہ کیا تھا اس لئے تباہ ہوا اور گناہ گار اپنے گناہوں کو سوچ سوچ کر نہایت نادم اور افسردہ تھا۔ اس لئے نجات پا گیا۔ ایک شخص کے پاس طاعت نہیں ہے اس لئے اس پر تکیہ بھی نہیں ہے۔ اور ایک کے پاس طاعت ہے اور اس پر تکیہ ہے یہ شخص پہلے سے کہیں زیادہ بُرا ہے جس کا ظاہر خراب ہو اور وہ دوزخ میں چلا جائے اس سے اتنا تعجب نہیں جتنا کہ اس شخص سے تعجب ہے کہ جس نے ساری عمر اپنے ظاہر کو اچھا رکھا ہو۔ طاعت کی ہو مگر وہی ذریعہ بن جائے اس کے دوزخ میں جانے کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عابد کا اپنی طاعت پر نظر کرنا یہ نہایت ہی بری چیز ہے اور گنہگار کا اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم پر بھروسہ کرنا نہایت ہی عمدہ خصلت ہے اور بزرگان دین تو طاعت کرنے کے بعد بھی نظر اپنی طاعت پر نہیں رکھتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل ہی پر رکھتے ہیں اسی کا نام توکل ہے۔ توکل کے معنی تاکل کے نہیں ہیں کہ اسباب رزق کو ترک کر دے بلکہ یہ ہر چیز میں ہوتا ہے۔ طاعت میں بھی ہوتا ہے۔ یعنی کام تو سب کر دے اور بھروسہ اللہ پر رکھے یعنی یہ سمجھے کہ ان کی مہربانی ہوگی تو بس بیڑا پار ہو جاوے گا ورنہ اسی میں پکڑا جاؤنگا۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت سعدیؒ، حضرت حافظؒ حضرت مولانا تھانوی رحمہم اللہ اور دوسرے مشائخ سب اس امر پر متفق ہیں کہ انسان کو عبادت کے باب میں بھی توکل اختیار کرنا چاہئے اسی کو میں یوں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے تو اب طاعت کا نکرنا تعطل ہے اور عبادت کر کے اس پر نظر کرنا یہ گویا تشبیہ ہے اور طاعت کر کے اللہ تعالیٰ پر نظر رکھنا یہ توحید ہے اور آپ جانتے ہیں کہ بزرگان دین نے جو اس توکل کو اپنا منصب بنایا ہے یہ کہاں سے ماخوذ ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائیگا۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا کہ کیا آپ بھی نہیں یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی مجھے ڈھانپ لے دیکھئے جب سید الانبیاء اور امام الاولیاء صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم اپنے متعلق یہ فرما رہے ہیں کہ جنت میں اپنے عمل کی وجہ سے نہیں جائینگے تو پھر اس کے سننے کے بعد کسی ولی یا کسی صوفی کی کیا مجال تھی کہ وہ اپنی طاعت پر نظر کرتا۔ یہی حدیث ماخذ ہے حضرات صوفیہ کے اس عمل کا کہ وہ طاعت پر نظر کو جائز ہی قرار نہیں دیتے محض اللہ تعالیٰ کی رحمت پر توکل کرتے ہیں چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا واقعہ ترصیع الجواہر المکیہ میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شب اپنے ورد سے سو گیا جسکی وجہ سے مجھے کچھ تکدر ہوا۔ اس لئے کہ اس وقت میں ان لوگوں میں سے تھا جو اعمال پر اعتماد کرتے ہیں۔ یعنی جن کی نظر اپنی طاعت پر ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے یہ سزا دی گئی کہ چند فرائض نیند کی وجہ سے مجھ سے چھوٹ گئے، اور باطن میں یہ ندا کی گئی کہ اے ابراہیم میرے بندے ہوجاؤ راحت پاجاؤ گے یعنی جب ہم سلادیں سوجاؤ اور قیام کی توفیق دیدیں تو قیام کرلو۔ ان دونوں کے درمیان تم کو کسی چیز کا اختیار نہیں ہے۔

دیکھئے حضرت ابراہیم ابن ادہم کا شمار اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے مگر اپنے متعلق ایک وقت وہ بھی فرماتے ہیں کہ میری نظر طاعت پر تھی گو ان کے اخلاص کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے نکال دیا تاہم اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ طاعت کرکے طاعت پر نظر ہوجانا کچھ بعید نہیں انسان جب اخلاص اختیار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے کو ڈال دیتا ہے ان کی قدرت اور ان کے استغنا اور انکی بے نیازی کو اپنے سامنے رکھتا ہے تب ہی اس عقبہ سے نکلتا ہے۔ بزرگوں نے اس سے نکالنے کے لئے کیسے کیسے مضامین بیان کئے ہیں اور لوگوں کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی ہے چنانچہ شیخ سعدی جو اس فن کے امام ہیں بوستان میں فرماتے ہیں۔

زمغرور دنیا رہ دیں مجوئے — خدا بینی از خویشتن بیں مجوئے
گرت جاہ باید مکن چوں خساں — بہ چشم حقارت نگہ در کساں
گماں کے برد مردم ہوشمند — کہ در سرگرانیست قدر بلند
ازیں نامور تر محلے مجوئے — کہ خوانند خلعت پسندیدہ خوئے

جو شخص خدا سے غافل ہو اور دنیا کے دھوکہ میں پڑا ہو اس سے دین کی توقع نہ رکھو۔ جو خود بیں شخص ہے اس سے خدا بینی کی امید نہ کرو اگر تم مرتبہ چاہتے ہو تو کمینوں کی طرح لوگوں کو بنظر حقارت مت دیکھو۔ جو عقلمند شخص ہے اسکو بھلا یہ خیال کب ہوسکتا ہے کہ تکبر اور غرور کے اندر مرتبہ کی بلندی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ مت تلاش کرو کہ مخلوق تم کو یہ کہے کہ نہایت اچھے اخلاق والا شخص ہے۔

نگہ چو توئے بر تو کبر آورد — بزرگش نہ بینی بہ چشم خرد
تو نیز از تکبر کنی ہم چناں — نمائی کہ پیشت تکبر کناں

چو استادئی بر مقام بلند　　بر افتادہ گر ہوشمندی مخند

بسا ایستادہ در آمد ز پائے　　کہ افتادگانش گرفتند جائے

ذرا غور کرو کہ اگر تم جیسا کوئی شخص تم پر تکبر کرے تو تم اسکو کبھی بزرگ سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوگے لہٰذا تم خود تکبر کی وجہ سے ایسا تو نہ کرو کہ جس طرح تمہارے سامنے اور اہل تکبر کرتے ہیں اور اگر تم کسی بلند مقام پر کھڑے ہو تو عقلمندی کی بات تو یہ ہے کہ نیچے گرے ہوؤں پر مت ہنسو اس لئے کہ ایسا بہت ہوتا ہے کہ کھڑا ہونے والا پھسل کر نیچے گر جاتا ہے اور نیچے پڑے ہوئے لوگ اسکی جگہ لے لیتے ہیں۔

گرفتم کہ خود ہستی از عیب پاک　　تعنت مکن بر من عیب ناک

یکے حلقۂ کعبہ دارد بدست　　یکے در خراباتے افتادہ مست

گر آنرا بخواند کہ نگزاردش　　وزیں را براند کہ بازآردش

نہ مستظہرست ایں با اعمال خویش　　نہ انرا در توبہ بست است پیش

میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم عیب سے پاک ہو اور پارسا ہو لیکن مجھ گناہگار پر زیادتی کرنے کا تمھیں کیا حق ہے۔ ایک شخص اپنے ہاتھ سے کعبہ کا پردہ پکڑے ہوئے ہے اور دوسرا شراب خانہ میں مست پڑا ہوا ہے۔ اب اگر حق تعالیٰ اس خرابات والے کو مقبول فرمالیں تو کون ہے جو اسکو ہونے دے اور اگر اس کعبہ والے کو اپنے در سے بھگادیں تو کس کی مجال جو اس کو واپس لاسکے۔ نہ اس عبادت گزار کو اپنے اعمال پر تکیہ کرنے کا کوئی حق ہے اور نہ اس گنہگار کے لئے توبہ کا دروازہ ہی بند ہے۔

جب معاملہ یہ ہے تو پھر کسی زاہد کو کسی رند پر تکبر کرنے کا کیا حق پہونچتا ہے اور اپنے عبادت پر تکیہ کرنا اس کو کب زیبا ہے۔ حضرت حافظؒ کا شعر ابھی میں نے پڑھا ہے فرماتے ہیں کہ ؎

تکیہ بر تقوی و دانش در طریقت کافریست

راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

حضرت مولاناؒ اس کو اس انداز سے پڑھا کرتے تھے کہ لوگوں کو لطف آجاتا تھا اور پڑھنے ہی کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ خود حضرت والا کا حال ہے اسی طرح حضرت کبھی کبھی ان اشعار کو بھی پڑھا کرتے تھے ؎

غافل مرو کہ مرکب مردانِ مرد راہ　　در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش　　ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

اسی طرح حضرتؒ اس شعر کو بھی بہت پڑھا کرتے تھے ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن　　کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

اور اس میں شک نہیں کہ یہ سب اشعار آبِ حیات اور تصوف کی روح اور اسکی جان ہیں۔
حضرت حافظؒ فرماتے ہیں ؎

زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ رندازرہ نیاز بدار السلام رفت

یعنی زاہد غرور اور پندار کی وجہ سے راہ صحیح و سالم نہ طے کرسکا اور رند راہ نیاز سے دارالسلام میں داخل ہوگیا اور فرماتے ہیں ؎

ترسم کہ حرفۂ نہ برد روز باز خواست نان حلال شیخ ز آب حرام ما

مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن بازی نہ لے جائیگی شیخ کی نان حلال ہمارے آب حرام سے
ہر زمانہ میں بزرگوں نے یہی سیرت پیش کی ہے چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ہے عبادت کا سہارا عابدوں کے واسطے ہے عصائے آہ مجھ بے دست و پا کے واسطے

اب ان سب باتوں کا وقت تو ہے نہیں مگر آپ کے سامنے اس لئے بیان کرتا ہوں کہ اگر آپ سیکھ لیں گے تو اس کا نفع آپ ہی کو پہونچے گا اور یہ ہوسکتا ہے کہ یہاں نقصان کی خبر نہ ہو گر آخرت میں تو ہوگی۔
مضمون سابق یعنی حکایت حضرت عیسٰی علیہ السلام و عابد ناپارسا پر مزید کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ سنئے صاحب چور پکڑ گیا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے جو قصہ لکھا ہے کہ عبادت پرست نے جب اس گنہگار کو دیکھا تو اسکو بہت کچھ سخت سست کہا اس پر ابرو ترش کئے اُسے مُدبر۔ نگوں بخت اور نادان کہا اور یہ کہا کہ اسکی مصاحبت سے اس لئے دور رہنا چاہتا ہوں کہ مبادا اس کی آگ کا کچھ حصہ مجھ پر نہ پڑجائے حتیٰ کہ آخر میں یہانتک کہہ دیا کہ ؎ بہ محشر کہ حاضر شود انجمن
خدایا تو با او مکن حشر من

یعنی اے خدا محشر میں جبکہ سب لوگ جمع ہونگے تو میرا حشر اس کے ساتھ نہ کیجیو تو اس کا یہ سب کہنا کبر کی بنا پر تھا اور کبر کسی میں بلاوجہ نہیں ہوجایا کرتا بلکہ اس کے کچھ اسباب ہوتے ہیں، اور یہاں وہ سبب یہ ہوا کہ عبادت کی وجہ سے وہ اپنے کو بزرگ سمجھنے لگا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ میں تو عابد ہوں شب و روز اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہوں اس لئے مقبول بارگاہ ہوں حالانکہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں بزرگوں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ ؏ بزرگاں نہادہ بزرگی زسر اللہ تعالیٰ کی ذات نہایت مستغنی و بے نیاز ہے فرشتے جن کی غذا ہی طاعت ہے وہ بھی اس کے حکم کے آگے گم صم ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا کچھ بیان بوستاں کے دیباچہ میں کیا ہے خوب کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

یکے را بہ سر بر نہد تاج بخت یکے را بخاک اندر آرد ز تخت

کلاہِ سعادت یکے برسرش گلیمے شقاوت یکے در برش
گلستاں کند آتشے بر خلیل گروہے بہ آتش برد زآب نیل

ایک کے سر پر نصیبے کا تاج رکھتا ہے اور ایک کو تخت سے آتار کر زمین پر لاتا ہے۔ کسی کے سر پر سعادت کی ٹوپی رکھدی ہے اور کسی کے بدن پر شقاوت کی کملی ڈال رکھی ہے۔ حضرت خلیل اللہ پر آگ کو گلستاں بنادیا اور ایک جماعت کے حق میں دریائے نیل کو آگ بنادیا۔

گر آن ست منشور احسان اوست درین است توقیر فرمان اوست
پس پردہ بیند عملہائے بد ہمو پردہ پوشد بآلائے خود
بتہدید گر برکشد تیغ حکم بمانند کروبیان صم وبکم

اگر وہ اس کے احسان کا مظاہرہ ہے تو یہ اس کے عظمت حکم کا مشاہدہ ہے برے اعمال کو پردہ کے پیچھے سے دیکھ لیتا ہے مگر اس کے بعد اپنے انعام کے ذریعہ پردہ پوشی ہی کرتا ہے۔ اگر وہ شاہی جلال کے ساتھ حکم کی تلوار کھینچے تو مقرب فرشتے بھی بس گم صم ہوکر رہ جائیں۔

دگر در دہد یک صلائے کرم عزازیل گوید نصیبے برم
بدرگاہِ لطف و بزرگیش بر بزرگاں نہادہ بزرگی زسر

اور اگر وہ کرم کا اعلان کردے تو ابلیس کو بھی اپنی بخشش کی توقع ہو جائے اس کے سراپا لطف و بزرگی کے دربار میں بزرگوں نے اپنے سرسے بزرگی اتار کر رکھدی ہے۔ جب یہ شان ہے حق تعالیٰ کی تو وہاں آپ کی عبادت کو پوچھتا کون ہے۔ بڑے بڑے ملائک شب و روز عبادت کرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو قاصر ہی سمجھتے ہیں مگر اس عابد نے تھوڑی سی عبادت کی اور اپنے آپ کو بزرگ سمجھ لیا یہی اس کے عدم اخلاص کی دلیل تھی اور یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص خود بزرگ نہو لیکن اپنے کو بزرگوں کے زمرہ میں شمار کرنا چاہتا ہو تو وہ اسی قسم کی باتیں کرتا ہے۔ اس کے لئے بزرگی کا سنبھالنا تو آسان نہیں ہوتا۔ لامحالہ اسکی جگہ ڈینگ ہی سے کام لیتا ہے۔ اس شخص کو عبادت کا کچھ بھی فیض نہیں حاصل ہوا۔ عبادت تو عابد و معبود کے درمیان واسطہ ہوتی ہے اور اسے نہ اپنی ہی معرفت تھی اور نہ معبود کی ورنہ تو اگر ذرا سا حصہ معرفت کا نصیب ہوجاتا تو اُسے عُجب وکبر سوجھتا؟ اور دوسروں پر نظر جاتی؟ یاکہ خود اپنی فکر پڑجاتی اور قلب خشیت و خوف سے بھر جاتا۔ چنانچہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اسی کتاب میں ایک حکایت دہقان در لشکر سلطان بیان کی ہے جس کے ذریعہ سے اس بات کو سمجھا دیا ہے حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی دیہات کے ایک رئیس دراس کے لڑکے کا گذر بادشاہ کے لشکر پر ہوا۔ لڑکے نے جب لشکریوں کے سازوسامان کو دیکھا اور فوجیوں کے

کروفر کا مشاہدہ کیا اور یہ دیکھا کہ ان سب کے سامنے میرا باپ بالکل کمتر ہے ذلیل معلوم ہوتا ہے تو اس نے باپ سے پوچھا کہ آخر آپ یہاں اس قدر مسکین اور متواضع کیوں نظر آرہے ہیں۔ آخر آپ بھی تو گاؤں کے چودھری ہیں اور بہت سے سرداروں سے بڑھ کر ہیں۔ پھر یہ آپ کا کیا حال ہو رہا ہے کہ اس قدر گھبرائے ہوئے سے ہیں کہ جیسے مرہی جاوینگے اور بادشاہ کے سامنے اس طرح کانپ رہے ہیں جیسے بید ہلتی ہے لڑکے کے اس سوال کا جواب جو باپ نے دیا بس میرا مقصود یہاں اسی کا بیان کرنا ہے اس نے کہا ؎

بلے گفت سالار و فرماں دہم ۔۔۔ ولے عزتم ہست تا در دہم

بزرگاں ازاں دہشت آلودہ اند ۔۔۔ کہ در بارگاہِ ملک بودہ اند

تو اے بے خبر ہم چناں در دہی ۔۔۔ کہ بر خویشتن منصبے می نہی

یعنی باپ نے کہا کہ ہاں بے شک میں سردار بھی ہوں اور حکمران بھی ہوں لیکن میری [illegible] بس گاؤں تک ہے۔ آگے شیخ سعدیؒ بطور تتمہ کے فرماتے ہیں کہ بزرگان دین پر جو [illegible] ہراس طاری رہتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ شاہی دربار میں ہوتے ہیں اور تو اے [illegible] ابھی اپنے لئے کوئی منصب اور مقام سمجھتا ہے تو یہ جان لے کہ تو ابھی دیہات ہی [illegible] میں نے اس پر سنائی کہ اس عابد کو اگر معرفت کا کچھ حصہ ملا ہوتا تو اس کی نظر [illegible] اپنی عبادت سے اٹھ چکی ہوتی لیکن جب اس پر نظر باقی ہے تو معلوم ہوا کہ [illegible] بجمعیت نہیں ہوئی۔ طریق نام ہے فنا کا۔ عابد پر جب عبادت اثر کر جاتی ہے تو وہ یاد محبوب میں غرق ہو جاتا ہے اور اپنے وجود کو ان کے وجود میں فنا کر دیتا ہے۔ شیخ نے اس مسئلہ کو بھی حکایت (کرمک شب تاب) کا عنوان قائم فرما کر نہایت ہی دلکش عنوان سے ثابت کیا ہے فرماتے ہیں ؎

مگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ ۔۔۔ بتابد بشب کرمکے چوں چراغ

یعنی تم نے اکثر باغ و بیابان میں دیکھا ہوگا کہ رات کے وقت ایک چھوٹا سا کیڑا چراغ کی طرح چمکتا پھرتا ہے۔

یکے گفتش اے مرغکے شب فروز ۔۔۔ چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

کسی نے اس سے دریافت کیا کہ اے رات کو چمکنے والے چھوٹے کیڑے تو دن میں باہر کیوں نہیں نکلتا۔

ببیں کاتشیں کرمکے خاک زاد ۔۔۔ جواب از سر روشنائی چہ داد

دیکھو مٹی سے پیدا ہونے والے اس آتشیں کیڑے نے کیسی عقلمندی کا جواب دیا۔

کہ من روز و شب جز بہ صحرا نیم ۔۔۔ ولے پیش خورشید پیدا نیم

اس نے کہا کہ میں تو رات و دن جنگل میں رہتا ہوں ہاں مگر اتنی بات ہے کہ آفتاب کے آگے میرا وجود نظر نہیں آتا۔

سبحان اللہ فنا کے مسئلہ کو کس طرح معمولی قصوں سے ثابت فرمایا ہے۔ واقعی گنہ گار کے مقابلہ میں اس عابد کی زبان جو قینچی کی طرح چلی تو اسی لئے کہ اس نے اپنے وجود کو ختم نہیں کیا تھا اور نہ اس مسکین کو معرفت کی ہوا لگی تھی ورنہ تو ع آنراکہ خبر شد خبرش باز نیامد کا مصداق ہوتا نہ کہ اس قسم کے تکبر کے کلمات زبان پر لاتا۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ شیخ نے عابد نا پارسا کی جو کچھ مذمت بیان کی ہے وہ اسکی عبادت کی بنا پر نہیں کی ہے بلکہ اس کی ناپارسائی کی بنا پر کی۔ ورنہ عبادت کا شرف اور فضل تو منصوص ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ یعنی ہم کتابوں میں لوح محفوظ (میں لکھنے) کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین کے مالک نیک بندے ہونگے۔ اس میں زمین سے مراد اگرچہ ارض جنت کو کہا گیا ہے تاہم ابن عباس سے مروی ہے کہ المراد بھا ارض الدنیا یرثھا المومنون ویستولون علیھا وھو قول الکلبی وایدہ بقولہ تعالیٰ لیستخلفنھم فی الارض یعنی ابن عباس فرماتے ہیں کہ مراد اس سے دنیا کی ہی نہیں ہے جس کے وارث مومن ہونگے اور ان کا اس پر تسلط ہوگا۔ کلبی کا بھی یہ قول ہے جس کی تائید میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کیا ہے کہ وہ ان کو زمین کا ضرور بالضرور خلیفہ بنائے گا۔ بہر حال آگے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ یعنی بلاشبہ اس میں کافی مضمون ہے ان لوگوں کے لئے جو بندگی کرنے والے ہیں اور ہم نے آپ کو کسی اور بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں پر مہربانی کرنے کے لئے۔ دیکھئے اس آیت میں بلاغ اور کفایت کو قوم عابدین کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین کی وراثت چاہتے ہو تو عبادت کرو۔ اس سے عبادت کی تعریف نکلی۔ مگر مراد اس سے وہ عبادت ہے کہ جس میں عابد حق تعالیٰ کی رضا کا قصد کرے نہ ایسی کہ ایک جانب عبادت بھی کرتا جائے اور دوسری جانب اسکی بدحالی بھی بڑھتی جائے جیسا کہ اس عابد ناپارسا کا حال ہوا۔ اس جیسی عبادت کی تعریف نہیں کی جائیگی کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی عبادت ہی نہیں بلکہ مخلوق کی خاطر ہے اور عبادت کی عبادت ہے۔ اسی واسطے شیخ نے اسکو عبادت پرست فرمایا ہے اس قسم کے لوگ اندر اندر اپنے ہی معتقد ہوتے چلے جاتے ہیں اس لئے جتنا کرتے جاتے ہیں اتنا ہی ان کے اخلاق خراب ہوتے جاتے ہیں اور مخلوق نے اگر کچھ تعریف وغیرہ کردی تب تو یہ اور بگڑ گئے یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ

جب ان کی ریائی عبادت کی وجہ سے ایک مخلوق دھوکے میں آکر ان کے پیچھے پیچھے ہولیتی ہے تو اُن کی نظر اپنے خداع اور بد باطنی پر نہیں جاتی بلکہ الٹے اپنے کو بزرگ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ خدا کے یہاں سے ان کا پتہ کٹ جاتا ہے ؎

او چو بیند خلق را سرمست خویش　　از تکبر می رود از دست خویش

اور اس کا مصداق ہوجاتے ہیں کہ ؎

یہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں　　پھرے رات بھر بھر جہاں تھے وہیں ہیں

میں یہ کہہ رہا ہوں کہ عبادت اور عابدین کی مدح تو منصوص ہے اور یہاں شیخ ان کی مذمت کر رہے ہیں تو بات یہ ہے کہ یہ لوگ عابد ہی نہیں اور اسکی دو وجہ ہے ایک تو یہ کہ انکو اپنی عبادت کا زعم ہوجاتا ہے اور دوسری چیز یہ کہ ان میں ریاکاری کی وجہ سے حمق پیدا ہوجاتا ہے اور جو اللہ کا طالب ہوتا ہے اس کی عقل درست ہوتی ہے۔ عارف سب سے زیادہ عاقل ہوتا ہے ان لوگوں کے اس قسم کے دعاوی خود ان کے مفاد کے بھی خلاف ہوتے ہیں کیونکہ لوگ بھی اہل دعویٰ کو پہچان ہی لیتے ہیں اور ان سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کے لئے کتنے نقصان کی بات ہے کیونکہ ریاکاری سے جو مقصود ہے اس کے خلاف ہے مگر اس حمق کے اختیار کرنے پر یہ لوگ مجبور بھی ہیں کیونکہ خدائے تعالیٰ کے یہاں سے جب کچھ ملا نہیں ہوگا تو ایسے شخص کے لئے اس قسم کی خرافات اور بکواس لازم حال ہوجاتی ہے جب آدمی سچا نہ ہوگا تو لامحالہ جھوٹا ہوگا اب جھوٹے لوگوں سے سچوں کے حالات کیسے پیدا ہوسکتے ہیں۔ مسیلمہ کذاب کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے یہاں اذان میں اپنے لئے بھی رسالت کی گواہی دلواتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بھی اعلان کراتا تھا گویا حضور سے مساوات کا دعویٰ تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ آپ کا انکار تو چلے گا نہیں اس لئے آپ کے ساتھ ساتھ اپنے کو بھی شامل کرلیا۔ اس لئے علماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص کچھ ہو اور دعویٰ کسی کمال کا کرے وہ مسیلمہ کذاب کا بھائی ہے۔ شیخ نے اسی لئے اس واقعہ کو بیان کیا تاکہ آپ کو ایسے لوگوں کی معرفت کرادیں کہ جب دعویٰ ہو تو سمجھ لو کہ کچھ نہیں ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں سے راندہ ہوا ہے۔ یہاں اس واقعہ میں بھی عابد کو اپنی عبادت پر ناز پیدا ہوگیا تھا۔ تقاضائے عبادت کے بالکل خلاف کیونکہ عبادت کی وجہ سے تو اس کے اندر تواضع، مسکنت، خاکساری اور انکسار پیدا ہونا چاہئے تھا مگر بجائے اس کے رعونت، تعلّی، کبر یہ سب رذائل پیدا ہوگئے جو کہ معصیت کے خواص تھے اور اس نے اپنی طاعت پر نظر کی اور اس پر تکیہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اپنے کو بے نیاز جانا لے عبادت کا ناز پیدا ہوگیا اور نیک لوگوں میں یہ چیزیں پیدا ہو ہی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ عجب ہے

بڑی دشوار گزار گھاٹی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی فضل فرماویں تو انسان اس سے بچ سکتا ہے ورنہ بہت مشکل ہے تکیہ
کے بارے میں بزرگانِ دین کا یہ فتویٰ ہے کہ یہ کافری ہے چنانچہ حضرت حافظؒ فرماتے ہیں ؎

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریست　　راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

اور کافری اس لئے ہے کہ مومن کا تکیہ خدا پر ہوتا ہے اس کے فضل وکرم پر ہوتا ہے اب غیر اللہ
پر تکیہ کرنا خدا پر سے ہٹ کر یہ کافروں ہی کی صفت ہو سکتی ہے۔ یہاں ایک بات یہ سمجھئے کہ جس طرح تکیہ زہد و
طاعت پر ہوتا ہے اسی طرح کبھی معصیت پر بھی ہو جاتا ہے یعنی گنہگار کی نظر حق تعالیٰ کے عفو وکرم سے ہٹ
کر اپنی معصیت پر مقصور ہو جاتی ہے چنانچہ جب وہ اپنے گناہوں کی کثرت پر نظر کرتا ہے تو اس میں
ایک یاس کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یعنی وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب میں بخشا ہی نہ جاؤں گا گویا
ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کے عفو وکرم سے اسکی نظر ہی ہٹ جاتی ہے اس کو بھی مشائخ فرماتے ہیں
کہ یہ خطرناک حال ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو گنہگاروں کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ
اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا یعنی اے وہ لوگو
جنھوں نے معصیت کرکے اپنے جانوں پر ظلم کیا ہے۔ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو بیشک اللہ تعالیٰ
گناہوں کو بخش بھی دیا کرتے ہیں۔ اسلامی عقیدہ تو یہ ہے اور یہ شخص اپنی عقل سے یہ حکم لگا رہا ہے کہ گویا
اللہ تعالیٰ اس کو بخش ہی نہیں سکتے۔ نہایت ہی مہمل اور بے عقل شخص ہے۔

بہرحال تکیہ خواہ طاعت پر ہو یا معصیت پر دونوں مذموم ہیں اور طاعت پر تکیہ عابد کو اس لئے
ہو جاتا ہے کہ اسکی نظر يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ پر نہیں رہتی اور عاصی جو اپنی معصیت پر تکیہ کرلیتا ہے تو
اس لئے کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اس کے پیش نظر نہیں ہوتا اس لئے اعتدال کی راہ یہ ہے کہ
عابد کو تو چاہئے کہ اگر وہ ایک جانب اپنی عبادت سے خوش ہوتا ہے تو ہو لیکن اس کو چاہئے کہ
دوسری جانب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھی ڈرتا ہے اسی طرح گنہگار اگر معاصی سے خوف کرتا ہے
تو کرے مگر ساتھ ہی ساتھ اُسے اللہ تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے کا عقیدہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے عاصی
کے اندر اگر یہ چیزیں موجود ہوں تو اس کے بعد معصیت مضر نہ ہوگی اور اس کا یہی خوف اس کا کام بنادے
گا جیسا کہ آپ نے عابد ناپارسا کی حکایت میں گنہ گار کا حال دیکھا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان
معصیت کرتا ہے اور اس پر جری ہوتا ہے ندامت اور انابت تو الگ رہی گناہ کرکے اس پر فخر
کرتا ہے۔ رات کو گناہ کرتا ہے اور دن میں لوگوں سے اس کو ہنسی خوشی بیان کرتا ہے اس کا نام
جرأت ہے اس پر اس سے قیامت میں مواخذہ ہو جائے گا۔

بہرحال یہ حق تعالیٰ کی تربیت ہے کہ ایک نیک آدمی کو رحمت کے خیال کے ساتھ ساتھ عذاب کا دھیان بھی رکھنے کو فرمایا اور عاصی کو خوف وخشیت کے ساتھ ساتھ رحمت کی جانب بھی متوجہ فرمایا۔

یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ شیخ سعدیؒ نے اس حکایت میں اُس عابد کو جو نا پارسا کہا تو اس سے معلوم ہوا کہ عابد دو طرح کے ہوا کرتے ہیں ایک پارسا اور ایک ناپارسا۔ اب یہ بات کہ عابد ناپارسا کون کہلاتا ہے تو اس کے متعلق کہتا ہوں کہ شیخ نے اس حکایت سے پہلے جو مضمون بیان کیا ہے اسکی سرخی جو قائم کی ہے کہ "گفتار در عجب و عاقبت آں و شکستگی و برکت آں" اس میں ایک نصیحت یہ بھی فرمائی کہ ؎

گرفتم کہ خود ہستی از عیب پاک　　تعنت مکن بر من عیب ناک

اس میں بتایا کہ کوئی شخص اگر خود عیوب سے پاک ہو تو سبحان اللہ کیا کہنا لیکن جو لوگ کہ اہل معصیت اور اہل عیب ہیں ان کے متعلق طعن اور عیب گوئی بھی نہ کرنی چاہئے۔ اس سے ان کی نیکی کی تکمیل ہوگی اور وہ عابد پارسا کہلائیگا ورنہ اگر اپنی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی تحقیر وتذلیل بھی پیش نظر رہی تو یہ شخص عابد تو کہلائیگا مگر پارسا نہ ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ عابد ہونا تو آسان ہے مگر پارسا ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ یہاں یہ عابد، جو ناپارسا کہلایا تو اسی لئے کہ اس گنہگار کے ساتھ نہایت ہی بد خلقی اور ترش کلامی سے پیش آیا معلوم ہوتا ہے کہ جب شیخ سعدیؒ نے نیکوں کو تعنت سے منع فرمایا تو اس کے بعد ہی عابد ناپارسا کی حکایت بیان کرکے اس تعنت کی توضیح فرمادی اس سے معلوم ہوا کہ اس کے ناپارسا ہونے کا سبب اس کا یہی تعنت تھا اور اس تعنت کا سبب یہ بنا کہ اس نے اپنے آپ کو بزرگ سمجھ لیا تھا اور اپنے عمل پر اس کی نظر ہوگئی تھی جس کی وجہ سے دوسروں کی حقارت قلب میں پیدا ہوگئی تھی۔

سبحان اللہ ان تعلیمات کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں اخلاق کا معیار کس قدر بلند ہے کہ ایک شخص جو گناہوں سے محفوظ بلکہ معصوم ہی کیوں نہ ہو اس کو بھی یہ حق نہیں دیا گیا کہ کسی گنہ گار کو حقیر سمجھے اسکی خیریت اسی میں ہے کہ اپنے ہی کو حقیر سمجھے اور دوسروں کو بہ نظر توقیر دیکھے کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور اسکی خبر نہیں۔ رہا عمل تو اس پر کوئی کیا فخر کرسکتا ہے جبکہ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا۔ اس پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کو تعجب بھی ہوا۔ عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا آپ بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائینگے آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی مجھے ڈھانپ لے یہ مسئلہ اس عابد ناپارسا کو نہیں معلوم تھا یا اُس پر

اُس کا عمل نہ تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے قول و فعل اور حال سب کے ذریعہ اپنی امت کو سمجھایا ہے اور امت نے اسے سمجھا ہے چنانچہ شیخ سعدیؒ نے بوستاں کے شروع ہی میں جو نعت لکھی ہے اس میں کس قدر عاجزی اور تواضع کے اشعار لائے ہیں کہ سبحان اللہ۔ ان کے پڑھنے سے ہی آدمی میں ایک حال پیدا ہوجاتا ہے اور اللہ و رسول کا مرتبہ اور اپنی پستی و حقارت سامنے آجاتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خدایا بحق بنی فاطمہ　　　　کہ بر قول ایماں کنم خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ور قبول　　　　من و دست و دامان آل رسول
چہ کم گردد اے صدر فرخندہ پے　　　　ز قدر رفیعت بدرگاہ حی
کہ باشند مشتے گدایان خیل　　　　بہ مہمان دار السلامت طفیل

اے خدا حضرت فاطمہ کی اولاد کے طفیل میں یہ درخواست ہے کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہو۔ آپ میری دعا کو خواہ رد کریں یا قبول کریں قیامت میں میں ہونگا۔ میرا ہاتھ ہوگا اور آل رسول کا دامن ہوگا۔ اے مرتبہ بلند کے صدر نشین حق تعالیٰ کی درگاہ میں جو آپ کا مرتبہ عظیم ہے اس میں کیا کمی آجائیگی اگر تھوڑے سے فقرا بھی آپ کے دارالسلام کے مہمانوں کے ساتھ طفیلی ہوکر آجائیں۔

خدایت ثنا گفت و تبجیل کرد　　　　زمیں بوس قدر تو جبرئیل کرد
بلند آسماں پیش قدرت خجل　　　　تو مخلوق و آدم ہنوز آب و گل

اللہ تعالیٰ نے آپ کی ثنا کی ہے اور بزرگی بیان کی ہے اور جبرئیل علیہ السلام نے آپ کی قدر کی زمین کو بوسہ دیا ہے۔ بلند آسماں آپ کی قدرت کے آگے شرمندہ ہے اور آپ کی تخلیق ہوچکی تھی درآنحالیکہ آدم علیہ السلام ہنوز آب و گل ہی میں تھے۔

تو اصل وجود آمدی و ز نخست　　　　دگر ہرچہ موجود شد فرع تست
ندانم کدامی سخن گویمت　　　　کہ والا تری زاں چہ من گویمت
ترا عز لولاک تمکیں بس است　　　　ثنائے تو طٰہٰ و یٰسین بس است
چہ وصفت کند سعدیؒ ناتمام　　　　علیک الصلوٰۃ اے نبیؐ السلام

آپ ابتدا ہی سے ساری کائنات کے وجود کے اصل تھے بعد میں جو چیزیں معرض وجود میں آئیں وہ آپ ہی کی فرع ہیں۔ میں اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کی شان میں کون سی ایسی بات کہوں جو آپ کو پسند آجائے کیونکہ میں جو کچھ بھی کہونگا آپ اس سے کہیں بالاتر ہیں۔ آپ کے مرتبہ کے لئے لولاک

لما خلقت الافلاک کا شرف ہی کافی ہے اور آپ کی ثنا کے لئے طٰہٰ و یٰسین کافی ہے۔ یہ نااہل وناقص سعدی آپ کا کیا وصف بیان کرسکتا ہے بس اے نبی آپ پر اللہ ہی کا درود و سلام ہو۔

دیکھئے شیخ نے اپنی کتاب کی ابتدا کس قدر پاکیزہ عنوان سے کی ہے۔ حق تعالیٰ کی حمد بیان کی جیسی کہ انکی شان ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت جو لکھی وہ بھی نہایت ہی مؤثر انداز میں کہ ہر ہر شعر ادب اور تواضع میں ڈوبا ہوا ہے اور سنئے۔ اپنی اسی کتاب کے باب چہارم میں سید الطائفہ حضرت جنیدؒ کی تواضع کا ایک واقعہ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندگان دین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے کس درجہ شغف اور مناسبت رہی ہے کہ جو انداز کسر و انکسار کا آپ نے اختیار فرمایا خواص امت بھی اسی پر چل پڑے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا کہ راہ یہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ ؎

شنیدم کہ بر دشت صنعا جنید　　سگ دید برکندہ دندانِ صید
زنیروئے سرپنجۂ شیر گیر　　فرو ماند عاجز چو روباہ پیر
پس از عزم و آہو گرفتن بہ پے　　لگد خوردہ از گوسپندان حے

میں نے سنا کہ صنعا کے جنگل میں حضرت جنید نے ایک کتے کو دیکھا کہ جس کے شکار کرنے والے دانت گرچکے تھے اور وہ شیر کو پکڑنے والے پنجے کی طاقت بھی کھوچکا تھا اور مانند بوڑھی لومڑی کے عاجز ہوگیا تھا۔ یا تو پہاڑی بکرے کو شکار کرنے کے بعد ہرن کا شکار کرلیتا تھا اور یا اب قبیلہ کی بھیڑوں کی لات کھاتا تھا۔

چوں مسکین و بے طاقتش دید وریش　　بدو داد یک نیمہ از زاد خویش
شنیدم کہ می گفت وخوں می گریست　　کہ داند کہ بہتر زما ہر دو کیست
بظاہر من امروز ازیں بہترم　　دگر تا چہ راند قضا بر سرم

حضرت جنید نے جب اُسے مسکین کمزور اور زخمی دیکھا تو اپنے توشہ میں سے ایک ٹکڑا اس کے آگے بھی ڈال دیا۔ میں نے سنا کہ حضرت جنید یہ کہتے تھے اور خون کے آنسو روتے تھے کہ کون جانتا ہے کہ ہم دونوں میں سے عند اللہ کون بہتر ہے۔ گو بظاہر آج میں اس سے بہتر معلوم ہوتا ہوں لیکن کل کو میرے سر پہ قضا کیا گزارے گی کچھ خبر نہیں۔

گرم پائے ایماں نہ لغزد زجائے　　بہ سر بر نہم تاج عفو خدائے
دگر کسوت معرفت در برم　　نہ ماند بہ بسیار ازیں کمترم
کہ سگ باہمہ زشت نامی چو مرد　　مرد را بدوزخ نہ خواہند برد

اگر میرے ایمان کے قدم نے اپنی جگہ سے لغزش نہیں کی تو حق تعالیٰ کے عفو کا تاج سر پر رکھونگا اور اگر کہیں خدانخواستہ معرفت ہی کا لباس ہمارے اوپر نہ رہ جائے یعنی ہم اس سے خالی ہوجائیں تو پھر میں کتے سے کہیں کمتر ہوں اور یہ مجھ سے کہیں بڑھ کر ہے اس لئے کہ کتے ہیں ہزار برائی سہی مگر جب وہ مرجائیگا تو دوزخ میں اس کو نہ لیجائیں گے اور انسانوں کے لئے تو دوزخ بھی ہے۔

رہ این ست سعدی کہ مردانِ راہ　　بہ عزت نکردند در خود نگاہ
ازیں بر ملائک شرف داشتند　　کہ خود را بہ از سگ نہ پنداشتند

سبحان اللہ۔ حکایت کا خلاصہ کیا عمدہ بیان فرمایا ہے کہ اے سعدی راہ بس یہی ہے کہ سالکان طریق نے کبھی اپنے اندر عزت کے ساتھ نگاہ نہیں کی یعنی عجب و خودپسندی میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ تواضع ہی اختیار کی چنانچہ فرشتوں سے اسی لئے شرف میں بڑھ گئے ہیں کہ انھوں نے اپنے کو کبھی کتے سے اچھا نہیں سمجھا۔

شیخ سعدیؒ کے کلام کی ابتدا اور وسط تو آپ نے ملاحظہ فرمایا اب کلام کی انتہا بھی دیکھئے چونکہ اختتام کے مناسب رجاء ہے اس لئے شیخ نے اس کا طریقہ بھی سکھلایا بلکہ دعا کرکے یہ بتادیا کہ اس طرح سے بندہ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت پر نظر رکھنا چاہئے اور اس میں شک نہیں کہ شیخ نے بہت ہی خوب بیان کیا ہے فرماتے ہیں ؎

دلم می دہد ہر وقت ایں امید　　کہ حق شرم دارد زموئے سپید
عجب دارم از شرم دارد زمن　　کہ شرمم نمی آئید از خویشتن

میرا دل رہ رہ کر مجھے یہ امید دلاتا ہے کہ حق تعالیٰ سپید بال والے مومن سے شرماتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ حق تعالیٰ کو مجھ سے شرم آتی ہے تو میرے لئے یہ بڑے تعجب کا مقام ہے کہ مجھے اپنے سے شرم نہیں آتی۔

نہ یوسف کہ چندیں بلا دید و بند　　چو حکمش رواں گشت و قدرش بلند
گنہ عفو کرد آلِ یعقوب را　　کہ معنیٰ بود صورتِ خوب را
بکردار بد شاں مقید نہ کرد　　بضاعات مزجات شاں رد نہ کرد

تم نے نہیں سنا کہ یوسف علیہ السلام نے باوجودیکہ اس قدر مصیبت جھیلی اور قید و بند میں رہے مگر جب حاکم ہوئے اور ان کا مرتبہ بلند ہوگیا تو آلِ یعقوب کے قصور کو معاف کردیا اور کیوں نہ ہوتا

جب اللہ نے انھیں صورتاً حسین بنایا تھا تو سیرت بھی اسی کے شایان شان ہی ہونی چاہیئے اور معاف یوں کر دیا کہ ان کی بد اخلاقی کے سبب سے انھیں قید نہیں کیا اور ان کی کھوٹی پونجی کو رد نہیں فرمایا پس جب ایک نبی کے عفو و کرم کا یہ حال ہے تو ؎

زلطفت ہمیں چشم داریم نیز بدیں بے بضاعت بہ بخش اے عزیز

بضاعت نیاوردم الا امید خدایا زعفوم مکن نا اُمید

اسی طرح اے خدا آپ کے لطف و کرم سے بھی ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس بے سرمایہ کو محض اپنے فضل و کرم سے بخش دیں گے۔

میں بھی کوئی پونجی لے کر نہیں آیا ہوں سوائے رجا اور امید کے لہٰذا اے خدا مجھ کو اپنے عفو سے ناامید فرمئے دیکھا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انا البائس الفقیر ارشاد فرما کر امت کو جو تعلیم کی تھی تو امت نے اسے کیسا سیکھا باقی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرح سے اعتراف ذنب کا سبب کیا ہوا جبکہ آپ معصوم بھی تھے تو اس کے متعلق سنئے۔

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا ۝ اس میں اعتراف ذنب کرنے والوں کی فضیلت اور انکی مدح فرمائی گئی ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی شان ہی یہ تھی کہ کان خلقہ القرآن کس طرح اس فضیلت کے حاصل کرنے سے صرف نظر فرماتے اور یہ ظاہر ہے کہ ہر فضل و کمال انبیاء علیہم السلام میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے اس لئے آپ نے بھی خود کو مذنبین کی صف میں کھڑا کر کے باوجود معصوم ہونے کے ایسا اعتراف ذنب کیا اور اس طرح گریہ و زاری فرمائی کہ اس منصب کا حق ہی ادا کر دیا اور توبہ و استغفار میں بھی سب سے بڑھ گئے۔ سبحان اللہ دیکھئے آپ نے کیسے کیسے کلمات فرمائے کہ دوسرا کوئی اس طرح کہنے پر قادر ہی نہیں تھا یہ فرمایا کہ:

> "میں مصیبت زدہ ہوں۔ محتاج ہوں۔ فریادی ہوں۔ پناہ جو ہوں۔ ترساں و ہراساں ہوں اپنے گناہوں کا اقرار و اعتراف کرنے والا ہوں۔ سوال کرتا ہوں۔ تجھ سے سوال بیکس کا سا۔ گڑگڑاتا ہوں تیرے سامنے گڑگڑانا گنہگار ذلیل کا سا اور طلب کرتا ہوں تجھ سے طلب کرنا خوف زدہ آفت رسیدہ کا سا اور طلب کرنا اس شخص کا سا کہ جھکی ہوئی ہو تیرے سامنے گردن اسکی اور بہہ رہے ہوں تیرے روبرو آنسو اس کے اور دعا مانگتا ہوں تجھ سے اس شخص کی سی جو فروتنی کئے ہوئے ہو تیرے سامنے اور رگڑتا ہو تیرے سامنے ناک اپنی۔"

سبحان اللہ اعتراف ذنب کا کیسا نقشہ کھینچا ہے اور اس کے ذریعہ گنہ گاروں کی کس قدر دلجوئی اور تسکین فرمائی ہے اور کس قدر عنایت ہے گنہگاروں کے حال پر کہ ان کی یوں تسلی فرمادی کہ میں ان کا بھی نبی ہوں اگر میں ہی ان کو چھوڑ دوں گا تو پھر وہ کہاں جائیں گے۔

واقعی کوئی شیخ ایسا نہیں ہے جو اس طرح مرید کے مقام پر نزول کر کے ان کی تربیت کرے جس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تو یہ تھی جو آپ نے ملاحظہ فرمائی لیکن کتابوں میں سید گیسو دراز کا عجیب واقعہ لکھا ہے اور یہ بڑے شخص ہوئے ہیں کسی نے ان کے بارے میں لکھا ہے ؎

ہر کو مرید سید گیسو دراز شد واللہ خلاف نیست کہ او عشقباز شد

واقعہ یہ ہے کہ صاحب مرآۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ میں سید گیسو دراز قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا انھوں نے مجھے روپیہ دیا کہ شراب خرید کر لاؤ میں نے تعمیل حکم کی فرمایا کہ پیالہ میں پُر کر کے مجھے دو میں نے پیش کیا شیخ نے نوش فرمالیا۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ تم بھی ایک پیالہ پیو۔ مجبوراً میں نے بھی الامر فوق الادب کے خیال سے ایک پیالہ پی لیا۔ حق تعالیٰ علیم ہیں کہ وہ شہد خالص تھا۔ سبحان اللہ کیا احوال اور کیا اسرار۔ اسکی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سالکین کو نہایت سلوک میں جب اپنی عبادت پر نظر اور عجب ہوتا ہے تو اپنے کو معصیت میں ڈال کر اپنے عجب کا ازالہ کرتے ہیں پھر جب یہ حضرات اپنے کو اس درجہ گرا دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کے صدق وخلوص کی برکت سے ان کے لئے حقیقت اشیاء ہی کو بدل دیتے ہیں علماء اسے بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ کتاب ہی میں لکھ دیا ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ صوفی اگر کسی عقبہ میں گرفتار ہو جائے تو اس سے نکلنے کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ خلاف سنت بلکہ خلاف شریعت عمل کیا جائے ایسے موقعہ پر بھی سنت ہی کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ یہی راستہ روشن اور بے خطر ہے اور وہ راستہ یہی ہے کہ اس موقعہ پر اس کا استحضار رکھو کہ انا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الخ اسکو زبان سے کہو گے اور دل سے سمجھو گے تو گیا اس کے ذریعہ سے اس عقبہ سے تہیں نکل جاؤ گے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دل تک پہونچتے پہونچتے اُسے کچھ دیر لگ جائے اور کچھ دنوں بعد یہ دل نشین مگر کرتے کرتے ہو ہی جائیگا اور اس سے نکل جاؤ گے اب اس کے بعد آپ سے پوچھتا ہوں کہ کسی بڑے سے بڑے ولی اور بزرگ کے لئے آخر یہ زیبا کب ہے کہ اس سے نکلنے کے۔ لئے اس قسم کے خلاف شرع امور کے ارتکاب کی ہمت کرے بہرحال ہم کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کرنے کا طریقہ تبلادیا ہے تو بس معصیت سے نکلنے کے لئے یہی کافی ہے اور قرآن شریف کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ اول الاعمال ہے ارشاد فرماتے ہیں:

التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ وبشر المومنین۔ یہاں اللہ تعالیٰ مومنین مجاہدین کی جو صفات بیان فرمارہے ہیں ان میں سب سے پہلی صفت توبہ ہی کی بیان کی ہے عبادت اس کے بعد ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا آپ نے جب دیکھا کہ صفت توبہ حق تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے تو آپ اس وصف میں بھی سب سے آگے رہے۔ چنانچہ فرمایا وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل الخ اور اس۔ آگے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جتنے بھی کمالات ہوتے ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام اُن سب میں اُمتیوں سے بڑھے ہوئے ہیں اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے توبہ کی مدح فرمائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کو بھی توبہ کرنے والوں کی صف میں سب سے آگے رکھا اور حق استغفار ادا کرکے دکھلادیا اور سب سے فائق ہوگئے۔ توبہ اور استغفار ایک ہی چیز ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ توبہ دل میں ہوتی ہے اور استغفار زبان سے کہنے کا نام ہے۔ پھر جب توبہ اول الاعمال ہے تو ہر جگہ اول ہی رہیگی یعنی اگر کافر مسلمان ہو تو توبہ کرے۔ مذنب اگر اہل اصلاح میں سے ہونا چاہے تو توبہ کرے کوئی صوفی طریق میں قدم رکھے تو اول توبہ کرے، غرض کافر و مشرک ہو یا مذنب ہو یا عابد و صوفی ہو یا ولی صدیق ترقی کرنا چاہے تو توبہ کرے جب یہ لوگ چاہیں کہ ہماری ترقی ہو تو جب تک اپنے کو کسر نہ کرینگے اور توبہ نہ کرینگے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہزار مجاہدہ ایک طرف اور توبہ صادق ایک طرف۔ اسکی وجہ سے اعمال پر سے نظر ساقط ہوجاتی ہے کیونکہ آدمی جب کوئی عمل کرتا ہے تو تھوڑی بہت نظر اپنے عمل پر ہو ہی جاتی ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے اس پر بہت زور دیا ہے اور شاہی دربار میں داخلہ کے لئے پہلی چیز توبہ کو قرار دیا ہے کیونکہ انھوں نے معلوم کرلیا ہے کہ اس کو بارگاہ خداوندی میں دخل عظیم ہے اسی لیے اسکو لیا ہے اور نیازمندی اختیار کی ہے ؎

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ رند از رہ نیاز بدارالسلام رفت

بات یہ ہے کہ سب علتوں کی علت نفس ہے جب یہ خراب ہوجاتا ہے تو ہر چیز کو خراب کردیتا ہے عبادت کیسی اچھی چیز ہے مگر جب نفس اس میں شریک ہوجاتا ہے تو اسکو خراب کردیتا ہے اسی لئے اسکو توڑنے اور ختم کرنے کی ضرورت ہے اور اسکو توڑنے کی سب سے عمدہ چیز استغفار ہے اب اس کے بعد اسی موقعہ پر اس شعر کو پڑھ سکتا ہوں جو مولوی موسیٰ صاحبؒ اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

اب نہ ڈھونڈھیں گے ہر گز پتہ مل گیا جب نبی مل گیا تو خدا مل گیا

میں کہتا ہوں کہ جس طرح توبہ اول الاعمال ہے اسی طرح آخر الاعمال بھی ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ جو چیز جہاں سے شروع ہوتی ہے وہیں پر ختم بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کسی بزرگ سے پوچھا گیا کہ ما النہایہ۔ انھوں نے جواب دیا کہ الرجوع الی البدایہ۔ یعنی کسی نے ان سے پوچھا کہ طریق میں انتہا کس کا نام ہے فرمایا کہ ابتداء کی جانب لوٹ جانا۔ چنانچہ یہ توبہ بھی حال نہیں بلکہ مقام ہے اور اعلیٰ مقام ہے اسی لئے تمام انبیاء اور اولیاء نے اسے لازم پکڑا ہے۔ اہل اللہ جب اس مقام پر پہنچتے ہیں اور اپنے عجز و قصور کو دیکھتے ہیں تو توبہ و استغفار ان کے لازم حال ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ آخر میں نازل ہوئی جس میں آپ کو تسبیح و استغفار کا ہی حکم تھا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝

اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے بزرگان دین نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں ذکر و فکر۔ اعتراف ذنب۔ توبہ و استغفار اور نفی کمال و مراد از خود کی ترغیب دی ہے چنانچہ مکتوبات معصومیہ میں ہے کہ:-

حلقۂ ذکر را گرم دارند و بخلوت و تنہائی راغب باشند و در شبانروزے یک دو وقت برائے عزلت معہ باید ساخت ذکر و فکر و تذکر زلات و تقصیرات و توبہ و استغفار و نفی وجود و سائر کمالات و نفی مرادات از خود دراں وقت از مغتنمات باید شمرد و باقی اوقات در افادہ و استفادہ صرف باید کرد۔ والسلام

(مکتوبات صـ۲۳۲ نمبر۱۷۶)

حلقۂ ذکر کا اہتمام اور اس پر دوام رکھیں اور تنہائی و خلوت میں رغبت اختیار کریں۔ چنانچہ دن رات میں سے گھڑی دو گھڑی اسکے لئے نکالیں اور اسوقت تنہائی میں رہیں۔ اور اس وقت میں ذکر و فکر کرنے۔ اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کو یاد کرنے اور توبہ استغفار کرنے اور اپنے تمام کمالات بلکہ وجود ہی کی نفی کرنے اور اپنے سے مرادات کی نفی کرنے کو مغتنمات میں سے سمجھنا چاہیئے۔ اور بقیہ اوقات کو افادہ اور استفادہ میں صرف کرنا چاہیئے۔

کیا عمدہ نصیحت فرمائی ہے۔ یعنی یہ کہ سالک کو چاہیئے کہ کچھ وقت روز آنہ نکال کر اس میں ذکر و فکر کیا کرے اور توبہ و استغفار کرے اور اپنی مراد کی نفی بلکہ خود اپنے وجود و کمالات کی نفی کیا کرے کہ عجب وغیرہ سے نکلنے کا یہی مجرب طریقہ ہے۔ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ بزرگوں کی بات کیجانب التفات نہیں ہے محض انکی ذات پر گرنا چاہتے ہیں اور اسی کو اب مقصود بنا رکھا ہے

الاعتراف والاستغفار من الذنوب من اعظم سنن النبی الکریمؐ

(گناہوں کا اعتراف اور اس سے استغفار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ترین سنت ہے)

اس نصیحت میں خواجہ محمد معصومؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس وقتِ خاص میں اپنے مرادات کی بھی نفی کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ مشائخ نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ سے فتوحات کا طلب کرنا عبودیت کے منافی ہے بلکہ سوء ادبی ہے چنانچہ ترصیع الجواہر میں ہے کہ اس کی وجہ سے بندہ جتنا پاتا ہے اس سے کہیں زیادہ فوت کر دیتا ہے اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو پیدا فرمایا اور اس دنیا کو دارِ تکلیف بنایا۔ چنانچہ کچھ چیزوں کے کرنے کا حکم دیا اور کچھ چیزوں سے منع فرمایا۔ اب اگر واقعی وہ بندہ ہے تو اس کا وظیفہ صرف یہی ہونا چاہیئے کہ اوامر کا امتثال کرے اور نواہی سے باز رہے اور اس پر توفیق طلب کرنے میں اللہ تعالیٰ سے مدد چاہے اور اس پر لازم ہے کہ اپنے قلب کو تیار کرے اس کی جگہ کے لئے یعنی اس میں غیر اللہ کی ربانیت کو دخل نہ پانے دے اور ان علائق کے قطع کرنے میں کوشش کرے جو اس کی عبودیت میں نقصان پیدا کرتے ہوں۔ یہ تو عبد کے شایانِ شان ہے۔ باقی اعمال کے ثمرات کا طلب کرنا یہ کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ نتائج کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ وہ چاہیں تو دنیا ہی میں دیدیں یا چاہیں تو آخرت میں عطا فرمادیں بندہ کو اس میں کوئی اختیار نہیں۔ اب اگر اس نے ثمرات کے طلب کرنے میں جلدی کی تو دو وجہوں سے اس نے بے ادبی کی ایک تو یہ کہ ثمرہ طلب کیا دوسرے یہ کہ اس موطن یعنی دنیا کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جو اس کی حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ یوں اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کچھ عطا فرمادیں تو ادب کے ساتھ بلا توقف اس کو قبول کر لینا چاہیئے اور نعمتوں پر تو اس اعتبار سے خوش ہو سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی دلیل ہے باقی اس کی یہ حالت کہ نعمت پر خوش اور سلب نعمت پر محزون ہو یہ کسی طرح مناسب نہیں اس لئے کہ بندہ کو مسلوب الارادہ ہونا چاہیئے جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

اذا رمت السبیل الی الرشاد ۔۔۔ مرادی منک نسیان المراد

(ترجمہ) آپ سے تو میری مراد یہ ہے کہ کچھ نہ چاہوں بلکہ اپنی مراد ہی کو بھول جاؤں۔ جب کہ میں رشد و ہدایت کے طریق کا قصد کروں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے بندے اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں راضی ہی رہتے ہیں۔ دنیا ان پر وسیع ہو یا تنگ۔ کثرت عبادت کی توفیق دئے جائیں یا نہیں اور یہ اس لئے کہ وہ نہیں جانتے کہ خیریت کس میں ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم نے فرمایا کہ ایک رات میں اپنے ورد سے سوگیا جس کی وجہ سے مجھے تکدر ہوا اور اس وقت میں اپنے اعمال پر اعتماد کرنے والوں میں تھا۔ دیکھا آپ نے شیخ کیا فرما رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اس وقت میں اپنے اعمال پر نظر کرتا تھا۔ چونکہ اخلاص تھا اس لئے اپنا کچا چٹھا سب بیان کردیا۔ ورنہ تو اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگوں کا سلوک تمام ہو چکا ہے اور اب سب لوگ ان عقبات سے گذر چکے ہیں اور کامل ہو گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ نہ تو عقبات سے نکلے ہو اور نہ سلوک ہی طے ہوا ہے۔ بس کچھ سمجھتے بوجھتے نہیں ہو اس لئے بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کیا دنیا کے امور میں تو فہم کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ کے طریق میں فہم کی ضرورت ہی نہیں اسی لئے ترقی نہیں ہو رہی ہے اور راستہ بند ہے۔ آج فہم بڑھاؤ اور باتوں کو سمجھو تو کام بن جائے گا

حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ چونکہ مجھے ورد کے چھوٹ جانے سے تکدر ہوا اس لئے نیند کی وجہ سے چند فرائض کے چھوٹ جانے کی سزا دیا گیا اور میرے باطن میں یہ ندا آئی کہ اے ابراہیم میرے بندے ہو جاؤ راحت پا جاؤ گے۔ یعنی ہم اگر سلادیں تو سو جاؤ اور اگر کھڑا کردیں تو کھڑے ہو جاؤ۔ درمیان میں تمہیں کسی چیز کا اختیار نہیں ہے۔

یہاں جاکر اعتماد اعمال سے اٹھا۔ اور بندے کو اپنی تجویز اور اپنی رائے اس لئے ختم کردینا چاہیئے کہ کبھی اللہ تعالیٰ اس کو گناہ میں اس لئے مبتلا فرماتے ہیں کہ وہ معصیت جو ذلت اور انکسار پیدا کرے اس طاعت سے کہیں بہتر ہے جو علو اور استکبار کا سبب بنے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ بندہ گناہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ گناہ کے بعد جو توبہ و استغفار کرتا ہے اور انابت و اعتراف کرتا ہے اس کی وجہ سے اس کی مغفرت ہوجاتی ہے۔ کیونکہ وہ اس گناہ کی وجہ سے ہمیشہ غمگین، افسردہ، شکستہ دل، شرمسار اور سرنگوں رہتا ہے اور یہ سب چیزیں حسنات ہیں حاصل یہ کہ عبودیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب محض اللہ تعالیٰ کے لئے کرے اس میں کسی اور غرض کی آمیزش نہ ہو اور اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں راضی رہے۔

اور اپنے لئے کوئی اختیار نہ ثابت کرے۔

فتح ربانی میں ہے کہ ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ کیا پہننا چاہتے ہو عرض کیا جو آپ پہنا دیں پھر دریافت کیا کون سا کام کرنا چاہتے ہو کہا جس کا آپ حکم دیں پھر سوال کیا کہاں رہنا چاہتے ہو عرض کیا جہاں آپ امر فرما دیں۔ یہ سن کر سید نے کہا کہ تم تو عجیب آدمی ہو کہ تمہاری کوئی مراد ہی نہیں ہے۔ اس نے عرض کیا کہ اے میرے سید بھلا عبد کے لئے بھی اپنے مالک کے ساتھ کوئی مراد ہوا کرتی ہے۔ یہ سنکر مولیٰ نے کہا کہ اے کاش میں بھی اپنے مالک حقیقی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا جیسے کہ تم میرے ساتھ ہو۔ جاؤ تم کو اسی بات پر آزاد کرتا ہوں اور اب یہ چاہتا ہوں کہ تم میری جگہ بیٹھو اور میں تمہاری خدمت کروں۔ اس لئے کہ تم میرے سید ہو تم نے مجھے بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ اسلئے تم اس لائق ہو کہ میں تمہاری خدمت کروں ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

صاحب ترصیع نے یہ بات خوب بیان فرمائی کہ کبھی اللہ تعالیٰ معصیت کے ذریعہ اپنے بندے کی آزمائش کرتا ہے اور وہی معصیت اس کے لئے توبہ و انابت کے بعد طاعت سے بہتر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ خیارکم کل مفتن تواب۔ یعنی تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو فتنہ میں پڑ جانے (یعنی ارتکاب معصیت) کے بعد کثرت سے توبہ کرے۔ ایسے شخص کو مفتون اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کے ذریعہ اس کا امتحان لیتے ہیں اور بار بار لیتے ہیں چنانچہ اس سے گناہ صادر ہوتا ہے اور وہ توبہ کرتا ہے پھر گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے۔ اسی طرح لوٹتا پوٹتا راستہ طے کرتا چلا جاتا ہے بقول شخصے ؎

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں گر پڑے گر کر اٹھے اٹھ کر چلے

بعض عارفین نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی ہے کہ امت کے خیار لوگ بھی زلل اور لغزش سے محفوظ نہ ہوں گے اور یہ کہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ان کو گناہوں سے باز نہ رکھ سکے گا۔ ان سے اس لئے گناہ ہو گا تاکہ اللہ تعالیٰ کی جانب توبہ اور انابت کے ساتھ رجوع ہوں۔ یہ انابت اور توبہ اللہ تعالیٰ کو نہایت پسند ہے چونکہ یہ معصیت پر موقوف ہے اس لئے ان حضرات سے بھی اس کا صدور ہو جاتا ہے یہی مطلب ہے اس قول کا جو بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ رُبَّ ذنبٍ یکون للمومن انفع من کثیر من الطاعات من وجلہ وانابتہ۔

یعنی بعضے گناہ ایسے ہیں جو مومن کے حق میں بہت سی طاعات سے بڑھ کر نافع ہوجاتے ہیں اسی لئے کہ وہ اس کے ارتکاب کے بعد اللہ تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں لاتا ہے اور اس کی جانب انابت کرتا ہے اسی وجہ سے کثرت سے توبہ کرنے والا ہوجاتا ہے اور حقیقی توبہ کے لئے وجل اور انابت لازم ہے اس کی وجہ سے یہ شخص خیار مجوبین میں سے ہوجاتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کو پسند فرماتے ہیں اور توبہ سے مراد یہاں وہ توبہ ہے جو قلب سے ہو نہ کہ وہ شخص جو صرف زبان سے استغفار کرے اور اس کا قلب معصیت پر مصر ہو۔ ایسا استغفار تو خود استغفار کا محتاج ہے۔

علامہ حرالی کہتے ہیں کہ منجملہ نفس کے وساوس اور شیطان کی ایجاد کے یہ بھی ہے کہ وہ گنہگار سے کہتا ہے کہ جب تک یہ نہ معلوم ہوجاوے کہ اب پھر اس گناہ کو نہ کروگے توبہ نہ کرنا کیونکہ ایسی توبہ سے کیا فائدہ جو ٹوٹ جائے۔ یہ شیطان کے مکائد میں سے ہے اور انسان کی ہوائے نفس کے قبیل سے ہے۔ لہٰذا انسان کو توبہ کی جانب سبقت کرنی چاہیئے پھر اگر توبہ ٹوٹ جائے تو مکرر توبہ کرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان کا یہ حال نہایت ہی پسند ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے اس کی طاعات کا عجب ٹوٹتا ہے اور رہی معصیت تو اس کو توبہ محو کردیتی ہے۔ بالآخر دونوں ہی کا خاتمہ ہوجاتا ہے یعنی نہ عجب ہی انسان میں رہ جاتا ہے اور نہ گناہ ہی باقی رہتا ہے یہ حق تعالیٰ کی تربیت ہے اس طریقہ سے جب وہ پاک وصاف ہوجاتا ہے تو ظاہر ہے کہ خیار المجوبین تو ہو ہی جائے گا اس سے معلوم ہوا کہ انسان جب طاعت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے ضرور کچھ عجب پیدا ہوجاتا ہے جس سے اس کو نکالنا ضروری ہوتا ہے۔ اور طاعت کا عجب جاتا نہیں جب تک کہ انسان اپنے کو مبتلائے معصیت دیکھ نہیں لیتا۔ پس اس معصیت کے عیب سے اس عجب کے عیب کا تو خاتمہ ہی ہوجاتا ہے اب رہ گئی معصیت تو اس کے ازالہ کے لئے حق تعالیٰ نے توبہ کو مشروع کیا۔ چنانچہ انسان جب صدق دل سے توبہ کرتا ہے اور اس کے قلب میں وجل اور انابت کی صفت پیدا ہوجاتی ہے تو وہ گناہ بھی معاف ہوجاتا ہے۔ اسی چیز نے اولیاء اللہ کی کمر توڑ دی ہے یعنی یہ حضرات چاہتے ہیں کہ گناہ سرزد نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ طاعت پر ان کی نظر نہ ہو اس لئے گناہ کا صدور ان سے بھی ہوجاتا ہے اور گو ان حضرات کو انابت الی اللہ طاعت میں کبھی نصیب ہوتی ہے مگر اس میں خوف نہیں ہوتا اس لئے انسان عجب وغیرہ میں مبتلا ہوجاتا ہے برخلاف اس

انابت کے جو اہل معاصی کو ارتکاب معصیت کے بعد پیدا ہوتی ہے کہ اس میں خوف بھی ہوتا ہے اسی لئے یہ انابت اس انابت سے بڑھ جاتی ہے اور واقعی انسان ایسی طاعت کرے جس سے یہ سمجھتا ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کر رہا ہوں اور پھر اس کی وجہ سے اس کے قلب میں خوف پیدا ہو جائے یہ بہت مشکل کام ہے کیونکہ طاعت کی وجہ سے اس کو ایک کیف و سرور حاصل ہوتا ہے جس کا نتیجہ عجب و پندار تو ہو سکتا ہے باقی خوف نہیں ہوا کرتا الا ماشاء اللہ اسی وجہ سے یہ عابد درجہ میں اس گنہگار سے کم ہو جاتا ہے نہ اس وجہ سے کہ اس نے عبادت کی بلکہ اس وجہ سے کہ اس کے ساتھ رذائل کو بھی شامل کر لیا اسی طرح سے جو گنہگار کہ ۔ انابت اور وجل کے ساتھ متصف ہو وہ درجہ میں عابد سے بڑھ جاتا ہے نہ اس وجہ سے کہ اس نے وہ معصیت کی ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے بعد اس نے وجل اور انابت جیسی باطنی طاعت بھی کی ہے اس نے اس کا درجہ بڑھا دیا آج ہماری ایمانی ترقی جو نہیں ہو رہی ہے تو اسی لئے کہ ہم اپنے باطن سے غافل ہیں اور پہلے لوگوں نے جو ترقی کی تھی تو اس لئے کہ ان کی نظر اپنے باطنی اعمال پر بھی ہوتی تھی اور باطنی عمل کا یہ حال ہوتا ہے کہ لوگ تو اس کو عمل سے عاری سمجھتے ہیں اور وہ اندر اندر کام کرتا رہتا ہے مثلاً یہی خوف اور انابت ہی ہے ۔ یہ جس کے قلب میں جاگزیں ہو جائیگی تو اس کو چین نہ لینے دیگی ۔ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنے قلب و جگر کو اس شخص نے خون کر دیا ۔ یہی ایمان ہے اور کسی دوسرے شخص کو اس کی اطلاع بھی نہیں ہوتی ۔ چنانچہ مومن کے قلب میں خوف و رجا ہر وقت موجود ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ اپنے دماغی توازن کو ٹھیک رکھتا ہے ۔ اگر طاعات سے عجب کا کچھ خیال ہوا تو خوف کو اپنے پیش نظر کر لیتا ہے اور اگر خوف و یاس کا غلبہ ہوا تو رجاء کو مدنظر کر لیتا ہے ۔ اسی لئے آپ نے سنا ہوگا کہ الایمان بین الخوف والرجاء یعنی ایمان نام ہی اس کا ہے کہ انسان امید و بیم کے مابین رہے ۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی وعیدوں کا اس کو خوف لگا ہو اور وعدے سے رجا قائم ہو ۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ بھی کیا ہے اور دوزخ کا ذکر کر کے وعید بھی سنائی ہے اسی لئے مومن کا دونوں پر ایمان ہوتا ہے اور اس کے قلب میں یہ دونوں صفتیں موجود ہوتی ہیں ۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ جو بہت زبردست عالم تھے اور حضرت مولانا شاہ فضل رحمنؒ کے خلیفہ بھی تھے ان سے کسی نے دریافت کیا کہ مولانا مزاج کیسا ہے فرمایا کہ بھائی مومن کا کیا مزاج پوچھتے ہو دنیا میں تو وہ بین الخوف والرجا ہی رہتا ہے اور جو شخص خوف و رجا کے درمیان ہو اسکا مزاج ہی کیا ۔ مزاج کا حال تو اس وقت بیان کیا جا سکتا ہے جب دخول جنت کی بشارت سن لیں ۔

سبحان اللہ کیسا عمدہ عالمانہ اور صوفیانہ جواب دیا۔ علماء نے اس جواب کو بہت پسند فرمایا ہے غرض مومن کے قلب میں خوف و رجا برابر ہی موجود رہتی ہیں اس سے اس کو خلو نہیں ہوتا۔ آج بمبئی سے ایک صاحب کا خط آیا ہے یہاں سے جانے کے بعد اپنے تاثرات کو ان صاحب نے ایک شعر میں ادا کیا ہے وہ یہ ہے ؎

بے رونقی جمود۔ تعطل۔ سکوتِ مرگ
ایسا ہے کائنات کا نقشہ ترے بغیر

یہ انھوں نے لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بھائی جب قلب میں خوف و رجا متمکن ہو اور باہم دونوں متلاطم بھی ہوں یعنی کبھی یہ غالب ہو اور کبھی وہ غالب ہو اس میں بھلا سکون و سکوت کہاں۔

بہرحال کلام طویل ہوگیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ خوف اور رجا یہ دونوں قلب کی صفات ہیں اور باطنی عمل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اس باطنی عمل سے متصف ہو گو بظاہر طاعت وغیرہ میں اس کی کمی ہو یا معصیت ہی میں کیوں نہ مبتلا ہو برخلاف اس کے کہ ایک شخص ایسا ہوتا ہے کہ ظاہری طاعات تو اس کے پاس بہت ہوتی ہیں مگر ان باطنی اعمال سے وہ کورا ہوتا ہے اور بجائے اس کے دوسرے باطنی رذائل میں مبتلا ہوتا ہے چنانچہ جب ان دونوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو یہ باطنی طاعت ہی ظاہری طاعت پر غالب آجاتی ہے اور جیسا کہ عابد ناپارسا اور گنہگار کے واقعہ میں مفصل بیان کیا جا چکا ہے کہ اس گنہگار کی رجا اور انابت کام آگئی اور اس پارسا کی پارسائی کا اس کے عجب نے ناس کر دیا اور گنہگار سے رجا اس لئے پسندیدہ ہے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے اس کا امر فرمایا ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا۔

اس میں قنوط یعنی ناامیدی سے نہی فرمائی ہے جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ رجا کا امر فرمایا گیا ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ ایک چیز سے نہی اس کی ضد کا امر ہوتا ہے اور کسی چیز کا امر اس کے خلاف سے نہی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کا کس قدر فضل عظیم ہے کہ گنہگاروں کو امید رکھنے کا امر فرمایا اور ناامیدی سے منع فرمایا۔ چنانچہ علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ سے نڈر اور بے خوف ہو جانا کفر ہے اسی طرح اسکی رحمت سے ناامید ہونا بھی کفر ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ:۔ ؏ "ناامیدی را خدا گردن زدہ است"

یعنی اللہ تعالیٰ نے ناامیدی کی گردن ہی مار دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ نے اس آیت کو ارجیٰ آیت فرمایا ہے۔ مکتوبات معصومیہ میں اس کے متعلق نہایت ہی عمدہ کلام فرمایا ہے۔ اسکو ہم بیان بیان کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے ایک اور سوال و جواب نقل کیا ہے جو خالی از لطف نہیں ہم پہلے اس کو ہی بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں:۔

نوشتہ بودند کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والبرکات در مقام رضا بودہ اند پس آیت کریمہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى بچہ معنیٰ است۔ مخدوما رضا بر دو گونہ است۔ رضائیست پیش از وجود عطیہ۔ انبیاء را علیہم الصلوٰۃ والبرکات امروز ایں رضا حاصل است عطیہ و عدم عطیہ و نعمت و نقمت دریں رضا مستوی است ہر چہ ازاں طرف می رسد و قضائے ازلی براں رفتہ است بآں راضی اند و رضائیست بعد وجود عطیہ و پیغمبر را صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم در روز قیامت چوں عطیات و انعامات بیشمار شود ... پیغمبر فرمائند علیہ الصلوٰۃ والسلام بس است من راضی شدم۔

آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والبرکات تو مقام رضا میں ہوتے ہی ہیں پس آیت کریمہ ولسوف يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى یعنی آپ کا رب آپ کو اتنا دیگا کہ آپ راضی ہو جاویں گے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ مخدوم من! رضا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ رضا ہے جو انعام کے وجود سے پہلے ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والبرکات کو یہ رضا ہر وقت حاصل ہوتی ہے۔ عطیہ کا ملنا نہ ملنا۔ نعمت اور نقمت سب حال اس رضا میں یکساں ہیں یعنی جو چیز کہ ان کی جانب سے پہونچے اور جس پر قضا جاری ہو چکی ہے۔ یہ حضرات اس پر دل سے راضی ہیں۔ اور ایک درجہ رضا کا وہ ہوتا ہے کہ انعام، عطایا وغیرہ ملنے کے بعد ہی رضا حاصل ہوتی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت میں جب بے شمار انعامات اور عطایا کا مشاہدہ کریں گے تو فرماویں گے کہ پروردگار بس۔ بس۔ میں راضی ہو گیا۔

(ص ۲۲۲ ج ۳)

اب اس کے بعد وہی گفتگو ہے جو میں اس موقعہ پر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ:۔

از امام محمد باقر منقول است کہ گفت اہل عراق شما می گوئید کہ ارجیٰ آیت در قرآن شریف لا تقنطوا من

حضرت امام محمد باقر سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ تم اہل عراق یہ کہتے ہو کہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ امید والی آیت لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ہے اور

رَحْمَةِ اللّٰهِ است و ما اہل بیت برانیم که امید در آیت وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى بیشتر است۔ چہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم راضی نہ شود کہ یکے از امت او در دوزخ باشد گوئیم کہ می تواند کہ ارجی آیت نسبت بعامۃ الخلق آیت اولی بود و ارجی نسبت بایں امت آیت ثانیہ بود۔

ہم اہل بیت اس کے قائل ہیں کہ آیت وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى میں زیادہ امید ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک راضی ہی نہ ہوں گے جب تک کہ آپکا ایک امتی بھی دوزخ میں ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ تطبیق اسطرح ہو سکتی ہے کہ عام مخلوق کے اعتبار سے زیادہ امید والی آیت اول لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ہے اور اس امت محمدیہ کے اعتبار سے آیت ثانی وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ہے۔

(مکتوبات معصومیہ جلد ثالث ص۲۲)

دیکھا آپ نے یہاں اس امر میں اختلاف ہوگیا کہ ارجی آیت کون سی ہے کسی نے لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کو کہا اور کسی نے وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى کو کہا اور امام محمد باقرؒ نے کیسی عمدہ تطبیق فرمائی لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ تو عام لوگوں کے لئے ہے یعنی تمام امتوں کے کے لئے اور وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى خاص اس امت کے لئے ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو بکثرت نعمتیں دیگا اتنی کہ آپ اس سے خوش ہو جائیں گے۔ پس یہ آیت ارجی آیت اس لئے ہوئی کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی فرمادینے کا گویا وعدہ فرمایا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر آپ کی امت کا ایک فرد بھی جہنم میں ہوگا تو آپ کیوں کر راضی ہو جائیں گے یہ آپ کی شان کرم سے بعید ہے۔ اسی مضمون کو کسی نے خوب ادا کیا ہے ؎

أَلَمْ يُرْضِكَ الرَّحْمٰنُ فِيْ سُوْرَةِ الضُّحٰى
فَحَاشَاكَ أَنْ تَرْضٰى وَفِيْنَا مُعَذَّبٌ

یعنی کیا آپ کو رحمٰن نے سورہ والضحیٰ میں راضی کرنے کا وعدہ نہیں فرمایا ہے تو آپ سے بعید ہے کہ راضی ہو جائیں اگر ہم میں سے ایک فرد بھی جہنم میں معذب ہو۔

سبحان اللہ خوب مضمون ہے۔

الاعتراف والاستغفار من الذنوب من اعظم سنن النبی الکریم

(گناہوں کا اعتراف واستغفار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ترین سنت ہے)

اب آپ کو ایک اور آیت سناتا ہوں۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :۔
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً وَّاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ (پارہ ۴)

اس آیت کے متعلق روح المعانی میں ہے کہ امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ یہ تمام قرآن میں سے اخوف آیت ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس نار کی دھمکی دی ہے جو کافرین کے لئے تیار کی گئی ہے وہ اس میں داخل ہوں گے۔ جب کہ وہ محارم سے اجتناب نہ کریں۔ جس طرح سے کہ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ارجیٰ آیت ہے اسی طرح پر یہ اخوف آیت ہے۔ ارجیٰ کو پاکر تو آپ لوگ بہت خوش ہوئے اخوف کو بھی تو لیجئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن شریف میں خوف ورجا دونوں کا ذکر ہے لیکن ہم قرآن شریف برابر پڑھتے ہیں اور یہ خبر نہیں کہ قرآن شریف کو بھی سلوک میں کچھ دخل ہے یا نہیں۔ رجا اور خوف یہ دونوں قلب کی صفات ہیں لہٰذا علماء کسی آیت کے متعلق یہ جو فرماتے ہیں کہ یہ ارجیٰ آیت ہے یا فلاں اخوف آیت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب ان آیتوں پر سے گذرو تو قلب میں بھی یہی کیفیت موجود ہونی چاہیئے کیونکہ اگر قلب میں ان کے مضامین کا کچھ بھی اثر نہ ہوا تو ان کا ارجیٰ یا اخوف ہونا ہمارے کس کام آیا۔ اس لئے مومن کو چاہیئے کہ علی العموم تلاوت کے وقت قلب کو حاضر رکھے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں اور کس کا کلام پڑھ رہا ہوں۔ بالخصوص اس قسم کی آیت پر سے جب گذرے تو اپنی توجہ اور التفات کو قوی کرے اور دلی قصد وارادہ کے ساتھ ان آیات کو زبان سے پڑھے اور سعی اس بات کی کرے کہ قلب بھی ان کے مضامین اور اثرات سے سرشار ہو۔ چنانچہ اگر ایک بار کے پڑھنے میں یہ کیفیت قلب میں نہ محسوس کرے تو مکرر وسہ کرر پڑھے اور جب تک اس کیفیت کا کچھ حصہ نصیب نہ ہو جائے آگے نہ بڑھے۔ چنانچہ آگے فرماتے ہیں کہ :۔
وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝
ایک صاحب جو انگریزی دانوں کے نزدیک مسلم شخص تھے وہ کہتے تھے کہ حضرت ہاجرہ کو

صفا و مروہ پر دوڑا کر اللہ تعالیٰ نے سب کو قیامت تک کے لئے دوڑا دیا میں نے کہا کہ آپ نے وہ تو دیکھا اور اسکو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں آیت وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ الخ نازل فرما کر سب کو مغفرت اور جنت کی طرف دوڑا دیا اور یہاں مراد اس کے اسباب ہیں یعنی اعمال صالحہ۔ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ادائے فرائض کی طرف سبقت کرو۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اسلام کی طرف۔ ابوالعالیہؒ کہتے ہیں کہ ہجرت کی طرف۔ انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ نماز کی تکبیر اولیٰ کی طرف۔ سعید بن جبیرؒ کا ارشاد ہے کہ ادائے طاعت کی طرف۔ حضرت یمانؓ سے منقول ہے کہ صلوٰۃ خمسہ کی طرف۔ ضحاک کہتے ہیں کہ جہاد کی طرف۔ حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں کہ توبہ کی طرف۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ تمام ہی معنیٰ مراد ہیں جس میں سارے اعمال داخل ہیں اور آیت میں مغفرت کی تقدیم جنت پر اس لئے کی گئی کہ مغفرت میں تخلیہ ہے اور جنت میں تحلیہ اور تحلیہ سے تخلیہ مقدم ہوتا ہے یا اس لئے کہ مغفرت ہی سبب دخول جنت کا ہوگا اور اس موقع پر رب کا لفظ استعمال فرمانا اور اسکو مخاطبین کی جانب مضاف کرنا ان کے اوپر مزید لطف و کرم کے اظہار کے لئے ہے اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ بنی اسرائیل ہم سے زیادہ خدا کے نزدیک مکرم ہیں اس لئے کہ ان میں کوئی شخص جب گناہ کرتا تھا تو اس حال میں صبح کرتا تھا کہ اس کا گناہ اور اس کی سزا کو اس کے دروازے پر لکھ دیا جاتا تھا مثلاً یہ کہ اپنی ناک کاٹ یا اپنا کان کاٹ یا ایسا ایسا کر۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش ہوگئے۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی جس کا آخری حصہ یہ ہے کہ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

(پارہ ۴۔ سورہ نساء)

اس آیت کے متعلق یہ بھی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں میں مواخاۃ فرمادی چنانچہ وہ دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے تھے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان میں سے ایک شخص غزوہ میں چلا گیا اور دوسرے کو اپنے اہل خانہ اور اپنی ضروریات خانہ داری پر محافظ بنا گیا۔ اس سے اپنے ساتھی کی عدم موجودگی میں کوئی گناہ صغیرہ ہوگیا۔ اس پر وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ سے توبہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا ساتھی واپس آیا اور اس کی تلاش میں نکلا دیکھا تو ایک جگہ وہ سجدے میں پڑا ہوا ہے اور یہ کہہ رہا ہے ربی ذنبی۔ ربی ذنبی۔ یعنی اے رب میں نے بڑے گناہ کا کام

کیا اور اپنے بھائی کی امانت میں خیانت کی اس نے اسے اٹھایا اور کہا کہ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اور اپنے گناہ سے استغفار کی درخواست کرو۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ کشادگی فرما دیں چنانچہ ادھر وہ مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ نماز عصر کا وقت تھا ادھر جبرئیل علیہ السلام اس کی توبہ لیکر حاضر ہوئے یعنی یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی وَالَّذِیْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً ..... الی قولہ سبحانہ و تعالیٰ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ۔ اس پر حضرت عمرؓ بولے کہ یا رسول اللہ کیا اسی کے لئے خاص ہے یا سب کے لئے عام ہے۔ حضور نے فرمایا کہ نہیں سب کے لئے عام ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابلیس نے اپنے لشکر کو بلایا اور اپنے سر پر مٹی اڑانے لگا اور ویل و ثبور پکارنے لگا۔ یہاں تک کہ ہر طرف سے اس کے لشکری آگئے سب نے اس سے پوچھا کہ اے ہمارے سید یہ آپ کا کیا حال ہے اس نے کہا کہ کچھ نہ پوچھو کتاب اللہ میں ایک ایسی آیت نازل ہوگئی ہے کہ اب اس کے بعد کسی بنی آدم کو کوئی گناہ بھی مضر نہ ہوگا۔ ان سب نے پوچھا کہ وہ کون سی آیت ہے اس نے یہی آیت بتلائی۔ ان سب نے کہا حضور پریشان نہ ہوں ہم ان لوگوں کے لئے خواہشات کا دروازہ کھولدیں گے۔ پس نہ تو کوئی توبہ کرے گا نہ استغفار ہی کرے گا اور جو کام بھی کریںگے تو یہی سمجھیں گے کہ ہم حق پر ہیں۔ یہ سن کر ابلیس خوش ہوگیا اور اس سے اس کے کچھ آنسو پونچھ گئے میں کہتا ہوں کہ علماء نے اس کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ یہ ارجیٰ آیت ہے لیکن آیت کے شان نزول اور اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس پر سب سے زیادہ شاق یہی آیت ہوئی۔ اور گنہگاروں کے لئے کس قدر تسلی اور شفقت ہے کہ وہ گناہ کرنے کے بعد اگر اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرلیں تو پھر ایسے ہو جائیں کہ گویا انھوں نے گناہ کیا ہی نہیں۔ چنانچہ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰہُ کے عنوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذنبین کے لئے بجز حق تعالیٰ کے کرم اور فضل کے اور کوئی مفزع نہیں ہے اور یہ اس لئے کہ جو ذات ایسی ہو کہ اس کی رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہو تو ظاہر ہے کہ کرم و فضل کے نشر میں اس کا کوئی ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ آیت ارجیٰ آیت یوں ہے کہ بندہ جب حق تعالیٰ کی ایسی عنایت دیکھے گا اور توبہ کے متعلق اس قدر اہتمام دیکھے گا تو اس کے نشاط میں حرکت ہوگی اور اس کے میلان میں تقویت ہوگی تو پھر وہ توبہ سے صبر ہی نہ کر سکے گا۔ نیز بطور استغراق کے جو بیان کیا گیا تو اس سے مقصود یاس اور قنوط کا قلع قمع کرنا ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ إِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا میں قنوط سے صراحۃً منع فرما دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اللہ والوں

کو مغفرت کی امید لگانے کا ایک ذریعہ ہاتھ آگیا۔ چنانچہ بزرگوں نے اسی کے حوالہ سے دعائیں کی ہیں۔ حضرت شیخ عطارؒ فرماتے ہیں ؎

مغفرت دارم امید از لطف تو
زانکہ خود فرمودہ لَا تَقْنَطُوْا

یعنی آپ کے لطف و کرم سے امید مغفرت کی اس لئے رکھتا ہوں کہ آپ نے خود ہی لا تقنطوا فرمایا ہے۔ اب اس حکم کے بعد پھر یاس و ناامیدی کفر ہی ہے۔

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ جس طرح اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ کے متعلق امام صاحبؒ نے یہ فرمایا کہ اخوف آیت ہے تو آگے اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ جو فرمایا ہے اس کے متعلق قرینہ مقابلہ سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ارجیٰ آیت ہے مجھے تو اس وقت یہاں یہ بیان کرنا تھا کہ یہ آیتیں بھی ارجیٰ آیتیں ہیں لیکن جب مضمون سامنے آگیا ہے تو اس آیت کی تفسیر بھی سن لیجئے کیونکہ اس میں مکارم اخلاق کا بیان ہے۔ جب یہ فرمایا کہ جنت متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے تو آگے یہ بیان فرماتے ہیں کہ متقی کون لوگ ہیں۔ یہاں ان کے تین اوصاف بیان فرمائے۔ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ اور وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ اور وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ

یعنی ان کی ایک صفت انفاق ہے خواہ حالت عسر کی ہو یا یسر کی۔ حال سرور کا ہو یا غم کا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زندگی میں بھی خرچ کرتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی بشکل وصیت اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان مقامات پر بھی خرچ کرتے ہیں جہاں انھیں اچھا معلوم ہوتا ہے یعنی اولاد و عزیز قریب پر اور ان مقامات پر بھی خرچ کرتے ہیں جہاں خرچ کرنا انھیں کھلتا ہے۔ مثلاً اپنے دشمنوں پر۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک دانہ انگور کا بھی صدقہ کردیا۔ بعض سلف سے منقول ہے کہ ان کے پاس ایک پوٹی پیاز کی تھی اس کو بھی انھوں نے صدقہ کردیا۔ حدیث شریف میں ہے اتقوا النار ولو بشق تمرۃ اور یہ بھی آتا ہے کہ سائل کو کچھ نہ کچھ ضرور دو اگرچہ جلی ہوئی کھری ہی کیوں نہ ہو۔

اب کظم غیظ کے متعلق سنئے۔ کظم کے معنی ہیں بھر جانے پر مشک کا منہ بند کردینا اور غیظ کہتے ہیں کسی منکر امر کو دیکھ کر طبیعت میں ہیجان کا پیدا ہوجانا۔ غیظ میں اور غضب میں فرق یہ ہے کہ غضب کے بعد انتقام کا ارادہ ضرور پیدا ہوجاتا ہے اور غیظ میں یہ ضروری نہیں ہے ایک قول یہ ہے کہ غضب وہ ہے کہ جس کا اثر بلا اختیار جوارح بشرہ پر ظاہر ہو اور غیظ میں ایسا نہیں ہوتا۔

حدیث شریف میں ہے کہ جس نے کظم غیظ کیا اور وہ اس کے نافذ کرنے پر بھی قادر رہے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو امن و ایمان سے بھر دیگا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کظم غیظ کیا اور وہ اس کے جاری کرنے پر بھی قادر رہے تو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو سب لوگوں کے سامنے طلب فرمائیں گے اور اختیار دینگے کہ جس حور کو چاہے لیلے دیکھئے کظم غیظ کی اتنی تو فضیلت آئی ہے اور کتنے کتنے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے مگر دیکھتا ہوں کہ آج جس قدر عملداری غصہ کی ہے اتنی اور کسی چیز کی نہیں۔ ہر شخص اس کی وجہ سے بادشاہ بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں اتنا مزہ ہے کہ عمدہ عمدہ کھانوں میں بھی نہیں ہے۔

اب عفو کے متعلق سنئے۔ متقی وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو معاف کرتے ہیں یعنی تسامح فرماتے ہیں ان لوگوں کو سزا دینے سے جو مستحق مواخذہ ہوتے ہیں جبکہ اس کو معاف کرنے میں کوئی دینی نقصان نہ ہو۔ حضرت حسن سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں ارشاد فرمائیں گے کہ جس شخص کا اللہ پر اجر ہو وہ کھڑا ہو جائے تو کوئی شخص نہ کھڑا ہو گا۔ بجز اس کے جس نے دنیا میں معاف کیا ہو گا۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے لئے مکانات تعمیر کئے جائیں اور اس کے درجات بلند ہوں تو چاہیئے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو معاف کر دے اور جو اس سے محروم کرے اسکو دے اور جو قطع رحمی کرے اس کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔ سبحان اللہ یہ صفات تھے متقیوں کے اب جو ترقی نہیں ہو رہی ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ علم صحیح نہیں ہے چنانچہ آپ کو بھی دین کا علم نہیں ہے۔ اب کس کو غرض پڑی ہے کہ وہ آپ کی خاطر دردسری مول لے اور آپ کو دین کا علم سکھلائے۔ میں تو کہتا ہوں کہ خود آپ کو بھی غرض نہیں پڑی ہے۔ باقی آپ جو کسی کے پاس آتے جاتے ہیں تو محض تبرک بنانے کے لئے اور اس کے بدن پر گرنے کے لئے۔ اللہ تعالیٰ نے تو متقیوں کے لئے جنت کو تیار فرمایا ہے اور آپ ہیں کہ اس کو یاد بھی نہیں کرتے۔

خیر یہ گفتگو تو ضمناً آگئی تھی میں اصل میں خوف و رجا پر کلام کر رہا ہوں اور الحمد للہ کہ ایک حد تک اس پر مفصل کلام ہو گیا چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ قلب کی صفات ہیں اور ظاہر ہے کہ جس قلب میں خوف و رجا موجود ہوں تو وہ انسان تو اپنے ہی متعلق اندیشہ میں پڑ جائے گا اسکو دوسروں کی برائی دیکھنے کی فرصت ہی کب ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب عابد کا قلب ان صفات سے خالی ہوتا ہے تو اس کی نظر اپنی طاعت پر پڑتی ہے اور دوسروں کے گناہ پر پھر اس کی وجہ سے عجب و تکبر پیدا ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ دوسروں کو کچھ زجر و توبیخ کرتا ہے اور گنہگار، فاسق

کو دیکھ کر چیں بجبیں ہوتا ہے۔ پس منشار تو اس کا ہوتا ہے کبر باطن اور وہ اسکو سمجھتا ہے غضب للہ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں میں التباس شدید ہے۔

یہیں سے اس اشکال کا جواب بھی سمجھ میں آگیا جو اس مقام پر ہو سکتا ہے وہ یہ کہ فساق و فجار اور کفار سے تو بغض رکھنے کا شریعت میں حکم ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق مکتوبات معصومیہ میں ہے کہ :-

"افسوس صوفیائے خام اور اس زمانہ کے ملاحدہ کفار سے موالات میں باک نہیں رکھتے اور یہ کہتے ہیں کہ فقیری کا راستہ کسی سے برا نہ بننا ہے۔ سبحان اللہ سرور انبیاء اور رئیس الاولیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو تو یہ حکم دیا گیا کہ یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ اور آپ کا طریقہ مرضیہ تو غلظت اور قتال با کفار تھا۔ عجب قسم کے فقرا ہیں کہ پیغمبر خدا کا راستہ ترک کر کے دوسرا راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں حالانکہ آپ کے طریقہ کو چھوڑنے کے بعد سوائے گمراہی اور ضلالت کے کیا رہ جاتا ہے۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ

بلا شبہ کفار اعداء اللہ ہیں نص قطعی اس پر دال ہے عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو ان سے دوستی کا دعویٰ ہے اور دوسری جانب ان کے دشمنوں سے بھی دوستی۔ اگر کفار و فساق اعداء حق اور عند اللہ مبغوض نہ ہوتے تو بغض فی اللہ واجبات دین میں سے نہ ہوتا اور افضل مقربات اور مکمل ایمان نہ قرار پاتا اور ولایت کے حصول کا سبب اور قرب حق اور رضائے باری تعالیٰ کا ذریعہ نہ بنتا۔" حدیث شریف میں ہے کہ :-

عَنْ عمرو بن الجموح انه سمع النبی صلی الله علیه وسلم لا یحق العبد حق صریح الایمان حتی یحب لله ویبغض لله فاذا

حضرت عمرو بن الجموح کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ بندہ صریح ایمان کا حق نہیں ادا کرتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے لئے حب اور بغض کرنے لگے۔ چنانچہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے لئے محبت اور اللہ تعالیٰ کے

احب اللہ تبارک وابغض اللہ تبارک فقد استحق الولاء من اللہ

(رواہ احمد)

کے لئے بغض کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی محبت کے رجانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔

وعن ابی امامۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان

(رواہ ابوداؤد)

حضرت ابوامامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ کے واسطے محبت کی اور اللہ کے واسطے بغض رکھا اور اللہ کے واسطے دیا اور اللہ کے واسطے روکا اس نے ایمان کی تکمیل کر لی۔

وہم درحدیث آمدہ است

تقربوا الی اللہ سبحانہ ببغض اھل المعاصی والقوھم بوجوہ مکفھرۃ والتمسوا رضاء اللہ تعالیٰ بسخطھم وتقربوا الی اللہ عزو جل بالتباعد منھم۔

نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ

اللہ تعالیٰ سبحانہ کا قرب حاصل کرو اہل معاصی سے بغض کرکے اور ان سے ترش روئی کے ساتھ ملو اور اللہ تعالیٰ کی رضا ان لوگوں کی ناراضگی میں حاصل کرو اور اللہ تعالیٰ کا قرب ان سے دوری میں تلاش کرو۔

وہم درحدیث آمدہ است

اوحی اللہ تعالیٰ الی نبی من الانبیاء قل لفلان العابد اما زھدك فی الدنیا فتعجلت راحۃ نفسك واما انقطاعك الی فتعززت بی فماذا عملت فی مالی علیك قال یارب وماذا علی قال ھل عادیت فی عدوا وھل والیت لی ولیا۔

نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سابق انبیاء میں سے کسی نبی کی جانب وحی بھیجی کہ فلاں عابد سے کہہ دو کہ رہا تیرا یہ دنیا سے زہد تو وہ تو اس لئے ہے کہ (کسب کی مشقت سے) تیرا نفس راحت پا گیا۔ اور رہا میری جانب تیرا انقطاع تو، تو نے میری وجہ سے عزت بھی تو پائی۔ یہ تبلا کہ میرا تجھ پر جو حق تھا اس کو تو نے کتنا ادا کیا؟ اس نے عرض کیا کہ اے رب مجھ پر کون سا تیرا حق تھا (جسکو میں نے نہیں ادا کیا) ارشاد ہوا کہ میرے لئے میرے کسی دشمن سے کبھی دشمنی رکھی؟ اور میری خاطر کبھی کسی میرے ولی کی زیارت کو تو گیا؟

مکتوبات معصومیہ ص

آگے فرماتے ہیں کہ:۔

والحق کہ محبت دوستان محبوب و عداوت دشمنان او از لوازم محبت است۔ محب صادق دریں دو عمل محتاج کسب و تعمل نیست چنانکہ در اعمال دیگر محتاج است۔ دوستان دوست چہ بلا زیبا بہ نظر درآیند و دشمنان او چہ قدر زشت ایں معنیٰ در مجاز ظاہر است ہر کہ دعوی دوستی نماید تا تبری از دشمنان او نکند مقبول نیست از منافق بیش نمی دانند۔

حق یہ ہے کہ محبوب کے دوستوں سے محبت اور اس کے دشمنوں سے عداوت بھی محبت کے لوازم سے ہے۔ محب صادق ان دونوں کاموں میں عمل اور کسب کا محتاج نہیں ہے (مطلب یہ کہ) جس طرح سے دیگر اعمال میں (جب کسی کام کو باختیار خود کرتا ہے تب ہی وہ ہوتا ہے لیکن یہاں محبوب کے دوست سے محبت اور دشمنوں سے عداوت اضطراری طور سے ہوتی ہے) واقعی دوست کے احباب بھی محب کی نظروں میں کسقدر خوب رو اور اسکے اعدا کسقدر بدرو معلوم ہوتے ہیں اسکا اندازہ اہل مجاز کے معاملات سے بھی عیاں ہے۔ (وہ یہ کہ) مثلاً جو شخص کسی سے دوستی کا دم بھرے تو جب تک کہ اس کے دشمنوں سے بیزاری نہ ظاہر کردے اس کا دعویٰ مقبول نہیں ہے۔ بلکہ منافق سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

(مکتوبات معصومیہ صفحہ ۹)

دیکھئے کس قدر زوردار کلام فرمایا ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لئے کہ فاسق فاجر اور کافر سے بغض رکھنا ہی علامت ایمان ہے اور ان سے ترشرو چہرہ کے ساتھ ہی ملنا چاہیئے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قرب ان سے دوری اختیار کرنے میں ہے۔ اشکال یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے جیسا کہ حدیث شریف سے معلوم ہوا تو پھر اس عابد نے اس گنہگار کو جو بہ نظر حقارت اور ترشرو چہرہ کے ساتھ دیکھا تھا تو کیا برا کیا تھا۔ حالانکہ شیخ نے اس کا جو یہ حال بیان کیا ہے کہ ؎

دراں خیمہ عابد سرپرغرور ترش کردہ برفاسق ابرو زدور

یہ کچھ بطور مدح کے نہیں بیان کیا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ مکتوبات معصومیہ میں جو روایات مذکور ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فاسق و فاجر سے بغض رکھنا چاہیئے۔ یہ بھی صحیح ہے لیکن حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں کہ من ابغض للہ جس سے یہ معلوم ہوا کہ بغض جو مطلوب و محمود ہے وہ ہے جو اللہ کے لئے ہے اپنے نفس کے لئے نہ ہو اور یہاں اس عابد پر جو نکیر کیگئی تو اس لئے کہ اس نے جو کچھ کیا تھا اپنے نفس کے لئے کیا تھا اس میں وہ مخلص نہیں تھا۔

مخلص کا کچھ انداز ہی جدا ہوتا ہے اس کے غضب میں بھی نور ہوتا ہے۔ وہ گناہ کو برا سمجھتا ہے مگر گناہگار کی ذات کو حقیر نہیں سمجھتا۔ بلکہ اپنے ہی اوپر خائف رہتا ہے کہ معلوم نہیں میرا کیا حال ہو اس کی گفتگو میں کبر اور عجب کی شان نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس عابد ناپارسا کا یہ حال نہیں تھا بلکہ وہ اپنے کو کامل سمجھ رہا تھا اور تھا کچھ نہیں اور باتیں اپنے متعلق ایسی کر رہا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ کاملین کی فہرست میں خود کو داخل کرنا چاہتا ہے یہ بہت برا ہے بغض فی اللہ کا درجہ حاصل کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ یہ تو نقالی ہوئی۔ اور نیک لوگوں کی شباہت اختیار کرنا ہوا اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے یعنی اس میں کہ ایک وہ شخص ہو جو واقعی کامل ہو اور ایک وہ جو کمال کا دعویٰ کرتا ہو۔ مولانا رومؒ نے مثنوی میں اس مسئلہ کو ایک مثال کے ذریعہ خوب ہی سمجھایا ہے۔ چنانچہ شغال رنگین کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک گیدڑ رنگ کے مٹکے میں گر گیا۔ نکلا تو رنگین تھا۔ اس نے اپنے ہم جنسوں کے سامنے یہ دعویٰ کیا کہ میں مور ہو گیا ہوں اور اس پر اپنے ظاہری رنگ کو دلیل بنایا کہ میرا بدن دیکھو اور اپنا بدن دیکھو۔ دوسرے گیدڑوں کو اس کا یہ دعویٰ برا تو معلوم ہوا لیکن ظاہری فرق کا کوئی جواب بھی نہیں تھا اس لئے خاموش ہو گئے۔ ایک پرانا گیدڑ آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ تم مور ہو گئے ہو اچھا مور تو ناچتا ہے اور بولی بھی بولتا ہے۔ تم بھی ناچو اور بولی بولو۔ چنانچہ وہ بولا تو گیدڑ کی سی بولی جس سے سب پر اسکا گیدڑ ہونا ظاہر ہو گیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اسی طرح سے بعضے لوگ اپنے ظاہر کو رنگ لیتے ہیں اور دعویٰ کمال کا کرتے ہیں لیکن امتحان ان کو رسوا کر دیتا ہے۔ ظاہر کو رنگنے سے کام نہیں چلے گا۔ اندر کو رنگنا چاہیئے اور اندر کا رنگ جانتے ہیں کیا ہے؟ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عَابِدُوْنَ۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ رقص محبت ہے اور بولی معرفت ہے اوپر اوپر کو تو اپنے رنگ سکتے ہو لیکن نہ رقص کر سکتے ہو اور نہ معرفت کی باتیں ہی بیان کر سکتے ہو۔

غرض میں یہ کہہ رہا ہوں کہ بغض فی اللہ بھی کوئی چیز ہے مگر کوئی اس کے ساتھ متصف بھی تو ہو وہ دوسرے ہی قسم کے لوگ تھے جن کے یہ اوصاف تھے اب ویسا ہونا بہت مشکل ہے ہاں دعویٰ اور نقالی البتہ آسان ہے۔ چنانچہ عابد ناپارسا کی حکایت میں اس عابد کے بغض پر جو انکار کیا گیا اور شیخ سعدیؒ نے اس کو پسند نہیں فرمایا تو اسی لئے کہ وہ نقال اور ریاکار تھا کبر کا شکار تھا کیونکہ اس نے جو جو الفاظ اس گنہ گار کے متعلق کہے تھے کہ اس کو مدبر کہا اور یہ

کہا کہ مسیح سے اسکو کیا تعلق ہے اور یہ کہا کہ ایسوں کیلئے دوزخ کے دروازہ کے کھولنے کی بھی ضرورت نہیں ہے تو یہ سب اس کا خالص تکبر تھا اور حدیث شریف میں جس بغض کا ذکر ہے اور حضرات صحابہ جو معاملہ کیا کرتے تھے وہ غایت اخلاص اور للٰہیت سے کرتے تھے ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں صورتاً تو دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے بغض فی اللہ کا شرعاً حکم ہے اور انسان اسکو تواضع کے ساتھ جمع کرسکتا ہے یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ انسان بغض فی اللہ بھی کرے اور عین اسی حالت میں غایت درجہ کا متواضع بھی ہو برخلاف اس بغض و غصہ کے جس کا منشا کبر باطن ہو کہ اس میں تواضع اصلا باقی نہیں رہتی۔

چنانچہ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس مسئلہ پر نہایت ہی محققانہ کلام فرمایا ہے جس کو ہم یہاں بعینہ نقل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

"اگر تم کہو کہ میرے لئے یہ بھلا کس طرح ممکن ہے کہ کسی مبتدع یا فاسق سے بغض فی اللہ بھی رکھوں کیوں کہ ہم کو ان سے بغض رکھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان سے تواضع سے بھی پیش آؤں اس لئے کہ ان دونوں کا جمع کرنا جمع بین المتناقضین سا ہے۔ اس کے جواب میں امام فرماتے ہیں کہ بیشک تمہارا یہ خیال صحیح ہے اور صرف تم ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں پر یہ امر مشتبہ رہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بدعت اور فسق پر انکار کے وقت غضب للہ کبر نفس اور علم و تقویٰ پر ناز کے ساتھ مختلط ہو جاتا ہے یعنی صورتاً چونکہ دونوں چیزیں یکساں ہوتی ہیں اس لئے ان میں باہم اشتباہ واقع ہو جاتا ہے۔"

(میں کہتا ہوں کہ امام غزالیؒ کی یہ بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اس فرق کو اگر ناقصین سمجھ لیں اور اپنا معمول بنالیں تو کامل ہو جائیں) آگے امام فرماتے ہیں کہ

چنانچہ بہت سے عابد جاہل اور عالم مغرور جب کسی فاسق کو اپنے پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں تو اسکو دھتکار دیتے ہیں اور اپنے کبر باطن کے سبب سے اس سے اس طرح نفرت اور دوری کا اظہار کرتے ہیں جیسے کہ کوئی نجاست وغیرہ سے اپنے دامن کو بچاتا ہو اور لطف یہ کہ سمجھتے یہ ہیں کہ ہمارا یہ غصہ اللہ کے واسطے ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے

ایک عابد نے اپنے رفیق کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کیا تھا۔ امام کی مراد
اس سے وہی عابد ناپارسا ہے کہ جس کا واقعہ شیخ سعدی نے بوستاں
میں بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ عابد جاہل اور عالم مغرور سے جو چیزیں صادر ہوتی ہیں وہ اس لئے کہ یہ لوگ عبادت وغیرہ کرنے کی وجہ سے علم اور زہد میں تو کچھ ترقی کر لیتے ہیں مگر اخلاق کی بلندی پر فائز نہیں ہوتے بلکہ اس کے اعتبار سے پستی میں ہی رہتے ہیں اس لئے ان کو اپنی اخلاقی کمزوری مثلاً یہ کہ نفس میں کبر موجود ہے یا اپنے علم وورع پر ان کو ناز پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سب باتیں ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔ اب اگر یہ لوگ اخلاقی بلندی حاصل کریں مثلاً تواضع جو کہ سب سے بڑا خلق بلکہ تمام اخلاق محمودہ کی اصل ہے اس کو سمجھنے اور اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ تب اپنی خامیاں اور کمزوریاں ان کو محسوس ہوں گی۔ یعنی جب خلق تواضع کی خوبی سے متصف ہو جائیں گے اور اب اس وقت نفس میں بگاڑ پیدا ہو کر اگر کبر آئے گا تو یہ فوراً اس کو محسوس کر لیں گے اور غضب للہ اور غضب للنفس میں انکو تمیز حاصل ہو جائیگی جیسا کہ صالحین امت کو ہر زمانہ میں ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کی کچھ مثالیں ہم آئندہ بیان کرینگے) آگے امام فرماتے ہیں کہ:۔

فاسق پر کبر اور غضب بغض فی اللہ کے مشابہ اس لئے ہوتا ہے کہ
مطیع پر کبر کا شر ہونا تو ظاہر ہے اور اس سے بچنا بھی ممکن ہے۔ مگر
فاسق اور مبتدع پر کبر کرنا اور اس پر غصہ ہونا اسکو تو اچھا ہی سمجھا
جاتا ہے کیونکہ بغض فی اللہ کے مشابہ ہوتا ہے اور بغض فی اللہ محمود
ہے۔ نیز غضب اور تکبر دونوں لازم وملزوم ہیں بھی کیونکہ غصہ والا
جس پر غصہ کرتا ہے اس سے گویا تکبر ہی کے ساتھ پیش آتا ہے اور تکبر
کرنے والا غصہ ضرور کرتا ہے۔ غرض دونوں لازم ملزوم اور باہم ملے
جلے اور صورتاً ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ امام نے یہ جو فرمایا کہ مطیع پر کبر کا شر ہونا ظاہر ہے تو یہ امام اپنے زمانہ کا حال بیان فرماتے ہوں گے تاہم اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ مطیعین پر بھی کبر کیا جاتا ہے مگر وہ ہوتا ہے شر اور مذموم اور اس سے بچنا بھی ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ یوں تو باہم خوب ملے جلے رہتے ہیں لیکن کوئی شخص اگر ان میں نیک اور صالح ہوتا ہے تو اسی پر انکار کیا

جاتا ہے بلکہ اسکو افضل العبادات سمجھا جاتا ہے ظاہر ہے کہ علماء اور مشائخ جو کہ دین حاصل ہونے کے ذرائع تھے جب انھیں سے کبر کیا جائیگا اور ان کو حقیر سمجھا جائیگا تو پھر حصول دین کی سبیل ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اس کا انجام ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ دین سے تعلق ختم ہی ہوتا چلا جارہا ہے اس لئے کہ لوگ اہل دین سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آگے امام فرماتے ہیں کہ:۔

چونکہ ان دونوں میں التباس شدید ہے اس لئے ان میں تمیز وہی شخص کر سکتا ہے جو موفق من اللہ ہو (یعنی جس شخص کو اس کے اخلاص کے سبب سے منجانب اللہ ایک ذوق و تمیز عطا ہوئی ہو جس سے بروقت وہ دونوں میں فرق کر لیتا ہو۔)

میں کہتا ہوں کہ امام کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جو موفق من اللہ ہوتا ہے اسے غضب للہ اور غضب للنفس میں تمیز حاصل ہوتی ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ لوگ ایسی چیزوں کو اختیار کریں جنکی وجہ سے قلب میں امتیاز کا ملکہ پیدا ہو جائے تاکہ جب غضب للہ میں نفس شامل ہونے لگے تو فوراً اس کا احساس ہو جائے۔ امام نے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح سے کہ عبادت میں خلوص کی ضرورت ہے یعنی یہ کہ وہ غیر اللہ کی آمیزش سے خالی ہو چنانچہ یہی وجہ ہے کہ شرعاً ریا کی ممانعت ہے اور اخلاص نیت کا حکم ہے کہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے یہاں عبادت مقبول نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے یہ بھی سمجھنا ضروری ہوگا کہ تعلیم و تربیت کا سلسلہ بھی عنداللہ اسی پر موقوف ہے اور اسی قاعدہ پر یہ بھی مرتب ہے کیونکہ بدعت اور فسق پر انکار بھی دین ہی ہے بلکہ اعظم خدمت دین ہے۔ تو اس میں بھی اخلاص کی ضرورت ہوگی یہ بھی بدون اخلاص کے مقبول نہ ہوگی۔ اور اخلاص بدون آمیزش نفس سے خالی ہوئے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب بدعت یا فسق کے انکار میں کبر یا علم و ورع پر ادلال ہو جایا کرتا ہے تو ایسے ناپاک مرض کے ہوتے ہوئے یہ انکار عنداللہ کیسے دین ہو سکتا ہے۔ بدعت اور فسق کے انکار کا منشاء غضب للہ ہوتا ہے جیسا کہ اکابر امت سے ثابت ہے۔ باقی غضب للنفس کا شمول بھی اس میں ہو جاتا ہے۔ یہ بھی انہیں اکابر کی تصریحات سے معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات نے غضب للنفس کو ترک کیا ہے۔ جس طرح سے کہ غضب للہ کو اللہ کے لئے عمل میں لائے ہیں۔ یہ دونوں قسمیں انہیں بزرگوں کے طرز عمل سے ثابت ہوئیں ورنہ غضب للنفس کو اگر یہ حضرات اپنے عمل میں نہ بیان فرماتے تو یہی باقی رہتا اور اس پر گمان غضب للہ کا کیا جاتا۔ اسی طرح غضب للنفس

دنیا سے رخصت ہی ہو جاتا۔

غرض غضب للہ جس طرح فرض ہے اسی طرح غضب للنفس حرام ہے۔ امام غزالیؒ کی غضب للہ اور غضب للنفس کی یہ تفریق تمام عباد اور علماء پر حجت ہے۔ لہٰذا ان کو یہ سمجھنا ہوگا کہ امام نے جس کی مذمت بیان فرمائی ہے کہیں ہم تو اس میں داخل نہیں ہیں۔

چونکہ غضب للہ اور غضب للنفس میں التباس اور اشتباہ واقع ہو جاتا ہے لہٰذا ان دونوں میں باہم امتیاز کرنا ضروری ہے۔ اب جو شخص ان میں تمیز رکھتا ہو اسکے لئے تو معاملہ بالکل آسان ہے لیکن جو ابھی ناقص ہے یعنی تمیز سے عاری ہے اسے اس موقع پر کیا کرنا چاہیئے۔ اس کے متعلق امام غزالیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ :۔

اس خلط اور التباس سے خلاصی کی یہ صورت ہے کہ جب تم کسی فاسق یا مبتدع کو دیکھو یا انھیں امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرو تو اس وقت تین باتوں کا استحضار رکھو۔

۱۔ ایک تو یہ کہ اپنی توجہ اپنے سابقہ معاصی پر رکھو تاکہ تمہارا مرتبہ خود تمہاری نگاہوں میں کمتر معلوم ہو اور تمہارا نفس ہی تم کو ذلیل جانے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ تم کو جو فاسق یا مبتدع پر فوقیت حاصل ہے خواہ علم میں یا اعتقاد حق میں یا عمل صالح میں تو یہ سمجھو کہ یہ سب چیزیں حق تعالیٰ کی عطایا ہیں اور اسی کا فضل ہے تمہارا اس میں کچھ کمال نہیں۔ جب اس بات کا لحاظ رکھو گے تو پھر تمہیں عجب نہ ہوگا اور جب عجب نہ ہوگا تو تکبر بھی نہ ہوگا۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ تمہارا اور اس شخص کا انجام جو کہ سر دست ایک امر مبہم ہے اس کے متعلق کم از کم یہ اندیشہ رکھو کہ شاید تمہارا خاتمہ اچھا نہ ہو (العیاذ باللہ) اور اس کا اچھا ہو جائے۔ جب اس امر کا تصور رکھو گے تو اس کی وجہ سے تمہارے اندر خوف پیدا ہوگا اور پھر وہ تمہیں تکبر سے باز رکھے گا۔

اب اگر تم یہ کہو کہ ان امور کی وجہ سے خوف جو طاری ہوگا تو اس کی وجہ سے کبر نفس تو بلاشبہہ ختم ہو جائے گا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ غصہ

کا بھی تو خاتمہ ہو جائے گا پھر غضب للہ کی کیا سبیل ہو گی ؟ تو میں کہونگا کہ نہیں اگر تمہارا سید تمہیں غصہ کرنے کا حکم دے تو تم اس کے لئے غصہ کر سکتے ہو اور تمہارا یہ غصہ یقیناً اپنے نفس کے لئے نہ ہوگا اس لئے کہ اس وقت تم اپنے غصہ کرنے میں اپنے کو ناجی اور اپنے صاحب کو ہالک نہیں سمجھو گے بلکہ تمہیں تو خود اپنا ہی خوف لگا ہو گا۔ کیونکہ تم یہ سمجھتے ہو گے کہ گو بظاہر یہ شخص گنہگار ہے لیکن مخفی اور باطنی گناہ میرے اس سے کہیں زیادہ ہیں اور پھر خاتمہ کا بھی حال معلوم نہیں۔ تو پھر کس بنا پر دوسرے کو حقیر سمجھا جائے۔ (حاصل یہ کہ اس طور سے تواضع اور غضب کو باہم جمع کیا جا سکتا ہے۔)

اب ہم تمہیں ایک مثال کے ذریعہ اسکو واضح کرتے ہیں۔ کہ غضب للہ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ انسان مغضوب علیہ پر تکبر بھی کرے اور اپنے آپ کو اس سے بڑا ہی جانے۔ دیکھو کسی بادشاہ کا کوئی غلام ہو اور ایک لڑکا بھی ہو جو کہ اس کا لخت جگر اور نور نظر ہو۔ اور اس نے اپنے لڑکے کو غلام کی تربیت میں دیدیا ہو اور اسے حکم فرمایا ہو کہ جب یہ کوئی بے ادبی کرے یا کوئی نازیبا حرکت اس سے سرزد ہو تو اس کو ڈانٹے۔ تنبیہ کرے اور اگر ضرورت سمجھے تو مارے بھی۔ اب اگر یہ غلام اپنے مالک کا محب اور فرمانبردار غلام ہو گا تو لڑکے کی بے ادبی پر اس کے لئے مارنے اور تنبیہہ کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو گا۔ چنانچہ اب یہ جو اس پر غصہ کرے گا تو محض اپنے مالک کی خاطر سے کرے گا اور اس سے اس کا مقصد امتثال امر کرکے قرب حاصل کرنا اور مولا کی مرضی کا پورا کرنا ہو گا۔ نیز اس لئے ہو گا کہ اس لڑکے سے اس کے مالک کی مرضی کے خلاف کا صدور ہوا ہے۔ لہذا وہ اس پر غصہ کرے گا مگر اس پر ذرا تکبر نہیں کرے گا بلکہ اس حال میں بھی متواضع ہی رہے گا کیونکہ اس کے پیش نظر اپنی حیثیت بھی ہے اور لڑکے کا مرتبہ بھی۔ وہ یہ کہ لڑکا بہر حال غلام

سے اعلیٰ و افضل ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر غصہ کے لئے تکبر اور عدم تواضع ضروری نہیں پس اس طرح سے ممکن ہے کہ مبتدع اور فاسق پر تم نکیر بھی کرو اور اپنے دل میں یہ سمجھتے ہو کہ شاید اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی تم سے افضل ہو۔ کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ ازل میں اس کے لئے حسن القضاء اور تمہارے لئے سوء القضاء ثابت ہو چکی ہو اور تمہیں اس کی خبر نہ ہو۔ لہٰذا اب اس حال میں تم جو اس پر غصہ کروگے تو محض مالک کے حکم کی خاطر اور اپنے مولا کی محبت کی وجہ سے اور اس لئے کہ اس لڑکے سے مولیٰ کی مرضی کے خلاف کام ہوا ہے پس اس وقت اس کے ساتھ تواضع بھی قائم رہے گی۔ کیونکہ تم یہ سمجھے ہوئے ہو کہ ہو سکتا ہے کہ کل کو قیامت میں اس کا مرتبہ تم سے بڑھا ہوا ہو اس کے بعد پھر تکبر کہاں باقی رہ سکتا ہے۔

چنانچہ علماء میں سے جو اہل فہم و بصیرت ہیں وہ اسی طرح سے تواضع اور خوف کو جمع کر لیا کرتے ہیں اور جو مغرور (یعنی دھوکہ میں پڑے ہوئے) ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تکبر بھی کرینگے اور پھر اپنے لئے دوسروں سے زائد اجر اور ثواب کے بھی خواہشمند ہوں گے۔ حالانکہ انجام کی کچھ خبر نہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر دھوکہ کی چیز اور کیا ہو سکتی ہے غرض یہ طریقہ ہے عاصی اور مبتدع کے ساتھ تواضع اور بغض فی اللہ کے جمع کرنے کا اور خود کو کمتر سمجھتے ہوئے بھی فاسق اور مبتدع سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا۔ جو کہ مطلوب شرعی ہے۔

(انتہیٰ کلامہ۔ احیاء العلوم ص۳ ج۳)

میں کہتا ہوں کہ امام نے خلاصی کی جو سبیل بیان فرمائی صحیح ہے۔ لیکن ایک مخصوص طبقہ ہی اس پر عمل کر سکتا ہے۔ ہر شخص کے لئے اس طریقہ پر عمل کرنا آسان نہیں اس لئے امام ہی کی برکت سے بلکہ انہیں کے کلام سے مستنبط کر کے اس کا آسان حکم بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ امام نے رفق کی فضیلت بیان کرتے ہوئے باب کے آخر میں لکھا ہے کہ ابی عون انصاری سے منقول ہے کہ کسی شخص نے کوئی سخت کلمہ اپنی زبان سے نہیں نکالا مگر یہ کہ اس کے قائمقام کوئی نرم کلمہ بھی ضرور ہوتا ہے جسے وہ اسکی

جگہ استعمال کر سکتا تھا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ دیکھو تمام اہل علم رفق اور نرمی کی مدح جو فرمار ہے ہیں تو یہ اسی لئے کہ نرمی اکثر احوال اور اغلب مواقع میں مفید ہی ہوتی ہے اور سختی کی جانب حاجت شاذ و نادر ہی پڑا کرتی ہے اور کامل وہ شخص ہے جس کو رفق و عنف کے مواقع کی تمیز پیدا ہو گئی ہو اور وہ ہر شخص کو اس کا حق دے سکتا ہو۔ لیکن اگر وہ ناقص البصیرت ہو اور کسی خاص واقعہ کا حکم اس پر پوشیدہ رہ جائے یعنی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہاں پر سختی کرنی چاہیئے یا نرمی تو اسے نرمی ہی اختیار کرنی چاہیئے اس لئے کہ اس میں کامیابی زیادہ ہے۔

(احیاء العلوم ص۱۸۶ ج ۳)

ناقص و کامل کا یہ حکم جو امام نے بیان فرمایا وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رفق اور عنف اختیار کرنے سے متعلق تھا۔ بس اسی پر قیاس کر کے ہم یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص کامل ہو یعنی اسکو امتیاز حاصل ہو وہ تو بدعت اور فسق پر انکار کر سکتا ہے کیونکہ اسے تمیز ہے کہ یہ غضب للہ ہے لیکن جو شخص ناقص ہو یعنی یہ تمیز نہ رکھتا ہو اس کے لئے متعین ہے کہ زبان سے ان پر انکار نہ کرے کہ یہ انکار منجر بہ کبر ہو گا۔ یہ بغض فی اللہ ہے ہی نہیں۔ کبر سے بچنا اہم ہے اس لئے اس کو اجازت اس کی نہ دیجائے گی۔ اگر اجازت دے دی جائے تو بڑے مفاسد پیدا ہوں گے۔ جیسا کہ آج کل مشاہد ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کامل کا اور حکم ہے اور ناقص کا اور۔ جس کو تمیز حاصل ہو چکی ہو وہ اس کے مطابق معاملہ کرے اور جسے نہ حاصل ہوئی ہو تو اس کے لئے احتیاط اسی میں ہے کہ وہ زبان سے انکار نہ کرے۔ باقی اس تمیز کا حاصل کرنا ہے اختیاری شے۔ یعنی انسان جب کہ نیت صحیح کر کے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس کے قلب میں صفائی پیدا فرما دیتے ہیں اور اسی کی وجہ سے اس کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ یعنی رذائل دور ہو جاتے ہیں اور صحیح اور اچھی چیزوں سے اسکو تعلق اور لگاؤ سا ہو جاتا ہے اور دین و دیانت کے ساتھ اسکو ایسی مناسبت حاصل ہو جاتی ہے کہ جہاں کوئی بات اس کے خلاف پیش آئی اور کوئی حال اس حال سے مختلف قلب میں گذرا تو یہ شخص اسکو ذوقاً اور وجداناً محسوس کر لیتا ہے۔ اسی ذوق والے کو موفق کہتے ہیں جس طرح حس ظاہر سے ہم مزہ کا احساس کرتے ہیں مثلاً یہ کہ پانی کو پی کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ پانی ہے اور اس میں

اگر شکر مل جائے تو یہ جانتے ہیں کہ یہ شربت ہے اور پانی سے الگ ایک چیز ہے یا مثلاً کسی چیز میں نمک پڑا ہوا ہو اور دوسری چیز اس سے خالی ہو تو ہم چکھ کر دونوں کا فرق معلوم کر لیتے ہیں - اسی طرح سے اعمال کا بھی باطناً ایک مزہ ہوتا ہے جب کہ وہ اخلاص کے ساتھ ادا ہو رہے ہوں اور جب اخلاص فوت ہو جائے تو اس کا دوسرا مزا ہو جاتا ہے اسکو موفق من اللہ پہچانتا ہے۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں کسی کے اندر کام میں اخلاص موجود ہو مگر بعد میں چل کر نہ رہ جائے۔ اسی طرح سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں کسی کام میں اخلاص نہ رہا ہو لیکن بعد میں چلکر پیدا ہو جائے۔

اب ہم آپ کے سامنے بزرگان دین کے کچھ واقعات بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ یہ حضرات کس قدر مخلص ہوتے تھے کہ اگر کبھی ان کے کام میں اخلاص کے خلاف کوئی چیز شامل ہو جاتی تھی تو یہ حضرات اسے فوراً محسوس کر لیتے تھے، اور اخلاص اور نفسانیت میں باہم تمیز فرما لیتے تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ فتح بیت المقدس بیان کرتے ہیں وہ یہ کہ آپ کے دور خلافت میں مسلمانوں نے جب بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو اہل شہر نے کہا کہ تم اپنے خلیفہ کو بلاؤ۔ ہماری کتاب میں ان کا حلیہ لکھا ہوا ہے اگر مطابق ہو جائے گا تو ہم بغیر جنگ کئے ہی قلعہ کا دروازہ کھولدیں گے۔ اور شہر تمہارے حوالہ کر دیں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کے سپہ سالار نے خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کے پاس یہ اطلاع بھیجی اور آپ شام یعنی (بیت المقدس) کے لئے روانہ ہو گئے۔ بوقت روانگی آپ کا یہ حال تھا کہ پیوند لگے ہوئے معمولی کپڑے زیب تن فرمائے ہوئے تھے اور اونٹ پر سوار تھے۔ یہ دیکھ کر ساتھ کے مسلمانوں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ مسلمانوں کے خلیفہ ہیں لہٰذا اچھے اور صاف کپڑے پہن لیں اور گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لے چلیں حضرت عمرؓ نے لوگوں کی اس درخواست پر کپڑے بدل لئے اور اونٹ سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئے مگر ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ فرمانے لگے کہ بھائی میرا نفس ان چیزوں کی وجہ سے پھول رہا ہے۔ لاؤ میرے پرانے کپڑے اور میرا اونٹ میں اسی پر چلوں گا۔ اور یہ فرمایا کہ نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام یعنی ہم ایسی قوم ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت دی ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے۔ یہ فرمایا اور پھر وہی پیوند دار کپڑے پہن لئے اور اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لے گئے۔ اللہ اکبر۔

دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کے کہنے سننے کی وجہ سے اپنے کپڑے

اور سواری کو بدلنے کو تو بدل لیا لیکن اس کی وجہ سے نفس میں جو تغیر پیدا ہوا اس کو فوراً محسوس فرمالیا اور خلوص اور نفسانیت میں امتیاز کرلیا۔ چنانچہ لباس وسواری کو بدل دیا پھر آپ کے اس اخلاص کی جو برکات ظاہر ہوئیں وہ معلوم ہیں کہ اسی کی وجہ سے قلعہ فتح ہوگیا۔

اور سنئے۔ مثنوی میں مولانا رومؒ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ جہاد میں کسی غیر مسلم پر آپ غالب آئے اور چاہا کہ تلوار سے اس کا کام تمام کردیں۔ اس بے ادب نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا۔ آپ نے اسی وقت تلوار پھینک دی اور اس کے سینہ پر سے اتر آئے۔ اس کو بہت حیرت ہوئی اور اس چھوڑنے کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ ؎

چوں خدو انداختی بر روئے من   نفس جنبید و تبہ شد خوئے من

نیم بہر حق شد و نیمے ہوا   شرکت اندر کار حق نبود روا

آپ نے فرمایا کہ جب تو نے میرے منہ پر تھوک دیا تو میرے نفس کو حرکت ہوئی اور میرا خلق حسن بگڑنے لگا پس میرا یہ لڑنا کچھ تو اللہ کے واسطے رہ گیا اور کچھ نفس کے لئے ہوگیا اور حق تعالیٰ کی عبادت میں شرکت جائز نہیں ہے اور یہ بھی فرمایا کہ ؎

تو نگارِ یدہ کف مو نیستی   آنِ حقے کردۂ من ہستی

نقش حق را ہم بامر حق شکن   بر زجاجۂ دوست سنگِ دوست زن

یعنی تو دست حق کا بنایا ہوا ہے اور حق تعالیٰ کا مملوک ہے میرا مملوک نہیں ہے پس مجھ ہی تصرف جائز ہوگا جو باذن حق ہو۔ کیونکہ تو مصنوع حق ہے اور مصنوع حق کو امر حق سے ہی توڑنا چاہیئے اور شیشۂ دوست پر سنگِ دوست ہی مارنا چاہیئے۔

دیکھئے یہ حضرت کے خلوص ہی کی برکت تھی کہ اپنے نفس پر قابو پاگئے چنانچہ آپ کے اخلاص پر یہ ثمرہ مرتب ہوا کہ وہ کافر مسلمان ہوگیا اور اپنے بہت سے خاندان والوں کو بھی مسلمان کرادیا۔

یہ واقعہ تو ایک جلیل القدر صحابی بلکہ امیرالمومنینؓ کا تھا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ سلاطین اسلام میں بھی بہت سے ایسے بادشاہ گذرے ہیں جن کو یہ تمیز حاصل تھی اور وہ موقع پر خلوص کو نفسانیت سے تمیز دے لیتے تھے۔ چنانچہ اخلاق محسنی میں ہے کہ خراسان کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ نے ایک مجرم کو سزا دینے کا حکم فرمایا۔ ادھر لوگوں نے اسے کوڑے لگانے شروع کئے ادھر اس نے بے شرمی کی زبان کھولی اور بادشاہ کو گالیاں دینی شروع کیں۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ سزا بند کردی جائے

اور اس کو رہا کر دیا۔ مقربان شاہی میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضور! جو موقع اس بے حیا کو اور زیادہ سزا دینے کا تھا ایسے وقت میں معاف کر دینے اور چھوڑ دینے کا کیا سبب ہوا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں اسکو خدا کے لئے تنبیہ کرتا تھا۔ جب اس نے مجھے بُرا بھلا کہنا شروع کیا تو اس سے میرا نفس متغیر اور متاثر ہوا جی چاہا کہ اس سے بدلہ لوں لیکن پسند نہ آیا کہ حق تعالیٰ کے معاملہ میں نفس کو بھی شریک گردانوں کہ یہ صورت شیوۂ اخلاص سے بعید ہے کیونکہ جو شخص کوئی دینی عمل کرے اور اس میں کسی دنیوی غرض کو بھی شامل کرے تو وہ اس کے ثواب سے محروم رہتا ہے ؎

از سخنش آتش من تیز شد | کار الٰہی غرض آمیز شد
داعیۂ نفس چو بنمود رو | معنئ اخلاص نماند اندرو
کار کز اخلاص نہ شد بہرہ ور | ترکِ چناں کار بسزا وار تر

یعنی اس کی بدگوئی و بدکلامی سے میرے غصہ کی آگ بھی تیز ہو گئی جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے لئے جو عمل تھا وہ غرض آمیز ہو گیا اور جب نفس کا داعیہ ظاہر ہوا تو پھر اس کام میں اخلاص کہاں باقی رہا جس کام میں اخلاص ہی نہ پایا جاوے ایسے کام کو ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔

دیکھا آپ نے جیسا کہ مولانا روم نے فرمایا تھا ؏

از علی آموز اخلاص عمل

اس خلیفہ نے سیکھا اور انھیں کی سنت پر چلا۔

اسی طرح سے احیاء العلوم میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ کبھی فضول کلام نہ فرماتے تھے۔ ایک دن دریا کے کنارے جارہے تھے کہ سامنے سے ایک کشتی آتی ہوئی نظر پڑی۔ اس پر کچھ مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ کشتی والے سے پوچھ پڑے کہ اس میں کیا ہے اس نے بڑی تیزی سے کہا کہ سلطان کی شراب جارہی ہے کر لو جو کرنا ہو۔ ان بزرگ نے کشتی والے سے کہا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے اس نے کہا ڈنڈا کہا ذرا دیر کے لئے مجھے تو دیدو اس نے جھنک کر دیدیا انھوں نے اس سے لاٹھی لیکر ایک ایک مٹکے کو توڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ تیس میں سے انتیس مٹکے توڑ ڈالے اور ایک چھوڑ دیا۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی ان کو طلب کیا۔ کہتے ہیں کہ نہایت ہی جابر بادشاہ تھا۔ لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر لوہے کا گرز ہاتھ میں لے کر دربار کرتا تھا ان بزرگ سے پوچھا کہ آپ نے ان مٹکوں کو توڑا ہے۔ کہا ہاں۔ اس نے کہا کہ آپ کو محتسب کس نے بنایا ہے کہا کہ جس نے آپ کو بادشاہ بنایا ہے۔ یہ سنکر بادشاہ نے سر نیچا کر لیا۔ ذرا دیر کے بعد پھر ان سے پوچھا

کہ اچھا یہ بتایئے کہ آپ کو کس جذبہ نے اس فعل پر آمادہ کیا۔ فرمایا کہ محض امیرالمومنین کی خیر خواہی نے اس لئے کہ اگر میں یہ دیکھوں کہ امیرالمومنین کی جانب کوئی موذی جانور مثلاً سانپ یا بچھو چلا آرہا ہے تو میرا فرض ہے کہ میں امیرالمومنین کو اس سے بچاؤں۔ اسی طرح میں نے جب یہ دیکھا کہ ایسی شئے امیرالمومنین کی طرف جارہی ہے جس کے ارتکاب کی وجہ سے قیامت میں سخت مواخذہ ہوگا۔ تو امیرالمومنین کی خیر خواہی نے مجھے مجبور کردیا کہ میں امیرالمومنین کو اس سے بچالوں۔ یہ سن کر وہ پھر سرنگوں ہوگیا اور دیر تک سر جھکائے رہا پھر اس نے پوچھا کہ اچھا ایک بات اور بتلا دیجئے وہ یہ کہ جب توڑنا ہی تھا تو سارے ہی مٹکے توڑ ڈالے ہوتے۔ ایک کو کیوں چھوڑ دیا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ جب آپ نے پوچھا ہی ہے تو بتلانا ضروری ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب تک میں انیتس مٹکوں کو توڑتا رہا، میرے قلب کی حالت نہایت عمدہ تھی۔ بغض فی اللہ اور نصح مسلم کا جذبہ کارفرما تھا اور قلب میں ایسی قوت محسوس کرتا تھا کہ اگر ساری روئے زمین شراب کے مٹکوں سے بھری ہوتی تو سب کو توڑ دیتا لیکن جب تیسویں پر پہونچا تو نفس نے کچھ حصہ لے لیا۔ یہ خیال آگیا کہ تم نہی عن المنکر کے باب میں اس قدر جری ہو کہ حاکم وقت کی بھی پروا نہیں کرتے بس اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے کہا کہ یہ تو نفسانیت آگئی للٰہیت رخصت ہوگئی اس لئے اس کو چھوڑ دیا۔

بادشاہ پر ان بزرگ کی اس گفتگو کا بہت اثر ہوا اس نے کہا اچھا آج سے تم کو محتسب بناتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ معاف کیجئے۔ آپ جب بنا سکتے ہیں تو یہ منصب لے بھی سکتے ہیں۔ لہٰذا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلے گئے اور جب تک وہ بادشاہ زندہ رہا اس شہر میں آئے ہی نہیں۔

دیکھا آپ نے بزرگوں کو اور اللہ والوں کو ان کے اخلاص کی وجہ سے قلب میں ایک وجدانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جس سے ان کو للٰہیت اور نفسانیت میں تمیز حاصل ہوجاتی ہے میں کہتا ہوں کہ جب اخلاص حاصل کرنا ضروری ہے اور نفسانیت سے بچنا فرض ہے تو پھر ہر مسلمان کو اس امتیاز کو سمجھنا اور اپنے قلب میں پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔ بزرگان دین کے یہاں یہی کام ہی ہوتا رہا ہے کہ وہ اخلاص پر بحث کرتے ہیں اور اپنے لوگوں میں اسی چیز کے پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ضرورت سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ اس لئے کہ آپ نے دیکھا کہ اس عابد ناپارسا کے پاس طاعت اور عبادت کی کمی نہیں تھی کمی جو تھی تو اخلاص کی تھی

اور سنئے مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلویؒ نے ایک واقعہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بیان

فرمایا کہ دہلی کا سفر پیش آیا تو فرمایا کہ کپڑے لے لو وہیں چل کر بدل لیں گے اور راستہ کیلئے تو یہی کافی ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ دہلی جانے کے بعد بھی حضرت نے اپنے کپڑے بدلے نہیں۔ انھیں میلے کپڑوں میں وعظ فرمایا۔ حضرت کو کچھ خیال آگیا ہوگا۔ اس لئے تبدیل نہیں فرمائے۔

دوسرا واقعہ سنئے:۔

حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک دفعہ حضرت دیوبندیؒ کو کانپور بلایا حضرت سے وعظ کی درخواست کی گئی۔ حضرت نے منظور فرمایا اور نہایت ہی عمدہ تقریر فرمائی۔ ایسی کہ بڑے بڑے معقولی سنکر حیران و ششدر رہ گئے۔ اتنے میں مولوی لطف اللہ صاحب علیگڈھی بھی آگئے۔ حضرت نے وعظ بند فرمادیا۔ لوگوں کو افسوس ہوا کہ آج ہی تو موقع تھا۔ مولوی صاحب آگئے تھے۔ حضرت کی تقریر بھی نہایت فاضلانہ ہو رہی تھی۔ کاش حضرت سلسلہ تقریر جاری رکھتے تو مولوی صاحب کو بھی کچھ سننے کا موقع مل جاتا۔ یہانتک کہ کسی نے ہمت کرکے حضرت دیوبندی سے بھی اس کا ذکر کردیا حضرت نے صاف فرمایا کہ بھائی یہی خیال تو مجھے بھی ہوا تھا اس لئے میں نے تقریر بند کردی۔ کہ اب تو یہ تقریر خدا کے لئے نہ ہوگی۔

ان واقعات سے آپ نے اندازہ کیا کہ بزرگان دین کی کس قدر توجہ خود اپنے نفس پر رہتی ہے دوسروں کو کچھ کہنے سننے کے بجائے ہر وقت یہ حضرات اپنا ہی محاسبہ کرتے رہتے ہیں۔

آخر میں بطور خلاصہ کے عرض کرتا ہوں۔ حاصل مضمون یہ ہے کہ :۔

(۱) آدمی کو چاہیئے کہ اپنے ہی عیوب پر نظر کرے۔ دوسروں کو حقیر و ذلیل اور اپنے سے کمتر سمجھنا نہایت بری بات ہے اور جس وقت تک انسان کے پیش نظر اپنے عیوب نہیں ہوتے وہ دوسروں کے عیوب پر نظر کرتا ہے لیکن جب اپنے معائب سامنے آجاتے ہیں تو پھر دوسروں کی تحقیر قلب سے نکل جاتی ہے ؎

اوروں پہ معترض تھے لیکن جب آنکھ کھولی
اپنے ہی دل کو ہم نے گنج عیوب دیکھا

(۲) جو گنہگار کہ اپنے گناہوں پر شرمسار ہو اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف اسکی مغفرت کی رجا اسکو حاصل ہو وہ عاصی اس پرہیزگار سے بہتر ہے جسے اپنی عبادت پر تکیہ ہو ؎

گنہگار اندیشناک از خدائے
بہ از پارسائے عبادت نمائے

یہی مطلب ہے بزرگوں کے اس ارشاد کا کہ العاصی خیر من المدعی اور اس کا کہ ؎

زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ
رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

(۳) اصل طریق تواضع ہے۔ یہی انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور ہر زمانہ میں صالحین امت کا اس پر عمل رہا ہے۔ جیسا کہ حدیث انا البائس الفقیر الحدیث کی تشریح سے ظاہر ہوا۔

(۴) تواضع اور بغض فی اللہ میں منافات نہیں ہے دونوں جمع ہو سکتی ہیں۔ تواضع باقی رکھنے کے لئے اپنی حیثیت پیش نظر رکھے۔ ایاز قدر خود بشناس اور بغض کرنے کے لئے دوسرے کی مصلحت سامنے کرے یعنی یہ سمجھے کہ یہی طریقہ اس کے حق میں نافع ہوگا۔ پس تواضع اپنے اعتبار سے کرے اور بغض اس کے اعتبار سے ان دونوں میں کیا تضاد ہے؟

(۵) البتہ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی بغض للنفس کا اشتباہ بغض فی اللہ کے ساتھ ہو جاتا ہے یعنی ہوتا تو ہے نفسانی غصہ اور نفس یہ دھوکا دیتا ہے کہ یہ بغض فی اللہ ہے۔ تو اس مغلطہ سے نکلنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر امتیاز پیدا کرے۔ بزرگوں نے اسکو بیدا کیا ہے اور نفسانیت اور خلوص میں اس کے ذریعہ تمیز دی ہے۔ ہر شخص اس کا مکلف ہے کہ یہ تمیز پیدا کرے اور ظاہر ہے یہ تمیز اہل تمیز کی صحبت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور جب تک آدمی کے اندر یہ چیز نہ پیدا ہو وہ بغض فی اللہ کا اظہار زبان سے نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ نفس شامل ہو جائے اور اس کو خبر بھی نہ ہو۔ پس اس کا ترک اس درجہ مضر نہیں جتنا کہ نفسانیت کی آمیزش اور کبر و تکبر اور دوسرے کی تحقیر مضر ہے۔ اسلئے انسب اور احوط اس کا ترک ہی کر دینا ہے۔ جس طرح سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں جو شخص مواقع عنف و لین کو نہ پہچانتا ہو اس کے لئے نرمی ہی متعین ہے۔

بس اب اسی دعا پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِیْ وَتَرٰی مَكَانِیْ وَتَعْلَمُ سِرِّیْ وَعَلَانِیَتِیْ لَا يَخْفٰى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِّنْ اَمْرِیْ وَاَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ الْمُسْتَغِيْثُ الْمُسْتَجِيْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِیْ اَسْاَلُكَ مَسْئَلَةَ الْمِسْكِيْنِ وَاَبْتَهِلُ اِلَيْكَ اِبْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ وَاَدْعُوْكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ + دُعَاءَ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهٗ وَذَلَّ لَكَ جِسْمُهٗ وَرَغِمَ لَكَ اَنْفُهٗ +

الاصول النادرة! لاصلاح الامة الحاضرة

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ و الصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الذی انزل علیہ ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر الآیہ

امّا بعد! آج کل عام طور پر مسلمانوں میں تبلیغ اور اصلاح نفس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے اور اس ضرورت کے پیش نظر مختلف جماعت اپنے اپنے کام اور صواب دید کے مطابق اس خدمت کو انجام دے رہی ہیں تاہم حسب توقع کامیابی نظر نہیں آتی اور پائدار اور دیرپا اثر محسوس نہیں ہوتا۔
ایک طبیب کو اگر باوجود پیہم استعمال ادویہ اور پرہیز بھی مریض کے مرض میں افاقہ محسوس نہ ہو تو اس کو تشخیص اور تجویز میں نظر ثانی کرنا چاہیے۔ اور اگر خود تعیین مرض و دوا تک رسائی نہ ہو تو بغیر کسی عار یا استنکاف کے تجربہ کار ماہرین سے رجوع اور مشورہ کرنا چاہیے جن کی نظر امراض کے ظاہری اور باطنی اسباب پر ہو اور جن ہاتھ سے سالہا سال تک ہزاروں مریض نکل چکے ہوں۔ ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔
چنانچہ تبلیغی امور میں پیہم ناکامی کے مشاہدہ کے بعد بعض احباب نے مرشدی و مولائی جناب مولٰنا الحاج الحافظ الشاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری مدظلہ العالی سے رجوع کیا اور حضرت مخدوم مدظلہ نے نہ تنہا اپنے سالہا سال کے کامیاب تجربے سے بلکہ حکماء اُمت کے اقوال کی تائید کے ساتھ چند اصول تحریر فرمائے۔
امید ہے کہ اگر اس وقت کام کرنے والی تبلیغی جماعتیں اور افراد ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر کام کریں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد اور پائدار کامیابی سے مشرف ہوں گے، وما توفیقی الا باللہ۔ فقط

بندہ ظہور الحسن غفرلہٗ کسولوی یکم ج ۲ ۱۳۷۵ھ

تنبیہ: - ان اصولوں سے صحیح اور پورا فائدہ اسوقت ہوسکتا ہے کہ ان کا بار بار مطالعہ کیا جائے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ خود نہ سمجھ میں آئے تو دوسروں سے سمجھ لیا جائے اور عمل کے وقت بھی گاہ گاہ اس کا مطالعہ کرکے سب اصولوں کو تازہ کرلیا جائے۔

التماس از ناشر: جہاں تک یاد پڑتا ہے تالیفات میں سے حضرتؒ کی سب سے پہلی تالیف یہی رسالہ ہے۔ ——— جامی غفرلہٗ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعدُ ! چند ضروری امور یا اصول جن کا پیشِ نظر رہنا بسلسلۂ اصلاح ضروری معلوم ہوا ان کو ضبط کر لیا گیا کہ ان کا تذکرہ و تحفظ سہل ہو۔ یہاں وہ نمبر وار درج ذیل ہیں۔

سب سے پہلے اصل اصول جو کہ مدار اصلاح ہے اس اعتبار سے اس کو اصل اول کہا جاوے اور سب پر تقدیم کی جائے تو اس کی وہ مستحق ہے وہ ہے جو کہ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں فرمایا ہے۔ وھو ھذا

اصل اوّل جو اصل الاصول ہے

(انقسام القلوب فی التغیر والثبات کے بیان میں فرماتے ہیں کہ)

(القلب الثانی) القلب المخذول المشحون بالھویٰ المدنس بالاخلاق المذمومة والخبائث المفتوح فیه ابواب الشیاطین المسدود عنه ابواب الملائکة ومبدأ الشر فیه ان ینقدح فیه خاطر من الھویٰ ویھجس فیه فینظر القلب الیٰ حاکم العقل لیستفتی منه ویستکشف وجه الصواب فیه فیکون العقل قد الف خدمة الھویٰ وانس به واستمر علی استنباط الحیل وعلی مساعدة الھویٰ فیستولی النفس وتساعد علیه فینشرح الصدر بالھویٰ وتنبسط فیه ظلماته

(قلب ثانی) وہ قلب ہے جو خواہشات نفسانی میں انہماک کی وجہ سے مردود و مطرود ہو چکا ہو اور خباثتوں اور بد اخلاقیوں سے مل کر میلا اور گندہ ہو گیا ہو۔ شیاطین کے لئے تو اس کے دروازے کھلے ہوں لیکن فرشتوں کے لئے بند ہو گئے ہوں اس قلب میں شر کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ پہلے ایک نفسانی خیال کا اس میں گذر اور خطور ہوتا ہے پس قلب (اپنے) حاکم (یعنی) عقل کی طرف نظر کرتا ہے تاکہ اس سے اس خیال کے بارے میں استفسار اور تحقیق کر کے صحیح حال معلوم کرے (کہ) آیا یہ قابل التفات ہے یا نہیں؛ یہاں یہ حال ہوتا ہے کہ عقل پہلے ہی سے خواہشات کی غلامی کی خوگر اور اس سے مانوس ہوتی ہے، نیز حیلوں کو تراشنے اور خواہشات کی مدد کرتے اس کو ایک زمانہ گذر چکا ہوتا ہے اس لئے نفس ہی عقل پر غالب اور مستولی

لانحباس جند العقل عن مدافعته فيقوى سلطان الشيطان لاتساع مكانه بسبب انتشار الهوى فيقبل عليه بالتزيين والغرور والاماني فيوحي بذلك زخرفًا من القول غرورًا فيضعف سلطان الايمان بالوعد والوعيد ويخبو نور اليقين لخوف الآخرة اذ يتصاعد عن الهوى دخان مظلم الى القلب يملأ جوانبه حتى تنطفي انواره فيصير العقل كالعين التي ملأ الدخان اجفانها فلا يقدر على ان ينظر وهكذا تفعل غلبة الشهوة بالعقل حتى لا يبقى للقلب مكان للتوقف والاستبصار ولو اتصره واعظ واسمعه ما هو الحق فيه عمى عن الفهم وصم عن السمع وهاجت الشهوة فيه وسطا الشيطن وتحركت الجوارح على وفق الهوى فظهرت المعصية الى عالم الشهادة من عالم الغيب بقضاءٍ من الله تعالى وقدره والى مثل هذا القلب الاشارة بقوله تعالى أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا ۝ أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ۝

ہوجاتا ہے اور اس نفسانی خیال کا اس کو فرصت حاصل ہوجاتا ہے پھر اس کی تاریکیاں قلب میں خوب پھیل جاتی ہیں کیونکہ عقل کا لشکر اس کی مدافعت سے قاصر ہوجاتا ہے (اور وہ لشکر مدافعت ہی کیا کرسکتا ہے جس کا سالار اعظم دشمن سے مل چکا ہو) آخر کار شیطان کی سلطنت قوی ہوجاتی ہے کیونکہ خواہشات نفسانیہ کے قلب میں پھیل جانے کی وجہ سے اس کی حدود حکومت وسیع ہوجاتی ہے۔ بعد اس کے خواہشات نفسانیہ بن سنور کر دفاتحانہ (غرور کے ساتھ امید اور آرزو لئے ہوئے عقل کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اس کو مزخرفات (ملمع کئے ہوئے) اور دھوکے کی باتوں کا سبز باغ دکھاتی ہے پس اللہ کے وعدوں اور وعیدوں (کو سچ جاننے والی ایمانی حکومت کمزور ہوجاتی ہے اور خوف آخرت کے یقین کا نور ماند پڑجاتا ہے کیونکہ خواہشات نفسانیہ کا کالا دھواں نکل کر قلب کی طرف جاتا ہے اور اس کے اطراف و جوانب کو محیط ہوجاتا ہے یہاں تک کہ اس کا نور بجھ جاتا ہے اس وقت عقل کی مثال اس آنکھ کے مانند ہوجاتی ہے جس کی پلکیں دھوئیں سے بھر گئی ہوں اور وہ دیکھنے سے عاجز رہ گئی ہو۔ بالکل یہی معاملہ غلبۂ شہوت بھی کرتا ہے عقل کے ساتھ یہاں تک کہ قلب میں سمجھنے اور دیکھنے کی قوت نہیں باقی رہتی اور اگر کوئی واعظ اور ناصح اس کو حق بات دکھانا یا سنانا چاہے تو اس کے سمجھنے اور سننے سے اندھا اور بہرا ہوجاتا ہے شہوات ابھر آتی ہیں اور شیطان اس پر غالب ہوجاتا ہے اور اعضاء بھی خواہشات ہی کی موافقت میں حرکت کرتے ہیں پس معصیت بمقتضاء قضاء و قدر عالم الغیب

وبقوله عزوجل لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى
اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وبقوله
تعالیٰ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ
لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ ورُبَّ
قلب هٰذا حاله بالاضافة الیٰ بعض
الشهواة كالذی یتورع عن بعض
الاشیاء ولكنه اذا رأی وجهاً حسناً
لم یملك عینه وقلبه وطاش عقله
وسقط امساك قلبه اوكالذی لایملك
نفسه فیما فیه الجاه والریاسة والكبر
ولا یبقی معه مسكة للتثبت عند ظهور
اسبابه اوكالذی لایملك نفسه عند
الغضب مهما استحقر وذكر عیب من
عیوبه اوكالذی لایملك نفسه عند
القدرة علیٰ اخذ درهم او دینار بل
یتهالك علیه تهالك الواله المستهتر
فینسی فیه المروءة والتقویٰ فكل
ذلك لتصاعد دخان الهویٰ الی
القلب حتی یظلم وتنطفی عنه انواره
فینطفی نور الحیاء والمروءة والایمان
ویسعیٰ فی تحصیل مراد الشیطان۔

ے عالم شہود میں ظاہر ہوجاتی ہے اور ایسے ہی قلب کی طرف
ان آیات میں اشارہ ہے (ترجمہ۔ اے پیغمبر اس شخص کی حالت
بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے سو کیا
آپ اُن کی نگرانی کرسکتے ہیں یا آپ خیال کرتے ہیں کہ انمیں اکثر
سنتے یا سمجھتے ہیں یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی
زیادہ بے راہ ہیں اور قول عزوجل ان میں اکثر لوگوں کو پر بات
ثابت ہوچکی ہے سو یہ لوگ ایمان نہ لاوینگے اور قول باری تعالیٰ
کا کہ برابر ہے ان کے حق میں۔ خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں
وہ لوگ ایمان نہ لاوینگے (یہ حال ان قلوب کا ہے جو خارج
از اسلام ہیں اور انمیں کسی چیز کی قابلیت باقی نہ رہی) اور بعض
قلوب کا بعض شہوات کے لحاظ سے ایسا ہی حال ہے (گو وہ خارج
از اسلام نہ ہوں مگر فاسق اور اشد فاسق ہیں کہ بعض شہوات
میں انکا حال ان ہی مذکورہ اشخاص کے موافق ہے) مثلاً کوئی
شخص کسی برائی سے اجتناب کرتا رہتا ہے لیکن جب کسی حسین
چہرہ کو دیکھ لیتا ہے تو پھر اپنی آنکھ اور دل پر قابو نہیں پاتا اس
کی عقل اڑ جاتی ہے اور قلب کی روک اور گرفت چھوٹ جاتی ہے
یا مثلاً وہ شخص جس کو اپنے نفس پر جاہ وریاست اور کبر کے مواقع
میں قدرت نہ ہو اور ان امور کے اسباب کے پائے جانے کے وقت
ثابت قدم رہنے (اور انمیں مبتلا نہ ہونے) کی اسے قدرت نہ ہو
یا جیسے کوئی شخص اپنے نفس پر قابو نہ پائے جس وقت کہ اس کی
تحقیر کی جائے اور اس کے عیوب میں سے کوئی کوئی عیب بیان
کیا جائے یا جیسے کوئی شخص روپیہ پیسہ کی تحصیل کے وقت اپنے نفس پر قادر نہ ہو بلکہ ایک بے صبرے عاشق کی
طرح اس پر اس طرح ٹوٹ کر گرے کہ مروت اور تقوی کو بالکل بھول ہی جائے جس طرح بے صبرا عاشق معشوق کو

پاکر تقوی فراموش کر دیتا ہے یہ ساری باتیں اس لئے وقوع میں آتی ہیں کہ خواہشات نفسانی کا دھواں قلب کی طرف چڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کو بالکل تاریک کر دیتا ہے جس کی وجہ سے قلب کے انوار ماند پڑ جاتے ہیں اس کے بعد حیا رخصت، مروت اور ایمان کا نور بھی بجھ جاتا ہے اور نفس شیطان کی مراد کی تحصیل میں کوشش کرنے لگ جاتا ہے

اصل دوم

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ قوت علمیہ وعلیہ دونوں قریب قریب معطل ہیں (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ) اصلاح موقوف ہے احساس صحیح پر اور احساس صحیح کا حصول موقوف ہے اہل احساس صحیح کے اقوال اور احوال پیش نظر رکھنے اور ان کے اتباع صادق پر۔ اور آج کل اس کا اہتمام نہیں بلکہ اس کی ضرورت ہی مسلم نہیں۔

اصل سوم

تجربہ سے یہ بات ظاہر ہے کہ اہل تعطل (یعنی بیکار لوگوں) کی جبتک خاص طور پر نگرانی نہ کیجائے (وہ از خود) کام نہیں کر سکتے کیونکہ احساس کے فقدان (یعنی نہ ہونے) سے کام اور اس کے منافع کی کوئی قدر ان کو نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کام کرنے سے اس کے منافع کا اذعان (یعنی یقین) اور احساس ہوتا ہے پھر اسوقت قدر ہوتی ہے (اور ان کو ابھی کام ہی کی نوبت نہیں آئی پھر قدر کیسے ہو)

اصل چہارم

یہ بات بھی تجربہ سے معلوم ہوئی کہ علماء فکر معاش کی وجہ سے کام نہیں کر سکتے (اس لئے کہ اول تو آج کل ہمت ضعیف ہے پھر طلب صادق نہیں لہذا طلب آخرت کے موانع (یعنی حصول معاش) میں پڑ کر آخرت سے بیکار ہو جاتے ہیں، پس جبتک قوم کی طرف سے ان کو فکر معاش سے بیفکر نہ کیا جائے گا خدمت دین کا کام نہیں کر سکتے (مشغلۂ معاش کے لحاظ سے) اگرچہ (وہ کسی مدرسۂ دینیات کے مدرس ہی کیوں نہ ہوں یا بزرگان دین سے تعلق بھی کیوں نہ رکھتے ہوں یا بزعم خود تعلق کا دعویٰ بھی کرتے ہوں تاہم وہ فارغین کی طرح خدمت دین انجام نہیں دیسکتے اور ان کا دعویٰ بے حقیقت ہوگا ؎

وجائزۃ دعوی المحبۃ فی الھوی　　ولکن لا یخفی کلام المنافق

(ترجمہ: عشق میں محبت کا زبانی دعویٰ تو بہت آسان ہے اور ہر ایک کیلئے ممکن ہے لیکن حقیقت یہ ہیکہ منافق کا

اصل پنجم

کام ہوتا ہے اخلاص سے اور ہم میں اخلاص نہیں ہے محض دعویٰ سے مخلصین کی برابری کرتے ہیں حالانکہ خدا مخلص اور غیر مخلص کو برابر نہیں کرتا جبتک (ہم ریا و نمود سے تصفیۂ قلب کرکے) اہل اخلاص (میں سے نہ ہوں گے کام نہیں ہوگا اور ہر ادارہ میں ہر مرکز میں ان (اہل اخلاص) کی سخت ضرورت ہے۔

اصل ششم

طلبہ میں علم کی کمی کا اصلی سبب یہ ہے کہ اہل علم کو اور اساتذہ کو (الا ماشاء اللہ) خود علم کا صحیح ذوق نہیں تو پھر شاگردوں کو کیا خاک ذوق پیدا ہوگا (اساتذہ کی طرح شاگردوں کو بھی) کسی فن سے ادنیٰ مناسبت نہیں ہوتی۔ علم کے ضیاع کا اصلی سبب یہ ہے اور یہی سبب ہے عمل کے ضیاع کا۔

اصل ہفتم

عوام علماء کی طرف اس وقت تک ہرگز رجوع نہیں کرسکتے جبتک ان میں تدین خاص دیکھیں گے اور یہ (تدین خاص) ان کے صفات محمودہ اور اخلاق فاضلہ پیدا کرنے سے ہوسکتا ہے منجملہ ان صفات حمیدہ کے جن سے وہ مقتدا اور مرجع خلائق بن سکتے ہیں، استغنا ہے اور طمع و کبر کا نہ ہونا ہے۔

اصل ہشتم

اس زمانہ میں بہت سے لوگوں نے صلاح نفس کو برباد کرکے بہیم آزادی و مطلق العنانی و بد سلیقگی و بدمعاملگی و بدعہدی و بدخلقی اور بدانتظامیوں سے اپنے کو ایسا ضائع کیا ہے کہ اب نہ تو وہ معاش ہی کے قابل رہے اور نہ معاد (آخرت) کے، اس لئے کہ ان کی قوت عملیہ ہی بیکار ہوگئی اور وہ اپنے نفس (دنیا) کے ہاتھوں تباہ ہوگئے، فریب نفس پر ان کو تنبہ ہو تب دونوں کی تعمیر ممکن ہے ایسے لوگوں کی اصلاح ہر شخص کا کام نہیں بلکہ ماہر مصلح ہی کرسکتا ہے کہ وہی ان کے فریبوں پر انھیں مطلع کرکے راہ پر لگا سکتا ہے اور وہی ان کو اس ہلاکی سے نکال سکتا ہے اور گئی ہوئی قوت عملیہ واپس دلا سکتا ہے جس سے معاش اور

معاد دونوں منتظم ہو سکتے ہیں اور فلاح دارین حاصل ہو سکتی ہے۔

اصل نہم

اصلاحِ نفس بغیر سیاست (تربیت) ناممکن ہے اور فی زمانا طالبین کی حالت یہ ہے کہ غلبۂ نفس اور ہوئی وہوس سے نفس کے خلاف ادنیٰ بات بھی گوارا نہیں ہوتی گو علماء دین ومفتیان شرع متین ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو۔ دیکھا جاتا ہے کہ علماء حق کو حق بات کہنے پر طرح طرح سے بدنام کیا جاتا ہے اور اس بدنام کرنے میں عوام کے ساتھ ان کے ہم مشرب علماء بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ فیا حسرتاہ دیاویلتاہ ویامصیبتاہ۔

اصل دہم

آجکل دیکھا جاتا ہے کہ مریدین وطالبین قرب مشائخ ڈھونڈتے ہیں ان میں سے بعض مریدین کا تو مقصود ہی دین اور خدا تک پہنچنا نہیں ہوتا بلکہ مشائخ ہی مقصود ہوتے ہیں یا کچھ دنیوی اغراض ہوتی ہیں، لہٰذا ان کے اس فعل کو جنون اور خود ان کو مجنون کہنا بعید نہ ہوگا۔ اور جن مریدوں کا مقصود دین ہوتا ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں، بعض تو اس کو قرب شیخ، انقیاد واتباع کامل اصلاح اعمال و اخلاق اور طلب صادق کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں، جو سراسر محمود ومقصود اور مطلوب ہے۔ اور بعض کی نیت گو قرب مشائخ سے دین ہی ہوتی ہے لیکن وہ اس کے حصول کے لئے اتباع، انقیاد، اطلاع حالات اور اصلاح کو ذریعہ نہیں بناتے بلکہ محض ظاہری ورسمی حاضر باشی، دست بوسی، نذرانہ گذاری اور تملق وچاپلوسی تک ان کا ذریعہ محدود رہتا ہے۔ ایسا تعلق اور قرب غیر محمود ہے اور ایسا طالب، طالب کاذب ہے اس کو اگر مجنون نہ کہا جائے تو یہ شخص احمق ضرور ہے۔ اس لئے کہ اس کا مطلوب صحیح اور محمود ہے۔ لہٰذا اس کو مجنون نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس کے حاصل کرنے کا طریقہ اس نے غلط اختیار کیا ہے اس لئے اس کے احمق ہونے میں تو کلام ہی نہیں ہے جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

والفرق بین الحمق والجنون ان الاحمق مقصوده صحیح ولکن سلوکه الطریق فاسد فلا تکون له رویة صحیحة	حماقت اور جنون میں فرق یہ ہے کہ احمق کا مقصد تو صحیح ہوتا ہے لیکن اس کا طریق کار غلط ہوتا ہے پس اس کے لئے (یعنی اس شخص کے لئے جو مجنون ہو)

فی سلوك الطریق الموصل فی الغرض واما المجنون فانه یختار مالا ینبغی ان یختار فیکون اصل اختیارہ واثیارہ فاسداً۔ (احیاء العلوم ص ۔)

قطعی اصابت رائے نہیں ہوتی اس راستہ کے اختیار کرنے میں جو مقصود تک پہنچانے والا ہو۔ اور مجنون تو ایسی چیز کو اختیار کرتا ہے جس کو اختیار نہ کرنا چاہیے پس اس کا انتخاب اور اختیار ہی سرے سے فاسد ہو جاتا ہے۔

اضافہ از ناقل حاصل یہ ہے کہ انسان تین طرح کے ہوتے ہیں۔ عاقل، احمق، اور مجنون۔ عاقل وہ ہے جس کا مقصد اور طریق کار دونوں صحیح ہوں۔ احمق وہ ہے جس نے کسی صحیح مقصد کی خاطر غلط طریق کار اختیار کر رکھا ہو۔ اور مجنون وہ ہے جس کا کوئی صحیح مقصد ہی نہ ہو۔ پس اس طریق میں بھی عاقل وہ شخص ہے جس کا مقصود خدا تعالیٰ تک پہنچنا ہو اور اس کا طریق اس نے انقیاد واتباعِ شیخ کامل کو بنایا ہے۔ اور اگر مقصود حق تعالیٰ ہی ہیں لیکن طریق کار شیخ سے صرف رسمی تعلقات اور اس کی چاپلوسی وغیرہ تجویز کیا ہے تو یہ شخص احمق ہے۔ اور وہ شخص جس کا مطلوب ہی شیخ ہو، خدا تک پہنچنا اس کا مقصد ہی نہ ہو وہ مثل مجنون کے ہے کیونکہ اس کا انتخاب ہی سرے سے فاسد ہے ــــ انسان کی ان ہی دونوں پہلی قسموں کا تذکرہ اس حدیث میں ہے:۔

عن شداد بن اوسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت۔ العاجز من اتبع نفسہ ھواھا وتمنی علی اللہ الامانی۔ رواہ الترمذی واحمد والحاکم وابن ماجہ (الادب النبوی ص ۲۲۵)

حضرت شداد بن اوسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیس (یعنی عاقل تجربہ کار اور عاقبت اندیش) وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس کو ذلیل اور پامال کر کے اس پر قابو پالیا ہو اور عمل (واہتمام) کیا ہو مرنے کے بعد (والی زندگی) کے لیے (یعنی خالق ومخلوق، نفس، اہل وعیال اور اپنی قوم کا حق ادا کر کے بعث وحشر، حساب کتاب سزا وجزا کی تیاری کرلی ہو) اور عاجز (یعنی واجب میں کوتاہی کرنے والا) وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس سے خواہشات کی اتباع کرائی ہو (پس اپنی شہوات کا ایسا تابع ہو گیا ہو کہ اس کے ہر حکم پر لبیک کہتا ہو۔ یہی شخص مستحق ہے اس کا کہ اس کو احمق کہا جائے) اور اس کی حماقت میں اضافہ ہو جاتا ہے اس بات سے کہ یہ شخص کچھ نہ کرنے کے باوجود) اللہ تعالیٰ سے اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کے ملنے کی امید لگائے بیٹھا ہے (اور اپنی بے عملی وبے راہ روی کے متعلق اپنے دل کو کبھی یوں تسلی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ بڑے غفور ورحیم ہیں اور کبھی اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے

اور کبھی یہ خیال کرلیتا ہو کہ اخیر عمر میں گناہوں سے توبہ کرلیں گے اور تلافی مافات کریں گے حالانکہ اس مسکین کو یہ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو لکھی ہوئی ہے (صرف) ان لوگوں کے لئے جو اس سے ڈرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں اور اسکے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہیں نیز اس مغفل نے یہ بھی نہ جانا کہ موت کا کیا اعتبار کہ کب آجائے کتنے جوان العمر طاقتور اور تندرست لوگ موت کا نشانہ بن چکے ہیں (الحاصل کام کچھ نہ کرنا اور ثمرات کا منتظر رہنا ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ اور اس کا قائل کسی احمق سے کم نہیں ہے)

اسی قسم کی تمنا کے متعلق قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے:-

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَا اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ الآیہ۔ نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے (کہ خالی خولی زبان سے اپنے فضائل بیان کیا کریں، بلکہ مدار کار طاعت پر ہے۔ پس جو شخص طاعت میں کمی کرے گا اور) کوئی برا کام کرے گا (خواہ از قسم عقائد ہو یا از قسم اعمال) وہ اس کے عوض میں سزا دیا جائے گا (تفسیر بیان القرآن ص ۱۵۹/۲)

اصل یازدہم

(سوانح حیات مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مضمون ان اصول کے مناسب معلوم ہوا لہٰذا وہ بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے):-

"اس زمانہ میں لوگوں کی ہمتیں ریاضات میں مشقت اٹھانے سے پست ہوگئیں آرام طلبی کا نفس خوگر ہو گیا اور جاہ طلبی انسان کے لئے جبلی اور فطری امر ہے، اگر علماء کی جماعت میں ہوئے تو خیال یہ پیدا ہوا کہ ہمیں لوگ ایسی نظر سے دیکھیں جس نظر سے علماء باللہ کو دیکھتے ہیں۔ اگر مشائخ و صوفیہ کے لباس میں ہوئے تو اس کی ہوس پیدا ہوئی کہ اسطرح مانے جائیں جس طرح جنید و شبلیؒ و بایزید مانے جاتے تھے۔ ادھر افعال، عادات، مجاہدات کو دیکھا تو مطلع صاف۔"

اصل دوازدہم

قال امام الغزالیؒ فی کتاب الامر بالمعروف امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں امر بالمعروف

والنہی عن المنکر من ربع العادات
الثانی من کتب احیاء العلوم الدین
بعد الحمد والصلوٰۃ - ھٰذہ عبارتہٗ

امابعد فان الامر بالمعروف و
النہی عن المنکر ھو القطب الاعظم
فی الدین وھو المہم الذی انبعث
اللہ لہ النبیین اجمعین ولوطوی
بساطہ واھمل عملہ لتعطلت النبوۃ
واضمحلت الدیانۃ وعمت الفترۃ
وفشت الضلالۃ وشاعت الجہالۃ
واستشری الفساد واتسع الخرق
وخربت البلاد وھلک العباد وان
لم یشعروا بالہلاک الا یوم التناد و
قد کان الذی خفنا ان یکون، اِنَّا لِلّٰہِ
وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، اذ قد اندرس
من ھذا القطب عملہ وعلمہ وانمحی
بالکلیۃ حقیقتہ ورسمہ واستولت
علی القلوب مداھنۃ الخلق وانمحت
عنہا مراقبۃ الخالق واسترسل الناس
فی اتباع الھوی والشہوات استرسال
البہائم وعزّ علی بساط الارض مومنٌ
صادقٌ لا تاخذہٗ فی اللہ لومۃ لائم

اور نہی عن المنکر کے بیان میں بعد حمد وصلوٰۃ کے فرمایا
ہے - عبارت یہ ہے کہ

—:—

امابعد بلاشبہہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
دین میں قطب اعظم ہے اور یہی وہ مہم ہے جس کیلئے
اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا ہے
اگر اس کا بساط تہ کر دیا جائے اور اس کا علم وعمل مہمل
بنادیا جائے تو نبوت معطل ہوجائے (یعنی اس کا اب کوئی
کام ہی نہ رہ جائے) اور دیانت مضمحل ہوجائے (کیونکہ
دیانت معروف ومنکر میں منحصر ہے) سستی وتکاسل
(اعمال میں) عام ہوجائے۔ جہالت اور فساد شائع وساری
ہوجائے اور خروق اور اختلاف کی خلیج وسیع ہوجائے اور
ملک خراب ہوجائے تمام لوگ ہلاک ہوجائیں اگرچہ وہ اپنی
ہلاکت کو قیامت سے پہلے نہ سمجھیں (بالآخر) جس کا ہمیں خوف
تھا وہ ہوکر رہا - اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس لئے کہ اس
قطب اعظم کا علم وعمل محو ہوگیا اور اس کی حقیقت اور رسم تک
مٹ گئی، قلوب پر مداہنت خلق کا استیلاء وتسلط ہوگیا
اور خالق کا مراقبہ قلوب سے محو ہوگیا، لوگ اتباع ہوا میں
ایسے پڑ گئے جیسے بہائم چھوٹ کر کھیت میں پڑ جاتے ہیں اور
ساری روئے زمین پر ایسا مؤمن صادق نادر الوجود ہوگیا
جسکو حق تعالیٰ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت
کا خوف نہ ہو۔

اصل سیزدہم

قال صاحب روح المعانی تحت قوله
تعالیٰ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ
أَنْفُسَكُمْ الآية- ثم ان هذا التوبیخ
والتقریع وان كان خطابا لبنی اسرائیل
الا انه عام من حیث المعنی لكل واعظ
یأمر ولا یأتمر ویزجر ولا ینزجر ینادی
الناس "البدار البدار"، ویرضی لنفسه
التخلف والبوار یدعو الخلق الی الحق و
ینفر عنه ویطالب العوام بالحقائق و
لا یشم ریحها منه وهذا هو الذی یبدأ
بعذابه قبل عبدة الاوثان ویعظم ما
یلقی لوفور تقصیره یوم لا حاكم الا الملك
الدیان وعن محمد بن واسع قال بلغنی
ان اناسا من اهل الجنة اطلعوا علی
ناس من اهل النار فقالوا لهم قد كنتم
تأمروننا باشیاء عملناها فدخلنا الجنة
قالوا كنا نأمركم بها ونخالف الی غیرها

آیت شریفہ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم کے تحت
صاحب روح المعانی نے فرمایا ہے کہ اس توبیخ و سرزنش
میں اگرچہ بظاہر خطاب بنی اسرائیل کو ہے لیکن درحقیقت
یہ ہر شخص کے لئے عام ہے جو دوسرے کو باز رکھے اور خود
باز نہ رہے، لوگوں کو پکارے کہ (اعمال حسنہ میں) جلدی
کرو جلدی کرو اور خود پسماندگی اور ہلاکت پر راضی رہے
مخلوق کو حق کی دعوت دے اور خود اس سے گریز
کرے عوام سے حقائق کا مطالبہ کرے اور خود اسکی
ہوا بھی نہ لگی ہو یہی وہ شخص ہے کہ بت پرستوں کے
عذاب سے قبل اس کو عذاب دیا جائے گا۔ اور چونکہ
اس کی تقصیر بڑی ہے اس لئے اس کو سزا بھی بڑی ملیگی
جسدن کہ کوئی حاکم نہ ہوگا بجز ملک دیان کے۔ محمد بن
واسعؒ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ مجھے یہ روایت پہنچی
ہے کہ جنت کے کچھ لوگ بعض اہل نار کو دیکھیں گے پس
ان سے کہیں گے تم لوگوں نے ہمیں باتیں بتائی تھیں
جنپر عمل کرکے ہم جنت میں داخل ہو گئے (پھر تم لوگ
دوزخ میں کیسے پڑے ہو) وہ لوگ جواب دینگے کہ جن باتوں
کا ہم تم کو حکم کرتے تھے خود اس کے خلاف کرتے تھے اس لئے ہمارا یہ حشر ہوا۔

اصل چہاردہم

(الوظیفة الثامنة) ان یكون المعلم
عاملا بعلمه فلا یكذب قوله فعله لان

معلم کا آٹھواں وظیفہ یہ ہے کہ اپنے علم پر عامل ہو اس
کا فعل اس کے قول کی تکذیب نہ کرے اس لئے کہ علم

العلم یدرک بالبصائر والعمل یدرک بالابصار وارباب الابصار اکثر فاذا خالف العمل العلم منع الرشد وکل من تناول شیئا وقال للناس لاتتناولوہ فانہ سم مہلک سخر الناس بہ واتھموہ وزاد حرصھم علیہ فیقولون لولا انہ اطیب الاشیاء والذھا لما کان یستاثر بہ ومثل المعلم المرشد من المسترشدین مثل النقش من الطین والظل من العود فکیف ینقش الطین بما لانقش فیہ ومتی استوی الظل والعود اعوج واذا اعوج العود اعوج الظل ولذلک قیل فی المعنی ؎

لاتنہ عن خلق وتاتی مثلہ
عار علیک اذا فعلت عظیم

وقال اللہ تعالیٰ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم ولذلک کان وزر العالم فی معاصیہ اکبر من وزر الجاھل اذ یزل بزلتہ عالم و یقتدون بہ ومن سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا ووزر من عمل بھا ولذلک قال علیؓ قصم ظھری رجلان عالم متھتک وجاھل متنسک فالجاھل

کا ادراک تو باطنی آنکھ سے ہوتا ہے اور عمل ظاہری آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور ظاہری آنکھ والے بہ نسبت باطنی کے زیادہ ہیں (تو ہو سکتا ہے کہ علم کا ادراک نہ ہو اور عمل کا ادراک ہو جائے) پس اگر عمل علم کے خلاف ہوگا تو ہدایت سے مانع ہوگا اور جو شخص خود تو کوئی کام کرے اور لوگوں سے کہے کہ تم نہ کرو تو یہ سم قاتل ہے لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے اور اسکو متہم گردانیں گے اور اس چیز کے کرنے پر انکی حرص زیادہ ہوگی، یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر یہ کوئی پسندیدہ اور اچھی چیز نہ ہوتی تو وہ خود کیوں کرتا۔ اور مثال ہدایت کرنے والے معلم اور اس سے ہدایت حاصل کرنیوالوں کی ایسی ہے جیسے نقش اور مٹی اور سایہ اور لکڑی پس گندھی ہوئی مٹی کو کیونکر نقش کیا جا سکتا ہے ایسے سانچے سے جس میں نقش نہ ہو اور سایہ کیسے سیدھا ہو سکتا ہے جبکہ لکڑی ہی ٹیڑھی ہو، جب لکڑی ٹیڑھی ہوگی ظاہر ہے کہ سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا اور اسی معنیٰ میں یہ شعر ہے (ترجمہ) "ایسا نہ کرو کہ ایک بات سے دوسروں کو منع کرو اور خود اسے کرو، اگر ایسا کیا تو تمھارے لئے یہ بڑی شرم کی بات ہے" اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کیا غضب ہے کہ کہتے ہو لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے اسی واسطے عالم کے گناہ کا وبال جاہل کے گناہ سے زیادہ ہے کیونکہ اس کی لغزش سے ایک دنیا کو لغزش ہو جاتی ہے اور لوگ اسکی اقتدا کرتے ہیں اور حدیث شریف میں ہے کہ، جو شخص کوئی برا طریقہ ایجاد کرے تو اس پر اپنا وبال بھی ہوگا۔ اور ان لوگوں کا وبال بھی ہوگا جن لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے، اسی واسطے حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ میری کمر دو

يغر الناس بتنسكه والعالم يغرهم بهتكه والله اعلم (احياء العلوم ص۲۲-ج۱)

آدمیوں نے توڑ رکھی ہے ایک عالم جو حکم شرعی کی پرواہ نہ کرتا ہو (بیحرمتی اور ہتک کرتا ہو) اور دوسرا عبادت گزار جاہل، جاہل اس لئے کہ لوگ اس کی عبادت سے دھوکے میں پڑینگے اور عالم اس لئے کہ اپنی بے عملی سے لوگوں کو دھوکہ میں ڈالے گا۔ واللہ اعلم بالصواب)

اصل پانزدہم

وفي تبيين المحارم لاشك في فرضية علم الفرائض الخمس وعلم الاخلاص لان صحة العمل موقوفة عليه وعلم الحلال والحرام وعلم الرياء لان العابد محروم من ثواب عمله بالرياء وعلم الحسد والعجب اذهما ياكلان العمل كما تاكل النار الحطب وعلم البيع والشراء والنكاح والطلاق لمن اراد الدخول في هذه الاشياء وعلم الالفاظ المحرمة او المكفرة ولعمري هذا من اهم المهمات في هذا الزمان لانك تسمع كثيرا من العوام يتكلمون بما يكفرهم عنها غافلون والاحتياط ان يجدد الجاهل ايمانه كل يوم ويجدد نكاح امرأته عند شاهدين في كل شهر مرة او مرتين اذ الخطاء ان لم يصدر من الرجل فهو من النساء كثير (شامی ج۱ ص۲۷)

تبیین المحارم میں لکھا ہے کہ فرائض خمسہ (یعنی ارکان اسلام کلمۂ توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) کا علم حاصل کرنا فرض ہے اور علم الاخلاص (کے حاصل کرنے کا طریقہ جاننا) بھی فرض ہے اس لئے کہ عمل کی صحت اسی پر موقوف ہے (اسی طرح) حلال وحرام کا علم بھی ضروری ہے) اور ریاء کا علم بھی فرض ہے اس لئے کہ عبادت کرنیوالا اسی ریار کی وجہ سے عمل کے ثواب سے محروم رہتا ہے حسد اور عجب کا علم بھی فرض ہے کیونکہ یہ دونوں عمل کو اس طرح سے کھا کر ختم کردیتے ہیں جس طرح آگ لکڑی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے) نیز خرید و فروخت نکاح وطلاق کے مسائل کا علم ہر اس شخص کیلئے ضروری ہے جس کو ان امور سے سابقہ پڑتا ہو، اسی طرح الفاظ محرمہ اور کلمات کفریہ کا جاننا بھی فرض ہے اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس آخری چیز کا علم اس زمانہ میں ایک اہم المہمات میں سے ہے۔ اس لئے کہ تم بہت سے عوام کو کلمات کفریہ زبان سے نکالتے سنوگے اور ان غریبوں کو اس کا پتہ بھی نہیں ہوتا۔ پس احتیاط یہ ہے کہ جاہل (اور عامی شخص) اپنے ایمان کی ہر روز تجدید کرلیا کرے اور دو گواہوں کے سامنے ہر مہینہ میں ایکبار یا دوبار اپنے نکاح کی بھی تجدید کرلیا کرے اس لئے کہ اس قسم کی غلطیاں اگر مرد سے نہ بھی واقع ہوں تاہم عورتوں سے

بکثرت وقوع میں آتی رہتی ہیں۔

اصل شانزدہم

اخبرنا عبد الملك بن سليمان ابو عبد الرحمن الانطاكي عن عباد بن عباد الخواص الشامي ابو عتبة قال امّا بعد اعقلوا والعقل نعمة فرب ذي عقل قد شُغِل قلبه بالتعمق فيما هو عليه ضرر عن الانتفاع بما يحتاج اليه حتى صار عن ذلك ساهياً ومن فضل عقل المرء ترك النظر فيما لا نظر فيه حتى لا يكون فضل عقله وبالاً عليه في ترك منافسة من هو دونه في الاعمال الصالحة

خبر دی ہمیں ابوعبدالرحمٰن عبدالملک بن سلیمان انطاکی نے بیان کرتے ہوئے ابوعتبہ عباد بن عباد شامی سے کہ انھوں نے فرمایا، امابعد! (اے لوگو) عقل اور سمجھ سے کام لو اور جان لو کہ عقل ایک بڑی نعمت ہے، مگر بہت سے عقل والے ایسے بھی ہیں کہ ان کا قلب مضر اشیاء میں شغف کے ساتھ مشغول ہونے کی وجہ سے اپنی مفید اور ضروری چیزوں سے بھی منتفع ہونے سے قاصر ہوگیا ہے یہانتک کہ (وہ قلب گویا) ان مفید چیزوں کو بھول ہی گیا ہے۔ انسان کے کمال عقل سے یہ بات ہے کہ وہ کسی ایسی چیز میں غور وخوض نہ کرے جو قابل توجہ والتفات نہو تاکہ اس کی زیادتی عقل اسپر وبال نہو جائے (کسی ایسے موقع میں جو محتاج نظر وتوجہ ہو مثلاً) اس شخص سے مناقشہ اور تعرض ترک کرنے میں جو اپنے سے اعمال صالحہ میں کم ہو (کہ یہ محل نظر ہے کیونکہ ممکن ہے کہ اسکی عقل ایسے شخص سے مناقشہ کرنے میں تردد کرے اور عجب نہیں کہ مناقشہ ہی کو اچھا سمجھے حالانکہ عقل کا فیصلہ ہونا یہ چاہئے کہ اس سے تعرض نہ کیا جائے اس لئے کہ اعمال صالحہ کی کمی ایک ایسی عملی کوتاہی ہے جو مناقشہ کی اجازت نہیں دیتی ورنہ اگر ایسی بات پر بھی مناقشہ کا دروازہ کھولا جائے گا تو دنیا فتنہ وفساد سے بھر جائے گی پس اگر اس نے سمجھ سے کام نہ لیا بلکہ عقل کی تیزی کی وجہ سے ایسے شخص سے بھڑ گیا، یہی عقل کا وبال ہونا ہے۔

اورجل شغل قلبه ببدعة قلد فيها دينه رجالاً دون اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم

یا (متردد ہو) ایسے شخص سے مناقشہ ترک کرنے میں جس کا قلب کسی ایسی بدعت کیساتھ مشغول ہو جسمیں اس نے اپنے دین کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے علاوہ دوسرے اشخاص کا تابع بنا دیا ہو (یہ مقام بھی قابل توجہ ہے اس میں بھی عقل کو وبال ہونے

بچانا چاہئے یعنی عقل اگر ایسے شخص سے مناقشہ کو روکے اور مصالح دکھلا کر ترک کو ترجیح دے تو اس کو ترک نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس شخص کی یہ اعتقادی خرابی ہے اگر اس کا انسداد نہ کیا گیا تو دنیا میں بدینی کا دورِ دورہ ہو جائیگا ایسی صورت میں اس کا مناقشہ نہ کرنا بھی عقل کے وبال ہونے کا مصداق ہے

او اکتفیٰ برائه فیما لا یری الهدیٰ الا فیها ولا یری الضلالة الا ترکها یزعم انه اخذها من القرآن وهو یدعو الیٰ فراق القرآن فما کان للقرآن حملة قبله وقبل اصحابه یعملون بمحکمه ویومنون بمتشابهه وکانوا منه علیٰ منار اوضح الطریق وکان القرآن امام رسول الله صلی الله علیه وسلم وکان رسول الله صلی الله علیه وسلم اماماً لاصحابه وکان اصحابه ائمة لمن بعدهم رجال معروفون منسوبون فی البلدان متفقون فی الرد علیٰ اصحاب الاهواء مع ما کان بینهم من الاختلاف وتسکع اصحاب الاهواء برائهم فی سبل مختلفة جائرة عن القصد مفارقة للصراط المستقیم فتوتهت بهم ادلاءهم فی مهامة مضلة فامعنوا فیها متعسفین فی هیأتهم کلما احدث لهم الشیطان بدعة فی ضلالتهم انتقلوا منها الیٰ

یا ایسے شخص سے (مناقشہ کرنے میں متردد ہو) جس نے اپنی رائے پر اکتفاء (اور اعتماد) کیا ہو ایسے (اہم) مسائل (منقولہ) میں کہ ہدایت اسی میں منحصر ہو اور ترک اس کا موجب ضلالت ہو (اور عقل کی وہاں دسترس نہ ہو اور نہ عقل کا حکم معتبر ہو) اس کا خیال تو یہ ہو کہ اس نے اس مسئلہ کو قرآن سے اخذ کیا ہے حالانکہ (حقیقۃً) وہ قرآن کو چھوڑنے کی دعوت دے رہا ہے (کیونکہ وہ خود اس کا مخترع ہے اور قرآن کے خلاف ہے)، (یہ شخص جو مدعی ہے فہم قرآن کا اس سے دریافت کرنا چاہئے کہ) کیا قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے والے اس کے اور آپ کے ساتھیوں سے پہلے کچھ لوگ ایسے نہیں گزرے ہیں جو اس کے محکم پر عامل رہے اور اس کے متشابہات پر ایمان رکھتے ہوں اور اس (مدعی) کے اعتبار سے ایک واضح راستہ کے منارہ پر فائز رہے ہوں (بیشک ایسے لوگ گزرے ہیں دیکھو) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امام قرآن تھا اور (آپؐ) صحابہؓ کے امام تھے اور صحابہ کرام بعد میں ہونے والے سب لوگوں کے امام تھے اور تمام بلاد میں مشہور و معروف تھے اور سب کے سب اہل اہوا کو رد کرنے میں متفق تھے باوجود اس کے کہ ان اہل اہواء میں آپس میں خیالات کا اختلاف بھی تھا اور وہ لوگ اپنی اپنی رائے اور خیالات کو لیکر ایسے مختلف راستوں میں حیران تھے جو میانہ روی سے دور اور صراط مستقیم کے بالکل مخالف تھے۔ ان

اہل اہواء کے رہنما سُست اور کمزور ہو کر ایک گمراہ کن دعالت کے) وسیع میدان میں پڑ گئے اور انہیں اچھی طرح واقع ہو گئے در آنحالیکہ وہ اپنی اس حالت میں بلا سوچے سمجھے داخل ہونے والے تھے اور جب بھی شیطان ان کے لئے ان کی گمراہیوں میں سے کسی بدعت کی ایجاد کرتا تو (نہ صرف یہ کہ اسے کرلیتے) اس سے دوسری بدعت کی طرف بھی منتقل ہو جاتے اور یہ اس لئے (ہوتا تھا) کہ ان لوگوں نے نہ تو اسلام کا طریقہ اختیار کیا اور نہ مہاجرین ہی کی اقتداء پسند کی حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ آپ نے حضرت زیادؓ سے پوچھا، جانتے ہو اسلام کو منہدم کرنے والی کیا چیز ہے پھر خود ہی فرمایا کہ تین چیزیں ہیں، ایک تو عالم کی لغزش (دوسرے) منافق کا جدال بالقرآن (یعنی خود اس کے دل میں قرآن کی عظمت نہ ہو مگر دوسروں سے جدال و مناظرہ کے وقت قرآن کی آیتیں پیش کرے تیسرے گمراہ کن ائمہ۔

اتقوا اللّٰہ وما حدث فی قرائکم واھل مساجدکم من الغیبۃ والنمیمۃ والمشی بین الناس بوجھین ولسانین وقد ذکران من کان ذا وجھین فی الدنیا کان ذا وجھین فی النار۔ یلقاک صاحب الغیبۃ فیغتاب عندک من یری انک تحب غیبتہ یخالفک الی صاحبک فیاتیہ عملک بمثلہ فاذا ھو قد اصاب عند کل واحد منکما حاجتہ وخفی علی کل واحد منک ما یاتی صاحبہ حضورہ عند من حضرہ حضور الاخوان وغیبتہ عمن غاب عنہ غیبۃ الا عدلو من حضر منھم کانت لہ الاثرۃ ومن غاب منھم لم یکن لہ حرمۃ یغبن من حضرہ بالتزکیۃ ویغتاب من غاب عنہ بالغیبۃ

لوگو! خدا سے ڈرو اور ان چیزوں سے بچو جو تمہارے (آجکل کے) قراء یعنی علماء اور اہل مساجد (یعنی نمازیوں میں پیدا ہو گئی ہیں یعنی غیبت، چغلخوری اور لوگوں سے دورُخے پن سے ملنا جلنا حالانکہ (حدیث میں آتا ہے) کہ جو شخص دنیا میں دورُخا ہو گا اس کے لئے دوزخ میں بھی دورُخ ہوں گے۔ غیبت کرنیوالا کرتا یہ ہے کہ (تم سے ملتا ہے تو تم سے ایسے شخص کی غیبت کرتا ہے جس کے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ تم اس کی غیبتوں کو پسند کرو گے (اور اس پر خوش ہو گے) پھر تم سے ہٹ کر تمھارے ساتھی کے پاس آتا ہے (جس کی غیبت تم سے کر چکا ہے) اور اس سے تمھارے متعلق اسی قسم کی باتیں کرتا ہے (اس طرح) تم دونوں میں سے ہر ایک سے اپنا مقصد تو حاصل کر لیتا ہے اور ہر شخص سے دوسرے کی بات پوشیدہ رکھتا ہے اس کی حاضری اس شخص کے پاس جس کے یہاں وہ جاتا ہے بھائیوں جیسی حاضری ہوتی ہے یعنی اس کے سامنے بالکل بھائی جیسا بن جاتا ہے) اور اس کا

غائب ہونا اس شخص کے سامنے سے جس کے یہاں سے وہ غائب ہوتا ہے دشمنوں کی سی غیبت ہوتی ہے (یعنی پیٹھ پیچھے دشمن جیسا ہوتا ہے) ان میں سے جو سامنے پڑجائے بس اسی کو ترجیح ہے اور جو موجود نہ ہو اس کا کوئی احترام نہیں جس کے پاس حاضر ہو تعریف کرکے اس کو دھوکے میں رکھے اور جس کے پاس سے غائب ہو برائیاں کرکے اس کی غیبت کرے۔ (افسوس)

فیالعباد اللہ اماف القوم من رشید
ولا مصلح بہ یقمع ھذا عن مکیدتہ
ویردہ عن عرض اخیہ المسلم بل
عرف ھواھم فیما مشی بہ الیھم
فاستمکن منہم وامکنوہ من حاجتہ
فاکل بدینہ مع ادیانہم

ان اللہ کے بندوں (عالموں اور نمازیوں) کو کیا ہوگیا ہے کیا ساری قوم میں کوئی سمجھدار شخص نہیں رہ گیا ہے اور کیا قوم میں کوئی بھی ایسا مصلح (اور خیر خواہ) موجود نہیں ہے جو (اس جیسے فتنہ پرداز سے) اسکی یہ چالبازی چھڑادے اور اس کو اپنے مسلمان بھائی کی بے عزتی کرنے سے روک دے (اس غیبت کرنیوالے سے اسکی عادت بد کو چھڑانا اور اسکو اس فعل شنیع سے باز رکھنا تو درکنار) دیکھا یہ جاتا ہے کہ خود لوگوں کی بھی رغبت اسکی غیبت کی طرف ہوتی ہے پس وہ غیبت کرنیوالا لوگوں سے اپنی خواہش پوری کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس سے اپنی خواہش پوری کرتے ہیں (یعنی ہر ایک محظوظ ہوتا ہے، ایک سنکر دوسرا سناکر) اس طرح وہ غیبت کرنے والا اپنا بھی دین کھاڈالتا ہے اور ان کا بھی (یعنی دونوں کی نیکیوں کے ضیاع کا سبب بنتا ہے۔

فاللہ اللہ ذُبُّوا عن حُرَمِ اعیانکم وکفوا
السنتکم عنہم الا من خیر وناصحوا
اللہ فی امتکم اذ کنتم حملۃ الکتاب و
السنۃ فان الکتاب لا ینطق حتی ینطق بہ وان
السنۃ لا تعمل حتی یعمل بہا فمتی
یتعلم الجاھل اذا سکت العالم فلم
ینکر ما ظھر ولم یامر بما ترک وَقَدْ اَخَذَ
اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیُبَیِّنُنَّہٗ
لِلنَّاسِ وَلَا یَکْتُمُوْنَہٗ

(اے عالمو اور نمازیو) اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے ڈرو، اپنے بھائیوں کی پردہ دری سے باز رہو اور ان کے متعلق گفتگو کرنے) سے اپنی زبانوں کو روکو بجز اس کے کہ کوئی اچھی بات ہو اور اپنی قوم کے لئے خدا کے دین کے، ناصح بنو اس لئے کہ تم کتاب و سنت کے حامل ہو اور دیکھو) کتاب خود تو بولے گی نہیں یہاں تک کہ اسکے ذریعہ سے بولا جائے اسیطرح یہ بھی یقینی ہے کہ سنت خود تو عمل کریگی نہیں یہانتک کہ اسپر عمل کیا جائے (یعنی کتاب و سنت کا نطق اس کا پڑھنا اور اسپر عمل کرنا ہے) پھر بھلا کیسے سیکھ سکتا ہے ایک جاہل جبکہ عالم ہی خاموش رہیگا جو نہ اس جاہل کے افعال ظاہرہ (خلاف

شرع، پر نکیر کرے اور نہ اس کو اعمال متروکہ (معروفہ) کا امر کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے عہد لیا ہے کہ وہ لوگ اسکی کتاب کو لوگوں تک ضرور بالضرور پہونچائیں گے اور چھپائیں گے نہیں۔

اتقوا اللہ فانکم فی زمان رق فیہ الورع وقل فیہ الخشوع وحمل العلم مفسدوہ فاحبوا ان یعرفوا بحملہ وکرھوا ان یعرفوا باضاعتہ فنطقوا فیہ بالھوی لما دخلوا فیہ من الخطأ وحرفوا الکلم عما ترکوا من الحق الی ما عملوا بہ من باطل فذنوبھم ذنوب لا یستغفر منہا وتقصیرھم تقصیر لا یعترف بہ کیف یھتدی المستدل المسترشد اذا کان الدلیل جائرا احبوا الدنیا وکرھوا منزلۃ اھلھا فشارکوھم فی العیش وزایلوھم بالقول ودافعوا بالقول عن انفسھم ان ینسبوا الی عملھم فلم یتبرؤا مما انتفوا منہ ولم یدخلوا فیما نسبوا الیہ انفسھم لان العامل بالحق متکلم وان سکت وقد ذکر ان اللہ تعالیٰ یقول انی لست کل کلام الحکیم اتقبل ولکنی انظر الی ھمہ وھواہ فان کان ھمہ وھواہ لی جعلت صمتہ

(اے عالمو) اللہ سے ڈرو اسلئے کہ تم ایک ایسے زمانہ میں ہو جس میں تقویٰ و پرہیزگاری نادر ہو گئی ہے، خشوع کم ہو گیا ہے علم کے حامل وہ لوگ ہو گئے ہیں جو اس کو تباہ و برباد کرنے والے ہیں ان (ظالموں) نے یہ چاہا کہ حاملین علم کے لقب سے مشہور رہوں اور اس بات کو ناپسند کیا کہ علم کے ضائع کرنے والوں میں ان کا شمار ہو اس لئے اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق اس میں (من مانا) کلام کیا (جب بھی ذرا) ان کو غلطی سے اسمیں داخل ہونے کا موقع مل گیا اور (حرکت یہ کی کہ) کلام کو حق سے پھیر کر جس کو کہ انھوں نے ترک کیا تھا باطل کی طرف کر دیا جس پر کہ وہ عامل تھے پس ان کا یہ گناہ ایسا گناہ ہے جس سے استغفار نہیں کیا جاتا اور ان کی یہ تقصیر ایسی تقصیر ہے جس کا اعتراف نہیں کیا جاتا (یعنی اس کو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا کیونکہ اس کو دین سمجھا جاتا ہے پھر اعتراف استغفار چہ معنی دارد جب یہ حال ہے تو تم ہی بتاؤ کہ) کیونکر راہ یاب ہو سکتا ہے کوئی مستدل طالب رشد جبکہ دلیل ہی میں غلطی اور کجی واقع ہو رہی ہو ان حاملین علم نے (حقیقۃً مفسدین علم میں) دنیا کو تو پسند کیا لیکن اہل دنیا کے درجہ کو برا ہی جانا۔ گویا عیش میں تو ان کے شریک کار بنے اور زبان سے ان سے علیحدگی بھی ظاہر کرتے رہے اور اقوال سے اپنے نفس کو ان کے عمل (یعنی دنیا داری کی طرف منسوب ہونے سے) بھی بچاتے رہے لیکن جس شئی کی اپنے نفس سے نفی کرنی چاہی تھی

حمداً و وقاراً لي وان لم يتكلم وقال الله تعالى مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا (لم يعملوا بها) كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (كتبا) وقال خُذُوْا مَا اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ قال العمل بما فيه

نہ تو اس سے بری رہ سکے (یعنی دنیا داری کا طعنہ) اور نہ اس چیز ہی میں داخل ہو سکے جس کی جانب اپنے کو منسوب کیا تھا (یعنی حاملینِ علم) اس لئے کہ حق پر عمل کرنے والا ناطق ہوتا ہے اگرچہ ساکت ہو۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں ہر حکیم کے کلام کو قبول ہی نہیں کرتا بلکہ میں اس کے قصد اور ارادہ کو دیکھتا ہوں۔ اگر اس کا ارادہ میرے لئے ہوتا ہے تو پھر میں اس کی خاموشی کو ہی اپنی حمد اور توقیر قرار دیتا ہوں اگرچہ (زبان سے کچھ) نہ بولے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مثال ان لوگوں کی جو حامل تورات ہیں لیکن اسپر عامل نہیں، ایسے ہے جیسے گدھا جو (اپنی پشت پر) کتابیں لادے ہوئے ہے نیز فرمایا کہ اور جو کچھ ہم تم کو دیں اسے مضبوطی سے پکڑو (یعنی اسپر عمل کرو)۔

ولا تكتفوا من السنة بانتحالها بالقول دون العمل بها فان انتحال السنة دون العمل بها كذب بالقول مع اضاعة العلم ولا تعيبوا بالبدع تزينا بعيبها فان فساد اهل البدع ليس بزائد في صلاحكم ولا تعيبوها بغيا على اهلها فان البغي من فساد انفسكم وليس ينبغي للطبيب ان يداوي المرضى بما يبرئهم و يمرضه فانه اذا امرض اشتغل بمرضه عن مداواتهم ولكن ينبغي ان يلتمس لنفسه الصحة ليقوى به على علاج المرضى فليكن امركم فيما تنكرون على اخوانكم نظرا منكم لانفسكم و نصيحة منكم لربكم

(اور دیکھو) حدیث کو صرف زبان سے نقل کر دینے ہی پر اکتفا نہ کرو کہ اسپر عمل کرو (یہ بہت ہی برا ہے) کیونکہ احادیث کا صرف نقل کرنا اور اسپر خود عمل نہ کرنا (ایک تو) کذب قولی ہے پھر علم کا ضیاع بھی ہے (کہ اس علم سے کیا فائدہ جس پر عمل نہ کیا) اور صرف بدعات ہی کو اس کی برائی دیکھتے ہوئے برا بھلا مت کہو اس لئے کہ اہل بدعت کا فساد تمہاری صلاح میں کچھ اضافہ نہ کریگا (یعنی محض دوسرونکی برائی کرنے سے تو اپنی اصلاح میں کچھ زیادتی نہ ہو جائیگی) نیز بدعات کی تردید اس انداز سے بھی مت کرو کہ (جس سے) اہل بدعت پر ظلم و تعدی ہو جائے کیونکہ یہ تعدی خود تمہارے نفس کا فساد ہے اور دوسروں کی اصلاح کی خاطر اپنے نفس میں فساد پیدا کر لینا کونسی دانشمندی ہے (اسی لئے) طبیب کو نہیں چاہیے کہ مریضوں کا علاج کسی ایسی چیز سے کرے جو انہیں تو اچھا کر دے اور اسے بیمار ڈالدے کیونکہ جب طبیب خود ہی مریض ہو جائیگا تو اپنے مرض کی وجہ

وشفقة منكم على اخوانكم وان تكونوا مع ذلك بعيوب انفسكم اعنا منكم بعيوب غيركم وان يستفطم بعضكم لبضا النصيحة وان يحظى عندكم من بذلها لكم وقبلها منكم وقد قال عمر بن الخطابؓ رحم الله من اهدىٰ الى عيوبي تحبون ان تقولوا فيحتمل وان قيل لكم مثل الذى قلتم غضبتم تجدون على الناس فيما تنكرون من امورهم وتاتون مثل ذلك افلا تحبون ان يوخذ عليكم اتهموا رأيكم ورأى اهل زمانكم وتثبتوا قبل ان تكلموا وتعلموا قبل ان تعملوا فانه ياتى زمان يشتبه فيه الحق والباطل ويكون المعروف فيه منكرا والمنكر فيه معروفا۔

سے دوسروں کے علاج سے قاصر رہیگا بلکہ اس کو چاہیے کہ اپنے نفس کے لیے صحت تلاش کرے تاکہ اسکی وجہ سے دوسرے بیماروں کے علاج پر قادر ہو۔ پس چاہیے کہ تمھارا اپنے بھائیوں کو امر بالمعروف) کرنا خود اپنے (عیوب) میں نظر کرنے کی غرض سے ہو اور یہ کہ تم ان تمام امور کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی عیوب پر اس سے کہیں زیادہ فکر مند ہو جتنا کہ دوسروں کے عیوب پر۔ اور یہ کہ تم میں بعض بعض سے اخلاص کے ساتھ نصیحت حاصل کرے اور (تمھاری جانب سے قدر ومنزلت کا) حصہ اس شخص کو ملنا چاہیے جو تمھیں کوئی نصیحت کرے یا تمھاری کوئی نصیحت قبول کرے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم کرے اس شخص پر جو مجھ پر میرے عیوب پیش کرے تم لوگ پسند کرتے ہو کہ (کچھ بھی) کہو لوگ تمھاری بات برداشت کریں۔ لیکن اگر تم سے کہا جائے وہی جو تم نے کہا ہے تو تم غصہ ہوتے ہو تم لوگوں سے تو خفا ہوتے ہو ان باتوں پر جن میں تم ان پر نکیر کرتے ہو اور خود وہی کام کرتے ہو کیا تم پسند نہیں کرتے کہ تم پر مواخذہ کیا جائے۔ متہم سمجھا کرو اپنی رائے کو اور اپنے اہل زمانہ کی رائے کو۔ اور بات کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ اور عمل کرنے سے پہلے علم سیکھو۔ اس لیے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جس میں حق وباطل مشتبہ ہو جائینگے۔

(وعلی ہذا اچھا آدمی بُرا اور بُرا آدمی اچھا سمجھا جائے گا۔ خوش اخلاق بد اخلاق اور بد اخلاق خوش اخلاق متصور ہوگا۔ صادق کاذب اور کاذب صادق خیال کیا جائے گا۔ سُنّت بدعت اور بدعت سنّت سمجھی جائیگی متبع سنت مخالف رسول اور تابع ہوا و نفس محب رسول قرار دیا جائیگا۔ افسوس کہ جس زمانہ کی پیشنگوئی کیگئی تھی آج ہم اسی دور سے گذر رہے ہیں اور جس چیز کا خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا ہم اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ معروف ومنکر میں اشتباہ ہو رہا ہے اور حق کو باطل، باطل کو حق سمجھا جا رہا ہے۔ چنانچہ علمائے محققین

سے تو استغنا برتا جا رہا ہے اور غیر محققین کو رہنما بنایا جا رہا ہے مشائخ معتبرین سے تو اعراض ہے اور دنیا دار پیروں سے اعتقاد ہے خاندان اور برادری کی رسمیں باوجود سخت و دشوار ہونے کے ہمیں گوارا ہیں اور شرعی احکام سہل ہونے پر بھی ناگوار ہیں پھر نہ صرف یہ کہ ان پر عمل نہیں ہے بلکہ بیشتر موقعوں پر ان کے ضد پر عمل کیا جا رہا ہے دیکھو شرع میں ڈاڑھی بڑھانے اور مونچھ کم کرنے کا حکم ہے اس کے برعکس ڈاڑھی منڈائی اور مونچھ بڑھائی جا رہی ہے۔ نماز جمعہ میں خطبہ کا مختصر پڑھنا مسنون تھا طویل پڑھا جا رہا ہے۔ نماز کو طویل کرنا مطلوب تھا مختصر ادا کی جا رہی ہے۔ نماز تنہائی میں لمبی پڑھنی چاہیے اور جماعت میں مختصر اس کے برعکس کیا جا رہا ہے حُبِّ دنیا مذموم شئے تھی باعثِ عزّت تصور کی جا رہی۔ نفاق بدترین عیب تھا ہنر سمجھا جا رہا ہے۔

فمنكم متقرب الى الله بما يباعده ومتحبب اليه بما يبغضه عليه قال الله تعالىٰ أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوْءُ عَمَلِهِ فَرَاٰهُ حَسَنًا الاٰية فعليكم بالوقوف عند الشبهات حتى يبرز لكم واضح الحق بالبينة فان الداخل فيما لا يعلم بغير علم اثم ومن نظر لله نظر الله له عليكم بالقراٰن فأتموا به و اُمُّوا به وعليكم بطلب اٰثار الماضين فيه

تم میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اس سے بعید کرنے والی چیزوں کے ذریعہ ڈھونڈینگے اور حق تعالیٰ کے محبوب بننا چاہینگے۔ ان چیزوں کے واسطے جو اللہ کو ناراض کرنے والی ہونگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کیا وہ شخص جس کے لئے اس کی برائیاں مزیّن کر دی گئی ہیں پس وہ انھیں اچھا سمجھ رہا ہو الآیۃ پس لازم کرلو اپنے ذمہ اس امر کو کہ شبہات کے کام میں توقف کروگے تا آنکہ دلائل واضحہ سے تمھارے لیے حق ظاہر نہ ہوجائے کیونکہ وہ شخص بلاعلم کے نامعلوم اشیاء میں قدم رکھے گا وہ گنہ گار ہوگا اور جو شخص اللہ کے لئے نظر کریگا تو اللہ تعالیٰ بھی اسکی طرف توجہ فرمائیں گے قرآن شریف کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور (اپنے جملہ امور کو) اسی کے ذریعہ پورا کرو اور اسی کی طرف قصد کرو۔ نیز اپنے ذمہ ضروری کرلو سلف کی اتباع کو قرآن (کے معنی و مطلب سمجھنے کے بارے) میں۔

ولو ان الاحبار و الرهبان لم يتقوا زوال مراتبهم وفساد منزلتهم باقامة الكتاب وتبيانه ما حرفوه ولا كتموه ولكنهم لما خالفوا الكتاب

اور (دیکھو) اگر یہ احبار و رہبان (یعنی یہود و نصاریٰ کے علماء) کتاب اللہ کی اقامت اور اس کے شرح و بیان کرنے پر اپنے مرتبہ کے فساد اور اپنی قدر کے زوال کا خوف نہ کرتے تو کتاب اللہ کی نہ تو تحریف کرتے اور نہ اس کا کتمان ہی کرتے لیکن جبکہ ان لوگوں

باعمالهم التمسوا ان يخدعوا قومهم عما صنعوا مخافة ان يفسد منازلهم وان يتبين للناس فسادهم فحرفوا الكتاب بالتفسير ما لم يستطيعوا تحريفه كتموه فسكتوا عن صنيع نفسهم ابقاءً على منازلهم وسكتوا عما صنع قومهم مصانعة لهم وَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ لَيُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا يَكْتُمُوْنَهٗ بل مالوا عليه ورفقوا لهم فيه ۔　　تمت الرسالہ

(دارمی ص ۸۵ تا ۸۸)

اپنے اعمال سے کتاب اللہ کی مخالفت کی تو اپنے کئے ہوئے کی طرف سے قوم کو دھوکہ دینا تجویز کیا (محض) اس خوف سے کہ کہیں ان کے مدارج ختم نہ ہوجائیں اور لوگوں پر انکا فساد عیاں نہ ہوجائے پس کتاب کی (اپنی مخترع) تفسیر کے ذریعہ تحریف (معنوی) کی اور جن مقامات پر تحریف کرتے نہ بن پڑا اُسے چھپالیا اور اپنی اس نفسانی کارروائی کو ان پر ظاہر بھی نہ کیا تاکہ اپنے مرتبہ پر برقرار رہ سکیں اور جو کچھ ان کی قوم نے حرکتیں کیں اپنے کو ان کا ہم پیشہ اور شریک کار ظاہر کرتے ہوئے اسکی جانب سے بھی سکوت اختیار کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ وہ ضرور بالضرور کتاب اللہ کو لوگوں کو پہنچائیں گے اور اسکو چھپائیں گے نہیں لیکن عہد کے خلاف خود بھی تحریف وکتمان کی طرف مائل ہوئے اور لوگوں سے بھی اس مسئلہ میں بہت نرمی سے پیش آئے"۔

اعلان

تالیفات مصلح الامۃؒ کا یہ حصہ دوم آپ کے پیش نظر ہے۔ اگر ملاحظہ سے نہ گذرا ہو تو اس کا حصہ اول بھی ملاحظہ فرمایئے جو کہ حسب ذیل بیس[20] کتب پر مشتمل ہے۔

اصلاحی مضمون[1] فوائد الصحبۃ[2] تلاش مرشد[3] عاقبۃ الانکار[4] اعتقاد و انکار[5] علم کی ضرورت[6] تحذیر العلماء (کامل)[7] توقیر العلماء[8] الامر الفارق[9] تواصی بالصبر[10] ادائے حقوق[11] ارتفاع الضیق[12] مضمون ضمیمہ[13] نعم الامیر[14] النعم علی خیر الامم[15] طریقہ اصلاح[16] طریق کار مع ضمیمہ[17] تمسک بالسنۃ[18] مژدہ جانفزا[19] افاضات کاملین[20]

قیمت مجلد: ۱۴ روپیہ = دفتر معرفت حق ۲۳ بخشی بازار الہ آباد-۳

خصوصیت حضرت والا در اصلاح امت

فرمایا کہ — میں نے اپنے کام کی بنا تمسک بالکتاب اور تمسک بالسنۃ پر رکھی ہے یہی وجہ ہے جو آپ اس قدر لوگوں کا مرجوعہ دیکھ رہے ہیں اگر بزرگوں کے ملفوظات ہی سناتا رہتا تو کچھ لوگ سنتے مگر اس قدر عام مرجوعہ نہ ہوتا اور آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ اسی تمسک بالکتاب والسنۃ کی برکت سے الحمد للہ کچھ حاصل ہو گیا ورنہ میں خود بالکل کورا رہتا۔

بات یہ ہے کہ کتاب وسنت پر تو سب کا ایمان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطاع مطلق اور متبوع مطلق قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَلَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اور بزرگوں کا ذکر نہیں ہے اور کسی خاص بزرگ پر ایمان بھی نہیں ہے کسی بزرگ کو جو مانا جاتا ہے تو اسی لئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع ہے اس لئے اس بزرگ کا قابلِ اتباع ہونا موقوف ہے اس امر کے اثبات پر کہ وہ متبع سنت تھے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے لوگوں کو سنت سے روشناس کیا جائے اور اس کے بعد ان اکابر کی سیرت کو پیش کیا جائے کہ دیکھو یہ سنت ہے اور یہ ان حضرات کا عمل ہے اس طرح سے ان بزرگوں سے بھی عقیدت ہو جائے گی باقی بدون اس کے آپ چاہیں کہ کسی بزرگ کو منوالیں تو یہ بڑا مشکل ہے آپ ایک بزرگ کو پیش کریں گے دوسرے لوگ اس کے مقابل میں اپنے بزرگ کو پیش کر دیں گے لامحالہ کتاب وسنت ہی کو حکم بنانا ہوگا۔

اس لئے میں نے اصل ہی کو لے لیا اور قرآن وحدیث پیش کرنا شروع کیا کہ کرو اس پر اعتراض۔ اب اس پر کیا اعتراض کریں اور کس طرح سے انکار کریں اعتراض یا انکار ہو تو ایمان ہی رخصت ہو جائے۔

(ملفوظات مصلح الامۃ۔ جمع کردہ جامی عفی عنہ)

حقیقی تلاوت کا طریقہ

فرمایا کہ حقیقی تلاوت جس پر میں زور دے رہا ہوں وہ کچھ ایسی آسان کبھی نہیں ہے کہ ہر شخص کو فوراً ہی حاصل ہو جائے۔ بلکہ جب اس کی تحصیل کا ارادہ کیجئے گا اور اس کا جو طریقہ ہے اس کو اختیار کیجئے گا تب جاکر وہ حاصل ہو گی۔ باقی آپ جو روزانہ تلاوت کرتے ہیں اور کئی کئی پارہ کی کر کے آتے ہیں میں اس کو نہیں کہہ رہا ہوں۔

اصلی اور حقیقی تلاوت وہ ہے جو قلب سے ہو اور جس کا منشار ایمان ہو اسی سے ناشی ہو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تلاوت سے پہلے اس بات کا استحضار کیجئے کہ یہ خدا تعالےٰ کا کلام ہے جس کی آپ تلاوت کرنے جا رہے ہیں اس امر کی تصدیق بالقصد والاختیار کیجئے اسی تصدیق کا نام ایمان ہے اور جب تک اس کا مراقبہ تام نہ ہو جائے تلاوت شروع نہ کیجئے۔ خواہ اس میں کچھ وقت ہی کیوں نہ لگ جائے۔

پھر جب یہ مراقبہ تام ہو جائے اور کلام اللہ کے کلام اللہ ہونے کا استحضار ہو جائے اور اس کی پوری تصدیق قلب میں آجائے تو گویا ایمان حاصل ہو گیا اب اسکے بعد جو تلاوت کرے گا وہ ایمانی تلاوت ہو گی اور ایک ایسا عمل ہو گا جو ایمان سے ناشی ہو گا۔ اسی طرح سے کرتا رہے گا تو عمل کی برکت سے اس کے ایمان میں بھی ترقی ہو گی۔ چنانچہ یہاں دونوں ہی چیزیں ہوتی ہیں اول تو ایمان منشار ہوتا ہے اور عمل (تلاوت) اس سے ناشی ہوتی ہے پھر یہ عمل (تلاوت) منشار بن جاتا ہے اور کمال ایمان اس سے ناشی ہوتا رہتا ہے۔

(ملفوظات مصلح الامۃ جمع کردہ
جامی عفی عنہ)

طریقہ تلاوت قرآن شریف

فرمایا کہ تلاوت قرآن قرب الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس سے سارے مراتب قرب کے حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اعتقاد و عظمت کے ساتھ دل سے تلاوت کی جائے یہی ایمان اور اذعان اور اعتقاد ہے جو کہ خود ایک کمال ہے اور بہت سارے کمالات کا موجب ہے اور مانند بھوک پیاس کے ایک وجدانی شے ہے جب انسان کو حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کو محسوس کرتا ہے اور اس کو اس کا علم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حلاوت لذتِ۔ ذوق و شوق اور محبت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

طریقہ تلاوت کا یہ ہے کہ اس سے پہلے عظمت قرآن کا استحضار کیا جائے اور استغفار کے ساتھ ساتھ تجدید ایمان بھی کی جائے اور اس امر کی تصدیق کیجائے کہ یا اللہ یہ آپ کا کلام ہے اور برحق ہے اس پر ہمارا ایمان ہے اس میں جو کچھ ہے سب برحق ہے ہم کو اس کی معرفت با اخلاص عطا فرما اور اس کے مطابق ہماری زندگی بنا دے۔ اور اس کے جملہ اوامر و مناہی پر عمل کی توفیق فرما اور اس کے برکات و ثمرات سے نواز دیجئے اور اس کو قبول فرمائے۔

اس طرح سے تلاوت کرے اول اول تکلف ہوگا مگر بعد میں لطف آنے لگے گا اور قرآن شریف کی ایک ہی آیت پکڑے گی چلنے نہ دے گی۔ حضرات صحابہ کرام کی تلاوت کا یہی طریقہ تھا۔

اللہ تعالیٰ ہم کو صحیح تلاوت اور حقیقی تلاوت کی توفیق عطا فرمادے۔

(ملفوظات مصلح الامۃ جمع کردہ جامی عفی عنہ)

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حضرت مولانا دامت برکاتہم کے ارشادات وملفوظات کے ضبط میں دقت اور دشواری دیکھ کر بعض حساس احباب نے یہ مشورہ دیا کہ اس زمانہ کی ایک نئی ایجاد "ٹیپ ریکارڈ" کا انتظام کرلیا جائے تو مضامین کے ضبط میں بہت سہولت ہوجائیگی اسلئے کہ اس میں من وعن تقریر محفوظ ہوجاتی ہے جو بہ آسانی قید کتابت میں لائی جاسکتی ہے۔ اس مشورہ کو پسند کیا گیا اور حضرت والا دامت برکاتہم بھی راضی ہوگئے تو اس کا انتظام ہوا۔ جب پہلے دن یہ آلہ ضبط تقریر کیلئے مجلس میں رکھا گیا تو حضرت والا نے معاً یہ آیت تلاوت فرمائی وَوُضِعَ الْکِتٰبُ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْہِ وَیَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ ھٰذَا الْکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً اِلَّآ اَحْصٰھَا الآیۃ

اور نہایت مؤثر انداز میں اسکی تفسیر فرماتے ہوئے بصیرت افروز تقریر فرمائی اور آخرت، بعث ونشر اور وہاں کے حساب وکتاب کو ایسا یاد دلایا کہ گویا قیامت کا نقشہ نظروں کے سامنے پیش فرمادیا اور کئی روز تک مختلف مجالس میں مسلسل اس مضمون کو بیان فرماتے رہے۔ نیز جن شرعی باتوں کو آج اہل دنیا مستبعد اور خلاف عقل وخرد سمجھتے ہیں ان کو انھیں کی ایجادات سے جو محسوس ہیں سمجھانیکی کوشش فرمائی اور اسی آلہ کو ضبط اعمال کی نظیر میں پیش فرمایا کہ جس طرح یہ آلہ ہر بات کو محفوظ کرلیتا ہے اسی طرح منجانب اللہ مامور ملائکہ تمام اعمال کو ضبط کرتے جارہے ہیں جنکو بروز قیامت من وعن پیش کرینگے۔ بیشک یہی حضرات صحیح معنوں میں حقائق اشیاء کے عارف ہوتے ہیں ان کو ہر شے میں آخرت ہی نظر آتی ہے اور ہر وقت وہیں کی باتیں یاد آتی ہیں ؎

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اور ؎

نگوید از سر بازیچہ حرفے　　کزو پندے نگیرد صاحب ہوش

اب آپ حضرات کے سامنے وہ تقریر پیش کیجاتی ہے۔ امید کہ آپ بھی اس سے محظوظ اور لطف اندوز ہوں گے۔

(از مرتب)

(۲۳-۲۴ ربیع الآخر ۱۳۸۴ھ) جمعہ و شنبہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ایجادات کی حقیقت وحیثیت

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَوُضِعَ الْكِتٰبُ یعنی کتاب رکھدی جائیگی اور مراد کتاب سے بندوں کا نامۂ اعمال ہے اسلئے کہ سب کے نامۂ اعمال لوگوں کے داہنے یا بائیں ہاتھوں میں رکھ دیئے جائیں گے۔ یا میزان میں یا اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھدیئے جائیں گے۔ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ۔ تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے (جن کے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے) کہ اس میں جو کچھ گناہ لکھا ہوگا اس کو دیکھ کر خائف ہوں گے۔ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا اور کہتے ہوں گے ہائے ہماری ہلاکت کہ اس کتاب کو کیا ہوگیا ہے کہ اس نے نہ کسی صغیرہ کو چھوڑا اور نہ کسی کبیرہ کو مگر یہ کہ اسکو احصاء (شمار) کرلیا۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ صغیرہ سے مراد تبسم ہے جو بے موقع ہو اور کبیرہ سے مراد قہقہہ ہے اور سعید ابن جبیر نے فرمایا کہ صغیرہ لمم[1] و مسیس اور قبلہ ہے اور کبیرہ زنا ہے اور یہ علی سبیل التمثیل بیان کیا ہے ورنہ اس کے علاوہ جتنے صغائر و کبائر ہیں سب مراد ہیں۔

سہل ابن سعد سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ حقیر سے حقیر گناہوں سے بچو اسلئے کہ یہ بھی موبقات یعنی مہلکات ہیں۔ اور سعد ابن جنادہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حنین سے فارغ ہوئے تو ہم لوگ ایک چٹیل میدان میں نازل ہوئے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر شخص جو کچھ پائے اسکو یہاں لاوے۔ ابھی تھوڑا ہی وقفہ ہوا تھا کہ ہم لوگوں نے ایک ذخیرہ جمع کردیا۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم لوگ اسکو دیکھ رہے ہو؟

[1] گناہ کے قریب ہونا۔

اسی طرح تم پر ذنوب بھی جمع ہو رہے ہیں جیسے تم لوگوں نے اسکو جمع کر دیا۔ لہٰذا چاہیئے کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔ نہ کوئی صغیرہ کا ارتکاب کرے اور نہ کبیرہ کا۔ اس لئے کہ ان سب کا شمار و احصا کیا جا رہا ہے۔ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا۔ اور جو کچھ انھوں نے دنیا میں کیا تھا وہ سب لکھا ہوا موجود پائیں گے۔ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا۔ اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا کہ بے کیا ہوا گناہ لکھ دے یا یہ کہ عمل کے مناسب جو سزا ہے اس پر زیادتی کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تین پیشیاں ہوں گی۔ ایک تو جدال کی، دوسرے معاذیر کی اور تیسری پیشی میں صحف کا تطایر ہوگا (یعنی نامۂ اعمال اڑ اڑ کر آپ سے آپ لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچیگا) کوئی دائیں ہاتھ میں لے گا اور کوئی بائیں میں۔

حکیم ترمذی فرماتے ہیں کہ جدال کفار و اعدا کے لئے ہوگا وہ لوگ اپنے رب کی عدم معرفت کی وجہ سے جدال کریں گے کہ شاید اس کی وجہ سے نجات پا جائیں اور ان کی حجت قائم ہو جائے۔ اور معاذیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام اور تمام انبیاء علیہم السلام کے سامنے عذر پیش فرماویں گے اور ان کے نزدیک دشمنوں کے مقابلہ میں اپنی حجت قائم فرماویں گے (جب حجت اعداء پر قائم ہوجائے گی) تو ان کو جہنم میں بھیجدیں گے۔ اور تیسری پیشی مومنین کی مغفرت کے لئے ہوگی اور ان پر خلوت میں مزید عتاب فرماویں گے تاکہ حیاء اور خجالت کا وبال چکھیں۔ پھر ان کی مغفرت فرمادیں گے اور ان سے راضی ہو جائیں گے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ بعض مومنین کو گناہوں سے اس قدر خجالت ہوگی کہ بیہوش ہو جائیں گے۔

علامہ شعرانی الیواقیت والجواہر میں فرماتے ہیں کہ:۔

واما العرض على الله يوم القيامة فهو مثل عرض العساكر على الملك فيوقف العبد بين يدى الله عز وجل كما يليق بجلاله ويقع السوال بحسب ما يريد الله عز وجل بذلك العبد فياله من موقف تيساقط فيه لحم الوجوه من شدة الخجل والحياء من الله عز وجل۔	اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے تو اسطرح پیشی ہوگی جیسے لشکری بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ تو بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائیگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے جلال کے لائق ہے اور اس بندہ سے جس طور پر اللہ تعالیٰ ارادہ فرمادیں گے۔ سوال کریں گے۔ پس کیا حال ہوگا اس موقف کا جس میں چہروں کے گوشت اللہ تعالیٰ سے حیاء و خجالت کی وجہ سے ساقط ہو جائیں گے۔

(صفحہ ۱۶۵ ج ۲)

تفسیر مظہری میں ہے کہ حضرت انسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تمام نامۂ اعمال تحت العرش ہوں گے۔ جب موقف ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجیں گے وہ ان کو داہنے اور بائیں ہاتھوں میں پہونچادیگی اور اوّل شے اس میں یہ مکتوب ہوگی۔ اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا۔ یعنی اپنی اس کتاب کو پڑھو آج کے دن تم خود اپنا حساب کرنے کے لئے کافی ہو۔

اور قتادہ سے روایت ہے کہ جو لوگ دنیا میں قاری نہیں ہیں اس دن وہ لوگ بھی اس کو پڑھیں گے۔

میں نے خاص طور سے یہ آیت اسلئے پڑھی کہ آپ لوگوں کو بتلاؤں کہ آپ کی ہر بات کا احصار ہو رہا ہے اور فرشتے اسکو قلمبند کرتے چلے جارہے ہیں اور قیامت کے دن سب آپ کے سامنے کھول دیئے جائیں گے اور آپ کا سب کیا دھرا اور ہر بات آپ کے سامنے ہوگی۔ مگر ہم لوگوں کو اسکی طرف التفات نہیں ہے اور نہ اسکو کچھ عجیب و غریب ہی سمجھتے ہیں۔

آواز کے ضبط کرنے کا ایک آلہ آگیا ہے اس میں ہر بات ضبط ہو جاتی ہے۔ جب سے وہ آیا ہے سب لوگ بہت خوش ہیں اور دھوم مچی ہوئی ہے کہ کتنی عجیب و غریب چیز آگئی ہے مگر افسوس کی بات ہے کہ فرشتے جو ضبط کر رہے ہیں اور آپ کی ہر بات لکھے جارہے ہیں جسکو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے اسکو ذرا بھی عجیب نہیں سمجھتے۔ آخر ہو کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو نہایت شدو مد سے قرآن میں قیامت کا بیان فرمارہے ہیں مگر ہم لوگ ان سب باتوں سے غافل ہیں ہمکو یہ چیزیں عجیب ہی نہیں معلوم ہوتی ہیں کس قدر تعجب کی بات ہے۔ یہ آلہ انگریزوں کی ایجاد ہے جسکو اب کے لوگ بہت بڑی کامیابی اور ترقی سمجھتے ہیں مگر اپنے اسلاف کے احوال سے واقفیت نہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی تو ان سے کیسی کیسی باتیں صادر ہوئیں جو آج کل کے لوگوں کے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتیں۔ چنانچہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

لما اودعت الكعبة شهادة التوحيد عند تقبيلی الحجر الاسود خرجت الشهادة عند تلفظی بها وانا انظر اليها بعينی فی صورة ملك وانفتح فی الحجر الاسود مثل الطاق	جب کہ میں نے شہادت توحید کو حجر اسود کے بوسہ دینے کے وقت کعبہ شریف کو ودیعت کی تو میرے تلفظ کے وقت وہ شہادت فرشتہ کی صورت میں خارج ہوئی جس کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور مثل طاق کے حجر اسود میں انفتاح ہوگیا۔ یہاں تک کہ میں نے حجر اسود کے قعر میں نظر کی

حتی نظرت الی قعر الحجر والشهادة قد صارت مثل الکعبة واستقرت فی قعر الحجر وانطبق الحجر علیهما وانسد ذلک انطاق وانا انظر الیه فقالت لی هذه امانة لک عندی ارفعها لک الی یوم القیامة فشکرتها علی ذلک انتهی۔ (الیواقیت والجواہر ص۱۴۲)

اور شہادت مثل کعبہ کے وسیع ہوگئی اور وہ قعر حجر میں مستقر ہوگئی اور حجر اسود اس پر بالکل ڈھک گیا اور وہ طاق بند ہوگیا اور میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا تو کعبہ نے مجھ سے کہا کہ یہ آپ کی امانت میرے پاس ہے۔ جسکو قیامت کے دن آپ کی خدمت میں پیش کرونگا تو میں نے اس بات پر اسکا شکر ادا کیا۔

دیکھا آپ نے یہ کوئی معمولی چیز ہے کہ حجر اسود جو ایک چھوٹا سا پتھر ہے اس کے اندر اتنی وسعت ہوگئی کہ اس نے شیخ کی شہادت کو جو کعبہ کے مثل ہوگئی تھی اسکو ضبط کرلیا اور یہ کہا کہ یہ امانت ہے جسکو قیامت کے دن آپ کے سامنے پیش کرونگا۔

لوگ اہل اللہ کے ان واقعات کو نہیں دیکھتے۔ لندن اور امریکہ کے شاگرد ہو گئے ہیں مگر کب تک ان کی شاگردی کروگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر کب شاگردی اختیار کروگے ؎

چند خوانی حکمت یونانیاں حکمت ایمانیاں را ہم بخواں

سنیئے! یہ آلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک بڑی چیز سمجھی جاتی ہے۔ آجکل کے عقلاء اس کو بڑی کامیابی سمجھتے ہیں ساری دنیا اسکی طرف راغب ہے اور ان ایجادات کو انتہائی ترقی اور عروج سمجھتے ہیں۔ مگر میں اسکی حیثیت اور حقیقت بیان کرتا ہوں۔ شاید آپ لوگوں کی سمجھ میں آئے۔

یہ آلہ آپ کا شاگرد ہے۔ آپ اصل ہیں اور یہ فرع، آپ معلم ہیں اور یہ متعلم۔ اس کے اندر کوئی ذاتی صلاحیت نہیں ہے جیسے اور جمادات ہیں ویسے ہی یہ بھی ایک جماد ہے جو بالکل بے حس وحرکت ہے حیوانات سے بھی اس کا درجہ کم ہے جیسے کہ یہ تپائی ہے کہ اسکو جہاں چاہیں رکھیں اس پر کتاب رکھیں یا اور کوئی چیز رکھ دیں۔ آپ کو اختیار ہے۔ اس کے اندر کوئی قدرت و اختیار نہیں آپ کی مملوک ہے۔ آپ اس کے مالک ہیں جیسے چاہیں اس میں تصرف کرسکتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی آپ کے بالکل تابع ہے جب آپ کی زبان تکلم کریگی جبھی اس کے اندر کلام ضبط ہوسکتا ہے اور اگر زبان ساکت ہو جائے تو پھر یہ بھی بالکل بے اختیار و بیکار ہو جائے گا اور آواز ضبط کرنے کے بھی بہت سے قواعد و ضوابط ہیں جب انھیں قواعد سے آپ اسکو چلائیں گے تو کلام کو ضبط کریگا ورنہ نہیں غرض یہ ہر طرح سے آپ کے تابع ہے اور آپ کا محتاج ہے۔ جب یہ ثابت ہوگیا تو سمجھئے کہ آپ کے شاگرد انسان جن کو آپ

سکھلا پڑھا رہے ہیں اس آلہ سے کہیں افضل واعلیٰ ہیں۔ اس لئے کہ یہ آلہ تو محض آواز کو ضبط کرتا ہے مگر آپ کے شاگرد آپ کے علوم کو اپنے سینوں میں محفوظ کر رہے ہیں اور علوم کو دوسری جگہ پہونچا سکتے ہیں میں تو اس آلہ کی حیثیت ایک بچے سے بھی کم سمجھتا ہوں اسلئے کہ اسکو پڑھایا جاتا ہے تو چونکہ قدرے قلیل ہی سہی فہم تو ہے جسکی وجہ سے وہ باتوں کو سمجھتا ہے اور وہ موقع بے موقع کی باتوں میں فرق کرتا ہے اور آپ کا سکھلانا اسکے علمی ترقی کا موجب ہوتا ہے۔ مگر اس آلہ کو کیا کہا جائے بالکل ہی بے سمجھ اور بے شعور ہے۔ جو بات کہتا ہوں ضبط کرلیتا ہے حتیٰ کہ کھانسی وغیرہ کو بھی نہیں چھوڑتا۔

اس آلہ کی مثال اس صندوق جیسی ہے جس میں روپیہ رکھا ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے اس صندوق کے اندر کوئی شرف وفضیلت نہیں آجاتی۔ بعینہ اسی طرح کلام کی حکایت کرنیکی وجہ سے اس آلہ کے اندر کیا شرف حاصل ہوگا اسلئے کہ اصل شرف تو محکی عنہ کا ہے جو اس سے خارج ہوتا ہے۔

سنئے۔ تعلیم وتربیت کے لئے جو طریقہ انبیاء نے اختیار فرمایا وہی نافع ومفید ہے اس سے بڑھ کر کوئی شئے نافع ہو ہی نہیں سکتی اسلئے کہ اگر کوئی چیز اس سے زیادہ مفید ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو ضرور اسکی تعلیم فرماتے۔ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ لسان سے علوم کو پہونچایا جائے یا ان کو کتاب میں لکھ لیا جائے۔

اصول فقہ کی کتاب نور الانوار وغیرہ میں قرآن پاک کی تعریف یوں کی ہے۔ القرآن هو المکتوب فی المصاحف والمقروء من الالسن۔ یعنی قرآن وہ ہے جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور زبان سے پڑھا جاتا ہے۔ دیکھئے قرآن کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ لسان سے پڑھا جاتا ہے اور مصاحف میں لکھا جاتا ہے ان دونوں کی کیسی فضیلت نکلی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو نازل فرمایا ہے۔ اسلئے وہ ہر کتاب کی اصل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی تعلیم فرمائی ہے تو آپ سب کے معلم ہیں۔ انبیاء لسان ہی سے تعلیم فرماتے ہیں۔ اس کے برابر کوئی شے نہیں ہوسکتی۔ دیکھئے میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں سب اس میں ضبط ہوتا چلا جارہا ہے مگر اس سے اسکو کیا فائدہ۔ کمال تو یہ ہے کہ یہ علم سے متصف ہو جائے اور اس کو علوم سکھلا دیئے جائیں۔

اکابر نے تعلیم وتربیت کرکے لوگوں کو خلیفہ بنایا ہے اور سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا ہے۔ سلسلۂ خلافت آدم علیہ السلام سے چلا آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اسماء سکھلائے۔ چمچہ، ڈوئی نیز اور تمام چھوٹی چھوٹی چیزوں کے نام تعلیم فرمادیئے اور آدم علیہ السلام نے ان سب کو سیکھ لیا تب خلافت کے اہل ہوئے اور ملائکہ چونکہ اس کے سیکھنے سے عاجز تھے ان کے اندر اس کی

صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ سیکھیں اس لئے اللہ تعالیٰ کی خلافت کے مستحق اور اہل نہیں قرار دیئے گئے۔
اسی طرح اس آلہ کو کوئی اپنا خلیفہ نہیں بنا سکتا۔ یہ تو بالکل عاجز و بے اختیار ہے۔ ہم بول رہے ہیں قرآن و حدیث کی باتیں کر رہے ہیں تو اسکو ضبط کر رہا ہے اور ابھی کوئی کفر و فسق کی باتیں کرنے لگے تو اسکو بھی ضبط کریگا کوئی فرق نہ ہوگا تو اس کو کیا شرف نکلا جسکو اتنی تمیز نہ ہو۔ اور ہمارا شاگرد جو ہوگا وہ ہماری ترجمانی کریگا۔ قرآن و حدیث کی باتوں کو اپنے سینہ میں محفوظ کریگا اگر اسکو نسیان کا خوف ہو تو صحیفہ سے ضبط کریگا۔ یہی طریقہ شروع سے چلا آرہا ہے اور یہی نافع ہے اور اب کے زمانہ کے طلبہ تو ایسے ہوگئے ہیں کہ علوم کو حفظ نہیں کرتے ورنہ پہلے جیسے قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے ویسے ہی احادیث کو بھی اپنے صدور میں محفوظ رکھتے تھے۔ فقہ کو یاد کرتے تھے مگر اب زمانہ ہی بالکل بدل گیا۔ جب یہ طلبہ جو کہ پڑھنے کے لئے آئے ہیں اور عقل بھی کچھ رکھتے ہیں پھر بھی استادوں کی باتوں کو یاد نہیں رکھتے تو بیچارہ آلہ جو اینٹ پتھر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ان کے علوم کو کیا محفوظ رکھ سکتا ہے اور اس سے کیا کام چل سکتا ہے۔ ایک بہت بڑی جگہ درس حدیث میں یہ آلہ سامنے رکھا جاتا تھا کہ تقریر ضبط ہو جائے یہ تو بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ یہ سمجھا گیا کہ اب کے زمانہ کے طلبہ ایسے نہیں ہیں کہ تقریر حدیث کو اپنے سینوں یا صحیفوں میں ضبط کر سکیں تو اس کے بقاو حفاظت کے لئے یہ آلہ استعمال کیا گیا ورنہ سب علوم ختم ہو جائیں گے۔ یہ طلبہ کے لئے کتنی بڑی بات ہے اور ڈوب مرنے کی بات ہے کہ ان کو بالکل ہی نااہل سمجھا گیا ایک جماد سے بھی کمتر جانا گیا۔

آپ کو امام بخاریؒ کا واقعہ معلوم ہوگا کہ ان کے پاس بہت سے محدثین بغرض امتحان آئے اور سب نے غلط سند کے ساتھ احادیث پڑھیں ہر ایک کے متعلق آپ نے فرمایا کہ لا (نہیں) جب سن چکے تو ایک ایک حدیث کو لیا اور جو سند انھوں نے پڑھی تھی وہ پڑھی اور کہا یہ سند غلط ہے اور سند صحیح یہ ہے۔ معلوم نہیں پچاس ساٹھ کتنی احادیث تھیں سب کی سند درست کر کے پڑھ دیں تو وہ حضرات مان گئے دیکھا آپ نے کیسا یاد رکھتے تھے اب کوئی ایسا ہے اور اتنا شغف علم سے ہے؟

قرآن پاک کا تو یاد رکھنا ضروری ہے ہی ورنہ کیسے نماز ادا ہوگی، تراویح کیسے ہوگی اور اسکی حفاظت کا تو اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا ہے اس لئے اسکے حفظ کرنے والے تو بہت سے ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔
اسی طرح احادیث کا یاد رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ سنت محفوظ رہے اور اب چونکہ احادیث کتب میں مدون ہوگئی ہیں اسلئے لوگ زبانی یاد نہیں کرتے تاہم جس صورت سے بھی ممکن ہو اسکی حفاظت بھی لازم ہے اگر زبانی یاد ہوں تو بہت خوب ہے۔ فقہ کا یاد رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ عمل کیا جا سکے بغیر اس کے کیسے عمل ہو سکتا ہے۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ طریقہ تعلیم کے لئے اللہ تعالیٰ نے لسان کو پیدا فرمایا ہے اس سے بڑھکر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا اور آدمی کے اندر نطق کا ہونا اللہ تعالیٰ کی زبردست صنعت و کاریگری کی دلیل ہے۔ چنانچہ پنج گنج کے خطبہ میں فرماتے ہیں کہ الحمد للہ الذی خلق الانسان وانطق لہ اللسان۔ تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ کی حمد میں انسان کے خلق کو خصوصیت سے ذکر فرمایا۔ اس لئے کہ انسان کے خلق میں جتنی صنعت و کاریگری ہے اتنی کسی اور مصنوع میں نہیں ہے گویا انسان ایک طرف اور اس کے علاوہ ساری مخلوقات و مصنوعات ایک طرف۔ پھر انسان کے اندر جو خوبیاں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں سب ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ مگر خاص طور پر زبان کو ناطق اور گویا بنانے پر اللہ تعالیٰ کی حمد کر رہے ہیں چنانچہ خلق الانسان کے بعد فرماتے ہیں وانطق لہ اللسان یعنی سب حمد اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے انسان کو پیدا فرمایا اور اسکی زبان کو گویا فرمایا۔

سبحان اللہ کتنا عمدہ خطبہ ہے۔ اب کے طلبہ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ کس کتاب کا خطبہ کیسا ہے۔ پڑھے چلے جا رہے ہیں مگر ان لوگوں کو ذرا عقل نہیں کہ کچھ تمیز کر سکیں۔ مجھے یہ خطبہ بچپن ہی سے پسند تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی حمد کی ہے۔ اس سے انسان کی اور اس کے نطق کی کیسی فضیلت نکلی کہ یہ عجائب مصنوعات سے ہے ورنہ ہم لوگوں کو اتنا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو تعریف ہوئی لسان کی۔ اب کان کی تعریف سنئے۔

اللہ تعالیٰ واقعات ماضیہ کو ذکر فرما کر فرماتے ہیں وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَّاعِيَةٌ۔ اللہ تعالیٰ کانوں کے متعلق فرما رہے ہیں کہ ان باتوں کو محفوظ کرنے والے کان محفوظ کر لیتے ہیں تو دیکھئے کان سے حفاظت کو فرما رہے ہیں۔ اب یہ آلہ ہے جو باتیں کہہ رہا ہوں اسکو ضبط کر لیتا ہے اسکو عجیب چیز سمجھ رہے ہیں مگر اپنے کان کو نہیں دیکھتے اور اس پر غور نہیں کرتے آخر یہ بھی تو ہماری باتوں کو محفوظ کر رہا ہے۔ اس میں اور اس میں کیا فرق ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ مومنین کے قول کو نقل فرماتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا تو سمع کان ہی سے تو ہوتا ہے۔ سماع مقدم ہے اطاعت پر۔ جس درجہ کا سماع ہوگا ویسے ہی اطاعت بھی ہوگی۔

ہم میں جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہیں اسکی قدر نہیں کرتے اسکی بھی ہم کو معرفت نہیں ہے۔ ایک بچہ ہے کہ ڈیڑھ دو سال خاموش رہتا ہے پھر یکایک تکلم کرتا ہے تو کیا تعجب کی بات نہیں ہے اس پر غور نہیں کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بین دلیل ہے۔ اگر دنیا میں آکر ان مصنوعات سے اللہ تعالیٰ

کی معرفت نہ ہوئی تو دنیا میں آنا بالکل بیکار اور لغو ہوا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ اور یہ معرفت انھیں افعال اور مصنوعات الٰہیہ ہی میں غور کرنے سے ہوتی ہے۔ اسی کو دیکھئے کہ بزرگان دین سے کوئی خرق عادت بات صادر ہوتی ہے تو اسکو ان کی کرامت سمجھتے ہیں اور اسکی آپ کے نزدیک اہمیت ہوتی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ بچے کا تکلم مع رعایات اصطلاحات کے یہ بھی کچھ کم خرق عادت نہیں ہے۔ آخر کونسی قدرت اسکے اندر پیدا ہوگئی کہ تکلم کرنے لگا۔ آپ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ہم لوگ بڈھے ہوگئے اب تک غور نہیں کیا تو اب ان امور میں کیا غور کریں۔ تو مت کرو ویسے ہی رہو۔ اور بلا معرفت ہی دنیا سے چلے جاؤ۔ اہل یورپ وامریکہ کے معتقد ہوگئے ہو۔ تمہارے مزاج کو بگاڑ دیا ہے۔ ان لہو ولعب کے آلات پر عاشق و فریفتہ ہوگئے ہو اس کے دلدادہ ہوگئے ہو۔ اس میں کمال حاصل کرنے کے لئے لندن امریکہ چلے جارہے ہو مگر یاد رکھو یہ آخرت میں تمہارے کچھ کام نہ آئے گا۔ سب دھرا دھرایا رہ جائیگا۔ وہ لوگ آخرت میں جاکر تمہاری مدد نہ کریں گے۔ ہاں اگر تم نے اس دار دنیا میں کچھ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرلی اور ان سے تعلق و نسبت پیدا کرلیا تو وہی وہاں کام آوے گی۔

اب اللہ تعالیٰ کی دوسری صنعت ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے اور یہ بات عارف ہی بیان کرسکتا ہے وہ یہ کہ حلق میں دو راستے ہیں ایک سانس لینے کا ہے اور ایک اسکے لئے ہے کہ جب آدمی کھائے پیئے تو اسکے ذریعہ سے معدہ میں پہونچ جائے۔ ذرا سا کھانا یا پانی سانس کی نلی میں پہونچ جائے تو موت کا سامنا ہوجاتا ہے۔ سخت تکلیف ہوتی ہے آنکھیں باہر کو نکل آتی ہیں سانس بند ہوجاتی ہے۔ آدمی دو وقتہ کھانا کھاتا ہے تو باختیار خود اپنی ہلاکت کا سامان کرتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی کھلی قدرت نظر آتی ہے اور پورے توکل کا مقام ہے۔ یہ کلام ابتداء طعام کے متعلق ہے اور معدہ میں پہونچنے کے بعد تو پھر ذرا بھی اختیار باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ کی ہی حفاظت کام کرتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت اقدسؒ کو ایسے ہی ہوگیا تھا۔ دیر تک یہ کیفیت رہی۔

حضرت مولانا ہی کھانسی کے متعلق یہ بیان فرماتے تھے کہ طب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب کوئی شئے ثقیل پھیپھڑے کی نلی یا پھیپھڑے میں پہونچتی ہے تو پھیپھڑا ہوا کو بند کرکے ایک حرکت کرتا ہے جس سے وہ چیز ہوا کے ساتھ باہر نکل آتی ہے۔ کھانسی پھیپھڑے کے لئے ایسی حرکت ہے جیسے دماغ کے لئے چھینک۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی صنعتیں ہیں عقل حیران ہو جاتی ہے۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ حلق میں دو راستے کتنے قریب قریب ہیں مگر اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرماتے ہیں کہ ہوا ہوا کے راستے سے اور کھانے پینے کی چیزیں اپنے راستے سے جاتی ہیں۔ آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔

ان خرافات پر جو عاشق ہوئے جاتے ہو تو اس سے کچھ نفع نہ ہوگا ہاں مگر اس سے یہ نتیجہ نکالو کہ جس طرح ہماری آواز اس میں ضبط ہوتی جارہی ہے ویسے ہی فرشتے ہمارے قول و فعل کو قلمبند کرتے جارہے ہیں۔ ایک چیز بھی ان سے چھوٹ نہیں سکتی سب قیامت میں سامنے رکھ دیئے جائیں گے۔ یہ آلہ تو ایسا ہے کہ اگر ذرا اسکے اندر کوئی کل پرزہ خراب ہوا تو ایک بات بھی ضبط نہیں کر سکتا۔ تعجب ہے ان عقلاء سے کہ یہ سب چیزیں تو ایجاد کرتے چلے جارہے ہیں مگر (عقل سے خدا کو نہیں پہچانتے) میں تو انھیں کو سب سے زیادہ بے ایمان پاتا ہوں ملا اسباب ایمان کثیر ہوتے جارہے ہیں مگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے بات یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف ان اشیاء کی نسبت نہیں کرتے بلکہ اپنی عقل و دانش کی طرف نسبت کرتے ہیں تو بھلا کیوں ایمان لادیں۔ ایک صاحب سے میں نے ایک دفعہ کہا کہ یہ عقل کس کام کی ہے کہ اسکی وجہ سے کتنے لوگ دوزخ میں چلے جائیں گے اور ایک بیوقوف آدمی اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اسکو پسند کیا۔

لوگ اس آلہ کو بہت کارآمد سمجھتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ اس سے کہیں زیادہ مفید شے دیا سلائی ہے۔ بہت ہی کام آتی ہے اسی طرح گھڑی ہے اس سے نماز کے اوقات معلوم ہوتے ہیں۔ غرضکہ یہ سب چیزیں بہت کام کی معلوم ہوتی ہیں مگر اس آلہ کا کیا فائدہ ہے۔ انھیں سب ایجادات لہو ولعب نے جوانوں کو خراب کر دیا۔ عورتوں کے اخلاق بگڑ گئے۔ سب کے سب اسی میں پٹے ہوئے ہیں۔ گانے کی آواز برابر سنائی پڑتی ہے۔ سارا وقت ان کا اسی میں ضائع ہو رہا ہے۔ اپنی جوانی کو تباہ کر رہے ہیں مگر ان کو کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں،

اِتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ۔ (ان یہود نے اپنے دین کو تفریح اور کھیل بنا لیا ہے اور ان کو اس موجودہ زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا ہے تو آج ہم بھی ان کو بھلائے دے رہے ہیں۔ جیسے یہ لوگ آج اپنی اس ہستی کو بھول بیٹھے ہیں اور اسکو بھول بیٹھے ہیں کہ یہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے۔)

یہ ایجادات جس پر آج کل کے سائنس داں نازاں ہیں اس سے پہلے بھی ایسی چیزوں کو لوگ ایجاد کر چکے ہیں چنانچہ سکندر نے آئینہ ایجاد کیا۔ اس کا کتنا بڑا کمال ہے اور کتنے کام کی چیز ہے۔

اسی طرح جمشید نے ایک جام جم بنایا تھا جس میں ساری دنیا نظر آتی تھی کیا اس وقت کوئی ایسا آلہ اب تک ایجاد ہوا ہے۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ ایک معمولی درجے کا چراغ ہی لے لیجئے جس نے اسکو سب سے پہلے ایجاد کیا تھا اس کا کسقدر کمال ہے کہ بتی روئی کی بنائی اس میں تیل ڈالا پھر آگ لگایا تو آہستہ آہستہ وہ روشنی دیتا ہے ورنہ اگر تیل نہ ہو تو ایک ہی دفعہ میں سب روئی جل جائے۔ اسکی روشنی کیسی مناسب ہوتی ہے۔ ذرا غور تو فرمائیے کس قدر معرفت پر یہ چیزیں دلالت کرتی ہیں اب اس میں ترقی کی گئی ہے تو جو فضیلت پہلے لوگوں کو حاصل ہے وہ بعد والوں کو نہیں حاصل ہو سکتی۔ الفضل للمتقدم۔

جب ان ترقیات کو اہل اللہ نے دیکھا تو انھوں نے بھی ایک چیز اس چراغ اور آئینہ اور جام سے بڑھ کر پیش کی۔ وہ قلب ہے ان حضرات نے اپنے قلب ہی کو روشن و منور کر دیا اور یہ شعر پڑھا ؎

جام جہاں نماست ضمیر منیر دوست　　اظہار احتیاج بآنجا چہ حاجت است

حضرت مجدد صاحب شب برات میں عبادت میں مشغول تھے۔ اچانک اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ اس شخص کا کیا حال ہوگا کہ اس سال اس کا انتقال ہو جائیگا۔ حضرت نے لوح محفوظ میں نظر کشفی سے دیکھ کر یہ فرمایا تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح ایک صاحب دل بادشاہ تخت پر بیٹھا تھا اسکی بیوی بھی ساتھ تھی یکایک رونے لگا اور آنسو گرنے لگے۔ بیوی نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے تو کہنے لگے کہ میں نے ابھی لوح محفوظ میں دیکھا ہے کہ میں مرجاؤں گا اور اس حبشی دربان سے تمہارا نکاح ہو جائیگا۔ بیوی نے کہا کہ جب لوح محفوظ میں دیکھ لیا ہے تو پھر رنج کی کیا بات ہے راضی رہنا چاہیئے۔

یہ سب واقعات کچھ کم اہمیت رکھتے ہیں۔ ان پر کیوں نہیں التفات کیا جاتا۔ اپنے گھر کی خبر نہیں۔

اب بس کرتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ کل اسکو پھر بیان کروں گا۔

ایجادات کی حقیقت وحیثیت

(۲)

آج کا مضمون کل کے مضمون سے مرتبط ہے۔ کل میں نے بیان کیا تھا کہ آلات جدیدہ کی بڑی وقعت ہے اس پر لوگ گرے پڑ رہے ہیں اور اسکی وجہ سے ایسی غفلت اور ایسا حجاب ہوگیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صنعتوں کی جانب اصلاً التفات نہیں کرتے۔ نہ اسکی خوبیوں پر غور کرتے ہیں اور نہ اسکے کمالات کو سمجھتے ہیں۔ علماء نے اللہ تعالیٰ کی مخلوقات و مصنوعات کو نظر غائر سے دیکھا ہے اور اسکی معرفت حاصل کی ہے چنانچہ صاحب پنج گنج جو علم صرف کی کتاب ہے خطبہ میں تحریر فرماتے ہیں:

الحمد للہ الذی خلق الانسان وانطق لہ اللسان الخ

یعنی ہر حمد مختص ہے اللہ تعالیٰ کے لئے اس بنا پر کہ اس نے انسان کو پیدا فرمایا۔ دوسری مخلوقات و مصنوعات کا ذکر اس موقع پر نہیں لائے تو معلوم ہوا کہ انسان کا خلق نہایت مہتم بالشان ہے اس میں عجیب عجیب صنعتیں ہیں کہ اسکو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ایک لسان ہی کو لے لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں گویائی کی قدرت عطا فرمائی کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ زبان میں کیا خاص بات ہے کہ وہ تکلم کرتی ہے اور دوسرے اعضاء تکلم نہیں کرتے۔ بس اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اس میں نطق کا ملکہ عطا فرمایا ہے ورنہ جسکو نہیں عطا فرماتے کوئی طاقت نہیں ہے کہ اسکو گویا بنادے۔ اسی لئے مصنف نے انسان کے خلق کے بیان کے بعد خطبہ میں خاص طور سے نطق کا ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حمد جو مختص ہے اس لئے بھی کہ اس نے انسان کی لسان کو ناطق بنایا تاکہ اپنی حاجات قلبیہ کو اس کے ذریعہ سے بیان کرسکے۔ اگر آدمی کلام پر قادر نہ ہو تو خواہ کتنا ہی عاقل ہو اور قلب میں کتنے ہی علوم و معارف رکھتا ہو انکو دوسروں پر کیسے ظاہر کرسکتا ہے اور مافی الضمیر کو کیسے ادا کرسکتا ہے۔ علوم تو قلب و دماغ میں ہوتے ہیں مگر ان کی ترجمانی لسان ہی کرتی ہے اور یہ جو شعر ہے ؎

زبان دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے عیاں نہ ہونا تھا یہ راز دل عیاں نہ ہوا

تو یہ اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ قلب کے حالات وکیفیات کو زبان نہیں بیان کر سکتی مگر سنئے اگر اسکو کوئی چیز کچھ بیان کر سکتی ہے تو زبان ہی کر سکتی ہے اور اسی سے قلبی احوال کا کچھ انداز و سراغ لگ سکتا ہے۔ اگر کسی دوسری شئے سے اظہار کرنا چاہیں تو اتنا بھی نہیں ہو سکتا۔ خوب سمجھ لیجئے۔ بہرحال میں یہ بیان کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو زبان میں نطق وتکلم کی قدرت رکھی ہے تو یہ بہت بڑی صنعت اور ایجاد ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کتنی عجیب چیز ہے اور قیامت میں تو اللہ تعالیٰ دوسرے اعضاء میں بھی نطق عطا فرمادیں گے چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو شہادت دینگے جس پر کفار کو بہت تعجب ہوگا کہ ان اعضاء کو کس نے ناطق بنادیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ٥ یہاں تک کہ جب وہ (کفار) اس (دوزخ) کے قریب آجاویں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور ان کی کھالیں ان پر ان کے اعمال گواہی دیں گے اور (اسوقت) وہ لوگ (متعجب ہوکر) اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف میں کیوں گواہی دی وہ (اعضاء) جواب دینگے کہ ہم کو اس (قادر مطلق) نے گویائی دی جس نے ہر (گویا) چیز کو گویائی دی اور اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا تھا اور اسی کے پاس پھر لائے گئے ہو۔ تو دیکھئے انھیں اعضاء کے لئے آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت کرتا ہے مگر یہی اللہ تعالیٰ کے سامنے جاکر شہادت دیں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں اعضاء کو ناطق بنادیں گے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے جیسے یہاں اللہ تعالیٰ کے ناطق بنانے کی وجہ سے زبان بولتی ہے ویسے ہی اللہ تعالیٰ ان اعضاء میں نطق پیدا فرمادیں گے جس کی وجہ سے وہ نطق کریں گی۔ الغرض آپکی لسان کوئی معمولی شے نہیں ہے نہایت کارآمد شے ہے۔ انبیاء نے تبلیغ احکام وشرائع لسان ہی کے ذریعہ سے تو فرمائی ہے اور لوگوں کو اسکے ذریعہ سے دین سکھلایا ہے اور ایمان کی باتیں بتلائی ہیں۔ آپ کے ایک بہت بڑے آدمی یہ کہتے تھے کہ کانوں تک پہونچانے کا آلہ تو ایجاد ہوگیا ہے مگر اب تک قلوب تک پہونچانے کا کوئی آلہ ایجاد نہ ہوسکا۔ تو میں کہتا ہوں کہ آلہ ایجاد ہوا ہے اور وہ لسان ہے۔ اسی سے قلب تک اپنی باتوں کو پہونچایا جاتا ہے۔ اپنی حاجات کی تبلیغ اور تفہیم تو سب ہی کرتے ہیں اور ایمان اور دین کی تبلیغ ہی اسی سے لوگ کرتے آئے ہیں۔ مگر ہر زبان میں اسکی اہلیت نہیں ہے بلکہ اس زبان میں اہلیت ہے جس کے صاحب کا دل علوم و معارف سے معمور ہو۔

قلب سے زبان کو برابر فیض پہونچ رہا ہو۔ لسان قلب کے علوم کی ترجمانی کرتی ہو۔ پہلے اس کا قلب ناطق ہوتا ہو اسکے بعد اسکی لسان ناطق ہوتی ہو تو پھر ایسی لسان سے نکلے ہوئے کلمات طیبات قلب تک براہ راست پہونچتے ہیں۔ درمیان میں نہ کوئی شئے حائل ہے اور نہ مانع۔ مقولہ مشہور ہے۔ ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔ یعنی جو چیز دل سے نکلتی ہے براہ راست دل تک پہونچتی ہے۔

اور یہ بھی سنئے کہ پنج گنج کا نام پنج گنج اسلئے رکھا گیا ہے کہ اس میں پانچ باب ہیں تو گویا ہر باب ایک خزانہ ہے اسی طرح پوری کتاب گویا پانچ خزانہ ہے اور حضرت مولانا روم نے فرمایا ہے: پنج گوہر دادیم در درج سر؛ اے اللہ تعالیٰ آپ نے سر کے ڈبہ میں پانچ گوہر عطا فرمائے ہیں سر کو ڈبہ فرمایا ہے جس میں بیش قیمت چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ یعنی آنکھ، کان، ناک، اور زبان میں دو قوتیں ہیں ایک سے نطق کرتی ہے اور دوسرے سے مزہ معلوم کرتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ پانچ خزانے اور عطا فرمائے ہیں یہ پانچ نمازیں ہیں جو مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔

(خیر یہ بات ضمناً آگئی تھی) اب اصل کلام سنئے اگر ان مصنوعات الٰہیہ میں غور و خوض کیا جائے اور تدبر سے کام لیا جائے تو آدمی عارف کامل ہو جائے مولانا روم کا کلام محبت اور فنا سے بھرا ہوا ہے اسکے ساتھ ساتھ معرفت بھی کامل رکھتے ہیں تمام اہل اللہ نے ان کے کلام کو حجت بنایا ہے۔ حضرت مولانا رومیؒ ہی مثنوی میں فرماتے ہیں ؎

یا خفیّ الذات محسوس العطا　　انت کالماء و نحن کالرحا

یعنی اے وہ جس کی ذات تو پوشیدہ ہے مگر جس کے انعامات محسوس ہیں تیری مثال پانی کی سی اور ہماری مثال چکی کی سی ہے۔ آگے فرماتے ہیں ؎

انت کالریح و نحن کالغبار　　یختفی الریح و غبراہ جھار

یعنی تو مثل ہوا کے ہے اور ہم مثل غبار کے ہر طرف اڑ رہے ہیں۔ ہوا خود چھپی رہتی ہے مگر اس کا غبار نمایاں رہتا ہے ؎

تو بہاری ما چوں باغ سبز و خوش　　او نہان و آشکارا بخشش

یعنی تو بہار ہے ہم ہرا بھرا باغ ہیں وہ خدا خود پوشیدہ ہے مگر اسکی بخشش ظاہر ہے۔

تو چو جانی ما مثال دست و پا		قبض و بسط دست از جاں شد روا

توہی روح ہے اور ہم گویا ہاتھ پیر ہیں ہاتھ کا پھیلنا سکڑنا جان ہی سے تو ہوتا ہے۔

تو چو عقلی ما مثال ایں زباں		ایں زباں از عقل می یابد بیاں

تو جیسے عقل ہو اور ہم جیسے یہ زبان، عقل ہی سے تو یہ زبان گویائی کی طاقت پاتی ہے۔

تو مثال شادی و ما خندہ ایم		کہ نتیجہ شادی فرخندہ ایم

تیری مثال خوشی کی کیفیت کی سی ہے اور ہماری مثال ہنسی کی سی ہے کہ وہ ہنسی خوشی کا نتیجہ ہوتی ہے اور مبارک سمجھی جاتی ہے۔ سنا آپ نے یہ اشعار کس قدر معرفت پر مبنی ہیں۔ اور حضرت مولاناؒ نے مثنوی کو مندرجہ ذیل اشعار سے شروع فرمایا ہے۔

؎ بشنو از نے چوں حکایت می کند		وز جدائیہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند		از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

تو مولانا نے ایک نے فرض کیا ہے اور اس سے مراد روح انسانی لیا ہے اور نیستاں فرض کیا جس سے مراد عالم ارواح ہے۔ اور فرما رہے ہیں کہ نے سے سنو کہ اپنی جدائی کی کیسی شکایت کر رہی ہے کہ جب سے نیستاں سے مجھ کو لوگوں نے علیحدہ کر دیا ہے میری نفیر سے مرد و زن رو رہے ہیں مرد سے مراد کامل اور زن سے مراد ناقص ہے یعنی سبھی لوگ اسکی جدائی کی حکایت سے پریشان ہیں۔ تو دیکھئے اسی سے کلام کو شروع فرمایا ہے اور اسکے ضمن میں بہت بہت حقائق معارف بیان فرمائے ہیں کہ اہل اللہ انکے کلام سے مست ہو گئے ہیں کتنے لوگوں کو محبت و معرفت اور فنا کا مقام حاصل ہو گیا۔ اسی کو ہم لوگ بھی پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر کچھ اثر نہیں لیتے زبان پر جاری کر لیتے ہیں دل میں ان احوال کو پیدا نہیں کرتے۔ اس پڑھنے پڑھانے سے کیا فائدہ۔ بیروت میں عیسائی ہدایہ پڑھاتے ہیں تو کیا محض اس سے وہ مسلم و مومن ہو جائیں گے؟

پھر حضرت مولانا روم نے کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

؎ دو دہاں داریم گویا ہمچو نے		یک دہاں پنہانست در لبہائے وے

نے کی طرح ہم دو منہ رکھتے ہیں ایک دہان اسکے لبوں میں پوشیدہ ہے۔

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما		ہائے و ہوئے در فگندہ در سماء

ایک منہ اس کا تمھاری طرف نالہ کر رہا ہے جسکی وجہ سے شور و غوغا تمام آسمانوں میں ہے۔ اسی مضمون کو ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان فرما رہے ہیں ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اور یہ مضمون قرآن پاک میں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى
اسی مضمون کو حضرت مولانا روم نے مثال دیگر خوب خوب واضح فرمایاہے تو دیکھئے نے ایک معمولی شئے ہے مگر اس سے کیسی معرفت حاصل کی اور اس کی وجہ سے کیسے حقائق و معارف بیان ہوئے تو کیا آپ بھی ایسے ہی ہیں۔ اگر نے کی مثال نہ دیتے تو آپ کو اتنی معرفت نہ تھی کہ آپ سمجھتے اور اس کو اس موقع پر مثال میں لاتے۔

اہل اللہ مصنوعات میں تفکر کرتے رہتے ہیں اور اس سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور اگر ہم نے ان آلات جدیدہ سے معرفت حاصل نہ کی تو بہت ہی خسارہ کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مصنوعات و مخلوقات میں تفکر و تدبر کا امر بھی فرمایا ہے اور بار بار اسکی پیدائش کو یاد دلایا کہ غور کرو کہ انسان کو کس چیز سے پیدا فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اسکو نطفہ سے پیدا کیا سو اب وہی علانیہ اعتراض کرنے لگا ہے۔ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۔ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۔ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ۔ اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل کو بھول گیا (کہ نطفۂ حقیر ہے جس سے ہم نے اسکو انسان بنایا۔ ورنہ طبعاً اور عقلاً ایسی بات نہ کہتا اگر اپنی اصل کو نہ بھولتا) کہتا ہے کہ ہڈیوں کو (خصوص) جب کہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں کون زندہ کردیگا۔ آپ جواب دیدیجئے کہ ان کو وہ زندہ کریگا جس نے اول بار میں ان کو پیدا کیاہے (جب کہ وہ حیات سے بہت بعید تھیں اور اب تو ایک بار وہ حیات کو قبول بھی کرچکی ہیں) اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے وہ ایسا ہے کہ ہرے درخت سے تمھارے لئے آگ پیدا کردیتاہے پھر تم اس سے اور آگ سلگا لیتے ہو۔

اگر آدمی اپنے ابتدائے خلق پر غور کرے اور سوچے کہ نطفۂ ناپاک ہماری اصل ہے تو اس پر گھمنڈ

پانی پڑجائے۔ اگر اہل یورپ ہوں وہ بھی اس کا انکار نہیں کرسکتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ یاد دلاکر انسان کی ذات کو فنا کیا ہے اور خجل کیا ہے اگر خجالت کامل ہوجائے تو اللہ تعالیٰ تک پہونچ جائیں مگر ان باتوں پر غور ہی کب کرتے ہیں۔ حضرت مجدد صاحب نسیان ماسوی اللہ کا بہت ذکر فرماتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ نسیان ماسوی اللہ میں اپنے خلق کا نسیان نہیں ہے اس کا یاد کرنا ضروری ہے۔ چونکہ نسخ خلقہ میں اس پر نکیر ہے لہٰذا یہ نسیان مذموم ہوگا۔

کل میں نے چراغ منگایا تھا اور آپ لوگوں کو دکھلایا تھا مقصد تو اس کا ظاہر تھا کہ اب روشنی کے لئے بجلی ایجاد ہوگئی ہے پہلے یہ چیز نہ تھی تو متقدمین نے یہ صورت اختیار کی تھی کہ ایک برتن میں تیل ڈالتے تھے اور اس میں روئی کی بتی ڈال کر بتی کے سرے میں آگ لگا دیتے تھے وہ بتی جلنے لگتی تھی اور اس میں آہستہ آہستہ تیل پہونچتا رہتا تھا یہ ایجاد بھی کم نہ تھی نہایت فہم ودانش پر مبنی تھی۔ یہی بیان کا مقصد تھا مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آیا تو میں کیا کروں محسوسات کو بھی نہ سمجھیں تو پھر اب سمجھانے کی کیا صورت کی جائے۔

اب دوسری بات کہتا ہوں سنئے۔ صوفیہ کرام تجدد امثال کے قائل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں مخلوقات پر ہر وقت فنا طاری ہوتا رہتا ہے۔ فنا ان پر ہر آن طاری ہوتا ہے اور دوسرا وجود بھی ہر آن ملتا ہے جو مثل وجود اول کے ہوتا ہے اور آنی ہوتا ہے لہٰذا محسوس نہیں ہوتا۔ اہل کشف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ وجود ہر آن میں جدا آتا ہے مگر اتصال وتشابہ وجودات کی وجہ سے امتیاد تغایر کا نہیں ہوتا نہ درمیان کا عدم معلوم ہوتا ہے۔ اسکی ایسی مثال ہے جیسے کہ بتی کے سرے پر جو آگ کا شعلہ ہے اس میں چراغ سے ہر وقت نیا تیل آتا ہے اور فنا ہوکر دوسرا آتا ہے اسی طرح تمام تیل ختم ہوجاتا ہے مگر حس میں ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ پہلا کب فنا ہوگیا اور دوسرا کب آگیا۔ اسکو تجدد امثال کہتے ہیں۔

دیکھئے تجدد امثال جو نہایت اہم مسئلہ ہے اسکو اسی چراغ سے مثال دیکر سمجھایا آپ ہی لوگ بتلائیے اس کے علاوہ اور دوسری کیا مثال ہوسکتی ہے۔ اگر یہ مثال نہ دیتے تو ہم کبھی اس کا سراغ بھی نہ لگاسکتے تھے۔ اس چراغ کی ایجاد سے صوفیہ کرام کو فائدہ پہونچا۔

اب اور سنئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال چراغ سے دی ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْہَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُہَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَہْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

اللہ تعالیٰ نور دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اس کے نور کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے (اور) اس میں ایک چراغ (رکھا) ہے (اور) وہ چراغ (خود طاق میں نہیں رکھا بلکہ) ایک قندیل میں ہے (اور قندیل طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف) ہے جیسا ایک چمکدار ستارہ ہو (اور) وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے کہ وہ زیتون (کا درخت) ہے جو (کسی آڑ کے) نہ پورب رخ ہے اور نہ (کسی آڑ کے) پچھم رخ ہے (یعنی نہ اس کی جانب شرقی میں کسی درخت یا پہاڑ کی آڑ ہے کہ اول نہار میں اس پر دھوپ نہ پڑے اور نہ اس کی جانب غربی میں کوئی آڑ ہے کہ آخر نہار میں اس پر دھوپ نہ پڑے بلکہ کھلے میدان میں ہے جہاں تمام دن دھوپ رہتی ہے۔ ایسے درخت کا روغن بہت لطیف اور صاف اور روشن ہوتا ہے اور) اس کا تیل (اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ بھی نہ چھووے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا (اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو) نور علیٰ نور ہے ۔۔۔ یعنی ایک تو اس میں خود قابلیت نور کی اعلیٰ درجہ کی تھی پھر اوپر سے فاعل یعنی نار کے ساتھ اجتماع ہو گیا اور پھر اجتماع بھی ان کیفیات کے ساتھ کہ چراغ قندیل میں رکھا ہو جس سے بالمشاہدہ چمک بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ ایسے طاق میں رکھا ہو جو ایک طرف سے بند ہے ایسے موقع پر شعاعیں ایک جگہ سمٹ کر بہت تیز روشنی ہوتی ہے اور پھر تیل بھی زیتون کا جو مزید اشراق وقلت دخان میں مشہور ہے تو اس قدر تیز روشنی ہو گئی جیسے بہت سی روشنیاں جمع ہو گئی ہوں اس کو نور علیٰ نور فرمایا۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال ایسے منور طاق سے دی جس میں چراغ رکھا ہوا ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور وہ قندیل ایسا صاف شفاف ہے جیسا کہ ایک چمکدار ستارہ ہو۔ اور نیز اللہ تعالیٰ نے اس قندیل کی تشبیہ شمس و قمر سے نہ دی اس لئے کہ یہ دونوں خسوف و کسوف کے وقت مظلم و تاریک دکھلائی پڑتے ہیں۔ بخلاف کوکب کے کہ جب بھی نظر آتا ہے نورانی اور روشن ہی نظر آتا ہے۔

اور اسکو بھی ملاحظہ فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی تشبیہ مصباح سے دی۔ اس نئی روشنی (یعنی بجلی) سے نہیں دی اگر مصباح سے یہ بجلی یا کوئی اور شئے بڑھ کر ہوتی تو اسی سے تشبیہ دیتے مصباح سے نہ دیتے۔ اب اس نئی روشنی کا حال سنئے کہ جب جلتی ہے تو اجالا ہی اجالا رہتا ہے مگر آئے دن خراب ہوتی ہے ایک دن عشا کی جماعت ہو رہی تھی کہ یکایک اندھیرا ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ بجلی فیل ہوگئی بہت ضیق ہوئی نماز کی حالت میں کیا کیا جا سکتا تھا؟ اس کے بعد موم بتی سے روشنی کی گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ روزانہ یہی معاملہ رہتا ہے تو مسجد میں لالٹین کا انتظام کردیا اور یہاں بھی اور گھر میں بھی لالٹین لگوادی تاکہ بوقت ضرورت کام آیا کرے۔ روزانہ اسکی لائن ہی خراب رہتی ہے کہاں تک ان کے تابع رہا جائے۔ روشنی اپنی اور اسکے جلانے میں دوسروں کے تابع رہیں یہ کون سی عقل ہے اور اس چراغ کو دیکھئے کہ اپنے اختیار میں ہے کہ جب چاہیں بجھادیں اور جب ضرورت ہو جلادیں۔ آپ لوگوں کو بجلی پسند ہے مگر بھائی ان پریشانیوں کی وجہ سے اس سے میری طبیعت گھبراتی ہے کہ ایک وقت خوب روشنی ہے چل پھر رہے ہیں کام دھام کر رہے ہیں اور اچانک اندھیرا گھپ ہوجاتا ہے اور سب لوگ بیکار ہو جاتے ہیں۔ آپ کی نئی روشنی کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيْهِ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ۔ بجلی کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی اس نے لی جہاں انکو ذرا بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کیا اور جب ان پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رکھ گئے اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے گوش وچشم سب سلب کرلیتے۔

سنا آپ نے آپ کی بجلی کی یہ حیثیت ہے۔ اسکی وجہ سے چھوٹے چھوٹے بچوں کے آنکھ کی روشنی خراب ہوگئی ہے عینک کی ضرورت پڑگئی ہے۔ جتنی ایجادات بڑھتی جارہی ہیں میں دیکھتا ہوں کہ صحت خراب ہوتی جارہی ہے یہ مزدور اب تھوڑی دور بھی پیدل نہیں چلتے۔ اپاہج ہوتے جارہے ہیں۔ مگر سب لوگ بس دوڑ دوڑ کر یورپ چلے جارہے ہیں۔ اور ان سے تمدن حاصل کررہے ہیں مگر ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ مسلمانوں سے ان لوگوں نے تمدن سیکھا ہے انکو اپنے گھر کی خبر نہیں۔ عجم کے لوگ تو جاتے ہی ہیں اہل عرب بھی عیسائیوں کے یہاں چلے جارہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں ؟

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب　　　اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

اس شعر کو ایک عالم نے لوگوں کے سامنے پڑھا سن کر سب خوش ہوئے خوب ہنسے مگر مذہب جب بھی نہیں بدلا۔ سب لوگ ان کے خیالات سے متاثر ہوگئے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب سنئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی تشبیہ میں مشکوٰۃ کا ذکر فرمایا ہے تو ہمیں سے علماء مشکوٰۃ نبوت کا لفظ استعمال فرماتے ہیں اور ایک حدیث کی کتاب کا نام ہی مشکوٰۃ المصابیح رکھا ہے اس لئے کہ یہ سب احادیث حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مشکوٰۃ یعنی صدر مبارک سے ظاہر ہوئی ہیں پس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا صدر مبارک مشکوٰۃ ہے اور آپ کے قلب میں جو علوم و معارف ہیں وہ مصباح ہیں اور اس کا تیل آپ کی باطنی استعداد ہے جس سے آپ نور کو اخذ فرماتے ہیں اور مخلوق پر افاضہ فرماتے ہیں۔

اب دوسری آیت سنئے جس میں اللہ تعالےٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سراج منیر فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۝ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ اے نبی ہم نے بیشک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہونگے اور آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈر سنانے والے ہیں۔ اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں۔ مجھے اس وقت سراج منیر ہی کے متعلق کچھ بیان کرنا ہے۔ مگر اس سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد مبشر نذیر اور داعی الی اللہ فرمایا گیا ہے تو ان کا بھی مختصراً بیان کرتا ہوں اسلئے کہ شاہد وغیرہ کا لفظ بولتے تو بہت سے لوگ ہیں مگر اس کے معنی بہت کم لوگ سمجھتے ہونگے۔ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں۔

انا ارسلنك شاهداً۔ ای علی امتك	یعنی آپ کو ہم نے آپ کی امت پر شاہد بنا کر بھیجا ہے (چنانچہ)
اخرج ابن المبارك عن سعيد ابن المسيب	ابن مبارک نے سعید ابن مسیب سے تخریج کی ہے کہ
قال ليس من يوم الا و يُعرَضُ على النبي	کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ جس میں صبح و شام حضور
صلی اللہ علیہ وسلم اُمتهُ غدوةً وعشيةً	پر آپ کی امت پیش نہ کی جاتی ہو تو آپ انکو انکی
فيعرفهم بسيماهم ولذلك يشهد عليهم	سیما و علامت سے پہچانتے ہیں اور اسی وجہ سے
	ان پر شاہد ہونگے۔

اوشاھداً لامتک مصدقاً لھم حین یشھدون الرسل علی الامم بالتبلیغ　(اور دوسرا مطلب یہ ہے) کہ آپ اس وقت اپنی امت کے لئے شاہد اور انکے مصدق ہونگے جبکہ یہ لوگ شہادت دینگے کہ رسولوں نے امم کو تبلیغ (احکام) کردی تھی۔

اخرج البخاری والترمذی والنسائی وابن ماجہ عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یدعی نوح یوم القیامۃ فیقال لہ ھل بلغت فیقول نعم فیدعی امتہ فیقال لھم ھل بلغکم فیقولون ما اتانا من نذیر وما اتانا احد فیقال من یشھد لک فیقول محمد وامتہ الحدیث　حضرت ابو سعید سے بخاری ترمذی نسائی ابن ماجہ نے تخریج کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نوح (علیہ السلام) قیامت کے دن بلائے جائینگے اور ان سے کہا جائیگا کیا آپ نے تبلیغ کردی تھی تو نوح علیہ السلام فرمائینگے کہ ہاں پھر انکی امت طلب کی جائیگی اور ان سے سوال ہوگا کہ تم لوگوں کو انھوں نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس نہ تو کوئی ڈرانے والا آیا اور نہ کوئی اور۔ تو نوح علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ آپ کا کوئی شاہد ہے وہ فرمادیں گے کہ ہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت۔ الحدیث۔

دیکھئے شاہد کے معنی مفسرین یہ لکھتے ہیں اب مبشراً و نذیراً کے متعلق سنئے آپ مومنین کے لئے مبشر ہیں اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے انکے لئے نذیر ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں اور رسولوں کی تصدیق کرتے ہیں انکو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی بشارت دینے والے ہیں اور جو لوگ کفر و معصیت کرتے ہیں انکو وعیدیں سنا کر ڈرانے والے ہیں۔ دَاعِیاً اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید و طاعت اور انکی جنّت اور لقاء غیر تمکیف کی طرف اللہ کے امر اور ان کے آسان فرمادینے سے داعی ہیں۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ داعیاً کو باذنہ کے ساتھ اس لئے مقید فرمایا کہ اس بات کی طرف اشارہ کریں کہ بغیر جناب قدس سے معونت کے یہ کام نہایت سخت اور دشوار ہے، خصوصاً اللہ تعالیٰ کی لقاء کی طرف دعوت دینا (تو بہت ہی صعب ہے) اسلئے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ تک پہونچنا بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل کے ممکن ہی نہیں ہے۔ اور صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ

باذنہ ای بتسھیلہ وتیسیرہ تعالیٰ۔ وباذنہ من متعلقات داعیاً وقیدت الدعوۃ بذلک　باذنہ یعنی اللہ تعالیٰ کی تسہیل و تیسیر کے ساتھ اور لفظ باذنہ داعیاً کے متعلق ہے چنانچہ دعوت کو باذنہ سے اسلئے مقید

ایذانا بانها امر صعب المنال و خطب فی غایة الاعضال لا یتاتی الا بامداد من جناب قدسہ کیف لا و ہو صرف للوجوہ عن القبل المعبودۃ وادخال الاعناق فی قلادۃ غیر معہودۃ

کیا گیا ہے تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہوجائے کہ اس امر کا حصول بہت ہی دشوار ہے امر عظیم ہے نہایت ہی مشکل ہے اسکو بغیر جناب قدس سے امداد کے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اور کیوں نہو حال یہ ہے کہ وہ (یعنی دعوت) وجوہ کا پھیرنا ہے ان قبلوں سے جنکی عبادت کی جارہی ہے اور غیر معہود قلادہ میں گردنوں کو ڈالنا ہے۔

دیکھئے مفسرین تو یہ فرمارہے ہیں کہ باذنہ کی قید اس لئے لگائی ہے تاکہ یہ تبلادیں کہ دعوت کا کام نہایت مشکل و دشوار ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب تک نصرت و تائید نہو کوئی شخص کر ہی نہیں سکتا اسلئے کہ اس میں لوگوں کے رخ کو پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف لانا ہوتا ہے اور ایسے قلادہ میں گردنوں کو ڈالنا ہوتا ہے جو غیر مانوس و غیر معہود ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کتنا دشوار امر ہے۔ مگر اب کے لوگ سب سے آسان کام دعوت الی اللہ ہی کو سمجھتے ہیں کہ نہ اس میں عقل کی ضرورت ہے اور نہ علم کی۔ مدار کامیابی مجمع کی کثرت کو سمجھتے ہیں۔ صاحب روح المعانی قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ کے تحت اپنے زمانہ کے دعاۃ کا حال بیان فرمارہے ہیں سنئے:۔

والدعاۃ الی اللہ تعالیٰ الیوم من ہؤلاء الذین نصبوا انفسہم الی الارشاد بزعمہم اجہل من حمار الحکیم

اور آج کل کے داعی اللہ جنھوں نے اپنی زعم میں اپنے کو مسند ارشاد پر نصب کرلیا ہے وہ تو بہکتے رہنے میں حکیم کے گدھے سے بھی زیادہ جاہل ہیں۔

توہا وہم لعمری فی ضلالۃ مدلهمۃ ومہامہ یحار فیہ الخریت وہم یحسبون انہم یحسنون صنعا ولبئس ما کانوا یصنعون

قسم ہے میری عمر کی کہ یہ لوگ بہت ہی تاریک ضلالت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایسے جنگلوں میں ہیں جن میں ماہر رہبر بھی حیران ہوجاتا ہے۔ اور یہ لوگ گمان کررہے ہیں کہ کوئی اچھا کام کررہے ہیں حالانکہ جو کچھ کررہے ہیں بہت ہی برا ہے۔

یہ صاحب روح المعانی فرمارہے ہیں میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ خوب سمجھ لیجئے۔

اب سراج منیر کے متعلق سنئے کہ چونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف داعی اور راہبر ہیں اور راستہ

میں روشنی کی ضرورت پڑتی ہے اسلئے آپ کو روشنی عطا کی گئی بلکہ آپ کی ذات مبارک ہی کو روشن چراغ بنا دیا گیا اور پھر کیسا چراغ جس کو خود اللہ تعالیٰ نے روشن کیا ہے اس کی روشنی کیسی ہوگی کیا وہ کسی کے بجھانے سے بجھ سکتا ہے ہرگز نہیں یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔ ایک عارف فرماتے ہیں ؎

چراغے را کہ ایزد می فروزد ہر آں کو تف زند ریشش بسوزد

اسی نور کا حصہ اہل اللہ کو بھی ملا ہے اور یہ آفتاب و ماہتاب کے نور سے کہیں بڑھ کر ہے۔ حضرت مولانا روم اپنے شیخ شمس تبریزؒ کی تعریف میں فرماتے ہیں

شمس تبریزی کہ نور مطلق است آفتاب است وز انوار حق است

فرمارہے ہیں کہ شمس تبریز کی جب بات آئی تو آفتاب شرمندہ ہوکر غروب ہوگیا اسلئے کہ وہ اجسام کو نور بخشتا ہے اور ہمارا شمس ارواح کو نور عطا کرتا ہے۔ اور یہ نور کبھی بجھتا نہیں ہے اور کبھی مظلم نہیں ہوتا۔ آخر اس نور کو کب حاصل کیجئے گا کیا مرنے کے بعد!

چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحبؒ تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں کہ:

قولہ تعالیٰ وسراجاً منیراً سماہ سراجاً لانہ یستضاء بہ ویھتدی بہ کالسراج یستضاء بہ ویُھتدیٰ بہ فی ظلمۃ اللیل یعنی انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان بلسانہ داعیاً الی اللہ وبقلبہ وقالبہ کان مثل السراج یتلون المومنون بالوانہ و یتنورون بانوارہ کالعالم یتنور بنور الشمس والبیت بالسراج۔ ولاجل ذالک اختصت الصحابۃ رضی اللہ عنھم بمزید

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سراج رکھا اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے منور حاصل کیا جاتا ہے اور اسی سے ہدایت پکڑی جاتی ہے جیسے کہ سراج سے رات کی ظلمت میں روشنی اور ہدایت حاصل کی جاتی ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لسان سے تو اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے اور داعی الی اللہ تھے مگر آپ اپنے قلب و قالب سے مثل سراج کے تھے کہ آپ کے الوان سے مومنین تلون ہو جاتے تھے اور آپ کے انوار سے متنور ہو جاتے تھے جیسے کہ یہ عالم آفتاب کے نور سے منور ہو جاتا ہے اور گھر سراج کے ذریعہ روشن ہوتا ہے اسی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم اوروں کے مقابلہ میں مزید فضل کے ساتھ مختص ہوئے کیونکہ وہ

الفضل علی الناس فان العلوم التی تلقتہا الامۃ من لسانہ لم یتفاوت فیہ الناس من الصحابۃ وغیرھم بل رب مبلغ اوعی من سامع اما التنور بانوارہ فانہ وان کان حاصلاً للناس بتوسط اصحابہ واصحاب اصحابہ الی یوم القیامۃ لکن لیس الغائب فیہ کالشاھد بل مثلہ کمثل بیت تنوّر بنور الساحۃ التی تنورت بنور الشمس لاجل مقابلتہا واین ھذا من ذلک واللہ اعلم

علوم جن کو امت نے حضورؐ کی لسان سے تلقی کیا ہے ان میں صحابہ اور غیر صحابہ متفاوت نہیں ہیں بلکہ بہت سے مبلغ زیادہ محفوظ کرنے والے ہیں سامع سے۔ بہر حال آپؐ کے انوار سے تنور اگرچہ لوگوں کو صحابہ کے واسطے یا صحابہ کے اصحاب کے توسط سے قیامت تک حاصل ہوتا رہیگا۔ لیکن غائب مثل حاضر کے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی حجرہ ہے جو کہ صحن کے نور سے متنور ہے اور صحن آفتاب کے مقابل ہونے کی وجہ سے (خود) اس کے نور سے متنور ہوگیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے۔

قاضی صاحبؒ فرمارہے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار سے متنور ہونے میں صحابہ اور غیر صحابہ میں تفاوت ہے۔ صحابہ کو نور زیادہ ملا ہے اور بعد والوں کو کم۔ اسلئے کہ غائب شاہد کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اور یہ فرمایا کہ صحابہ کو جو جمیع امت پر فضیلت حاصل ہے تو اسی نور کی زیادتی کی وجہ سے ورنہ تو علوم کی تلقی میں سب برابر ہیں۔

اس پر عرض کرتا ہوں کہ قاضی صاحب انوار میں تفاوت کو تو فرما ہی رہے ہیں مگر علوم میں تساوی کے قائل ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ نفس احکام و شرائع میں تو سب لوگ برابر ہیں مگر فہم وادراک میں ضرور تفاوت ہے۔ صحابہ جتنا حضور کی صحبت کی وجہ سے سمجھتے تھے دوسرے لوگ نہیں سمجھ سکتے خود صحابہ میں فہم کے اعتبار سے فرق ہے جتنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے کوئی دوسرا نہیں سمجھتا تھا چنانچہ یہ کہا گیا کہ وہ ہم میں سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق لوگوں کو خیال ہوا کہ انکو حضور نے کچھ زیادہ باتیں بتلائی ہیں، آپ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ نہیں ایک آدمی کو فہم فی القرآن دیا جاتا ہے اسکی وجہ سے وہ ایسی باتیں بیان کرتا ہے جنکو دوسرے لوگ نہیں بیان کرسکتے۔ تو پھر بعد والے صحابہ کا کیا مقابلہ کرسکتے ہیں؟

قاضی صاحب نے صحابہؓ اور غیر صحابہ کے انوار میں تفاوت کی یہ مثال دی ہے کہ صحابہ کی مثال

تو ایسی ہے جیسے ساحت (صحن مکان) کہ وہ بلا واسطہ شمس کے نور سے متنور ہوتا ہے اسلئے کہ آفتاب اور ساحت کے درمیان کوئی حائل نہیں ہے اور بعد والوں کی مثال ایسی ہے جیسے کمرہ کہ آفتاب کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ رہی ہے بلکہ ساحت (صحن) چونکہ متنور ہے اسلئے اس کا نور کمرہ میں جارہا ہے جس کی وجہ سے کمرہ روشن ہوجاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کمرہ کے متعلق جو یہ فرمایا کہ ساحت کی روشنی سے متنور ہے تو یہ سمجھئے کہ صحن و ساحت میں جو نور ہے اسکا تو آفتاب سے ہونا ظاہر ہے مگر کمرہ میں جو روشنی ہے وہ بھی حقیقتاً آفتاب ہی کا نور ہے ساحت کا نہیں۔ ساحت چونکہ آفتاب کے مقابلہ میں ہے اسلئے اس کا نور قوی اور زیادہ پہونچا ہے لیکن کمرہ چونکہ آفتاب کے مقابلہ میں نہیں پڑا اس لئے اس کا نور اس تک پہونچتے پہونچتے ضعیف ہوجاتا ہے لیکن جتنی بھی روشنی ہے وہ سب ہے آفتاب ہی کی ساحت کی نہیں۔ بعینہٖ اسی طرح صحابہ کو جو نور ملا ہے وہ بلا واسطہ ملا ہے اور سراج منیر سے براہ راست متنور ہوئے ہیں اور صحابہ جو سراج منیر سے متنور ہوئے ہیں ان سے دوسرے لوگ متنور ہوتے ہیں مگر وہ نور خود صحابہ کا نہیں ہے اصل نور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ہے۔ واسطہ کی کمی زیادتی کی وجہ سے نور کے ضعف و قوت میں تفاوت ہوجاتا ہے۔

اب اصل مضمون سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سراج منیر فرمایا اسلئے کہ اس سے روشنی کا حاصل کرنا آسان ہے اور اپنے اختیار کی چیز ہے ہر وقت اس سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے اور یہ بھی سنئے کہ اس کے ذریعہ سے بہت سے چراغ روشن ہوسکتے ہیں ان رعایات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سراج منیر فرمایا گیا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ روشنی خالی یہی روشنی یعنی بجلی ہے اللہ تعالیٰ نے اہل اللہ کے قلب میں نور عطا فرمایا ہے اگر اللہ تعالیٰ نہ بیان فرماتے تو آپ لوگ سمجھتے کہ خالی آفتاب و ماہتاب ہی میں روشنی ہے اور نور خالی بجلی ہی میں ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ۔ الخ

کیا ایسا شخص جو کہ مردہ تھا ہم نے اسکو زندہ بنادیا اور ہم نے اسکو ایک ایسا نور دیدیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے۔ الخ تو آپ نے سنا ایسا نور ہے کہ اسکو لے کر لوگوں میں چلتا پھرتا ہے مگر آپ کو معلوم نہیں۔ آپ اسی بجلی اور جدید آلات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں آخر

اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں کب غور کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝ جس نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے تو خدا کی اس صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا سو تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ۔ نگاہ ذلیل اور درماندہ ہوکر تیری طرف لوٹ آوے گی۔ اور ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں (ستاروں) سے آراستہ کر رکھا ہے اور ہم نے ان کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی بنایا ہے اور ہم نے ان شیطانوں کے لئے دوزخ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ آسمان میں نگاہ کرنے کو فرما رہے ہیں اور اس میں عدم خلل کو بیان فرما رہے ہیں۔ اور آپ کے آلات تو برابر خلل پذیر ہوتے رہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی مصنوعات کو دیکھئے کہ نہ کبھی خراب ہوتے ہیں اور نہ بگڑتے ہیں۔

آخر کیا بات ہے کہ لندن اور امریکہ سے کوئی خبر آتی ہے تو اسکو بے چون وچرا تسلیم کر لیتے ہو اور انبیاء جن باتوں کی اطلاع دیتے ہیں انکو کیوں نہیں مانتے۔ جب انبیاء کا اخبار تمہارے نزدیک معتبر نہیں تو پھر اخبار کو اور لندن اور امریکہ کے لوگوں کی باتوں کو بھی مت تسلیم کرو۔ انبیاء علیہم السلام صادق ہوتے ہیں انکی ہر خبر سچی ہوتی ہے اس سے علم یقین حاصل ہوتا ہے جیسے عقل وحواس سے حاصل ہوتا ہے بلکہ انبیاء کی خبریں عقل وحواس سے حاصل شدہ باتوں سے بھی زیادہ قابل یقین ہیں۔ صاحب شرح العقائد فرماتے ہیں۔

لما وجد وا بعض الادراكات حاصلة عقيب استعمال الحواس الظاهرة التى لاشك فيها سواء كان من ذوى العقول او غيرهم جعلوا الحواس احد اسباب العلوم ولما كان معظم المعلومات الدينية مستفاداً من الخبر الصادق جعلوه سبباً آخر۔

یعنی چونکہ بعض ادراکات یقیناً حواس ظاہرہ کے استعمال کے بعد ہی حاصل ہوتے ہیں تو حواس کو اسباب علوم کا ایک سبب قرار دیا اسی طرح چونکہ معلومات دینیہ کا اکثر حصہ خبر صادق سے

مستفاد ہے اسلئے خبر صادق کو بھی ایک مستقل سبب کر دیا ہے ــــ تو دیکھئے خبر صادق کا یہ درجہ ہے اب انبیاء سے زیادہ کون سچا ہوگا۔ ابوجہل سے ایک شخص نے تنہائی میں حضور کے متعلق پوچھا تو کہا کہ بھائی وہ کبھی جھوٹ بولے ہی نہیں (یعنی وہ دعوائے نبوت میں بھی سچے ہیں) مگر پھر بھی ایمان نہ لایا۔ اب ہم اپنے کو مسلمان کہے جاتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخبار کی تصدیق نہیں کرتے۔ آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو اغیار پریشان کر رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں غلط ہے ہم کو ہماری بے ایمانی اور نفاق نے پریشان کر دیا ہے آج ایمان لاؤ دیکھو پریشانی ختم ہوتی ہے یا نہیں ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا تو پڑتا نہیں بس ہر چیز کو عقل سے سمجھنا چاہتے ہیں ہر حکم کی لم اور علت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

اور یہ جو ایجادات کرتے ہیں یہ اپنے عقل و دماغ کا کرشمہ سمجھتے ہیں ذرا بھی اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ نہیں ہوتی حالانکہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس سے قلب میں ایمان پیدا ہو جائے مگر جتنے بڑے عقلمند ہیں اتنے ہی بڑے منکر اور بے ایمان ہیں۔ اہل اللہ نے انھیں چیزوں سے معرفت وعبرت حاصل کی ہے ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفترے است معرفت کردگار

(یعنی ہرے بھرے درختوں کے پتے ایک عاقل کی نگاہ میں ایسے ہیں کہ گویا ہر ہر پتہ اس کا حق تعالیٰ کی معرفت کا ایک ایک دفتر ہے۔)

اخیر میں یہ بات عرض کرتا ہوں کہ میں ان ایجادات کا منکر اور مخالف نہیں ہوں مگر ہاں ان ایجادات میں لگ کر اللہ تعالیٰ اور اسکی مصنوعات سے غفلت بھی نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ سے غفلت حرام ہے اور جو شے مورث و موجب بنے حرام کا وہ خود بھی حرام ہوتی ہے۔

ختم شد

افاضات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"حجِ ربّ البیت"

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

امابعد۔ بزرگان دین کے ملفوظات اوران کی عبارات میں اس قسم کا مضمون پایا جاتا ہے جس سے ظاہر بینوں کو کچھ توحش ہوتا ہے اور ممکن ہے بعض غیر معتقد بھی ہوجاتے ہوں۔ ایسے اقوال اگر فرقۂ باطنیہ سے صادر ہوں توقابل انکار ورد ہوں گے اور اگر کسی متبع سنت سے منقول ہوں تو مبادرت بالانکار (یعنی سنتے ہی جلدی سے انکار کر بیٹھنا) جائز نہ ہوگا۔ یعنی مراد اگرنہ بھی سمجھ میں آئے تب بھی انکار منع ہوگا۔ بطور مثال کے اب چند اقوال لکھتا ہوں۔ پھران کی توجیہ عرض کروں گا۔

(۱) مثلاً ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں صفحہ ۱۵۵ پر زیر عنوان "ذکر زیارت مکہ معظمہ"۔ یہ عبارت ہے کہ ــــــــــ ؟

بعد ازاں فرمود کہ بعد از نقل شیخ الاسلام فرید الدہر قدس سرہ العزیز مرا اشتیاق حج عظیم غالب شد۔ گفتم بائے در اجودھن بردم بزیارت شیخ۔ القصہ چوں بزیارت شیخ الاسلام رسیدم آں مقصود من حاصل گشت مع شیٔ زائد۔ بار دیگر ہم چنیں ہوس باعث آمد باز۔ بزیارت شیخ رفتم آں غرض حاصل شد۔

اس کے بعد فرمایا کہ شیخ الاسلام حضرت بابا فرید گنج شکر قدس سرہٗ کے یہاں سے واپس ہونے پر مجھے حج بیت اللہ کا شوق ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ اجودھن چلا جاؤں، اور حضرت شیخ کی زیارت سے مشرف ہوں۔ غرض شیخ الاسلام کی زیارت کیلئے گیا ــــ تو مجھے میرا مقصود مع شیٔ زائد حاصل ہوگیا۔

پھر دوسری بار اسی طرح کا شوق غالب آیا چنانچہ پھر حضرت شیخ کی زیارت کو چلا گیا۔ میری غرض پوری ہوگئی۔

(فوائد الفواد)

(۲) یا مثلاً اسی کتاب میں ذرا آگے چلکر یہ عبارت ہے کہ:-
بحج کسے رود کہ او را پیر نباشد ــــــ یعنی حج کرنے وہ شخص جائے جس کا پیر نہ ہو۔
(۳) یا مثلاً اسی کتاب میں یہ مصرعہ بھی ہے جو کہ بہت مشہور اور زبان زد ہے کہ:-
ع آں رہ بسوئے کعبہ بردو ایں بسوئے دوست
یعنی وہ راستہ تو صرف کعبہ ہی تک جاتا ہے اور مشائخؒ کی صحبت کا راستہ براہ راست دوست تک لے جاتا ہے۔
(۴) یا مثلاً مثنوی مولانا روم کا یہ شعر ہے ؎

صورتے کو فاخر و عالی بود
اُو زبیت اللہ کے خالی بود

یعنی جو صورت کہ نور ایمان اور آثار عمل سے مزین ہو کر فاخر اور عالی ہو جاتی ہے وہ بیت اللہ سے کب کم ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح سے بیت اللہ۔ اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ اور اسکی معرفت کا ایک ذریعہ اور اس کی ذات کا مظہر ہے۔ اسی طرح سے اولیا اللہ بھی حق تعالیٰ کے مظہر اتم ہوتے ہیں حضرات صوفیہ صافیہ کے نزدیک یہ تمام عالم اللہ تعالیٰ کا مظہر ہے اور ذات حق اس میں ظاہر ہے۔
(۵) یا مثلاً ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید
معشوق دریں جاست بیائید بیائید

یعنی اے لوگو جو حج کو جا رہے ہو کہاں جا رہے ہو کہاں جا رہے ہو معشوق تو یہیں موجود ہے۔ اِدھر آؤ۔ اِدھر آؤ۔
(۶) یا مثلاً حضرت بایزید بسطامیؒ کا وہ واقعہ جسے مولانا رومؒ نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے سرخی یہ قائم فرمائی ہے۔

"رفتن بایزید بسطامی بکعبہ و در راہ بخدمت بزرگے رسیدن و گفتنِ آں بزرگ کہ کعبہ من ام مرا طواف کن"

پھر اس عنوان کے تحت یہ اشعار بیان فرمائے ہیں ؎

حق آں حقے کہ جانت دیدہ است ــــ کہ مرا بر بیت خود بگزیدہ است

(اس خدائے برحق جل جلالہ کی قسم ہے جسے تیری جان نے دیکھ لیا ہے ــــ کہ اسی نے مجھے اپنے بیت سے بھی بڑا درجہ دیا ہے

کعبہ ہر چندے کہ خانہ براوست
اگرچہ کعبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکیوں کا گھر ہے

خلقت من نیز خانہ سر اوست
تو سمجھ رکھو کہ میری پیدائش بھی اللہ تعالیٰ کے راز کا گھر ہے

تا بگرد آں خانہ را در دے نرفت
جب سے اس گھر کے گرداگرد نہیں گیا

واندریں خانہ بجز آں حی نرفت
تو یاد رکھو کہ میرے دل کے گھر میں بجز ذات حی قیوم کے کسی کا خطرہ نہیں گذرا

چوں مرا دیدی خدا را دیدۂ
اب جو تم نے مجھے دیکھ لیا ہے تو سمجھ لو کہ تم نے خدا تعالیٰ ہی کو دیکھ لیا ہے

گرد کعبہ صدق بر گردیدۂ
اور سچے کعبہ کے گرداگرد تم گھوم لئے

خدمت من طاعت و حمد خدا ست
میری خدمت میں ہنا اور میری خدمت کرنا ہی خدا کی اطاعت اور اسکی حمد کے برابر ہے

تا نہ پنداری کہ حق از من جدا ست
دیکھنا کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا مجھ سے الگ کہیں ہے

چشم نیکو باز کن در من نگر
ذرا آنکھیں خوب کھولو اور میرے اندر نظر ڈالو

تا بہ بینی نور حق اندر بشر
تب تمہیں انسان کے اندر حق کا نور نظر آئے گا

بایزیدا! کعبہ را دریافتے
اے بایزید! میرے پاس جو تم آگئے تو گویا کعبہ ہی کو پا گئے

صد بہاء و عز و صد فر یافتی
اب سینکڑوں عزت۔ رونق۔ اور مرتبہ پاؤ گے

کعبہ را یک بار بیتی گفتہ یار
خدائے تعالیٰ نے کعبہ کو تو صرف ایک ہی بار بیتی (میرا گھر) فرمایا

گفت یا عبدی مرا ہفتاد بار
مگر مجھے تو حق تعالیٰ نے ستر بار یا عبدی کہہ کر پکارا ہے

بایزید آں نکتہا را ہوش داشت
بایزید نے ان تمام نکتوں کو غور سے سنا

ہمچو زریں حلقہ اش درگوش داشت
اور ان نکتوں کو کان کا زیور سمجھ کر کانوں میں ڈال لیا

آمد از وے بایزید اندر مزید
اس عقیدتمندی کی بدولت بایزید کو اور ترقی کی دولت ملی

منتہی در منتہی آخر رسید
اور آخر کار انتہائی منتہا تک وہ پہنچ گئے

حضرات مشائخ کے ان سب اقوال میں۔ بیت اللہ کا خود ان کی ذات کے ساتھ تقابل کیا گیا ہے بلکہ بعض کلام میں تو صحبتِ مشائخ کو زیارت بیت اللہ پر ترجیح دی گئی ہے۔ اسی سے عام طبائع کو توحش ہو کر مشائخ کے ان کلمات پر انکار پیدا ہوتا ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھے کہ جن حضرات کے یہ کلمات ہیں ان میں سے بہت سے بلکہ تقریباً سبھی مسلّم شیخ اور متبع سنت بزرگ ہوئے ہیں جن کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی یہ باتیں زندقہ اور گمراہی کی ہیں کیونکہ ان حضرات کو شریعت کی حدود کا جس قدر خیال و لحاظ ہوتا ہے ہم لوگوں کو تو اس کا عُشر عشیر بھی نہیں ہے۔ نیز عوام الناس کو دین کا جو کچھ بھی خیال

پیدا ہوتا ہے، وہ انھیں حضرات کی برکت سے ہوتا ہے، تو اب اگر یہی لوگ گمراہ ہوجائیں گے تو پھر ہدایت کہاں ہوگی۔ لیکن بات یہ ہے کہ بزرگوں کے کلام کو سمجھنا آسان نہیں ہے بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ لوگوں کو دین سے اور بزرگانِ دین سے مناسبت ہی باقی نہیں ہے اور نہ اُن کی معرفت ہی حاصل ہے اس لئے ان کی بات بھی نہیں سمجھتے۔

تاہم جب ان بزرگوں نے اس مضمون کو لکھا ہے تو آخر اس میں کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہی ہوگی اس کے متعلق بطور قاعدہ کلیہ کے یہ سمجھ لیجئے کہ ظاہری الفاظ ان کے خواہ کچھ موحش کیوں نہ ہوں لیکن اُن میں یہ حضرات جو حقیقت بیان فرماتے ہیں وہ کتاب وسنت کے عین مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ سنیئے مالا بد منہ میں ہے کہ :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ حرمت مال وابروئے مسلمان مثل حرمت خون اوست وکعبہ را فرمودہ کہ حق تعالیٰ ترا چہ قدر حرمت دادہ لیکن حرمت مسلمان وحرمتِ خون او ومال او وابروئے او از تو زیادہ است۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کے مال اور آبرو کی حرمت مانند اس کے خون کی حرمت کے ہے اور کعبہ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اے کعبہ اللہ تعالیٰ نے تیرا مرتبہ کتنا عظیم بنایا ہے اور تجھ کو کیسی کچھ عزت بخشی ہے لیکن مسلمان کی حرمت اور اس کے خون اور آبرو اور مال کی حرمت تجھ سے کہیں بڑھ کر ہے۔

(ص ۱۵۹)

میں کہتا ہوں کہ عجب نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہاں مسلمان سے خود ذات شریفہ ہی ہو یعنی کنایہ کے طور پر اپنے ہی متعلق مخالفین کو یہ سنانا چاہتے ہوں کہ تم لوگ ایک جانب تو کعبہ کی تعظیم کے مدعی ہو اور ادھر مجھے ایذائیں بھی پہونچا رہے ہو جسمانی بھی اور قلبی و روحانی بھی تو سمجھ رکھو کہ ایک نبی کا قلب حرمت اور عظمت میں کعبہ سے کہیں بڑھا ہوا ہے کیونکہ جس خدا نے کعبہ کو شرف بخشا ہے اسی نے بوجہ ایمان وایقان کے انبیاء علیہم السلام کے قلوب کو بھی واجب الاحترام بنایا ہے پس ادنیٰ شے کو ماننا اور اعلیٰ کا انکار کردینا انتہا درجہ کی نفسانیت ہے۔ یوں آپ کے طفیل میں دولت ایمان کی برکت سے عامۂ مومنین کے قلب کو بھی یہ شرف حاصل ہو جائے تو غلط نہیں ہوگا مگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہی میں اور تبعاً ہوگا)

دیکھئے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مومن کامل کی جان اور اس کی آبروریزی سب حرام ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مومن کی جان اور مال اور اس کی آبرو احترام میں کعبہ سے بھی بڑھکر

ہے۔ اب اس مضمون کی صحت میں تو کسی کو کلام کی مجال نہیں ہے کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور اسکو آپ وحی سے فرمارہے ہیں پس مشائخ کے اُن تمام کلمات کا مرجع اور ماخذ جن میں کعبہ سے تقابل معلوم ہوتا ہے یہی حدیث ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اس لئے آپ کا کلام بھی نہایت ہی صاف وشفاف اور توحش سے پاک ہے اور حضرات مشائخ کا مقام چونکہ مقام نبوت سے فروتر ہے اس لئے ان کے کلام میں بھی وہ بات نہیں آسکتی جو نبی کی خصوصیات میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عظمت اور احترام کعبہ کو ملحوظ ومحفوظ رکھتے ہوئے حرمت مومن کی ترجیح اس طریقے سے بیان فرمائی جو کسی گوشہ سے بھی تنقیص کعبہ پر مشتمل نہیں ہے لیکن حضرات مشائخ نے بھی اسی مسئلہ کو بیان کرنا چاہا تو انداز بیان کچھ ایسا ہوگیا جس سے حرمت مومن کی اثبات کے ساتھ ساتھ تنقیص کعبہ کا شائبہ پیدا ہوگیا چنانچہ یہی امر لوگوں کی کھٹک کا باعث بنا مثلاً جس مضمون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی خوبی کے ساتھ اس حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ اسی مضمون کے متعلق ایک صوفی کا بیان سنئے۔ فرماتے ہیں ؎

کعبہ بنیاد خلیل آزر است	دل گذرگاہ جلیل اکبر است
از ہزاراں کعبہ یکدل بہتر است	دل بدست آور کہ حج اکبر است

یعنی کعبہ تو حضرت ابراہیم ابن آزر کا تعمیر کیا ہوا ایک گھر ہے اور دل وہ تو جلیل اکبر یعنی حق تعالیٰ کی گذرگاہ ہے۔ پس ایک دل ہزاروں کعبہ سے بڑھ کر افضل ومکرم ومحترم ہے۔ لہذا دلداری کرو کہ یہی حج اکبر ہے۔

آج لوگوں کی زبان پر یہ اشعار جاری اور ساری ہیں اور ان کو خوب لطف لے لے کر پڑھا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کا دوسرا شعر حدیث کا گویا ترجمہ ہی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون کے بیان کرنے سے پہلے کعبہ کے فضل واحترام کو بھی تسلیم کیا تھا۔ چنانچہ یہ الفاظ فرمائے کہ حق تعالیٰ تراچہ قدر حرمت دادہ لیکن ان بزرگ نے اس مدعا کے اثبات کے لئے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں جو تمہید اٹھائی وہ نہایت ہی بھونڈی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ع

کعبہ بنیاد خلیل آزر است

میں کہتا ہوں کہ کعبہ کے ساتھ آزر کا کیا جوڑ یہ کعبہ خلیل آزر کی بنیاد تھی۔ یا خلیل اللہ کی ہے تعجب ہے کہ بنائے کعبہ کے متعلق قرآن شریف میں حق تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرماکر تو یہ فرمائیں کہ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ۔ یعنی اُس

وقت کو یاد کیجئے جبکہ ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کو تعمیر فرما رہے تھے اور اسمٰعیل علیہ السلام بھی (ان کے مددگار تھے) ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے اس بیان سے بیت اللہ کی عظمت اور اس کا شرف معلوم ہوتا ہے جس کو ان بزرگ نے بنیاد خلیل آزر فرمایا ہے، تعجب ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر حق تعالیٰ کا یہ ارشاد آخر کیوں نہیں رہا ــــــ اور سنئے۔

نص قرآنی ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ صرف بناء ابراہیمی ہی نہیں ہے بلکہ دنیا کا سب سے پہلا گھر ہے اور سب سے پہلے اس کو فرشتوں نے تعمیر کیا تھا۔ چنانچہ آیۃ کریمہ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبَارَکًا وَّھُدًی لِّلْعَالَمِیْنَ۔ یعنی بلاشبہ وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے۔ جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہان بھر کے لوگوں کا رہنما ہے۔

اس آیۃ کے تحت صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ:۔

وورد فی بعض الآثار ان اول من بنی البیت الملائکۃ۔ وقد بنوہ قبل آدم علیہ السلام بالفی عام۔ وعن مجاھد وقتادۃ وسدی مایؤید ذلک۔ وحکی ان بناء الملائکۃ لہ من یاقوتۃ الحمراء۔ ثم بناہ آدم ثم شیث ثم ابراھیم ثم العمالقۃ ثم جرھم ثم قصی، ثم قریش ثم عبد اللہ بن زبیر ثم الحجاج واستمر بناء الحجاج الی الآن الا فی المیزاب والباب والعتبۃ ووقع الترمیم فی الجدار والسقف غیر مرۃ وجدد فیہ الرخام وقیل انہ نزل مع آدم من الجنۃ ثم رفع بعد موتہ الی السماء۔ وقیل بنی قبلہ ورفع

بعض روایات میں آتا ہے کہ سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر ملائکہ نے کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے دو ہزار سال قبل اسکی تعمیر کی تھی۔ مجاہد اور قتادہ اور سُدی سے بھی اسی کے مطابق روایات ہیں۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ فرشتوں نے اس کو سرخ یاقوت سے بنایا تھا۔

پھر اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے اسکو بنایا۔ پھر حضرت شیث علیہ السلام نے پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر عمالقہ نے پھر جرہم نے پھر قصی نے پھر قریش نے پھر عبد اللہ بن زبیرؓ نے پھر حجاج بن یوسف نے چنانچہ حجاج ہی کی تعمیر ابتک باقی ہے سوا میزاب کے اور باب الکعبہ کے اور اسکی چوکھٹ کے ہیں کچھ ترمیم اسکی دیواروں اور چھت میں بھی متعدد بار ہو چکی ہے اور اس میں جدید سنگ مرمر بھی بدلے گئے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ کعبہ بھی حضرت آدم کے ہمراہ جنت سے نازل ہوا تھا۔ پھر آپ کے وصال کے بعد آسمان کی جانب اٹھا لیا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آدمؑ سے پہلے تعمیر

فی الطوفان الی السماء السابعۃ و قیل الرابعۃ۔　　　ہوا تھا اور طوفان نوح کے وقت ساتویں یا چوتھے آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

(روح المعانی ص۵ ج۴)

اس کے بالمقابل ایک دوسرے بزرگ یوں فرماتے ہیں - اور اس میں شک نہیں کہ خوب ہی فرمایا ہے ؂

کعبہ را ہر دم تجلی می فزود　　　دیں ز اخلاصات ابراہیم بود۔

یعنی یہ جو تم کعبہ پر روز افزوں تجلی دیکھتے ہو　　　یہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اخلاص کی برکات ہیں

میں کہتا ہوں کہ جب حضرت ابراہیم ؑ کے اخلاص کی وجہ سے کعبہ پر اس قدر تجلی ہوگئی تو خود حضرت کے قلب اطہر پر حق تعالیٰ کی کیسی کچھ تجلی رہی ہوگی اور اولیاء کرام و مشائخ عظام بھی چونکہ وصول الی اللہ میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے نائب ہوتے ہیں اس لئے ان کے قلب پر بھی یہی تجلی ہوتی ہے۔ جو کہ صحبت کے ذریعہ سالکین کے قلب میں منتقل ہوتی ہے "ان حضرات سے اخذ فیض زیادہ آسان ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ کعبہ سے اس فیض کو لیا جائے۔ غرض اس تقریر سے یہ واضح ہوگیا کہ ان حضرات نے کوئی غلط بات نہیں فرمائی۔

اب اس کے بعد سنئے کہ مشائخ محققین نے ایسا کیوں فرمایا؟

رسالہ قشیریہ میں ہے اور یہ فن کی نہایت ہی معتبر کتاب ہے اور امام ابو القاسم عبدالکریم القشیری الشافعی نیشاپوری کی تصنیف ہے جو کہ چوتھی پانچویں صدی کے لوگوں میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"احکام مریدین کے منجملہ یہ ہے کہ جب کسی تربیت کرنے والے شیخ کو اپنی بستی میں نہ پائیں تو وہاں سے ہجرت اور سفر کر کے اس شخص کے پاس پہونچیں جو اپنے زمانہ میں لوگوں کی اصلاح کے لئے منجانب اللہ منصب ارشاد و تربیت پر فائز ہو پھر اسی کے پاس مقیم رہیں اور اس کی چوکھٹ کو نہ چھوڑیں جب تک کہ وہ اجازت نہ دے دے"

آگے فرماتے ہیں (اور یہی سنانا آپ کو اس وقت مقصود بھی ہے) کہ:-

واعلم ان تقدیم معرفۃ رب البیت علی زیارۃ البیت واجبٌ" فلولا معرفۃ رب البیت ما وجبت　　　خوب سمجھ لو کہ حق تعالیٰ کی معرفت کو زیارت بیت اللہ پر مقدم کرنا واجب ہے۔ اس لئے کہ اگر رب تعالیٰ کی معرفت ضروری نہ ہوتی تو زیارت بیت واجب ہی

زیادۃ البیت۔		نہ ہوتی۔

یعنی سب سے مقدم اور اہم چیز جو انسان کے لئے اس دنیا میں ہے وہ اپنے رب کی معرفت ہے۔ بس یہی اصل جواب ہے کیونکہ حج سے بھی زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ معرفت رب البیت کی نہیں ہوتی اور بزرگوں کی خدمت میں حاضری سے طالب خدا کو معرفت خدا کی ہوتی ہے کیونکہ یہ جگہ اسی لئے موضوع ہے۔ اور اہل اللہ کی خدمت میں رہنے کے بعد اور معرفت حاصل کر لینے کے بعد کعبہ کی تجلیات کا مشاہدہ ہوتا ہے جس کو بزرگان دین نے حج کی روح اور اس کی اصل اور حج مردانہ سے تعبیر فرمایا ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

حج زیارت کردنِ خانہ بود		حج رب البیت مردانہ بود

(یعنی یوں تو حج نام ہے خانہ کعبہ کی زیارت کا لیکن رب البیت کی معرفت جس کو حاصل ہو جائے اس کا حج مردانہ ہے)

یہی مطلب ہے صاحب قشیریہ کے مذکورہ بالا اس ارشاد کا کہ :۔

فلولا معرفۃ رب البیت ما وجبت زیارۃ البیت یعنی اگر رب البیت کی معرفت حاصل کرنی ضروری نہ ہوتی تو زیارت بیت اللہ یعنی حج بھی واجب نہ کیا جاتا۔

غرض علماء و مشائخ کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ رب البیت کی زیارت اصل ہے اور بیت کی زیارت اس کا وسیلہ ہے۔

اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس قول کے حق ہونے میں بھی کسی کو کلام ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ضروری چیز ہے حضرات مشائخ نے لوگوں کے عمل سے یہی اندازہ لگایا ہوگا کہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے لوگ حدود پر رہ نہیں گئے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ عورتیں بلا محرم کے حج کرنے جاتی ہیں۔ اور ایک چیز روح سے خالی ہو کر محض رسم کے درجہ میں رہی جاتی ہے۔ اسی پر تنبیہ فرمانے کے لئے اس قسم کے کلام ارشاد فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو یہ پسند ہے کہ بچپن ہی میں وفات پا جاتے اور گناہ وغیرہ سے محفوظ رہ کر پاک وصاف دنیا سے چلے جاتے یا یہ پسند ہے کہ بالغ ہو کر دنیا میں زندگی گذاریں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے یہاں گنہگار ہی جانا پڑے۔ آپ نے اس کا جو جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے فرمایا کہ بھائی مجھے تو یہی پسند ہے کہ بالغ ہو کر دنیا سے رخصت ہوں بلا سے گنہگار جاؤں لیکن اللہ تعالیٰ کی معرفت تو ہو جائیگی۔ اور بچپن کی معرفت کا کچھ اعتبار نہیں۔

دیکھا آپ نے معرفت رب البیت کتنی بڑی دولت ہے۔ اب لوگوں کو بزرگوں کے کلام میں شبہ اور اشکال ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگ حقیقت حال سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ان کو اس دولت کی خبر ہی نہیں ہے جو بزرگوں کے پاس ہوتی ہے اور جس کے حاصل کرنے کے لئے لوگ ان کے یہاں جاتے ہیں۔

حضرت مولینا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ حج بدل کے لئے کسی نے کہا ہو تو مجھے بھیجد یجئے گا۔ میں کہتا تھا کہ حضرتؒ دل میں یہ فرماتے ہونگے کہ دیکھو تو اسکو حج کرنے کا کتنا شوق ہے اور میرے پاس جو دولت موجود ہے اسکی جانب توجہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے متعلق جب حج کو جار ہا تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ امسال حج کا ارادہ ہے اور اس کے بعد ہی یہ کہا کہ حج تو میرا یہیں ہوتا ہے یعنی مقصد حج تو یہیں حاصل ہوتا ہے۔ حضرت گھر جانے کے لئے اٹھ ہی رہے تھے میری یہ بات سنکر بیٹھ گئے اور غور سے میری بات کو سنا میں تو ڈر گیا کہ شاید کوئی بات ناگوار نہ گذری ہو لیکن میں نے بمبئی سے پھر خط لکھا تو بہت پسند فرمایا اس سے اندازہ ہوا کہ خوش تھے۔ تو بات یہی ہے کہ حضرات مشائخ نے کبھی کبھی جو اس قسم کے کلمات فرمادیے ہیں تو اس سے انکا مطلب یہی رہا ہے کہ زیارت بیت کی تو فکر ہے اور معرفت رب البیت کی جانب اصلاً التفات نہیں حالانکہ وہی اصل ہے اور زیارت بیت اس کا ایک وسیلہ ہے جس طرح سے اس کا ایک دوسرا وسیلہ مشائخ کی صحبت بھی ہے اور تجربہ سے یہ بات ان حضرات کو معلوم ہوئی کہ ہمارے پاس جو لوگ آمد و شد رکھتے ہیں ان کو تو وصول ہو جاتا ہے اور وہ عارف باللہ بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن حج کرنے کے بعد بھی عام طور سے یہی دیکھا جاتا ہے کہ لوگوں کے اندر ذرا تغیر نہیں پیدا ہوتا۔ جیسے جاتے ہیں اسی طرح سے واپس آجاتے ہیں۔ الا ماشاءاللہ اس لئے ان حضرات نے اپنے اعتبار سے ایسا فرمایا اور نفل حج کرنے والوں کو اس کا مخاطب بنایا ورنہ تو حج فریضۂ اسلام ہے اور اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ پس جس طرح کہ نماز و روزہ اور زکوۃ اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کے راستے ہیں اسی طرح سے حج بھی ہے۔ اس کے متعلق یہ حضرات نہ ایسا فرمارہے ہیں اور نہ فرما سکتے ہیں۔ انھیں بزرگوں سے تو ہم کو دین ملا تو کیا یہی دین اور خدا کے فریضے سے لوگوں کو منع کردیں گے۔ معاذ اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پس یہی محمل ان کے کلام کا متعین ہے اب جو شخص اس کے علاوہ کوئی معنی مراد لے یا ان کو ظاہر پر محمول کرے وہ غلطی پر ہے اس اشکال کا یہ نہایت ہی محققانہ جواب ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور سمجھئے وہ یہ کہ حضرات مشائخ کرام کے کارنامے اور انکی تاریخ

شاہد ہے کہ ہر زمانہ میں ان حضرات نے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ سے قریب ہی کیا ہے۔ چنانچہ یہی خدمت ان کی اصلی خدمت اور ان کے فن کا موضوع لئے رہی ہے جس طرح سے کہ اعمال ظاہری کی خدمت علماء ظاہر نے فرمائی ہے مشائخ نے قلب کی اور باطن کی خدمت کی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی کام بدون کسی استاد سے سیکھے نہیں آتا۔ پس جس طرح کہ ہم ظاہری احکام شرع کے جاننے میں علماء کے محتاج ہیں اسی طرح سے باطنی اعمال (ایمان اور اخلاص) کے جاننے میں صوفیاء کرام کے محتاج ہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ حج میں جس طرح سے ظاہری اعمال و افعال ہیں اسی طرح سے باطنی اعمال بھی اس میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان کو سیکھے اور اپنے اندر پیدا کئے بغیر حج کو جائیگا تو گو ارکانِ ظاہری اس کے ادا ہو جائیں لیکن بیت اللہ کی تجلی اور حج کی روح سے تو وہ محروم ہی رہے گا۔

پس ان حضرات نے محض نصح نصیح کے طور پر طالب ہی کی مصلحت سے کبھی یہ فرمایا ہے کہ مشائخ کی خدمت میں رہ کر قلب میں پہلے کچھ استعداد و صلاحیت پیدا کر لو تب حج کو جاؤ تاکہ اللہ تعالیٰ کی خاص تجلیات جو بیت اللہ پر ہوتی ہیں اس سے بھی حصہ پاؤ۔ غرض ان کلمات کے ذریعہ یہ حضرات کسی جانے والے کو روکتے نہیں بلکہ شرائط داخلہ کی تحصیل کی جانب متوجہ فرماتے ہیں تاکہ خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ انسان حج کو بھی جائے اور اس کا مصداق ہو کہ ؎

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند   کہ برونِ درچہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

میں خانہ کعبہ کا طواف کرنیکے لئے حاضر ہوا تو حرم میں مجھے گھسنے نہیں دیا (اور یہ فرمایا کہ) تو نے باہر کیا کیا ہے جو اب گھر کے اندر آنا چاہتا ہے۔

اور یہ سننا پڑے کہ ؎

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد   کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

میں نے جب زمین پر سجدہ کیا تو زمین کے اندر سے یہ آواز آئی کہ اے ظالم تو نے توریائی سجدہ کر کے مجھے بھی خراب کر دیا۔

اب فرمائیے بزرگان دین کے یہ کلمات کس قدر اخلاص پیدا کرنے والے ہیں۔ نہایت عمدہ بات اور بالکل شریعت اور عقل کے موافق کلام ہے لیکن نہ تو ہم کو آج حق تعالیٰ کی معرفت کی فکر ہے اور نہ دین اور بزرگوں کی معرفت ہی حاصل ہے اس لئے ان کی باتوں کو بھی نہیں سمجھتے اور عار و استکبار کی وجہ سے کسی دوسرے سے ان کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ حالانکہ جب کسی بڑے شخص سے کوئی ایسا کلام صادر ہو جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے منکر معلوم ہوتا ہو تو اس کا مطلب

سمجھنا چاہیئے اور خود نہ معلوم ہو تو کسی جاننے والے سے پوچھنا چاہیئے جیسا کہ ان صاحب[ع] نے مجھ سے دریافت کیا میں تو ان کے اس سوال سے بہت خوش ہوا کہ انھوں نے کام کی بات پوچھی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ میرے ماموں امداد علی صاحب رح کہتے تھے کہ میرے پاس روپیہ نہیں ہے تو مجھ پر حج بھی فرض نہیں ہے لہذا یہ خیال بھی مجھے کبھی نہیں ہوتا کہ میرے پاس روپیہ ہوتا تو حج کرتا۔ لیکن یہ تمنا ضرور ہوتی ہے کہ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو حضرت حاجی صاحب رح کی زیارت کو جاتا۔ یہ کیوں فرماتے تھے؟ اسی لئے فرماتے تھے کہ معرفت رب البیت زیارت بیت پر مقدم تھی۔ حضرت حاجی صاحب رح سے بہت تعلق تھا شاید حضرت ہی کی دعا سے پیدا بھی ہوئے تھے۔ بچپن میں حضرت حاجی صاحب رح نے ان کو گود میں لے کر کہا تھا کہ میں امداد اللہ اور تو امداد علی پھر تیسرا کون؟

انھیں کے متعلق حضرت حاجی صاحب رح نے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا تھا کہ میاں فلاں! تمھارے ماموں صاحب ابھی تلوین میں ہیں میرے پاس آتے تو میں تمکین میں کردیتا اب آپ اسکو کیا سن رہے ہیں اس تلوین اور تمکین کو تو آپ لوگ خوب ہی سمجھتے ہوں گے؟ اور یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ ہم سب لوگ تمکین ہی میں ہیں۔ جی اب دھرے ہیں سمجھنے والے۔

حضرت مولانا رح اور ان کی تصانیف نہ ہوتیں تو ان چیزوں کا مصداق تو درکنار لوگ ان کے نام سے بھی آشنا نہ ہوتے۔

خیر۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان بزرگ نے حضرت حاجی صاحب رح کے زیارت کی جو تمنا کی تو اسلئے کہ وہ معرفت رب البیت کا ذریعہ تھا جس طرح سے مقصود زیارت بیت اللہ سے بھی معرفت رب البیت ہی ہے اور یہ زیارت اس کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح سے یہ بزرگان دین بھی دراصل معرفت رب ہی کے اعلیٰ ترین ذرائع اور اسباب میں سے ہیں۔ اسی کو مولانا روم رح فرماتے ہیں ؎

صورتے کو فاخرد عالی بود　　　او ز بیت اللہ کے خالی بود

اور اسی معنی کر بزرگوں نے اپنے مشائخ کو قبلہ تک کہدیا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحب رح آب حیات کے شروع ہی میں فرماتے ہیں کہ:۔

" اوراق مسودہ کا پشتارہ باندھ کر جہاز پر چڑھا اور محض بامداد خداوندی باوجود گمراہی اور نامہ سیاہی کے جس کی وجہ سے اپنی رسائی تو درکنار ہمراہیوں کی گم گشتگی کا بھی اندیشہ تھا، دریا پار ہو کر جدہ پہونچا اور وہاں سے بسواری شتر دو روز میں دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف

ع۔ ایک صاحب نے یہی سوال کیا تھا۔ اور اس وقت مجلس میں موجود تھے۔ ۱۲

ہوا۔ بیت اللہ زادھا اللہ شرفاً وعزۃً الی یوم القیامۃ کا طواف میسر آیا اور حضرت پیر و مرشد امداد اللہ فیوضہم کی قدمبوسی سے رتبۂ عالی پایا۔" انتہیٰ۔

دیکھئے حضرت مولانا نانوتوی لکھتے ہیں کہ :۔

دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا ایک قبلہ تو بیت اللہ تھا اور دوسرا قبلہ پیر و مرشد یعنی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھے۔ حضرت حاجی صاحب کو بھی قبلہ فرمایا۔

یہ حضرات چونکہ بزرگوں سے اور ان کی باطنی دولت سے واقف تھے اور ان سے اس کو حاصل کرتے تھے اس لئے ان کی صحبت اور ان کی زیارت کو کبریت احمر اور غنیمت کبریٰ سمجھتے تھے اور ہم لوگ چونکہ اس سے ناواقف ہیں ہم کو کیا معلوم کہ یہ دولت کیا ہوتی ہے اس لئے نہ ہم بزرگوں کا کلام ہی سمجھ سکتے ہیں اور نہ اہل عقیدت کے معاملات ہی کی فہم رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا قاسم صاحب کے صرف اتنے ہی کلام سے کسقدر عقیدت، عظمت اور محبت کا پتہ چلتا ہے جو کہ ان حضرات کو اپنے بزرگوں سے ہوتی تھی۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ لوگ خشک ہوتے ہیں بزرگو کو اور پیروں کو مانتے ہی نہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس قدر ان حضرات نے اپنے مشائخ کو مانا ہے شاید ہی کسی نے مانا ہو۔

غرضکہ جو دولت بزرگوں کے پاس ہوتی ہے یعنی معرفت رب البیت ان حضرات کا مقصد مریدوں کو اسی کی جانب متوجہ کرنا ہوتا ہے اور اسی کو سمجھانے کے لئے کبھی کبھی عنوان میں اپنا اور بیت اللہ کا بظاہر مقابلہ سا بھی ہو جاتا ہے باقی جو بات فرماتے ہیں وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہوتی ہے۔

اب لوگ حج بھی کرنے جاتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کہ معرفت رب البیت سے ذرا حصہ ان کو نہیں ملتا۔ چنانچہ اسی کو آگے چل کر صاحب رسالہ قشیریہ فرماتے ہیں کہ :۔

والشبان الذین یخرجون الی الحج من ھولاء القوم من غیر اشارۃ الشیوخ فھی بذلک لاجب نشاط النفوس فھم متوسمون بھذہ الطریقۃ ولیس سفرھم علی اصل والذی یدل علی ذلک انہ لایزداد سفرھم الا وتزداد تفرقۃ قلوبھم۔ فلو انھم ارتحلوا من عند

اور وہ نوجوان جو اس طریق میں ہو کر بدون اجازت شیخ کے حج کیلئے نکلتے ہیں تو وہ محض اسلئے کہ نفس ذرا سیر و تفریح حاصل کرے اور یہ لوگ بس نام کیلئے طریق میں ہیں اور ان کا سفر صحیح مقصد پر ہوتا نہیں جسکی دلیل یہ ہے کہ جوں جوں ان کا سفر زیادہ ہوتا رہتا ہے اتنا ہی ان کا قلبی تشتت بھی زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ پس اگر یہ لوگ کہیں اپنے نفس کے چھوڑنے کے سفر کا ایک قدم بھی چلتے تو وہ ان کے لئے

انفسهم بخطوة لكان اخطى لهم من الف سفرة + اس جیسے ہزاروں حج سے بہتر ہوتا۔
(رسالہ قشیریہ)

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ نفس کی اصلاح کرنا (گویا معرفت رب البیت) کہیں زیادہ اہم ہے زیارت بیت سے اور اصلاح نفس کا طریق صحبت ہے۔ چنانچہ اسی مضمون کو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید	معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(یعنی اے وہ لوگو جو حج کو چلے ہو کہاں جاتے ہو؟ کہاں جاتے ہو — معشوق تو یہاں موجود ہے اِدھر آؤ اِدھر آؤ)

اور اسی مضمون کو اس مصرع میں بھی بیان کیا گیا ہے جسے ان صاحب نے لکھا تھا۔ ع

"آں رہ بسوئے کعبہ بَرد وایں بسوئے دوست"

(یعنی وہ شخص تو کعبہ ہی تک راستہ پائیگا اور یہ دوست تک راستہ پائے گا)

یہ مضمون نہایت عمدہ اور بالکل صحیح ہے اور علماء ظاہر کے کلام بلکہ نصوص سے بھی مؤید ہے۔ غلط فہمی کا سبب ہماری ناواقفیت اور کم علمی ہے۔ اس مسئلہ کو اور واضح کرتا ہوں سنئے :۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رح نے مالابد منہ میں فقہی ابحاث کے بعد کتاب الاحسان کا عنوان بھی قائم فرمایا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ :۔

ایں ہمہ کہ گفتہ شد صورت ایمان و اسلام و شریعت است۔ و مغز و حقیقت در خدمت درویشاں باید جُست۔

یہ جو کچھ کہ کہا گیا ہے ایمان اور اسلام کی صورت تھی جس کا نام شریعت ہے باقی اس کی حقیقت اور مغز کو بزرگوں کی خدمت اور صحبت میں تلاش کرنا چاہیئے۔

پھر اس کے کچھ دور بعد فرماتے ہیں کہ :۔

نور باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را از سینۂ درویشاں باید جست و بداں نور سینۂ خود را روشن باید کرد تا ہر خیر و شر بفراست صحیحہ دریافت شود۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کو درویشوں کے سینہ سے حاصل کرنا چاہیئے اور اس نور سے اپنے سینہ کو روشن کرنا چاہیئے تاکہ فراست صحیحہ حاصل ہو کر ہر خیر و شر دریافت ہو سکے۔

(مالابد منہ صـ۱۴۱)

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک باطنی نور بھی ہوتا ہے جو کہ درویشوں کے سینہ سے ملتا ہے اور اس نور کو حاصل بھی کرنا چاہیئے۔ یہی وہ نور ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے

فرماتے ہیں:۔

أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ + سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھولدیا اور وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے۔

اور اسی نور کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم النور اذا دخل الصدر انفسح فقیل یا رسول اللہ ھل لذلك من علم یعرف به قال نعم التجافی من دار الغرور والانابة الی دار الخلود والاستعداد للموت قبل نزوله ۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ نور جب سینہ میں داخل ہوتا ہے تو اس میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! اسکی کوئی علامت بھی ہے؟ فرمایا ہاں۔ دنیا سے نفرت۔ آخرت سے رغبت اور موت سے پہلے اس کی تیاری کی فکر۔ یہ سب علامات ہیں کہ نور سینہ میں اتر گیا ہے۔

(رواہ البیہقی، حاشیہ مکتوبات معصومیہ صـ۱۳۳)

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ دین اور ایمان کا ایک نور ہوتا ہے جو اہل اللہ کی صحبت اور ان کے سینوں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان میں معرفت پیدا ہوتی ہے پس جس طرح سے کہ اس معرفت کا ایک ذریعہ حج بیت اللہ شریف ہے۔ اسی طرح سے اس کا ایک ذریعہ بزرگوں کا قلب بھی ہے۔ پھر بیت اللہ سے معرفت تو کسی ہی کسی اللہ کے بندے کو حاصل ہوتی ہوگی۔ جن میں اس کے حاصل کرنے کی پہلے سے استعداد پیدا ہو چکی ہو انھیں کو کچھ حاصل ہوتی ہوگی اور بزرگان دین سے تو معرفت بھی حاصل ہوتی ہے اور یہ حضرات اس کی استعداد بھی پیدا کرتے ہیں۔

بزرگوں سے سنا ہے کہ جو لوگ اہل دل اور اہل معرفت ہوتے ہیں جن کے سینے میں نور ہوتا ہے جب وہ طواف کرتے ہیں تو پورا مطاف بلکہ ساری مسجد حرام ہی ان کے نور سے منور ہو جاتی ہے اور بعضے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو نور تو کیا ملتا اہل دل کو ان کی ظلمت کی وجہ سے طواف کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

مولوی شفیع الدین صاحب کے بھائی مولوی محب الدین صاحبؒ جو کہ حاجی صاحبؒ کے خلیفہ تھے ایک بار حرم میں موجود تھے مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ آخاہ آپ موجود ہیں جب ہی تو میں کہوں کہ آج حرم کیوں اتنا منور ہو رہا ہے۔

اسی طرح سے حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ بعض لوگ ایسے کامل النور ہوتے ہیں کہ ان کے نور کو آدمی دیکھے تو بس دیکھتا ہی رہ جائے (اس ظاہری آنکھ سے نہیں بلکہ باطن کی آنکھ سے) اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی ظلمت کی وجہ سے لوگوں کو طواف کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بہرحال اس تقریر سے جب یہ معلوم ہوگیا کہ رب البیت کی معرفت زیارت بیت پر مقدم ہے اور معرفت الٰہی کا محل بزرگوں کا سینہ اور ان کا قلب ہے۔ اسی کی جانب وہ لوگوں کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں تو اب اس کے بعد ان کے کلام میں کوئی وجہ اشکال کی باقی نہیں رہ جاتی اس لئے کہ ان حضرات کے قلب میں دین اور اسلام اور اس کے شعائر کی جو عظمت اور احترام اور اس کے ساتھ جو عقیدت اور تعلق ہوتا ہے اس کا تو ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ خاصکر حج جیسا مہتم بالشان فریضہ جو شعائر اسلام میں سے ہے اور جس پر کہ تمام عالم اسلامی کا قیام ہے جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ اور نہ صرف کعبہ شریف ہی بلکہ پورا مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا اسلام میں جو مقام ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے زَادَهُمَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّعِزَّةً اور ان حضرات پر بھی وہ مخفی نہیں تو پھر اس کے بعد یہ بات خیال میں خطرہ اور وہم کے طور پر بھی نہیں آسکتی کہ یہ حضرات ایسی واجب الاحترام چیز کی تنقیص فرمائیں یا اس سے لوگوں کو منع کریں گے۔ معاذ اللہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ بات وہی ہے جس کو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس سے بھی جو اہم شئے ہے یعنی رب البیت کی معرفت جب لوگوں کو اس کی جانب سے غافل اور سست پایا تو اس کی جانب متوجہ کرنے اور اسکی اہمیت قلب میں زیادہ پیدا کرنے کے لئے اس قسم کے ذرا موحش عنوان اختیار فرمائے تاکہ مسلمان کے دل میں جا کر لگے اور وہ اتنی بڑی دولت سے محروم نہ رہے اور متوجہ یوں فرمایا کہ بیت اللہ کی زیارت کا بڑا شوق ہے اور مشائخ کے قلب اور ان کی صحبت سے اسقدر استغناء ہے، حالانکہ جس طرح بیت اللہ حق تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے تو قلب اہل اللہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مورد ہے۔

چنانچہ مشائخ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ کعبہ پر جو اس قدر تجلی ہے اس کا سبب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خلوص ہے ؎

کعبہ را ہر دم تجلی می فزود ۔۔۔ ایں ز اخلاصات ابراہیم بود

یہ جو کعبہ پر حق تعالیٰ کی تجلی ہر آن بڑھتی رہتی ہے (جانتے ہو ایسا کیوں ہے؟) یہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کے اخلاص کی برکت

پھر یہ افراط و تفریط کیسی؟ کیوں ان کے سینے سے نور باطن نہیں اخذ کیا جاتا؟ جب کہ علماء باطن یہ بھی فرماتے ہیں:۔

"نورِ باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را از سینہ درویشاں باید جست و بداں نور سینہ خود را روشن باید کرد"

بس اسی کی جانب لوگوں کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ مشائخ سے اخذ فیض کریں اور ان سے اپنی اصلاح نفس کرانے کو ضروری سمجھیں۔ یہی مقصود تھا ان حضرات کا چنانچہ یہی مطلب ہے اس کا ؎

آں رہ بسوئے کعبہ برد ویں بسوئے دوست۔ اور اس کا کہ ؎ "صورتے کو فاخرد عالی بود ۔ او زبیت اللہ کے خالی بود" اور اس کا کہ ؎ "بہ حج کے رود کہ او را پیر نباشد" اور اس کا کہ ؎

"اے قوم بحج رفتہ کجا ئید کجا ئید معشوق دریں جاست بیا ئید بیا ئید"

پھر اگر حالات کا تتبع کیجئے گا تو اس قسم کے کلمات کا محل عموماً نفل ہی حج کو پائیگا۔ فرض تو خدا کا ہے اس کے کرنے کا تو خدا نے حکم دیا ہے اس کو یہ لوگ کیسے منع کر سکتے ہیں۔ یہ حضرات خدا کے حکم کی اتباع سکھلاتے ہیں نہ یہ کہ بے عملی اور اسکی مخالفت ؎

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

میرے خیال میں اب تو بات بالکل صاف ہو گئی اور اب شاید کسی کے لئے بزرگان دین کے اس قسم کے کلام میں اشکال کی کوئی وجہ نہ ہوگی۔

اب سنئے کہ حج اور زیارت بیت بھی اللہ تعالیٰ سے نسبت اور تعلق ہی کا ذریعہ ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جس کی نسبت میں نقص اور کمی ہو وہ آئے اور بیت اللہ سے اپنے نور اور نسبت کی تکمیل کرے۔ تو دیکھئے لوگوں نے یہ بھی تو کہا ہے۔ مولانا شاہ فضل الرحمن صاحبؒ کے خلیفہ کے ایک خلیفہ تھے وہی یہ فرماتے تھے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ مگر آپ سے کہتا ہوں کہ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جو شخص پہلے سے صاحب نسبت ہو اور اسکی نسبت میں ابھی کسر اور نقص ہو تو وہ تو اپنی نسبت کی تکمیل بیت اللہ سے کرے گا۔ لیکن اگر کسی نے سرے سے نسبت ہی نہیں پیدا کی اور اس سے بالکل کورا ہے تو وہ کیا تکمیل کریگا۔ اسکے لئے تو ضرورت کسی شیخ کامل اور مکمل ہی کی پڑے گی۔ خیر وہ صاحب جو بات کہتے تھے وہ صحیح ہے کہ کعبہ شریف سے ایمان کی نسبت کی تکمیل بیشک ہوتی ہے چاہے کسی کی بھی ہوتی ہو لیکن میں ایک آسان ذریعہ اس قسم کی تکمیل کا اور بتلاتا ہوں لوگ اس کو نہیں لیتے اور اسکو مکمل ایمان اور متمم نسبت نہیں سمجھتے حالانکہ وہ بھی ہے اور یقیناً ہے اور آپ کی بھی سمجھ میں آجائے گا کہ بیشک وہ ہے۔ وہ کیا چیز ہے؟ وہ ہے قرآن شریف۔ اب جس کے اندر کسی بزرگ کی صحبت کی برکت سے کچھ بھی حصہ نسبت کا پیدا ہو چکا ہے وہ قرآن شریف

سے بھی اپنی تکمیل کر سکتا ہے۔ کیونکہ جس طرح کعبہ شریف بیت اللہ ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ جسم نہیں ہیں کہ ان کا کوئی مکان ہو اسی طرح سے قرآن شریف بھی کلام اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ متکلم ہیں۔ کلام اللہ تعالیٰ کی صفات کمالیہ ازلیہ میں سے ہے۔ پس جس طرح سے اللہ تعالیٰ کی تجلی بیت اللہ میں ہوتی ہے اور وہی منشا ہوتی ہے۔ سالک کی تکمیل کا اسی طرح سے وہی تجلی کلام اللہ میں بھی درجۂ اتم و اعلیٰ موجود ہے۔ کیونکہ کسی کے اسم کو مسمی سے وہ نسبت اور اتصال نہیں حاصل ہوتا جو کہ اس کے کلام کو اس کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی جیسی کچھ تجلی اس کے کلام میں ہوگی، ظاہر ہے کہ کسی دوسری چیز میں نہ ہوگی۔ اس مسئلہ پر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنی تفسیر میں نہایت ہی عمدہ کلام فرمایا ہے۔ اس کو بعینہ نقل کرتا ہوں کَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهٗ کے تحت لکھتے ہیں کہ:-

واختلاف مضامین را در ذکر بودنش تاثیرے نیست زیراکہ ہر مضمون کہ باشد کلام الٰہی است۔ واتصال کلام با متکلم اقوی واشد است از اتصال نامے با صاحب نام والتفاتے کہ در وقت ذکر نام شخص بآں شخص حاصل می شود از التفاتے کہ در وقت خواندن کلام او حاصل می گردد کمتر است چنانچہ بر صاحب تجربہ پوشیدہ نیست ونیز کلام شخص شانے ست عمدہ از شیون ذات او در وقت تلاوت آں کلام بر قلب تالی متجلی می شود۔ لہذا تاثیر کلام بزرگان در نفس زیادہ تر از تاثیر نام آنہا می باشد ولہذا در حدیث شریف وارد است کہ در حق قرآن فرمودہ اند کہ ھو حبل اللہ المتین۔

قرآن شریف میں مختلف مضامین جو بیان کئے گئے ہیں تو ان کے اختلاف سے اسکے ذکر ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا اسلئے کہ جو مضمون بھی اس میں ہے وہ کلام الٰہی ہے اور کلام کو متکلم کیساتھ جو اتصال اور نسبت ہوتی ہے وہ اس سے کہیں زائد قوی اور شدید ہوتی ہے جو کسی کے نام کو اپنے مسمی سے ہوتی ہے اور وہ توجہ اور التفات جو کسی شخص کے نام لینے سے اسکی طرف ہوتی ہے بہت ہی کم ہے اس توجہ اور التفات سے جو کہ اسکے کلام کے پڑھنے کے وقت اسکی جانب ہوتی ہے جیسا کہ صاحب تجربہ پر پوشیدہ نہیں۔ نیز یہ کہ کسی شخص کا کلام اسکے ذات کی شانوں میں سے ایک عمدہ شان ہے جو کہ اس کلام کے تلاوت کیوقت قلب تالی پر متجلی ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگوں کے کلام کی تاثیر نفس میں ان کے نام کی تاثیر سے زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے۔

اور حضرت امام جعفر صادق رحؒ فرمودہ اند کہ تجلی اللہ لعبادہ فی کلامہ ولکنھم

اور حضرت امام جعفر صادق رحؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے بندوں کے لئے اپنے کلام میں تجلی فرمائی ہے لیکن

تبصرون۔	وہ دیکھتے نہیں۔

(ص۳۲۵ عزیزی)

تو دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ کلام اللہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی تجلیات موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں اسی طرح سے مخفی ہیں جیسے خوشبو پھول میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

چنانچہ خوب کہا ہے کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل	ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

حضرت مولانا رح فرماتے تھے کہ اسکو اللہ تعالیٰ اور کلام اللہ کے لئے بھی پڑھا جاسکتا ہے یعنی چونکہ کلام اللہ میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات ہیں جو اس میں اسی طرح سے موجود ہیں جیسے پھول میں خوشبو تو جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت اور ان کے دیکھنے کا قصد رکھتا ہو تو وہ ان کو ان کے کلام میں دیکھے گویا حق تعالیٰ کی جانب سے اس کو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل	ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

پس اللہ تعالیٰ کی جو تجلی قرآن میں ہے یا معیت اللہ میں ہے اس کو مومن حاصل کرتا ہے اور بقدر اپنے ایمان کے حاصل کرتا ہے۔ اب ان سب تصریحات کے ہوتے ہوئے بھی کیا کوئی مسلمان اس کا انکار کرسکتا ہے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات نہیں ہیں۔

پھر اس کو ذریعۂ تکمیل نسبت اور ایمان جو نہیں بنایا جاتا تو اس میں نفس کا ایک چور ہوتا ہے وہ یہ کہ حج کے لئے تو کچھ اہتمام وانتظام وغیرہ کرنا پڑتا ہے اور دور دراز کا سفر کرنا ہوتا ہے اس لئے اس کی تو عظمت قلوب میں ہے اور قرآن شریف چونکہ ہر شخص کے گھر میں موجود ہے اس لئے اس کی قدر نہیں حالانکہ کلام اللہ کو اللہ تعالیٰ سے جو نسبت اور تعلق ہے وہ ابھی آپ نے سن ہی لیا۔ اب اس کے بعد اگر حج اور قرآن کے متعلق یہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا کہ ؏

آں رہ سوئے کعبہ بردو ایں بسوئے دوست

اب یہ رمضان شریف کا مہینہ ہے بہت سے لوگ یہاں اس لئے آتے ہیں کہ حج کے لئے جانا ہے اس کے لئے تیاری کریں۔ تو میں کہتا ہوں کہ مقصود حج سے نفس کی تکمیل ہی ہوتی ہے پھر اس مہینے میں اور وہ بھی قرآن شریف کے ذریعے سے نفس کی جو تکمیل ہوسکتی ہے اس کی جانب سے آپ لوگ آخر کیوں غافل ہیں؟

بات یہ ہے کہ بزرگوں سے بھی ایمان اور نسبت حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں

چونکہ ان چیزوں کا اعتقاد لوگوں سے ختم ہوتا جا رہا ہے اس لئے یہ سب باتیں سمجھ میں ہی نہیں آتیں بس اس لئے لوگ کچھ پاتے بھی نہیں۔

اے بھائی نفس کا مارنا جو فرض ہے تو کیا اس کے لئے مکہ شریف ہی جانے کا انتظار ہے؟ کیا وہ ہندوستان میں فرض نہیں ہے؟ پھر آخر یہاں بھی جو چیز فرض ہے اسکی جانب التفات کیوں نہیں ہے۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ یعنی کیا بعض چیزوں کو تو لیجئے گا اور بعض کو چھوڑ دیجئے گا؟ دین میں یہ تقسیم کیسی؟

لہٰذا جس طرح سے قرب خداوندی کا ایک ذریعہ حج ہے اسی طرح سے اس کا ایک ذریعہ تلاوت قرآن بھی ہے۔ اور جس طرح سے حصول نسبت کا ایک طریقہ زیارت بیت ہے اسی طرح سے اس کا ایک ذریعہ اہل اللہ کی صحبت بھی ہے اس میں کیا اشکال ہے؟

بس مجھے اس جگہ یہی کلام کرنا ہے۔ امید ہے کہ اس تشریح و توضیح کے بعد خلجان رفع ہو گیا ہوگا۔ نیز اس سے معلوم ہوا کہ مشائخ محققین کی کوئی بات شریعت کے خلاف نہیں ہوا کرتی البتہ کبھی کبھی کلام میں کچھ خفا ہوتا ہے اس لئے اسکو کسی محقق سے سمجھنا چاہیئے۔

بزرگوں کے کلام میں علوم و معارف ہوتے ہیں۔ کبھی ان کی ایک ہی بات سے آدمی کہیں سے کہیں پہونچ جاتا ہے۔ اس لئے ان پر بجائے اعتراض و انکار کرنے کے ان حضرات سے مناسبت اور باطن کا ذوق پیدا کرنا چاہیئے ؎

چوں نشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

علماء نے لکھا ہے کہ اولیاء اللہ کا کلام ان کے بعد ان کا خلیفہ ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ان کی ذات سے فیض ہوتا ہے بعد کے لوگوں کو ان کے کلام سے بھی نفع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے صالحین بندوں کے قال سے مستفید فرماوے اور ان کے حال سے بھی حصۂ وافر نصیب فرماوے ؎

اُحِبُّ الصَّالِحِیْنَ وَلَسْتُ مِنْہُمْ
لَعَلَّ اللّٰہُ یَرْزُقُنِیْ صَلَاحًا

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا و مقتدانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مضمون طہارت

فرمایا کہ حضرت مولانا شاہ ولی صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں کہ

ان من اجل نعم اللہ تعالیٰ التی لا یستطیع العباد شکرھا ان بعث الانبیاء مترجمین عن الغیب ھادین الی طرق التقرب الی اللہ تعالیٰ لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحیٰی من حی عن بینۃ ثم جعل لھم ورثۃ یقومون بعلمھم بین الناس ویحیون سنتھم ویدعون الی رشدھم۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ان بڑی نعمتوں میں سے جن کا شکر ادا کرنے سے بندے قاصر ہیں ایک بڑی نعمت حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہے جو غیب کے ترجمان ہیں۔ اور ان حضرات کی بعثت اسلئے ہوتی ہے تاکہ اس کے بعد جو ہلاک ہو وہ بینہ کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ بینہ کے ساتھ زندہ رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کے لئے ورثہ بنائے جنھوں نے لوگوں میں ان حضرات کے علوم پھیلائے اور ان کی سنت اور ان کے طریق کو زندہ رکھا اور ان کی ہی ہدایت کی جانب لوگوں کو دعوت دی آگے فرماتے ہیں۔

ومعظم مادعت الی اقامتہ الرسل امور ثلاثۃ تصحیح العقائد فی المبدأ والمعاد والمجازات وغیرھا وتکفل بھذا الفن اھل الاصول من علماء الامۃ شکر اللہ مساعیھم۔

اور حضرات انبیاء علیہم السلام نے جن امور کے قائم کرنے کی دعوت دی ان میں سے بڑے بڑے امور تین ہیں۔ ایک تو مبدا اور معاد جزا و سزا کے متعلق عقائد کی تصحیح کرنا (یعنی اپنی پیدائش میں غور کرنا پھر اپنی موت کو سامنے رکھنا اور آخرت کے حساب و کتاب جزا و سزا کے متعلق اسلامی عقیدے رکھنا اور اس فن کی کفالت علماء اصول یعنی حضرات متکلمین نے فرمائی اللہ تعالیٰ ان کی سعی مشکور فرمائے

وتصحیح العمل فی الطاعات المقربة والارتفاقات الضروریة علی وفق السنة وتکفل بھذا الفن فقھاء الامة فھدا ھم اللہ بھم کثیرین واقام بھم فرقة عوجاً۔

دوسری چیز طاعات مقربہ میں عمل کی تصحیح کرنا اور سنت کے مطابق ضروری طریق انتفاع کا بیان اور اس فن کی کفالت فقہائے امت نے فرمائی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بہت سے لوگوں کو ہدایت بخشی اور بہت سے فرقوں کی کجی کو درست فرمادیا۔

ولتصحیح الاخلاص والاحسان وتکفل بھا الصوفیہ۔

اور تیسری چیز ان میں سے اخلاص اور احسان کی تصحیح ہے جس کی کفالت حضرات صوفیہ صافیہ رحمہم تعالیٰ نے فرمائی۔

تفہیمات ص ۱۲ ج ۱

تو دیکھئے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بعثت انبیا کو اجل نعم الہٰی میں سے جو شمار فرمارہے ہیں تو اسی لئے کہ حضرات انبیا علیہم السلام سے ہمیں تقرب الی اللہ کا راستہ معلوم ہوا اور پھر ان کے بعد ان کے ورثہ نے ان کی سنت کو زندہ رکھا اور انھیں کی ہدایت کی جانب لوگوں کو دعوت دی۔

پھر آگے شاہ صاحب نے خود بیان فرمایا ہے کہ ورثہ کون حضرات ہیں۔ چنانچہ علمائے اصول، فقہا اور صوفیہ کو ان کا وارث قرار دیا اس لئے کہ ان کی دعوت کا بڑا حصہ تین ہی امور سے متعلق تھا ایک تو عقائد کی تصحیح۔ دوسرے طاعات مقربہ میں عمل کی تصحیح تیسرے اخلاص کی تصحیح۔ ان میں سے عمل کی تصحیح کی بابت فرمایا کہ اس شعبہ کی کفالت حضرات فقہاء نے فرمائی۔ چنانچہ فقہا بھی یہی لکھتے ہیں۔ اور اپنی تصانیف کا تعارف انھیں لفظوں میں فرماتے ہیں۔ مثلاً یہ لکھتے ہیں کہ ہم نے اپنی کتاب میں ان مسائل کو بیان کیا ہے جن سے عبادات خمسہ کی تصحیح ہوتی ہے جیسا کہ صاحب مراقی الفلاح اپنی کتاب کے خطبہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔

ان ھذا الکتاب صغیر حجمہ غزیر علمہ صحیح حکمہ احتوی علی ما بہ تصحیح العبادات الخمس۔

یعنی میری کتاب ضخامت میں تو کم ہے مگر اس کا علم بہت ہی کثیر اور عمیق ہے اور اس کے دلائل سب کے سب صحیح ہیں اور یہ ایسے مسائل پر مشتمل ہے جن سے عبادات خمسہ کی تصحیح ہوتی ہے۔

دیکھئے یہاں مصنف اپنی تالیف کا مقصد عبادات کی تصحیح کو فرما رہے ہیں جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمایا تھا کہ فقہا کا منصب طاعات مقررہ میں عمل کی تصحیح ہے اور یہ فرما رہے ہیں کہ وہ عبادات پانچ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حدیث شریف میں آتا ہے بنی الاسلام علی خمس۔ یعنی اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد عبدہ ورسولہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان یعنی گواہی دینا اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ نماز کا قائم کرنا۔ زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا ان میں چار تو وہی عبادات ہیں جن کا تذکرہ فقہا فرماتے ہیں یعنی نماز روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج لیکن پانچویں چیز حدیث شریف میں ایمان کو فرمایا گیا ہے۔ اس لئے کہ ان سب کی اصل تو وہی ہے اور فقہاء چونکہ صرف امور فرعیہ کو بیان کرتے ہیں اس لئے یہ حضرات بجائے ایمان کے طہارت کا تذکرہ فرماتے ہیں

بہر حال حدیث میں جس نمبر پر ایمان کا تذکرہ کیا گیا ہے فقہ میں طہارت کو وہی درجہ دیا گیا ہے یعنی پہلی عبادت اسی کو قرار دیا گیا ہے۔

آپ سے کہتا ہوں کہ طہارت کے شرف کے لئے یہ کچھ کم ہے۔ شائد اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ الطھور شطر الایمان یعنی طہارت نصف ایمان ہے۔ بہر حال مصنف نے یہاں عبادات خمس فرمایا۔ اور عبادت کے نام سے عرف میں چار ہی چیزیں مشہور ہیں۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج اس لئے علامہ طحطاوی اس کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

(العبادات الخمس) اراد الطهارة والصلوٰة والصوم والزكوٰة والحج وعد الطهارة عبادة لانه يثاب عليها بالنية وان كانت لا تشترط فيها۔ (طحطاوی علی المراقی صـ۱)

یعنی عبادات خمسہ سے مراد طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج لیا ہے اور طہارت کو عبادت اس لئے شمار کیا ہے کہ نیت کے بعد وہ بھی عبادت ہو جاتی ہے اگرچہ نیت صحت طہارت کے لئے شرط نہیں۔

جس طرح سے نماز روزہ اور دیگر عبادات اپنی صحت اور ثواب میں نیت کے محتاج ہیں۔ اسی طرح سے ترتب ثواب میں طہارت بھی محتاج نیت ہے۔ اسی اشتراک حکم کی وجہ سے اس کو بھی عبادت شمار کر لیا گیا۔

میں کہتا ہوں کہ طہارت کو عبادت اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ یہ نماز کا موقوف علیہ ہے۔

نیز طہارت اس لئے بھی عبادت ہے کہ اس کا حکم نص میں آیا ہے چنانچہ صاحب ہدایہ کتاب الطہارۃ کا عنوان ابتداہی میں قائم فرماتے ہیں اور اس کو اس آیۃ سے شروع فرماتے ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ اے ایمان والو جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اپنے چہرے کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھوؤ اور اپنے سروں کا مسح کرو اور پیروں کو ٹخنوں سمیت دھوؤ پس جب طہارت کا حکم ہے تو یہ بھی عبادت ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا امتثال عبادت ہے۔

وضو کے متعلق صاحب درمختار نے ایک بات یہ فرمائی کہ

لیس اصل الوضوء من خصوصیات ھذہ الامۃ بل الغرۃ والتحجیل بدلیل ھذا وضوئی ووضوء الانبیاء من قبلی وقد تقرر فی الاصول ان شرع من قبلنا شرع لنا اذا قصہ اللہ تعالیٰ ورسولہ من غیر انکار ولم یظھر نسخہ۔

نفس وضو اس اُمت کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ خصوصیت جو ہے تو وہ چہرہ اور ہاتھ پاؤں کا آثار وضو سے چمکنا ہے چنانچہ اسی کے سبب سے آپ قیامت میں اپنی اُمت کو پہچانیں گے اور اصل وضو کی خصوصیت اس لئے نہیں ہے کہ اگلی اُمتوں میں بھی اس کا حکم تھا جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے۔

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین تین بار وضو فرمایا ہے اور یہ فرمایا کہ یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے کے تمام انبیاء کا وضو ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وضو ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی اُمتوں میں بھی وضو تھا اور اصول میں یہ امر طے شدہ ہے کہ ہم سے پہلے لوگوں کی جو شریعت ہے وہ ہمارے لئے بھی شریعت ہے جب کہ اللہ و رسول اس کو بلانکیر ذکر فرمادیں اور وہ حکم منسوخ بھی نہ ہو گیا ہو۔

لہٰذا اس قاعدہ کی رُو سے تو وضو ہم پر بھی لازم تھا اس کے وجوب کے لئے نص جدید کی حاجت نہ تھی پھر قرآن شریف میں اس کا حکم مستقل طور پر جو آیا تو کے متعلق صاحب درمختار فرماتے ہیں کہ

ففائدۃ نزول الاٰیۃ تقریر الحکم الثابت۔

یعنی وضو کے متعلق نص جو وارد ہوئی تو اس کا فائدہ حکم ثابت کی تقریر ہے یعنی اس کی تثبیت اور اس کو باقی رکھنا ہے اس لئے کہ وضو مستقل عبادت تو تھی نہیں بلکہ یہ نماز کے تابع تھا۔ تو ہو سکتا تھا کہ اُمت سے کماحقہٗ اس کی شان کا اہتمام فوت ہو جاتا اور زمانہ وحی سے بُعد کے سبب اور نقل

کرنے والوں کی کمی کی وجہ سے لوگ اس کے شرائط اور ارکان کی ادائیگی میں بھی تساہلی برتتے اور اس طور پر یہ ضمنی حکم آہستہ آہستہ ختم ہی ہو جاتا بخلاف اس کے جب کہ نص متواتر سے بھی ثابت ہوگیا ایسی نص جو ہر زمانہ میں باقی رہنے والی اور ہر شخص کی زبان پر جاری وساری رہنے والی ہے تو اب اس کے ختم بلکہ اس میں تغیر و تبدل ہونے کا بھی احتمال ختم ہوگیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ و رسول کے نزدیک طہارت کس درجہ مطلوب اور مہتم بالشان چیز ہے۔

طہارت کا اسلام میں خاص درجہ ہے چنانچہ تمام فقہاء نے اپنی اپنی کتابوں میں اسی کو سب سے پہلے بیان کیا ہے۔ یہ ہدایہ ہے فقہ حنفی کی نہایت معتبر کتاب ہے اور اس کے مصنف بھی بڑے آدمی ہیں انھوں نے اپنی کتاب میں نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج تمام عبادات کے مسائل بیان فرمائے ہیں لیکن کتاب الصلوٰۃ کا بیان تینتیس ۳۲ ورق کے بعد کیا ہے اور اس سے پہلے اتنی دور تک کتاب الطہارۃ ہی کا بیان کیا ہے جس میں فرائض وضو، سنن وضو، نواقض وضو، طریقۂ غسل، موجبات غسل۔ پھر اس پانی کا بیان جس سے طہارت جائز ہے اس سلسلہ میں کنوئیں کے پاک کرنے کا طریقہ بیان کیا ہے پھر تیمم کا بیان ہے۔ پھر عورتوں کے طہارت کے سلسلے میں حیض و نفاس کا بیان کیا ہے پھر نجاست حقیقیہ سے بدن، کپڑے، اور جگہ کے پاک کرنے کی تفصیلات اور پھر اس کے بعد نجاست خفیفہ و غلیظہ کا بیان ہے اور یہ کہ کس قدر مقدار ہر ایک سے معاف ہے ان سب کو مفصل بیان کر کے تب اس کے بعد کتاب الصلوٰۃ شروع کی ہے تو دیکھئے فقہاء نے طہارت کا اس قدر اہتمام آخر کیوں کیا ہے یہ اسی لئے کہ حقوق اللہ میں سے ایمان کے بعد نماز تمام ارکان سے بڑھ کر ہے اور اس کی صحت طہارت پر موقوف ہے۔

مراقی الفلاح میں تطہیر کے معنی بیان فرماتے ہیں کہ

والتطهير اما اثبات الطهارة بالمحل او ازالة النجاسة عنه ويفترض في مالا يعفى منها وقد ورد ان اول شيئ يسئل عنه العبد في قبره الطهارة وان عامة عذاب القبر من عدم الاعتناء لشانها والتحرز عن النجاسة خصوصا البول۔

یعنی تطہیر کے معنی ہیں کسی محل میں طہارت کا ثابت کرنا یا کسی محل سے نجاست کو زائل کرنا اور یہ طہارت فرض ہے اس نجاست سے جو معافی کی مقدار کے اندر اندر نہ ہو کیونکہ کچھ کچھ مقدار نجاست

غلیظ اور خفیفہ کی معاف ہے اگر اس کے اندر اندر ہے تو اس کا پاک کرنا فرض نہیں۔ آگے اس فرضیت کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سب سے پہلی چیز جس کا سوال بندے سے اس کی قبر میں ہوگا وہ طہارت ہے۔ نیز حدیث میں آتا ہے کہ پیشاب سے بچو اس لئے کہ عام طور پر عذاب قبر اسی سے ہوتا ہے۔ یعنی طہارت کا اہتمام نہ کرنے سے اور نجاست سے نہ بچنے سے خاص کر پیشاب سے (چنانچہ حدیث میں ہے کہ عذاب قبر تین چیزوں سے ہوتا ہے۔ غیبت سے نمیمہ سے اور پیشاب سے احتیاط نہ کرنے سے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے اور فرمایا کہ ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور کسی بڑی وجہ سے نہیں ہو رہا بلکہ ایک ان میں سے چغلی کھایا کرتا تھا اور دوسرا پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا۔

دیکھا آپ نے شریعت میں طہارت کی کس درجہ اہمیت ہے فرماتے ہیں کہ قبر میں سب سے پہلے اسی کا سوال ہوگا۔

آپ جانتے ہیں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے اور طہارت نماز پر بھی مقدم ہے پس جب محشر میں سب سے پہلے نماز کا سوال ہوگا اس لئے کہ وہ آخرت کی دوسری منزل ہے تو پہلی چیز یعنی طہارت کا سوال پہلی منزل یعنی قبر میں ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ طہارت کی اہمیت کے لئے یہ کچھ کم ہے۔ علما نے جس طرح سے نماز روزہ کے مسائل بیان کئے اسی طرح سے طہارت کے مسائل بھی بیان کئے ہیں تاکہ ان سب کی ادائیگی انسان کے لئے آسان ہو جائے اور اللہ و رسول کے منشا کے مطابق ہو جائے۔ اس لئے کہ بالغ ہونے کے بعد ہمارے لڑکوں اور لڑکیوں پر سب سے پہلا حکم شریعت کا جو عائد ہوتا ہے وہ طہارت ہے چنانچہ علما نے انھیں مسائل کو ایسے طریقہ سے بیان کیا ہے کہ لوگ اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ طحطاوی میں ہے کہ۔

(وحی) ان الشافعی استحسن مبسوط الامام محمد فحفظہ۔

یعنی روایت ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام محمد کی کتاب مبسوط کا مطالعہ کیا اور اس کو اتنا پسند کیا کہ اس کو حفظ کر لیا۔

دیکھئے انسان کلام اللہ کو حفظ کیا کرتا ہے مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو امام محمد کی مبسوط اس قدر پسند ہوئی کہ اس کا حرف حرف یاد کر لیا۔ معلوم نہیں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں کیا لکھ دیا تھا اور کس عنوان سے ان مسائل کا بیان فرمایا تھا کہ امام شافعی صاحب جو خود امام تھے اس سے اتنا متاثر ہوئے۔

اسی طرح سے ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ۔

واسلم حکیم من کفار اھل الکتاب لسبب مطالعتہ وقال ھذا کتاب

محمد کم الاصغر فکیف کتاب محمد کم الاکبر۔

طحطاوی علی المراقی صہ

یعنی اہل کتاب کا ایک حکیم امام محمد کی اسی مبسوط کے مطالعہ کی وجہ سے مسلمان ہوگیا اور کہا کہ یہ تو تمہارے محمد اصغر کی کتاب ہے پس تمہارے محمد اکبر کی کتاب کی کیا شان ہوگی یعنی قرآن شریف جس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پاس سے لائے ہیں وہ کیسا کچھ ہوگا۔ امام محمد صاحب کی مبسوط تو اب شائد ملتی بھی نہیں۔ بڑا اشتیاق ہے کہ اس کو دیکھتا البتہ امام سرخسی کی مبسوط ملتی ہے اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا اس میں فقہی مسائل وہ بھی لکھتے ہیں اور اس کے دلائل بیان فرماتے ہیں لیکن اس میں جو دلائل لائے ہیں وہ اپنے فقہاء کے دلائل سے بالکل مختلف ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ احکام خدا تعالیٰ کی طرف سے بیان فرمارہے ہیں۔

اس حکیم پر اسی بات کا اثر ہوا اس نے دیکھا ہوگا کہ اسلام کے ابتدائی احکام کی یہ کتاب ہے اور اس قدر مرتب اور مہذب اس کا بیان ہے اور جو بات کہی ہے اس کے نہایت ہی معقول دلائل موجود ہیں ان کے دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بیشک یہ خدائی احکام ہیں اور ان کے رسول جن سے یہ احکام منقول ہیں بلاشبہ خدا کے رسول ہیں غرض امام محمدؒ کے حسن بیان سے اس کے قلب میں ایمان آگیا اور وہ یہ کہہ کر مسلمان ہوگیا کہ جب محمد اصغر یعنی امام محمد صاحبؒ کی لکھی ہوئی کتاب ایسی زبردست ہے تو محمد اکبر یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب یعنی قرآن شریف کی شان کا تو پوچھنا ہی کیا۔

میں کہتا ہوں کہ اس حکیم نے بہت ہی خوب بات کہی۔ عاقل شخص تھا اس کی عقل نے صحیح رہنمائی کی کہ امام محمدؒ کی مبسوط کے مطالعہ سے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہوگئی اور اس سے اس نے سمجھا کہ مسائل کی یہ تعبیر اور تحریر امام محمدؒ کی ہے لیکن یہ مسائل اور تعلیمات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں اور جب ایک امتی کی کتاب ایسے عالی مضامین پر مشتمل ہے تو نبی کی کتاب کیسے کچھ مضامین کا خزانہ ہوگی اور اس کے ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی اس نے صرف مبسوط ہی کا مطالعہ کیا تھا۔ قرآن شریف اس کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ اس نے اسکے مضامین کے حسن کو مبسوط پر قیاس کر کے کہا تھا باقی اس میں شک نہیں کہ قرآن شریف کے مطالعہ سے

اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں توحید کے مضامین بیان فرمائے ہیں اور بندوں کو اپنی ذات صفات اور افعال کی معرفت کرائی ہے جس سے کلام کی شوکت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشک شاہی کلام ہے۔

ایک دفعہ حضرت مولانا نے مجلس میں بیان فرمایا کہ قرآن شریف اور حدیث شریف میں فرق یہ ہے کہ کلام اللہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی ذات کا کلام ہے جو کسی سے ڈرتی نہیں ہے کلام میں شاہانہ دبدبہ اور شوکت ہے۔ اور حدیث شریف کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی ذات کا کلام ہے جو کہتا جاتا ہے اور کسی سے ڈرتا جاتا ہے یعنی یہ کہ مالک کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ ہوجائے اور یہ اس لئے کہ یہ بہر حال مخلوق کا کلام ہے جو خود کو خالق کے ماتحت سمجھتا ہے رہا کلام اللہ تو یہ خالق کا کلام ہے اور وہ کسی کا ماتحت اور تابع نہیں جس کی شان یہ ہے لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ یعنی جو کچھ کرتا ہے تو اس کے بارے میں کوئی سوال کرنے والا نہیں اور لوگ جو کچھ کریں گے اس کی بابت میں ان سے سوال کیا جائے گا۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ تقرب الی اللہ کا ایک شعبہ تصحیح عمل بھی ہے جس میں طاعت اور طہارت سبھی داخل ہیں اور آپ نے دیکھا کہ طہارت دیگر طاعت پر مقدم ہے۔

اب اس زمانہ میں طہارت کی اہمیت سے آپ لوگ صرف نظر کرلیں تو کرلیں لیکن آپ کے اسلاف کے نزدیک تو اس کی بڑی اہمیت تھی اور یہ حضرات اس کا بہت اہتمام کرتے تھے چنانچہ کتابوں میں امام محمدؒ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن امام ابوحنیفہؒ درس دے رہے تھے۔ امام محمد بھی آکر کنارے کھڑے ہو گئے اس دن اتفاق سے یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ کوئی نابالغ لڑکا شب کو سویا اور اسی رات کو وہ بالغ ہوگیا تو اس پر عشاء کی نماز فرض ہوئی یا نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس پر نماز فرض ہوجاتی ہے اس کو ادا کرنا چاہئے۔ اب امام محمد یہ سنتے ہی وہاں سے چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آگئے۔

امام ابوحنیفہؒ نے پوچھا کہ میاں صاحبزادے کہاں چلے گئے تھے امام محمد نے جواب دیا کہ ابھی آپ حضرات جس مسئلہ میں گفتگو فرما رہے تھے آج رات میں اسی میں مبتلا ہوا تھا چنانچہ جب میں نے سنا کہ اس پر نماز فرض ہوجاتی ہے تو اسی کو ادا کرنے گیا تھا امام ابوحنیفہؒ کو ان کی یہ ادا یعنی عظمت شرع اور جذبۂ امتثال احکام پسند آیا بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میاں صاحبزادے تم بہت ہونہار معلوم ہوتے ہو ہمارے پاس آیا کرو کامیاب ہوجاؤ گے چنانچہ اس کے بعد سے امام محمد صاحب

امام ابو حنیفہؒ کے درس میں حاضر ہونے لگے اور پھر فقہ میں ان کا جو درجہ ہوا وہ معلوم ہے۔ دیکھئے امام محمدؒ کے کمال کی ابتدا بھی طہارت ہی سے ہوئی۔

اسی لئے کہتا ہوں کہ خدا کا تقرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو کام ترتیب سے کرو قلب کو کیا پاک کرو گے جب تمہارا بدن اور کپڑا ہی پاک نہ ہوگا۔ علماء نے جو یہ سب کتابیں لکھی ہیں اور طہارت اور نماز ظاہر شرع کو بیان فرمایا ہے تو یہ سب تقرب الی اللہ ہی کا طریق بنایا ہے پہلے ظاہر ہی کو ٹھیک کیا جائے گا پھر اس کے بعد باطن کو لیا جائے گا۔ محققین نے ہر زمانہ میں یہی ترتیب اختیار کی ہے چنانچہ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ہے جنھیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے جمع فرمایا ہے۔ کہ

"اول راہ سلوک کی یہ ہے کہ جو آدمی شریعت پر ثابت قدم ہوا
اور جو کچھ احکام شرع کے ہیں ان کو بجا لایا اور سر مو ان سے تجاوز نہ کیا
تو اس کا مرتبہ آگے کو بڑھتا ہے اور دوسرے مرتبہ میں پہنچ جاتا ہے"
(ص ۱۲ السنۃ الجلیۃ)

اس کے تحت حضرت مولانا تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ دیکھئے اس میں کیسی تصریح ہے کہ تمام ترقیاں اس پر موقوف ہیں کہ شریعت پر ثابت قدم رہے۔ انتہیٰ

بس کہتا ہوں کہ شریعت میں جس طرح سے اور احکام ہیں اسی طرح سے اس میں طہارت اور نماز بھی ہے۔ جسے آپ لوگوں نے آج بے قدر بنا رکھا ہے آپ کو یہی سمجھانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو آج بھی نفع ہو۔ مگر نفع جو نہیں ہو رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کام ترتیب سے نہیں ہو رہا ہے تصوف حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس آتے ہیں لیکن میں جب طہارت اور نماز کے مسائل بیان کرتا ہوں تو اس کو خلاف تصوف سمجھتے ہیں۔ اسی بات کو میں نے پہلے بھی بیان کیا تھا کہ تمہاری ترقی تو صرف فرائض پر عمل کرنے سے ہو جائے لیکن جب کہ اس کو اعتقاد کے ساتھ ادا کرو تب اور خدا کے فریضے کے ساتھ بد عقیدگی رکھو اور اس کو کم سمجھو اور نوافل میں بزرگی کا یقین کرو تو کچھ نہ ملے گا۔ لوگوں کے اس حال کو ایک بزرگ نے اس طرح بیان فرمایا ہے

ہر گاہ شیطان لعین برین جماعت چیرہ دست می شود و بمقتضائے
وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ
آنہا را از راہ حق دور تر می برد۔ نماز را مثل بیگار سرکار حاکم

وقت می دانند و ایں قدر وقت را کہ در نماز و وضو می گذارند رائیگاں
می انگارند و کار آمدن خود نمی دانند۔ معاذ اللہ من ذالک

صراط مستقیم ص۴۹

جس وقت کہ شیطان لعین اس جماعت پر (یعنی ان نامقبول کی جماعت پر جن کا طریقہ یہ ہے کہ مشائخ کے وظائف کا تو اہتمام کرتے ہیں لیکن فرض نماز کا اہتمام اس کا سواں حصہ بھی نہیں کرتے قابو پالیتا ہے تو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان کے بھائی گمراہی میں ان کو دور تک کھینچ لے جاتے ہیں اور اس میں کوتاہی نہیں کرتے شیطان ان لوگوں کو بھی راہ حق سے بہت دور لے جاتا ہے جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ پھر یہ لوگ فرض نماز کو بھی سرکار حاکم وقت کی بیگار سمجھتے ہیں اور جتنا وقت کہ ان کا وضو اور نماز میں گزرتا ہے اس کو ضائع اور بیکار سمجھتے ہیں۔ معاذ اللہ۔

اس کو کہہ رہا ہوں کہ جب وضو اور نماز کے ساتھ یہ معاملہ رکھو گے تو پھر اس سے فیض کیا خاک ملے گا۔ اور اس کی برکات آپ کو کیا حاصل ہوں گی، اس زمانہ میں عام حالات لوگوں کے یہی دیکھ رہا ہوں کہ نماز سے غافل ہیں اور طہارت سے جاہل ہیں حالانکہ وہ نماز کا مقدمہ ہے۔ آدمی نماز کیلئے اٹھتا ہے تو پہلے وضو کرتا ہے اور اس وقت اگر پیشاب وغیرہ کا تقاضا ہوا تو اس سے بھی فراغت حاصل کرتا ہے۔ پس جس طرح سے نماز پڑھنے میں اس کو ثواب ملتا ہے اسی طرح سے وضو اور غسل کرنے میں ثواب ملتا ہے بالکل اسی طرح سے حقیقی اور حکمی نجاسات سے بدن اور کپڑے وغیرہ کو پاک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے۔ جس طرح سے علمائے باطن نے رذائل کی گندگیوں سے قلب کے طاہر کرنے کا طریقہ سکھلایا۔ اسی طرح سے علمائے ظاہر نے طہارت وغیرہ کے مسائل کتابوں میں مدون فرمائے اسی کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ حضرات صوفیہ نے تصحیح اخلاص و احسان میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی نیابت فرمائی اور حضرات فقہاء تصحیح طاعات مقربہ میں انبیاء علیہم السلام کے نائب ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے نماز روزہ، زکوٰۃ، حج اور طہارت کے مسائل سے امت کو روشناس کرایا اور اس میں شک نہیں کہ اگر پاکی و ناپاکی کے مسائل اللہ و رسول کی طرف سے نہ بیان کئے جاتے تو بندوں کے لئے قلبی اور باطنی طہارت تو الگ رہی ظاہری طہارت یعنی اپنے بدن اور کپڑے کے پاک کرنے کا طریقہ بھی انسان کو نہ معلوم ہوتا چنانچہ جو لوگ اللہ و رسول اور شریعت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے احکام کو نہیں مانتے انھیں دیکھتا ہوں کہ بالکل گندے ہی رہ جاتے ہیں اور بجائے تطہیر کے تلویث ہی میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے حضرت شاہ صاحب نے

بعثت انبیاء کو اجل نعم فرمایا ہے کہ آپ نے جس طرح سے اخلاق اور امور باطن کی تعلیم دیکر ہمارے قلوب کا تزکیہ فرمایا اسی طرح سے نجاست اور طہارت کی تفصیلات کو بیان فرماکر ہمارے ظاہر کو بھی طاہر کر دیا۔ جب انسان کا ظاہر پاک ہوتا ہے تو اُس کا اثر اُس کے باطن پر بھی پڑتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ تم وضو سے پہلے اپنے قلب کو دیکھو اور پھر وضو کرنے کے بعد اپنے باطن میں غور کرو تو اپنے اندر ایک نور محسوس کروگے چنانچہ یہ سب مشاہدہ ہے کہ آپ وضو کر لیجئے تو اُس کی وجہ سے اپنے قلب میں ایک قسم کا انشراح پائیے گا۔

چونکہ اللہ و رسول نے طہارت پر زور دیا ہے اس لئے میں بھی ان امور کی جانب آپ لوگوں کو متوجہ کرتا ہوں اور علماء سے کہتا ہوں کہ وعظ میں ان چیزوں کو کیوں نہیں بیان کرتے۔ لوگوں کو طہارت کے مسائل سکھاؤ۔ ان کی طہارت ٹھیک ہو جائے گی تو نماز بھی ٹھیک ہو جائے گی، اور جب نماز ٹھیک ہو جائے گی تو پورا دین درست ہو جائے گا اور اگر ابتدا ہی درست نہیں ہوگی تو انتہا کی درستی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ انسان پر بالغ ہونے کے بعد سب سے پہلا فریضہ طہارت ہی کا عائد ہوتا ہے جو کہ نماز پر بھی مقدم ہے۔ اب اگر آپ اپنے لڑکے لڑکیوں کو نجاست کی اقسام اور طہارت کے احکام نہ سکھائیں گے تو وہ خدا کے دربار میں پاک ہوکر کھڑے تک نہ ہو سکیں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ یعنی تم میں کا ہر شخص نگہبان ہے۔ اور ہر شخص سے اس کے متعلقین کے بارے میں سوال ہوگا۔

اس حدیث کی رو سے ہم سب مکلف ہیں کہ اپنی اولاد کو نماز اور طہارت کے مسائل بچپن ہی میں سکھائیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ

اذا بلغ اولادکم سبع سنین فعلموھم الصلوٰۃ۔

واذا بلغوا عشر سنین فاضربوھم علیہا وفرقوا بینھم فی المضاجع۔

یعنی جب تمہاری اولاد سات برس کی ہو جائے تو اس کو نماز سکھاؤ اور جب دس برس کی ہو جائے تو اس کو نماز کے ترک کرنے پر سزا دو اور سونے میں انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرو یعنی الگ الگ سلاؤ۔ بذل المجہود میں ہے فرقوا بینھم فی المضاجع۔

ای فرقوا بین الاخ والاخت مثلاً فی المضاجع

لئلا یقعوا فیما لا ینبغی لان بلوغ العشر مظنۃ الشہوہ

(بذل صفحہ ۲۷۸ جلد ۱)

یعنی بھائی کو بہن سے اور لڑکے کو ماں سے اور لڑکی کو باپ سے بلکہ ایک بھائی کو بھی دوسرے بھائی سے الگ سلاؤ) تاکہ کسی نامناسب حال میں نہ واقع ہوجائیں اس لئے کہ دس سال کی عمر میں شہوت پیدا ہوجایا کرتی ہے۔

اس حدیث میں تو صرف نماز ہی کا حکم دیا گیا ہے لیکن فقہاء نے اور دیگر احکام کا بھی یہی حکم بیان کیا ہے۔ چنانچہ مراقی الفلاح میں ہے کہ تؤمر بها الاولاد لسبع سنين وتضرب عليها لعشر ليتدلو بخشيته۔ (مراقی الفلاح صـ۹۳)

یعنی اولاد کو نماز کا حکم کیا جائے گا جب کہ وہ سات برس کی ہوجائے۔ اور اس کو مارا جائے گا جبکہ وہ دس برس کی ہوجائے لیکن ہاتھ سے مارے لکڑی وغیرہ سے نہیں۔ دیکھئے نماز کے ترک کرنے پر یہاں اولاد کو مارنے کا حکم ہے لیکن شریعت میں اس کی بھی حدیں مقرر ہیں۔ چنانچہ فقہاء فرماتے ہیں کہ ہاتھ سے مارے لکڑی وغیرہ سے نہیں، لیکن آج ہمارا یہ حال ہے کہ یا تو اولاد کی جانب سے بالکل غفلت ہی برتیں گے یا تربیت پر اتر آئیں گے تو پھر لکڑی، ڈنڈا، چھڑی چھاتا جو بھی سامنے آیا اسی سے مارنا شروع کردیں گے اور یہ نہ دیکھیں گے کہ ناک ٹوٹ گئی یا کان پھٹ گیا یا چہرہ زخمی ہوگیا۔ چنانچہ ایک مدرس کو دیکھا کہ ظالم بچوں کو دانت سے کاٹ لیتا تھا۔ یہ صریح ظلم ہے اور اس کا مصداق ہے کہ

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یہاں مراقی الفلاح میں تو صرف نماز کا حکم بیان فرمایا ہے اس کے تحت طحطاوی میں ہے کہ تؤمر بها الاولاد ذكوراً واناثا والصوم كالصلوة وفي الدر انه يؤمر بالصوم والصلوة وينهى عن شرب الخمر ويتالف الخير وليعرض عن الشر والظاهر منه ان هذا واجب على الولي۔

(طحطاوی صـ۹۳)

یعنی اولاد کو نماز کا حکم کیا جائے گا خواہ لڑکا ہو یا لڑکی اور روزہ کا بھی حکم مثل نماز کے ہے اور درمختار میں ہے کہ بچوں کو نماز روزہ کا حکم کیا جائے گا اور شراب وغیرہ کے پینے سے روکا جائے گا اور خیر کی ان کو رغبت دلائی جائے گی اور برائیوں سے ان کو منع کیا جائے گا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ سب امور ولی پر واجب ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جب نماز کی تاکید ولی کے ذمہ ہے تو طہارت کی تعلیم بدرجۂ اولیٰ واجب ہوگی

اس لئے کہ نماز بغیر طہارت کے صحیح نہیں ہوتی۔ اسی کو کہتا ہوں کہ اولیاء کے ذمہ یہ سب چیزیں لازم ہیں۔ اب خواہ وہ خود سکھائیں یا کسی معلم کا انتظام کریں۔

اسلاف میں ترویج دین کا یہی طریقہ تھا کہ لوگ اپنے باپ دادا سے نماز اور طہارت کے مسائل سیکھتے تھے۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں ہے کہ

> عوام کی یہ حالت تھی کہ لوگ طریقۂ وضو اور غسل اور نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام اپنے باپ دادا سے (یعنی اپنے گھر ہی میں) سیکھتے تھے یا شہر کے معلمین سے سیکھ کر اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔
>
> (صفحہ ۱۵۴ جلد ۱)

میں کہتا ہوں کہ معلمین سے زیادہ ذمہ داری والدین اور اولیاء پر ہے۔ پس اگر یہ لوگ اگر اولاد کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ اور جس طرح خود نہ عمل کرنے سے فاسق ہوں گے اسی طرح سے اولاد کی تعلیم و تربیت جو ان پر فرض کی گئی ہے نہ کرنے سے فاسق گردانے جائیں گے۔

آج یہ ہمارے لڑکے جو نماز سے بھاگتے اور جان چراتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل یہ وضو اور غسل سے گھبراتے ہیں۔ اس کی اہمیت دلوں میں نہیں ہوتی اور ضرورت غسل کی ہوتی ہے کہتے ہیں کہ کون غسل کرے اور اگر صبح کا وقت اور سردی کا زمانہ ہوا تو پھر ایسے وقت میں نہانا پورا مجاہدہ ہی ہے۔ جس پر عمل بدون شریعت پر ایمان کے اور اللہ اور رسول کی عظمت کے مشکل ہے اب ہر شخص تو امام محمدؒ ہو نہیں سکتا پھر جب احکام سے بھی ناواقف ہوگا اور قلوب میں شریعت کی عظمت بھی نہ ہوگی تو ظاہر ہے کہ آج ایک عمل کو چھوڑ دے گا کل دوسرے عمل کو اسی طرح چھوڑتے چھوڑتے ترک کی خو اور بدعملی کی عادت ہو جائے گی جس کا ترک پھر آسان نہ ہوگا لیکن تعلیم و تربیت کے ذریعہ اگر کسی کے قلب میں اللہ و رسول کی محبت اور احکام شرع کی عظمت پیدا ہو چکی ہوتی ہے تو پھر وہ وقت پر کام بنا دیتی ہے۔ جیسا کہ میں نے ایک مولوی صاحب کا واقعہ آپ کو بارہا سنایا کہ وہ ریل پر سفر کر رہے تھے۔ غسل کی ضرورت پیش آئی نماز کا وقت آگیا انھیں بڑی فکر لاحق ہوئی کہ یا اللہ کیا کروں کیسے نماز پڑھوں۔ بالآخر ایک تدبیر ذہن میں آئی وہ یہ کہ جب گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھہری تو انھوں نے ایک بہشتی سے کہا کہ میں لنگی پہن کر پلیٹ فارم بیٹھ جاتا ہوں تو میرے اوپر مشک سے پانی ڈال دے۔ اس طرح سے غسل کر کے ریل کے اندر آکر کپڑے بدل لئے اور پھر نماز ادا کی

اپنے اس واقعہ کو حضرت مولاناؒ سے بیان کر کے یہ کہتے تھے کہ حضرت اس نماز میں مجھے جتنا لطف آیا اور جیسی لذت ملی وہ کبھی نہیں ملی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ لذت احکام الٰہی کے امتثال کی تھی اللہ تعالیٰ کے حکم پر مجاہدہ کر کے انھوں نے عمل کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسی دنیا میں اس کا صلہ اور بدلہ بھی عطا فرمادیا کہ ان کو اس نماز میں اتنا لطف و مزہ آیا۔ یہ تو محض دنیاوی صلہ تھا۔ اور آخرت میں جو اجر ملے گا وہ اس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ یہ اس پر سنا رہا ہوں کہ جب احکام شرع کی عظمت تیرے میں ہوگی تبھی اس پر عمل ہو سکے گا۔ اگر احکام خداوندی کا اہتمام کروگے تو فرشتوں سے بڑھ سکتے ہو اور احکام میں سب سے پہلا درجہ طہارت ہی کا ہے میں تو ان نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ دیکھو تم اسی میں فیل ہوتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جب نماز کو فرض کیا اور طہارت کو اس کے لئے شرط قرار دیا تو جس طرح نماز ضروری ہے طہارت کا سیکھنا ضروری ہے۔ اسی قید کو یہ لوگ دشوار سمجھتے ہیں ورنہ اگر یہ وضو اور غسل کی قید ہٹادی جائے تو یہ لوگ نماز خوب بے وضو ٹرخائیں۔ اس بے وضو ٹرخانے پر ایک قصہ سنئے۔ ایک عالم نے کسی دیہاتی سے کہا کہ تم چالیس دن نماز پڑھو تو ہم تم کو ایک بھینس دیں گے۔ چالیس دن پورے کر کے مولوی صاحب کے پاس آیا اور بھینس کا طالب ہوا۔

مولوی صاحب نے کہا کہ بھائی بھینس وینس کہاں ہے۔ میں نے تو تمھیں پابند نماز بنانے کے لئے ایسا کہا تھا اور یہ سمجھا تھا کہ چالیس دن کے بعد تم کو نماز سے تعلق ہوجائے گا پھر بھینس وغیرہ کا تمھیں خیال بھی نہ ہوگا بلکہ بجائے مجھ سے طلب کرنے کے تم خود مجھے بھینس دوگے۔ اس نے جب مولوی صاحب کا یہ جواب سنا تو کہا کہ اچھا مولوی صاحب تو پھر سن لو کہ میں نے بھی بلا وضو ہی ٹرخائی ہے۔

دیکھا آپ نے ظالم نے بے وضو ہی نماز پڑھی تھی۔ اور اس پر آیا تھا مولوی صاحب سے بھینس لینے کے لئے۔ مولوی صاحب نے تو وعدہ نماز پڑھنے پر کیا تھا اور وضو کے بغیر نماز ہی کب بنتی ہے جو وعدہ کہ نماز پر تھا اس کو ان مولوی صاحب سے بلا نماز ہی کے لینا چاہتا تھا۔

اور جس طرح سے یہاں یہ شخص شرط کو فوت کر کے مشروط اور جزا کا طالب ہو رہا تھا۔ اسی طرح سے ایک اور صاحب کا واقعہ ہے وہ یہ کہ ــــ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے چالیس دن عبادت کرتا ہے تو اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری فرمادیتے ہیں۔

ایک شخص نے یہ حدیث سن کر عبادت کرنی شروع کی چالیس دن پورے ہوگئے مگر حکمت کے

چشمے جاری نہیں ہوئے کسی عارف سے اس کو بیان کیا کہ حدیث شریف میں تو یہ آتا ہے۔ اور میں نے عبادت کی مگر اس کے ثمرہ سے محروم ہوں کیا بات ہے؟۔ انھوں نے فرمایا کہ حدیث بالکل صحیح ہے اس پر شبہہ نہ کرو۔ اس میں تو یہ آتا ہے کہ اخلص للّٰہ اربعین صباحاً یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے چالیس دن اخلاص کے ساتھ عبادت کرے تب ایسا ہوگا اور تم نے تو یہ عبادت حکمت کے چشمے جاری کرانے کے لئے کی تھی یہ اخلاص تو نہ ہوا پس جب شرط نہیں پائی گئی تو پھر اس پر جزا کا اثر تب کیسے ہو میں کہتا ہوں کہ ہوشیار لوگ ہیں کام نہیں کرنا چاہتے ہیں اور اُجرت اس پر پوری چاہتے ہیں۔ آج کل کے لوگوں کا عام حال یہی ہے باقی بدون طہارت کے نماز پڑھ لینا یہ تو بڑی ہی بددینی کی بات ہے۔

ایک دفعہ میں نے ایک شخص سے کہا کہ چلو نماز پڑھو وہ میرے ساتھ مسجد گیا اور نماز پڑھ لی بعد میں مجھ سے کہا کہ میں آپ کے کہنے کی وجہ سے اس وقت مسجد چلا گیا تھا۔ لیکن میں اس وقت ناپاک تھا اور مجھے غسل کی حاجت تھی میں نے یہ سن کر اس سے کہا کہ اب میں تجھے کہوں یا اپنے کو کہوں مجھے اگر یہ معلوم ہوتا تو کبھی تجھ سے نہ کہتا اور اگر تو نے ایسا کر لیا تھا تو مجھ سے کیوں کہا چھپا ہی لیتا۔ اور اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کر لیتا۔ ایسے لوگ اس زمانہ میں بہت ہیں کہ دین اور دیانت میں کمی اور مسائل شرعیہ سے جہالت کے سبب ایسے ایسے امور کا ارتکاب کر لیتے ہیں کہ فقہا کے نزدیک ان کے لئے سخت حکم ہے۔

اور یہ دیانت علم سے الگ ایک شئے ہے ہو سکتا ہے کہ آدمی جاہل ہو اور متدین ہو اور عالم ہو مگر اس میں تدین نہ ہو۔ ایک عالم ایک دوسرے اہل علم کے متعلق یہ کہتے تھے کہ میں ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا حالانکہ وہ ان کے استاد تھے مگر کہتے تھے کہ مجھے ان کا اعتبار نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نماز بلا وضو ہی پڑھا دیں سن کر حیرت ہوتی تھی کہ ایک شخص عالم ہے مگر دیانت کی کمی کی وجہ سے لوگوں کو ان پر اعتماد نہیں اور ان کا اعتبار نہیں۔ ان کی جانب سے اندیشہ کرتے ہیں کہ کہیں بلا وضو ہی نہ مصلے پر کھڑے ہو جائیں۔ توبہ توبہ

یہ سب دیانت کی کمی کا نتیجہ ہے اور قلب میں شریعت کی تعظیم نہ ہونے کا ثمرہ اسی لئے کہتا ہوں کہ طہارت کا اہتمام قلب میں پیدا نہیں ہوگا جب تک کہ ابتدا ہی سے اسے نہ سکھاؤ گے۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ نوجوان نماز سے جو بھاگتے ہیں تو وضو اور غسل (یعنی طہارت) کی قید کی وجہ سے۔ نماز ان پر اتنی دشوار نہیں ہے۔ جتنی کہ اس کی شرائط ان پر شاق ہیں۔ انھیں میں سے ایک شرط طہارت بھی ہے

وہ بھی ان پر شاق ہوتی ہے۔ اور یہ شاق اس لئے ہوتی ہے کہ بچپن سے ان کو اس کی ترغیب اور تربیت نہیں سنائی جاتی۔ حالانکہ ابھی آپ نے سنا کہ قبر میں سب سے پہلے طہارت ہی کا سوال ہوگا اور عام طور سے عذاب قبرستانِ طہارت کے عدم اعتنا اور نجاست سے احتراز کرنے میں لاپرواہی کے سبب سے ہوتا ہے۔ خاص کر پیشاب وغیرہ سے احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے۔ آپ جب اس قسم کے مضامین لوگوں کو سنائیے گا تو ان کے قلب میں اس کی اہمیت کس طرح پیدا ہوگی۔ اور آپ سے کہتا ہوں کہ حدیث شریف میں یہ جو آتا ہے کہ قبر میں پہلا سوال طہارت کے متعلق ہوگا تو یہ کہ قبر کا سوال اور اس کا عذاب حق ہے۔ لیکن اس زمانہ میں چونکہ دین کی تعلیمات اور شریعت کی عظمت میں کمی ہوگئی طبیعتوں میں آزادی آگئی ہے۔ اس لئے آخرت کا انکار عذاب قبر کا انکار اگر ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں۔

ایک مولوی صاحب تھے ان سے ایک انگریزی داں نے کہا کہ مجھے عذاب قبر کے بارے میں کچھ شبہ ہے مجھے اس کو سمجھا دیجئے وہ مولوی صاحب بے چارے رونے لگے کہ یا اللہ اس کو کیسے سمجھاؤں۔ پس جب یہ عذاب قبر کا منکر ہے تو دوزخ کے عذاب اور آخرت کے واقعات پر بھی اس کو انکار ہوگا۔ اتنے میں ایک اور صوفی صاحب جو اُن کے ملنے والے تھے آگئے تو ان مولوی صاحب نے صوفی صاحب سے کہا کہ یہ شخص عذابِ قبر کو نہیں مانتا آپ ہی اس کو کچھ سمجھا دیجئے۔ صوفی صاحب نے اس شخص سے کہا کہ ہاں میں تمہیں عذاب قبر سمجھا سکتا ہوں۔ بلکہ دکھا سکتا ہوں مگر جاؤ نہا دھو کر کپڑے بدل کر آؤ لیکن ایک بات یہ بھی سمجھ لو کہ میں تمہیں عذابِ قبر کا مشاہدہ کرا تو دوں گا مگر ہو سکتا ہے کہ تم وہاں سے زندہ واپس نہ آؤ یہ سن کر وہ شخص ڈر گیا اور ان کے ساتھ قبرستان جانے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اپنی بدعقیدگی سے توبہ کی اور انھیں سے کہا کہ بیعت کر لیجئے۔ چنانچہ انھوں نے بیعت کر لیا اور ان مولوی صاحب نے بھی اُن کا ہاتھ پکڑ لیا کہ نہایت مبارک بیعت ہے انھوں نے ایک شخص کے ایمان کو درست کر دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اس کا نمونہ دکھاتے رہتے ہیں تاکہ منکرین کو ایمان کی توفیق ہو اور مؤمنین کی تصدیق میں اضافہ ہو۔ ابھی چند روز ہوئے میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا تھا لکھا تھا کہ "

عذاب قبر اور آخرت میں عذاب نار کے ڈر سے رونگٹے کانپنے لگتے ہیں
اور وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ ابھی دس بارہ دن ہو رہے ہیں کہ ہمارے
دیار کے ایک گاؤں میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ ایک عورت مر گئی اس کو

دفنانے کے لئے جب لوگوں نے قبر کھودی تو اس کے اندر ایک اژدھا سانپ موجود دیکھا اس قبر کو چھوڑ کر دوسری قبر کچھ فاصلہ پر کھودی وہاں بھی جب میت کو لے جاکر رکھنا چاہا تو اس دوسری قبر کے اندر بھی اژدھا دیکھا گیا۔ لوگ اس گاؤں کے ایک مستان صاحب کے پاس گئے اور اُنسے دریافت کیا کہ اب کیا کیا جائے انھوں نے لوگوں سے عورت کے خصائل کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ عورت اپنے شوہر کو بہت گالی دیا کرتی تھی اور لوگوں کو بھی کوسا کرتی تھی بہت بدزبان تھی اس پر مستان صاحب نے مشورہ دیا کہ سب لوگ مل کر اس کی مغفرت کی دعا کریں تاکہ اس کو عذاب قبر سے نجات ملے اور کچھ دور پر تیسری قبر کھودیں چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ مگر اس میت کو قبر کے اندر جب قبلہ رخ پھیرنے لگے تو وہاں بھی دیکھا گیا کہ اس عورت کے منھ کو اژدھا سانپ پکڑے ہوئے ہے یہ دیکھ کر لوگ جلدی سے قبر بند کر کے چلے آئے۔

دیکھا آپ نے ایسے ایسے واقعات اس زمانے میں بھی ہوتے رہتے ہیں جن سے اللہ اور رسول کے ارشادات کی تصدیق ہوتی ہے۔ انھیں ارشادات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قبر میں سب سے پہلے طہارت کا سوال ہوگا اس لئے کہتا ہوں کہ اپنی اولاد کو سب سے پہلے طہارت سکھلادو۔

اللہ تعالیٰ کے احکام طہارت سے متعلق بھی ہیں۔ اگر ان احکام کو ادا کروگے تو قرب حاصل ہوگا میں پہلے کہتا تھا کہ یہ راستہ بدنی نہیں ہے۔ مگر اب کہتا ہوں کہ نہیں بدنی بھی ہے اس لئے کہ ہم بشر ہیں ہمارے بدن کے بھی بہت سے تقاضے ہیں۔ اُن کے متعلق خدائی احکام ہیں مثلاً پیشاب پاخانہ سے طہارت حاصل کرنا وضو اور غسل کی حاجت ہونا اور پھر اس نجاست حکمی سے اپنے کو پاک کرنا اور ان کے احکام سے واقف ہونا تاکہ خدا اور رسول کے مرضی کے مطابق ہم پاک اور طاہر رہ سکیں۔ ہمارے لئے یہ ضروری ہے۔ اس کے لئے ہمیں شریعت کے احکام اور فقہاء امت نے اس کی جو تفاصیل بیان فرمائی ہیں ان کا جاننا ضروری ہے اگر حکم شرع سے تجاوز ہوگا تو وہ اللہ اور رسول کو پسند نہ ہوگا۔

ایک مولانا صاحب بیمار ہوئے۔ ایک دوسرے مولانا صاحب جو ان کے عزیز اور ساتھی تھے ان کی عیادت کو گئے دیکھا کہ باوجود عذر شرعی کے وہ بجائے تیمم کے وضو کر رہے ہیں انھوں نے ادب کے ساتھ ٹوکا اور کہا کہ آپ تیمم کیوں نہیں فرما رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تیسیر سے فائدہ نہیں

اظہار ہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم تیمم نازل کرنے کے بعد یہ فرمایا ہے کہ (یُرِیدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیدُ بِکُمُ الْعُسْرَ) یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے دشواری کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کے باوجود آپ جو وضو فرما رہے ہیں تو اپنے قلب میں غور کیجئے اس کی وجہ یہ ہوگی کہ آپ تیمم کو طہارت ناقصہ سمجھتے ہوں گے یہ چور ہوگا۔ حالانکہ ہمارے نزدیک وہ بھی طہارت کاملہ ہی ہے اور وضو کا کامل خلیفہ ہے۔ اس کے بعد سے ان مولوی صاحب نے تیمم کرنا شروع کر دیا۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ بزرگی شریعت سے الگ ہو کر کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اتباع شریعت میں بزرگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تقرب حاصل کرنے کا راستہ شریعت ہی ہے جو لوگ شریعت میں اور طریقت میں فرق کرتے ہیں وہ انتہائی جہالت کی بات کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا ایسا کہنا کفر ہے حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ فقہ میں کتاب مالابد لکھی ہے۔ اس کے آخر میں کتاب الاحسان کا بھی ایک عنوان قائم فرمایا ہے اور اس طرز میں یہ منفرد ہیں کہ فقہ اور احسان (یعنی شریعت اور طریقت) کو جمع کر کے ایک ہی جگہ بیان فرمایا وہ تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"بدان اسعدک اللہ تعالیٰ ایں ہمہ کہ گفتہ شدہ صورت ایمان و اسلام و شریعت ست و مغز حقیقت او را در خدمت درویشاں باید جست و خیال نباید کرد کہ حقیقت خلاف شریعت ست کہ ایں سخن جہل و کفر ست بلکہ ہمیں شریعت ست کہ در خدمت درویشان چوں قلب از تعلق علمی وحبی کہ بماسوی اللہ داشت پاک شود و رذائل نفس برطرف گشتہ نفس مطمئنہ شود و اخلاص بہم رساند شریعت در حق او با مغز شود نماز او عند اللہ تعلق دیگر بہم رساند و دو رکعت او بہتر از لک رکعت دیگران باشد و ہمچنیں صوم او و صدقہ او۔

(مالابد صفحہ ۱۷۲)

یعنی جانو اللہ تعالیٰ تمہیں نیک بخت بنائے یہ جو کچھ بیان کیا گیا۔ ایمان اور اسلام اور شریعت کی صورت تھی۔ باقی اس کا مغز اور اس کی حقیقت درویشوں کی صحبت میں تلاش کرنا چاہئے اور خیال بھی نہ کرنا چاہئے کہ حقیقت (یعنی بزرگی اور تصوف) شریعت کے خلاف کوئی چیز ہے کیونکہ ایسا کہنا کفر اور جہالت ہے بلکہ یہی شریعت ہی ہے کہ بزرگوں کی خدمت میں رہنے کے بعد جب قلب اس تعلق علمی

وجہ سے پاک ہوجاتا ہے جو ماسوا اللہ کے ساتھ رکھتا ہے اور نفس کے رذائل دور ہو کر نفس مطمئنہ ہوجاتا ہے اور اخلاص کامل اس کو حاصل ہوجاتا ہے تو پھر یہی شریعت اس کے حق میں بامغز ہوجاتی ہے اور پھر اس کی نماز اللہ تعالیٰ سے دوسرے ہی نوع کا تعلق پیدا کردیتی ہے (جس کی وجہ سے) اب اس کی دو رکعت دوسروں کی لاکھ رکعت سے بڑھ کر ہوتی ہے یہی حال اس کے صوم اور صدقہ کا بھی ہوجاتا ہے۔

پس طریقت اور حقیقت کو شریعت کے خلاف سمجھنا گمراہی کی بات ہے۔ اگر شریعت کی اتباع نہیں کروگے تو خدا تک نہیں پہنچ سکوگے۔

جن کو آپ آج بزرگ سمجھتے ہیں وہ لوگ اسی وجہ سے ہوئے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کے احکام کا احترام کیا۔ چنانچہ اسی راستہ سے وہ لوگ خدا تعالیٰ تک پہنچتے ہیں یعنی نماز و طہارت کا ہی پورا اہتمام کیا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دو ملفوظات سنئے۔

۱۔ فرمایا کہ ایک وقت ہم اور خواجہ اجل بیٹھے تھے۔ نماز مغرب کا وقت تھا۔ خواجہ تازہ وضو کرتے تھے۔ انگلیوں میں خلال کرنا ان سے سہواً فراموش ہوگیا۔ ہاتف غیبی نے آواز دی اور ان کے کان مبارک میں کہا اے اجل ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دوستی کا دعویٰ کرتے ہو اور انکی امت سے کہلاتے ہو اور ان کی سنت کو تم نے ترک کیا اس کے بعد خواجہ اجل نے قسم کھائی کہ جس دن سے میں نے ندا سنی موت کے وقت تک کوئی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے متروک نہ ہوگی۔ پھر فرمایا کہ میں نے ایک وقت خواجہ اجل کو انتہا متردد دیکھا اور پوچھا کیا حال ہے۔ فرمایا کہ جس روز سے انگلیوں کا خلال مجھ سے فوت ہوا ہے مجھ کو حیرت ہے کہ کل کے روز قیامت میں یہ منہ خواجہ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں کر دکھاؤں گا۔

ف ۔ دیکھئے خلال کے ترک پر اور وہ سہواً پھر سنت موکدہ بھی نہیں صرف مستحب۔ کس قدر قلق ہوا۔ اس سے ان حضرات کے احترام شرع کا اندازہ لگتا ہے ۔ فرمایا کہ خواجہ فضیل بن عیاض وضو کے وقت دوبارہ ہاتھ دھونا بھول گئے اور نماز ادا کی۔ اسی رات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ حضرت نے فرمایا کہ اے فضیل بن عیاض تعجب کی بات ہے کہ وضو میں تجھ سے نقصان واقع ہو۔ خواجہ مارے ہیبت کے نیند سے جاگ اٹھے اور از سر نو تازہ وضو کیا اور اس جرم کے کفارہ میں پانچسو رکعت نماز پڑھنی ایک برس تک اپنے اوپر واجب کیں۔

ف۔ اول تو یہ تکرار فرض وواجب نہ تھا۔ دوسرے سہواً یہ کوتاہی ہوگئی تھی۔ اس لئے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد درجہ ناخوشی میں نہ تھا مگر پھر بھی ان پر کس قدر اثر ہوا۔ اس سے زیادہ شریعت کا کیا اہتمام ہوگا۔

یہ واقعات بزرگوں کے میں نے اس پر سنائے کہ راستہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا یہی شریعت ہے جس کا اہم اور اقدم شعبہ طہارت ہے۔

حدیث شریف میں تو یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ الطھور شطر الایمان طہارت آدھا ایمان ہے اس لئے آپ لوگ جب میرے پاس آتے ہیں تو خدا اور رسول کا حکم سمجھ کر دین و دیانت کی جو بات سمجھ میں آتی ہے بتاتا ہوں۔ اگر آپ لوگ اس کو بزرگی اور تصوف نہیں سمجھتے تو جائیے جہاں سے تصوف اور بزرگی ملے حاصل کر لیجئے میرے پاس کیوں آتے ہیں اور یہ میں طہارت وغیرہ پر زور اس لئے دے رہا ہوں کہ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہمیں کچھ بتاؤ۔ ہم کیا کریں کہ کامیاب ہوجائیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اطمینان دل میں آجائے اس کے لئے کوئی طریقہ بتاؤ۔ اس قسم کے سوالات کے جواب میں یہی کہتا ہوں کہ ہم کو جو معلوم ہے وہ تو یہی ہے کہ ان سب چیزوں کے حاصل کرنیکا ذریعہ دین اور شریعت پر عمل کرنا ہے اور اس میں سب سے پہلی چیز طہارت ہے۔

آج جو ہر شخص آسیب کی شکایت کرتا ہے جس کو دیکھو مبتلائے آسیب ہے تو اس کے بارے میں بھی یہی کہتا ہوں کہ جب تم پاکی ناپاکی کو نہ پہچانو گے۔ تمہاری عورتیں اور تمہارے بچے اس کے احکام کو نہ جانیں گے اور تم اس طرح سے ظاہری اور جسمانی اعتبار سے بھی نجس اور گندے رہو گے تو الجنس یمیل الی الجنس تمہارے پاس آسیب نہ آئے گا تو کیا فرشتہ آئے گا۔ بلکہ کبھی کبھی یہ کہہ دیتا ہوں کہ تمہارے پاس آسیب وغیرہ نہیں آتا۔ بلکہ تم خود آسیب ہوگئے ہو۔ جسکو چمٹ جاؤ اس کا ناس مار دو، پیروں کے پاس پہنچ جاتے ہو نہ خود کچھ کام کرتے ہو نہ ان کو کرنے دیتے ہو شریعت پر کیوں نہیں آتے ہو۔ دین اختیار کرو۔ ذکر و تلاوت۔ نماز و طہارت اختیار کرو۔ دیکھو قلب میں روشنی اور نور پیدا ہوجاتا ہے یا نہیں اور اگر ان سب باتوں کو کرنا ہی نہ چاہو تو اس کا کیا علاج ہے۔

آج مسلمانوں کی دینی بے عملی اور جہالت کے پیش نظر یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ اور قرب حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلی چیز طہارت ہے۔ بزرگوں نے تو اور کچھ فرمایا ہے اور وہ غلط بھی نہیں ہے۔ کسی وجہ سے انھوں نے ایسا فرمایا ہے چنانچہ فتوح الغیب میں ہے کہ

قال رضی اللہ عنہ سألنی رجل شیخ فی المنام فقال ای شیٔ یتقرب بہ العبد الی اللہ تعالیٰ فقلت و لذلک ابتداء و انتہاء فابتداء الورع وانتہاؤہ الرضاء والتسلیم والتوکل۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھ سے ایک بوڑھے آدمی نے خواب میں دریافت کیا کہ وہ کون سی چیز ہے جس کے سبب بندہ اللہ کا تقرب حاصل کرتا ہے میں نے اس کے جواب میں کہا کہ جس چیز سے حق تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے اس کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا ہے ابتدا اس کی ورع اور تقویٰ ہے جو کہ نام ہے بقدر امکان محرمات اور مکروہات سے بچنے کا اور اس کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر بندہ راضی رہے اور اللہ تعالیٰ اپنے ارادے سے جو امور واقع فرمائیں اپنے کو ان پر ڈال دے اور اپنے کاموں کو حق تعالیٰ پر چھوڑ دے۔

حضرت جیلانی قدس سرہٗ بڑے شخص ہیں انھوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اپنے مرتبہ اور اس زمانے کے لوگوں کے حالات کے مطابق تھا اس لئے کہ لوگ اس وقت بزرگوں کے پاس جو جاتے تھے تو اس حال میں کہ اپنے ظاہر کو شریعت کا پابند بنائے ہوئے ہوتے تھے یعنی نماز روزہ اور طہارت وغیرہ جو کہ بنیادی اور ابتدائی چیزیں ہیں ان سب کو سیکھنے اور ان کو عمل میں لانے کے بعد تب بزرگوں کی خدمت میں اللہ تعالیٰ کا راستہ حاصل کرنے کے لئے جاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے فرمایا کہ بھائی طریق میں پہلی چیز ورع اور تقویٰ ہے۔ یعنی مکروہات اور محرمات سے اپنے کو بچانا اور اب اس زمانہ میں خیر القرون سے دوری کے سبب سے اس قدر جہالت ہوگئی ہے کہ شریعت کا ادب و احترام ہی قلوب سے نکل چکا ہے جس کے سبب سے ہماری ظاہری نماز روزہ بلکہ طہارت بھی درست نہیں ہے اس لئے اب اس زمانہ میں اور ان حالات میں جب کوئی شخص راہ خدا کا طالب ہو تو اول اسے طہارت اور ظاہر شریعت کو درست کرنے کو کہا جائے گا اس لئے کہ کوئی کام ہو دین کا یا دنیا کا جب طریقہ اور ترتیب سے کیا جاتا ہے تب ہی مفید ہوتا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ تقرب الی اللہ کا طریق اختیار کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے طہارت کا اہتمام کرے کیونکہ اعمال ظاہری میں سب سے مقدم طہارت ہے جس طرح کہ امور باطنی میں سب سے اول چیز ہے توبہ۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کی صفات میں سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا ہے۔ عبادت سے پہلے توبہ کا ذکر فرمایا ہے ارشاد ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرَّاکِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین مجاہدین کی تعریف فرمانے کے بعد ان کے کچھ اوصاف کا ذکر کیا ہے کہ وہ ایسے ہے جو توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے حمد کرنے والے اور روزہ رکھنے والے رکوع اور سجدہ کرنے والے نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے بُری باتوں سے باز رکھنے والے اور اللہ تعالیٰ کی حدوں کا خیال رکھنے والے ہیں اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سنا دیجئے۔

تو دیکھئے یہاں عبادت سے پہلے توبہ کا ذکر فرمایا ہے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا توبہ کے مضمون پر ایک وعظ ہی ہے اس کا نام حضرت نے اول الاعمال رکھا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ نے احیاء العلوم کے حصہ چہارم جس کو ربع المنجیات کہا جاتا ہے اس کی ابتدا بھی کتاب التوبہ سے فرمائی ہے۔ اور اس میں یہ فرمایا ہے کہ توبہ سب کیلئے ضروری ہے کوئی شخص ہو۔ کافر ہو۔ مشرک ہو۔ عاصی ہو۔ سالک ہو۔ عابد ہو۔ ولی ہو۔ صدیق ہو۔ حتیٰ کہ نبی ہو سب کے لئے اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق توبہ ضروری ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ۔

فان التوبة عن الذنوب بالرجوع الی ستار العیوب وعلام الغیوب مبدا طریق السالکین ورأس مال الفائزین واول اقدام المریدین ومفتاح استقامة المائلین ومطلع الاصطفاء والاجتباء للمقربین ولابینا آدم علیه الصلوٰة والسلام وعلیٰ سائر الانبیاء اجمعین وما اسعد باولاد الاقتداء بالآباء والاجداد۔

اپنے گناہوں سے توبہ کرنا اس ذات کی جانب رجوع ہو کر جو عیبوں کو چھپانے والی اور عیبوں کو جاننے والی ہے سالکین کے طریق کی ابتدا ہے اور کاملین کی پونجی ہی ہے۔ مریدین کا سب سے پہلا قدم ہے جو لوگ راہ صواب سے مائل ہونے والے ہیں ان کی اصلاح دانستگی کی کنجی ہے اسی کی وجہ سے مقربین مصطفیٰ اور مجتبیٰ بنائے جاتے ہیں اور یہی ہمارے مورث اعلیٰ اور جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کے تقرب کا مطلع اور زینہ بنا۔ اس لئے کتنی سعادتمند ہے وہ اولاد جو اپنے آبا و اجداد کی اقتدا کرنے والی ان کے نقش قدم پر چلنے والی ہو۔

مطلب یہ کہ جب ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی کامیابی کا ذریعہ توبہ ہے تو ان کی اولاد کو بھی یہی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ یہی سعادت مندی کا بھی تقاضہ ہے۔

دیکھئے حضرت جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے تو تقرب کی زینہ ورع کو فرمایا تھا لیکن امام غزالیؒ مقربین کے اجتبار اور اصطفاء کا سبب توبہ کو فرما رہے ہیں چنانچہ اہل طریق میں یہی مشہور اور

معروف بھی ہے کہ راجع الی اللہ کا سب سے پہلا عمل توبہ ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ توبہ طہارت باطنی ہے اسکی وجہ سے قلب طاہر ہوتا ہے اور وضو طہارت ظاہری ہے۔ اسی سے جسم پاک ہوتا ہے اور یہ معلوم ہے کہ ظاہر کی طہارت باطن کی طہارت پر مقدم ہے اس لئے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ تقرب الی اللہ حاصل کرنے والے کے سب سے پہلی چیز طہارت ہے تو اس میں کیا اشکال ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اسی کا اہتمام کرنا چاہئے اور اسے چھوٹا اور معمولی کام سمجھ کر ترک نہیں کر دینا چاہئے کیونکہ کسی کام کے کرنے میں ترتیب کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ صاحب موافقات نے ایک مقام پر چند فرقوں کا تذکرہ کر کے یہ لکھا ہے کہ۔

لیس کل ما یعلم مما ھو حق یطلب نشرہ وان کان علم الشریعة ومما یفید علما بالاحکام بل ذالک ینقسم فمنہ ماھو مطلوب النشر وھو غالب علم الشریعة ومنہ مالا یطلب نشرہ بالاطلاق اولا یطلب نشرہ بالنسبة الی حال او وقت او شخص۔ (موافقات صفحہ ۱۹۱ جلد ۴)

یعنی جو بات حق ہو تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کا شائع کرنا بھی مستحسن ہو اگرچہ وہ علم شریعت اور اس کے احکام ہی سے متعلق کوئی بات ہو بلکہ اس میں تفصیل اور تقسیم ہے وہ یہ کہ ۱۔ بعض امور قابل اشاعت ہوتے ہیں۔ مثلاً عام شرعی احکام۔ ۲۔ بعض چیزوں کا نشر مطلقاً جائز نہیں ہوتا۔ اور بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ بعض حالات بعض اوقات اور بعض اشخاص کے اعتبار سے ان کا نشر مناسب نہیں ہوا کرتا۔ یوں عام طور سے چاہے وہ ممنوع النشر نہ ہوں۔

پھر اس کے کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں اور مجھے اس وقت یہی آپ کو سنانا ہے کہ۔

ومنہ ان لا یذکر من العلم ماھو حظ المنتھی بل یربی لصغار العلم قبل کبارہ۔

(صفحہ ۱۹۱ جلد ۴)

یعنی ان امور میں سے جن کہ رعایت مصلح اور کام کرنے والے کے لئے ضروری ہے ایک یہ کہ مبتدی کے سامنے ان علوم کو نہ بیان کرے جو منتہیوں کا حصہ یعنی ان کے حسب حال ہوں بلکہ اس کو چاہئے کہ پہلے چھوٹے چھوٹے علوم کے ذریعہ لوگوں کی تربیت کرے پھر بڑے بڑے علوم کو ان تک پہنچائے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بھی فرمایا ہے کہ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ اور ربانی رب سے ماخوذ ہے اور رب تربیت سے مشتق اور تربیت کے معنی ہیں کسی چیز کو درجہ بدرجہ

کمال تک پہنچانا۔ پس عالم ربانی کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ اُمت کو تدریجاً تقرب الی اللہ کا طریق بتائے اور اس پر لے چلے۔

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جو لوگ تقرب الی اللہ کے طریق کے طالب ہیں۔ ان کو ابتداء سے لے چلو یعنی پہلے طہارت کے مسائل کو سکھلاؤ۔ نماز روزہ کا پابند بناؤ حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام اُنکے اندر پیدا کرو اور حقوق اللہ میں سے پہلے فرائض کی تعظیم اور ان کا اہتمام ان کے دل میں ڈالو۔ قضا نمازیں قضا روزے اس طرح سے کفارے وغیرہ اگر ان کے ذمہ ہوں ان کو ادا کراؤ۔ اور ظاہری اور مشہور مشہور اخلاق رذیلہ مثلاً کذب۔ غیبت۔ نمیمہ۔ غصہ اور نفاق وغیرہ ان سے ترک کراؤ اور انکو متوجہ کرو کہ اپنی روزی خود حاصل کریں اور حلال روزی کمائیں۔ کاہل اور عہدی بن کر نہ رہیں اور کسی پر کل اور بار نہ ہوں یہ سب ابتدائی چیزیں ہیں اور کرنے کے کام ہیں ان سب کو نونہ کرو۔ اور اوّل ہی دن سے وظیفہ کا مطالبہ شروع کردو مراقبہ اور مشاہدہ۔ ذکر قلبی اور دوام ذکر فنا فی الشیخ فنا فی اللہ بقا باللہ ان سب امور کی تحقیق اور تدقیق کے درپے ہو جاؤ تو یہ سب کام نہ کرنے کی باتیں ہیں اس لئے کہ جن چیزوں کو سمجھتے نہیں اس کے تو پیچھے پڑے ہوا اور جس کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ قبر میں سب سے پہلے اس کا سوال ہوگا۔ اس کی فکر نہیں بس اب اس دعا پر مضمون کو ختم کرتا ہوں

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ تَمَامَ الْوُضُوْءِ وَتَمَامَ الصَّلٰوةِ وَتَمَامَ رِضْوَانِكَ وَتَمَامَ مَغْفِرَتِكَ۔

اور

اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِیْ مِنَ الرِّيَاءِ وَلِسَانِیْ مِنَ الْكِذْبِ وَعَيْنِیْ مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ ؕ

اے اللہ میں سوال کرتا ہوں آپ سے کامل وضو اور کامل نماز کی اور آپ کی پوری رضامندی اور آپ کی پوری مغفرت کی۔

اے اللہ پاک کردے میرے دل کو نفاق سے اور میرے عمل کو ریا سے اور میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے اس لئے کہ آپ جانتے ہیں خیانت کرنے والی آنکھوں کو اور وہ چیز جو چھپاتے ہیں دل دیکھئے ان دعاؤں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح سے باطنی اور قلبی طہارت کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا ہے اسیطرح آپنے ظاہری طہارت کا بھی اللہ تعالیٰ سے سوال کیا یہ اسلئے کہ باطنی طہارت کا ذریعہ ظاہری طہارت ہے چنانچہ جسقدر کسیکی طہارت کامل اسقدر اسکی نماز کامل اور جتنی نماز کامل اسی قدر اسکا دین کامل۔

ملفوظات

فرمایا کہ میں اپنے مسلک میں تو نرم ہوں نہیں لیکن دوسرے لوگوں سے بھی پورے اخلاق سے ملتا ہوں یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی کشش اپنی جانب پاتا ہوں۔ جس جماعت کی اپنی ہی جماعت کے لوگ تفسیق و تکفیر تک کرتے ہیں میں ان سے بھی بہت نرمی سے ملتا ہوں اور اس کا یہ اثر دیکھتا ہوں کہ اہلِ حق کی جانب سے ان کے اندر بھی نرمی پیدا ہوئی۔ جو شخص مصلح ہو اس کے لیے اس خلق کو بہت ضروری سمجھتا ہوں۔

اور یہ خلق انبیا علیہم السلام کا ہے کہ خود تو ہوتے ہیں معصوم مگر اہلِ معاصی کو حقیر نہیں جانتے۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب پر بھی شفقت کا معاملہ فرماتے ہیں اس اخلاق کو دیکھ کر وہ لوگ ذبح ہو جاتے تھے۔

پس جو لوگ متبع سنت ہیں وہ اس وصف سے حصہ دئے جاتے ہیں۔

فرمایا کہ فنا فی اللہ اور اللہ تعالیٰ سے محبت کی ترغیب میں اس شعر کے مضمون سے زیادہ موثر مضمون میری نظر سے نہیں گذرا ؎

میں جو اس پر مر مٹا ناصح تو کیا بیجا کیا
اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی

فرمایا کہ کیسے کیسے انبیاء و مرسلین علماء مشائخ ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا دم بھرتے آئے ہیں کیا سب کے سب سودائی ہی تھے (معاذ اللہ)

فرمایا کہ آدمی پیر کے بدن سے قرب حاصل کرتا ہے تو پیر تک پہونچ جاتا ہے اور اس کے روح سے قرب حاصل کرے گا تو اللہ تعالیٰ تک پہونچ جائیگا باقی صرف بدن سے قرب حاصل کر کے خدا تک پہونچنا چاہے یہ نہیں ہو سکتا۔ لوگ یہی سمجھے ہوئے ہیں اور میں اسی کو سمجھاتا ہوں کہ بدن پر گرنا بے سود ہے۔

از افاضات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قال اللہ تعالیٰ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ۔ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَلۡمُسۡلِمُ اخوالمُسۡلِمِ۔

اس آیت اور اس حدیث سے مسلمانوں میں باہم اخوت کا مطلوب ہونا معلوم ہوا۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اخوت اور صحبت کے کچھ آداب اور حقوق بیان فرمائے ہیں ہم آج اسی کو بیان کرنا چاہتے ہیں دیکھئے جس طرح ماں باپ میں یا صرف باپ یا صرف ماں میں شرکت کی وجہ سے دو شخص آپس میں بھائی بھائی ہوجاتے ہیں اسی طرح اسلام و ایمان میں مشارکت کی وجہ سے دو شخصوں میں دینی اخوت قائم ہوجاتی ہے۔ ایک پیر کے جتنے مُرید ہیں یا اس کو جانے دیجئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب لوگ اُمتی ہیں لہٰذا سب میں اخوت قائم ہے خواہ وہ اس کو زبان سے کہے یا نہ کہے اخوت بہرحال قائم ہے جس طرح سے دو شخص ایک ماں باپ کی اولاد ہوں تو وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اس اخوت کے ثابت ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کو زبان سے بھی کہیں کہ ہم بھائی ہیں ہم بھائی ہیں۔ اخوت تو ان کی فطری طور پر قائم ہے یعنی کسی کے کہنے پر موقوف نہیں ہے۔ اسی طرح سے اخوت دینی بھی خود بخود قائم ہوجاتی ہے۔ تاہم لوگوں نے عقدِ اخوت کو منعقد بھی کیا ہے چنانچہ اسلام میں ابتداءً عقدِ اخوت لوگ منعقد کرتے تھے اور اس کی وجہ سے ان میں باہم میراث بھی جاری ہوتی تھی۔ گو بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ بہرحال اس عقد اخوت کے متعلق احیاء العلوم میں ہے کہ عقدِ اخوت دو شخصوں کے درمیان ایک رابطہ اور تعلق کا نام ہے۔ جیسے کہ زوجین کے مابین عقد نکاح اور جس طرح سے کہ نکاح مقتضی ہوتا ہے کچھ حقوق کو جن کا ایفاء جانبین کے لئے واجب ہوتا ہے تاکہ یہ عقد قائم رہے اسی طرح سے عقد اخوت بھی کچھ حقوق کو واجب کرتا ہے

جن کا لحاظ ہر ایک کے لئے ضروری ہوتا ہے اور جس طرح سے کہ عقد نکاح کے حقوق کا ایفاء نہ کیا جائے تو جانبین سے مطالبہ متارکت کا ہوتا ہے اسی طرح سے عقدِ اخوت کی وجہ سے جو حقوق ایک کے دوسرے پر عائد ہوتے ہیں اگر ان کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی تو پھر اس کا بھی نتیجہ متارکت و مفارقت بلکہ باہمی بغض و عداوت کی شکل میں نمودار ہونا ناگزیر ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عقد اخوت کی وجہ سے تمھارے بھائی کا تم پر مال میں بھی حق ہوتا ہے اور نفس میں بھی۔ زبان میں بھی اور قلب میں بھی۔ یعنی یہ کہ اس کو معاف کرو۔ درگذر کرو۔ اس کے لئے دُعا کرو۔ اس کے ساتھ اخلاص سے پیش آؤ اس کے حقوق کو ادا کرو۔ اس کے ساتھ سہولت پسندی کا معاملہ کرو اور تکلف اور تکلیف کو ترک کرو چنانچہ یہ کُل آٹھ حقوق ہیں۔ پہلا حق مال میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دو بھائیوں کی مثال ایسی ہے جیسے کہ دونوں ہاتھ کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو دھوتا اور صاف کرتا ہے آپؐ نے دو بھائیوں کو دو ہاتھوں سے تشبیہ دی ہاتھ اور پیر سے نہیں دی اس لئے کہ ہاتھ اور پیر کے اغراض مختلف ہوتے ہیں اور دونوں ایک ساتھ ہی کام میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہیں اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ یہی حال دو دینی بھائیوں کا ہے کہ ان کی اخوت بھی اسی وقت تام سمجھی جائے گی جبکہ ایک مقصد میں دونوں شریک ہوں پس وہ دونوں ایک حیثیت سے مانند شخص واحد کے ہیں اور جب ایسا ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ رنج و راحت میں دونوں ایک دوسرے کے شریک کار ہوں اور مال اور حال میں دونوں مشارک۔ درمیان سے اختصاص اُٹھ جائے اور کسی کو کسی پر ترجیح باقی نہ رہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ مال کے سلسلہ میں برتاؤ تین قسم پر ہے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کو اپنے غلام اور خادم کے مانند سمجھو یعنی اپنے فاضل مال سے اس کی حاجت روائی کرو جب اس کو کوئی ضرورت پیش آئے اور تمھارے پاس اپنی ضرورت سے فاضل مال بھی موجود ہو تو اس کو بلا مانگے ہوئے دو۔ سوال پر اس کو مجبور نہ کرو۔ یہ میں امام غزالی کے ارشادات سُنا رہا ہوں اب لوگ سب سے

پہلے اس کو مُجھی پر مشق کرتے ہیں یعنی ہم کو ہمارے کلام سے مجوج کرکے ہمیں سے اس پر عمل کا مطالبہ کرتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے۔ ہم کو آزملتے ہیں اپنے کو کوئی نہیں آزماتا۔ آپ سے پوچھتا ہوں کہ علماء اور مشائخ کو تو لوگ مرنے کے وقت تک آزمائیں اور اپنے کو نہ آزمائیں۔ یہ کیسا ہے؟ آگے سُنئے امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم نے اس کو سوال پر مجبور کیا تو یہ عقد اخوت میں انتہائی خامی اور کوتاہی کی بات ہے اور یہ سمجھو کہ تم نے اس کا ادنیٰ درجہ بھی ادا نہیں کیا۔

دوسرا درجہ اخوت کا یہ ہے کہ تم اس کو اپنی طرح سمجھو اور اس بات پر راضی ہو جاؤ کہ وہ تمہارے مال میں اور تمہارے جملہ تصرفات میں تمہارا شریک کار ہو جائے، یہاں تک کہ تم اپنا نصف مال ہی اس کو دے دو۔ حضرت حسن رضؓ فرماتے ہیں کہ اس مرتبہ میں اسلاف کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کے پاس ایک تہبند ہی ہوتا تو وہ اس میں سے نصف پھاڑ کر اپنے بھائی کو دیتا اور نصف خود استعمال کرتا۔

اور عقد اخوت کا تیسرا مرتبہ جو کہ سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کو اپنے نفس پر بھی ترجیح دو اور اس کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم سمجھو اور یہ مرتبہ صدیقین کا ہے اور باہم محبت رکھنے والوں کا اعلیٰ درجہ ہے ــــ میں یہ مضمون اس لئے بیان کر رہا ہوں تاکہ آپ لوگ اس کو سُن کر گھبرا جائیں کیونکہ یہ سب کام تو آپ سے ہوں گے نہیں۔ اس زمانہ میں یہ بہت مشکل ہے اور مجھے کچھ آپ کے موجودہ حالات سے یہ توقع بھی نہیں کہ آپ لوگ اس پر عمل کریں گے۔ وہ تو دوسرے ہی لوگ تھے اور دوسرا ہی زمانہ تھا جب کہ لوگ اس پر عمل کرتے تھے اب نہ آپ ویسے۔ نہ ہم ویسے اور نہ زمانہ ویسا۔ باقی اگر آپ یہ فرمائیں کہ اچھا پھر اس قسم کے مضامین کو بیان ہی کیوں کرتے ہو؟ تو میں عرض کروں گا کہ بیان اس لئے کرتا ہوں کہ آپ کو آپ کے اسلاف کا نمونہ دکھلاؤں تاکہ آپ ان کی سیرت کے آئینہ میں اپنی تصویر دیکھیں۔ اور آپ کو اندازہ ہو کہ آپ کہاں تھے اور کہاں پہنچ چکے ہیں۔ اخلاق کی کس بلندی پر تھے اور اب بداخلاق کی کس پستی میں گر گئے ہیں۔ الغرض اس قسم کے مضامین بیان ہی اس لئے کرتا ہوں کہ آپ گھبرا کر زبان قال سے یا کم از کم زبان حال

سے یہ کہیں کہ تم نے تو بیان کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا ہے کہ اب اس زمانہ میں ان پر عمل تو درکنار ان کا سننا ہی بار خاطر ہوتا ہے۔ اس لئے ایسی باتیں نہ بیان کرو۔ میں کہوں گا کہ اسی قسم کے مضامین کے بیان کرنے کی تو ضرورت ہے اب اس کو نہ بیان کروں تو کیا بیان کروں۔ لہٰذا میں تو بیان کروں گا آپ یہ فرمائیں گے کہ اب اس زمانہ میں بھلا ہم لوگوں سے ان باتوں پر عمل ہو سکتا ہے؟ ارے اپنے باپ ماں اور بھائی بہن کو تو کوئی مال دینے کے لئے تیار نہیں ہے اور آپ دوست کا ایسا ایسا حق بیان کر رہے ہیں میں یہ کہوں گا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے اچھا اگر آپ سے اتنی اونچی چیزوں پر عمل نہیں ہو سکتا تو پھر میرے اور آپ کے درمیان صلح کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ کچھ آپ دبئے اور کچھ ہم دبیں ہم آپ سے اس اعلیٰ درجہ کا مطالبہ نہ کریں گے لیکن آپ بھی یہ کریں کہ اگر اخوت کے یہ سب مراتب نہیں اختیار کر سکتے اور کسی کو اپنی ذات سے نفع نہیں پہنچا سکتے تو نہ پہنچائیے لیکن کم از کم اتنا تو کیجئے کہ کسی کو ضرر نہ پہنچائیے۔ اس زمانہ میں اگر اسی قدر پر ہماری اور آپ کی صلح ہو جائے تو غنیمت ہے۔

الحاصل میں اخوۃ کے یہ سب حقوق اسی لئے بیان کر رہا ہوں تاکہ اس کو سُن کر آپ یہ سمجھیں کہ اللہ اکبر مسلمانوں کے اور اخوۃ کے اتنے حقوق ہیں اور ہم انہیں کس قدر پامال کر رہے ہیں جب اس کا احساس ہو گا تب جا کر ادنیٰ درجہ پر آپ آسکیں گے یعنی یہ کہ کسی کو نقصان اور ضرر نہ پہنچائیں گے کہ لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صاحب سے ان کے کسی نزاع کے متعلق کچھ گفتگو فرمائی اور کچھ سمجھایا اور نصیحت فرمائی پھر ان سے پوچھا کہ آپ سمجھ گئے کہنے لگے جی ہاں۔ سمجھ میں تو آگیا زبان تو ساکت ہو جائے گی مگر دل ساکت نہ ہو گا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ بس میں اتنا ہی چاہتا ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کسی کی نصیحت کا اتنا ہی اثر دوسرے پر پڑے کہ وہ اپنی زبان بند کرلے تو کچھ کم فائدہ ہے؟ زبان ہی تو نزاعات کی جڑ ہے۔ آج جتنے بھی فسادات اور عداوت مسلمانوں میں ہیں ان میں اکثر و بیشتر کا سبب یہی زبان ہوتی ہے۔ آدمی کے قلب میں اگر بالفرض کبر۔ حسد یا غصہ اور عداوت وغیرہ موجود ہے تو اس سے خود

اس کا نقصان تو ہے کہ یہ بداخلاق سمجھا جائے گا لیکن دوسروں کا اس سے کیا ضرر؟ غیر کے حق میں تو یہ مضر اسی وقت ہوگا جب کہ یہ شخص اپنے قلب کے مقتضار پر جوارح سے عمل کرے اور ان میں سب سے پیش پیش آدمی کی زبان ہی ہے۔ اسی لئے میں نے کہا کہ زبان ہی فتنوں کی جڑ ہے اور بغض و عداوت کے شیوع کا ذریعہ ہے اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ چیزیں آج ہم میں عام ہیں۔

اب اگر مسلمانوں کے انھیں حالات کو دیکھ کر جب کہ آپ حضرات یہاں تشریف لاتے ہیں اور جمع ہوتے ہیں آپ کے سامنے اس قسم کے مضامین نہ بیان کروں تو پھر کیا باپ دادا کا ذکر کروں ایک صاحب نے کسی عالم سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت میں کمی معلوم ہوتی ہے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور خصائل بیان کئے۔ نیز آپ کے جمال و کمال و منال پر نہایت عمدہ وعظ فرمایا جس سے یہ صاحب خوب محظوظ اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ درمیان میں ان عالم صاحب نے فرمایا کہ یہ سارے کمالات تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ سن رہے ہیں لیکن آپ کے والد صاحب بھی بہت اچھے آدمی تھے اس پر وہ صاحب بولے کہ ارے مولانا! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں کہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہو رہا ہے اور کہاں میرے باپ دادا کا ذکر آپ نے چھیڑ دیا۔ کس قدر بے جوڑ سی بات ہے یہ سن کر مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہاں بات تو بے جوڑ ہے لیکن میں نے ایسا قصداً کیا ہے آپ کو یہ سمجھانا مقصود تھا کہ آپ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اور بحمد اللہ والدین کی محبت سے زائد ہے اسی لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے درمیان میں اپنے باپ دادا کا ذکر آپ کو ناگوار گذرا ورنہ تو میں نے تو ان کی تعریف ہی تو کی تھی۔ ان کی مذمت تو کی نہیں تھی۔۔۔

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ اگر ان سب مضامین کو آپ کے سامنے نہ بیان کروں تو کیا باپ دادا کا ذکر کروں اور اگر میں کرنے لگوں تو آپ کو بھی ناگوار گذرے گا اور آپ بھی کہیں گے کہ اصلاحی مجلس میں ان سب باتوں کا کیا جوڑ؟ تو سنئے اصلاح انھیں سب چیزوں کے بیان کا نام ہے۔ اصلاح عمدہ عمدہ اشعار پڑھ دینے کا نام نہیں ہے اور نہ اس کا نام ہے کہ لوگوں کے سامنے قواعد کلیہ

نہایت مدلل طریقہ سے بیان کر دیئے جائیں محض اس اتنے سے اصلاح نہ ہوگی میں نے ابھی چند روز ہوئے بیان کیا تھا کہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ البالغہ میں فرمایا ہے کہ :-

باب بیان ما کان علیہ حال اھل الجاھلیۃ فاصلحہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم	اہل جاہلیت جس حال پر تھے اس کا بیان نیز یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اس کی جو اصلاح فرمائی اس کا بیان -

یہ باب قائم فرماکر فرماتے ہیں کہ :-

ان کنت تریدالنظر فی معانی شریعۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتحقق اولاً حال الامیین الذین بعث فیھم التی ھی مادۃ تشریعہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (حجۃ اللہ البالغہ)	اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے معانی میں نظر و فکر کرنا چاہتے ہو تو پہلے ان اُمیوں کے حالات پیش نظر کرو جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے اور جو کہ آپ کی شریعت کے لئے بمنزلہ مادہ کے تھے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

اس سے معلوم ہوا کہ ہر زمانہ میں قوم کی اصلاح کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوم کے حالات خود بھی پیش نظر رکھے اور قوم کو بھی اسلاف کی سیرت سے واقف کرائے۔ لوگوں کے حالات ہی کو اپنی اصلاح کا مادہ قرار دے اور ان سے یوں کہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ کے احکامات یہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات ہیں۔ اسلاف کی یہ سیرت ہے اور تمھارا یہ حال ہے۔ شریعت کی یہ تعلیمات ہیں اور تمھارے یہ اعمال ہیں۔ تم کو ایسا ہونا چاہئے تھا اور تم یہ ہو۔ تمھیں ادھر چلنا تھا اور تم کدھر جارہے ہو۔ تمھارے کبھی یہ اخلاق تھے اور اب ان کی جگہ ان بداخلاقیوں نے لے لی ہے۔ کسی وقت میں تم میں آپس میں یہ اخوت اور ایسی صداقت تھی اور اب تم میں باہم یہ نفرت اور یہ بغض اور یہ عداوت پیدا ہوگئی ہے۔ اخلاص کی جگہ نفاق اور ذکر کی جگہ غفلت سے پوری قوم دو چار ہے آپس کے تعلقات کی پراگندگی کی وجہ سے کوئی دو شخص باہم یک دل نہیں رہے دُنیا میں محبت و مروّت اور اخوت کا صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہے اور اہل دُنیا

اس کا مصداق دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ یوں ظاہراً گو ملنا جلنا بھی ہے مگر اہل احساس سمجھتے ہیں کہ اس ظاہر میں باطن نام کو نہیں ہے اور اس صورت میں حقیقت کا دور تک پتہ نہیں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آپ لوگ صرف جسمانی طور سے مجتمع ہوں اور قلوب میں اس اجتماع کا مطلقاً اثر نہ ہو تو یہ بھی کوئی اجتماع ہے؟ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ بات تو ہنسی کی ہے لیکن ہے ہمارے حال کے عین مطابق اس لئے بیان کرتا ہوں۔ ہمارے دوستوں میں سے ایک بنگالی ماسٹر صاحب تھے۔ یہ بنگال میں ماش کی دال زیادہ کھاتے ہیں اور کبھی کبھی اس کو خشک بھی پکاتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے کھانے میں چاول اور ماش کی بھری بھری دال آئی۔ چاول بھی خشک تھے اس لئے دونوں باہم ملتے نہ تھے۔ انھوں نے کھانے کو تو جیسے تیسے کھا ہی لیا مگر ہم لوگوں سے کہتے تھے کہ دال بہت خشک تھی۔ آج دال بھات میں ملاقات نہیں ہوا۔ لوگ تو یہ سُن کر بہت ہنسے اور ان کا ایک مذاق سا بنا لیا جب ملتے تو لوگ ان سے کہتے کہ ماسٹر صاحب! آج دال بھات میں مُلاقات ہوا یا نہیں؟ لیکن میں نے اس سے ایک مسئلہ نکالا وہ یہ کہ اس سے معلوم ہوا کہ بعض ملاقات ایسی بھی ہوتی ہے کہ ملاقات ہونے پر بھی ملاقات نہیں ہوتی۔ چنانچہ دیکھئے دال چاول ایک ہی برتن میں موجود تھے اور ان کو باہم ملا کر کھایا بھی گیا تھا مگر ماسٹر صاحب کہتے تھے کہ ملاقات نہیں ہوا تو کیا بات تھی؟ بات یہ تھی کہ چاول خشک تھے اور دال بھی اتفاق سے خشک تھی اس لئے باوجود ملانے کے بھی وہ ملی نہیں بلکہ ہر ایک اپنی جگہ اینٹھا رہا جس طرح سے دو متکبر شخص اپنے اپنے طور پر اکڑے رہتے ہیں اور باہم ملتے نہیں گو بظاہر ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے ایک اور واقعہ سُنئے۔

ایک صاحب ذرا چھوٹے قد کے تھے ان کی ملاقات ایک ایسے صاحب سے ہوئی جن کی توند نکلی ہوئی تھی باہم معانقہ کیا لیکن کچھ تو یہ پستہ قد اور کچھ ان کی بڑی توند اس لئے گلے سے گلا نہ مل سکا اس پر ان میں سے ایک صاحب نے بعد میں کہا کہ یہ تو معانقہ نہیں ہوا۔ مباطنہ ہوگیا۔ تو دیکھئے بعضا ملنا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملنے پر بھی آدمی نہیں ملتا یعنی محض صوری ہوتا ہے اور حقیقی نہیں ہوتا۔

دو شخص میری ہی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے ان میں آپس میں کچھ اختلاف رہا ہوگا جس کی وجہ سے باہم ایک دوسرے کو سلام تک کرنے کے روادار نہیں تھے۔ میں ان کی یہ حالت دیکھ کر کہتا تھا کہ یا اللہ میں دن رات انھیں باتوں کو بیان کرتا ہوں مگر ان لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ان کو کیا ہوگیا ہے۔ حالانکہ میں کتاب میں دکھا سکتا ہوں کہ ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے ملتا ہے تو اس کی وجہ سے ہر ایک کے دوسرے پر کچھ حقوق ہوجاتے ہیں لیکن آج اس کو لوگ سمجھتے تک نہیں اور اس زمانہ میں اس بحث کا سمجھنا بھی مشکل ہے اور سمجھانا بھی مشکل ہے۔

آجکل جن لوگوں کو آزاد خیال کہا جاتا ہے دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو مجلس اور مُلاقات کا کچھ حق بھی ادا کرتے ہیں۔ باہم خوش طبعی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں مگر ہم لوگ جو اخلاق کے مدعی ہیں ان میں سے یہ سب چیزیں بالکل ختم ہوچکی ہیں ــــ تو جس طرح سے ان ماسٹر صاحب نے کہا تھا کہ دال بھات میں مُلاقات نہیں ہوا اور اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ ایسی ملاقات نہیں ہوئی جیسی کہ ان کے اطراف کے دال بھات میں ہوا کرتی ہے یعنی یہ کہ دونوں چیزیں اشارۂ حسیہ میں بھی متحد ہو جائیں اور ایک طرف اشارہ بعینہٖ دوسرے کے جانب اشارہ ہوجائے۔ مثلاً دیکھئے یہ دیوار ہے اور یہ سفید ہے تو سفیدی دیوار کے ساتھ اس درجہ متحد ہے کہ اگر آپ سفیدی کی طرف اشارہ کریں تو وہی اشارہ دیوار کی جانب بھی ہوجائے گا اور دیوار کی جانب اشارہ کیا جائے تو وہی سفیدی کی طرف سمجھا جائے گا۔ گویا ملنے سے ان کا مطلب یہ تھا کہ ایسا نہیں ملا کہ اس کا مصداق ہوجاتا کہ ؎

من تو شُدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ آج اور تعلقات کو تو جانے دیجئے خود پیر اور مُرید میں ایسی ملاقات نہیں ہے جیسی وہ ماسٹر صاحب دال اور بھات میں چاہتے تھے اور یہی حال اس زمانہ میں تمام تعلقات کا ہوگیا ہے۔ آج اپنے کسی بھائی کی مدد کرنا تو درکنار اس کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ چاہتے ہیں کہ کس طرح اسے تباہ کریں

یہ حال ہمارا ہوگیا ہے۔

آج اسی بداخلاقی نے قوم کو کھوکھلا کر دیا ہے اور ہماری تمام خرابی اور تباہی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ غیروں نے ہمیں تباہ کیا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ ہم نے خود اپنے پاؤں میں کلہاڑی ماری ہے ہم خود اپنی بداخلاقی کی وجہ سے خراب ہوئے ہیں اور اپنی تباہی وبربادی کے خود ہم ذمہ دار ہیں اب میں ان باتوں کو بیان کروں اور چاہوں کہ آپ حضرات کو کچھ اس جانب متوجہ کروں تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ سے کہتا ہوں کہ آپ نے بھی دوستوں سے ایسا ہی عقد باندھا ہے جس کو امام غزالی رح بیان فرما رہے ہیں یا نہیں؟ اگر باندھا ہے تو پھر اس کے حقوق کیوں نہیں ادا ہو رہے ہیں اور اگر ابھی تک یہ عقد ہی نہیں باندھا تو اب سے اس کو کیجئے۔ اور دل سے کیجئے۔ امام فرماتے ہیں کہ جو عقد کہ ابھی تک باطن میں نہ منعقد ہوا ہو تو اس کے بغیر یہ میل ملاپ اور آمد ورفت جو باہم جاری ہے محض رسمی ہے جس کا کہ نہ عقل کے نزدیک کچھ اعتبار ہے اور نہ شرع میں۔

میں اس وقت جو کلام کر رہا ہوں وہ زمانہ اور لوگوں کے حالات کے تقاضے کے موافق کر رہا ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ اہل فہم کے نزدیک وہی کلام معتبر ہے جو کہ مقتضئ حال کے مطابق ہو۔ اب جو یہ باتیں کہہ رہا ہوں اگر لوگ اس کو سُن کر ان پر عمل بھی کرنے لگیں تو اس میں ان کا کیا ضرر ہے؟ پھر لوگ عمل کیوں نہیں کرتے؟

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت نہ صرف مسلمان بلکہ ساری دُنیا ایسے حالات سے گذر رہی ہے کہ اب ایسی ہی گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایسا وقت ہے کہ بداخلاقیوں کے شیوع کی وجہ سے نہ کسی کی جان و مال محفوظ ہے اور نہ کسی کی عزت و آبرو محفوظ ہے۔ ایذا اور اضرار حرام ہے۔ لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام لیکن حال یہ ہے کہ معمولی سے معمولی باتوں پر لوگ جھوٹا حلف تک اُٹھانے میں باک نہیں کرتے اور تماشہ یہ کہ کام تو کرتے ہیں غلط اور اس کو کمال سمجھتے ہیں۔ ایک شخص جھوٹا حلف اُٹھا رہا تھا اور حلق خشک ہوتا جا رہا تھا

لوگ سمجھتے تھے کہ یہ جھوٹا شخص ہے اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ ہوشیاری ہے اور اس کے لوگ بھی یہی سمجھتے تھے کہ یہ شخص بہت ہوشیار ہے۔ یہ کیسا ہے؟ قرآن شریف اور حدیث میں جس کو نفاق کہا گیا ہے اب لوگ اسی کو ہوشیاری کہیں۔ آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ کیسا ہے؟ لوگوں کا مذاق کس درجہ فاسد ہو چکا ہے اور آپ کہاں سے کہاں پہنچ بگئے ہیں۔

میں سچ کہتا ہوں کہ آج اسی نفس پرستی نے لوگوں کو خدا پرستی سے روک دیا ہے اور ہماری اسی بداخلاقی نے ہمیں یہ روز بد دکھلایا ہے۔ معاد یعنی آخرت کی درستگی تو اصلاح پر موقوف ہے ہی میں تو اب یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی دنیوی زندگی کا چین اور سکون بھی اخلاق ہی کے درست کرنے پر موقوف ہے اور اس پر قسم کھا سکتا ہوں کہ جس طرح سے کہ اگلے زمانہ میں صوفیاء کرام نے اپنے نفس کو مارا تھا اسی طرح سے اب ہر ہر شخص کو آخرت کے لئے نہیں تو دنیوی راحت کے لئے اپنے نفس کی اصلاح کرنی ہوگی اور اسی طرح سے کرنی ہوگی جس طرح سے صوفیاء کرام نے کی تھی۔ باقی وہ لوگ تو بڑے لوگ تھے انھوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نفس کو مارا تھا اور اپنے اخلاق کی اصلاح کی تھی اور آپ کو اب دنیوی چین اور سکون حاصل کرنے کے لئے نفس کو مارنا ہوگا ورنہ بدوں اس کے آخرت تو خراب ہوگی ہی یہ دنیا بھی دوزخ کا نمونہ بن جائے گی۔

میں نے سفر حج میں ایک مصری عالم کو وعظ کہتے ہوئے سنا تھا انھوں نے نہایت مؤثر طریقہ سے مسلمانوں کی بداخلاقی کا بیان کیا تھا ایسا کہ میں نے ان کی تقریر سن کر اپنے دل میں کہا کہ ہاں یہ ہے وعظ اور یہ سمجھا کہ میرا یہ سفر کامیاب ہوگیا۔ انھوں نے یہ بیان کیا تھا کہ دیکھو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں تشریف آوری کا مقصد یہ تھا کہ ہم کو دونوں جہان کی فلاح کا طریقہ بتائیں۔ چنانچہ آپ نے معاد اور معاش دونوں کی درستگی کے اصول تعلیم فرمائے۔ آپ نے خالق اور مخلوق کے مابین اصلاح کا طریق سکھلایا اور آپ نے یہ بھی بتایا کہ باہم ایک مخلوق کے دوسرے پر کیا کیا حقوق ہیں چنانچہ اسلامی اخلاق اور آداب معاشرت دنیا کے سامنے پیش فرمائے اور آپ نے بتایا کہ تدبیر منزل کے کیا کیا اصول ہیں، اولاد پر والدین کے اور والدین پر اولاد کے اسی طرح سے زوجین کے باہم ایک دوسرے پر کیا

حقوق ہیں ؟

غرضکہ آپ نے دین و دُنیا کی کوئی ایسی ضرورت کی چیز نہیں چھوڑی جس میں رہنمائی نہ فرمائی ہو تو اب جس نے آپ کی کامل تصدیق کی یعنی معاد میں بھی اور معاش میں بھی وہ یہاں بھی کامیاب ہوا اور وہاں بھی کامیاب ہوا اور جس نے جس قدر تصدیق میں کمی کی وہ اسی قدر نقصان اور خسارہ میں پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اس دُنیوی زندگی سے متعلق جو امور تھے ان میں تو تُم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق نہیں کی یعنی آپ کے تعلیم فرمودہ اخلاق اور اصول معاشرت کو چھوڑا تو اس کا انجام بد تمھاری نظروں کے سامنے ہے کہ آج بھائی بھائی سے جُدا ہے۔ اس کو اس سے ناگواری ہے میاں بیوی میں تفریق ہے۔ ہر ایک دوسرے سے مُنہ پُھلائے ہوئے ہے۔ باپ بیٹے میں مُنافرت ہے غرضکہ زندگی دُشوار ہوگئی ہے۔ یہ تو وہ نتیجہ ہے جو تمھارے سامنے آچکا ہے بلکہ تم اس کو بھگت بھی رہے ہو۔ اس سے قیاس کرلو کہ امور معاد (آخرت) سے متعلق آپ نے جو تعلیمات فرمائی ہیں اگر اس کی بھی تصدیق نہ کروگے تو یہاں کی طرح وہاں بھی سزا ملے گی اس کے لئے تیار رہو اور منتظر رہو موت کے بس یہاں سے جانے کی دیر ہے اور وہاں اس سے کہیں زیادہ دیکھو گے جتنا کہ دُنیا میں دیکھ رہے ہو اللّٰھم احفظنا

وہ مصری عالم صاحب نہایت ہی فصیح بلیغ عربی میں یہ تقریر فرما رہے تھے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے ان کے اس وعظ سے بہت فائدہ پہنچا۔ میں نے کہا کہ دیکھو اس شخص نے تھوڑے لفظوں میں کتنی بڑی حقیقت کی معرفت کرادی۔ میں نے اسی وقت ان کی اس نصیحت کو پلّے باندھ لیا اور اپنے نفس سے کہا یہ مضمون کبھی بھولنے کا نہیں ہے۔

اب آپ سے کہتا ہوں کہ دیکھئے جہاں اخلاق کی ایسی ایسی تعلیمات ہوں وہاں لوگ اس درجہ بد اخلاق ہوں اور اپنی ان بد اخلاقیوں کو کمال سمجھیں کس قدر افسوس کی بات ہے۔ قوم کے اس حال پر اگر خون کے آنسو بھی رو دیئے جائیں تو کم ہے۔

ابھی میں نے بیان کیا ہے کہ جس چیز نے لوگوں کو خُدا پرستی سے روک دیا ہے وہ نفس پرستی ہے اور نفس پرستی کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ اور بُت پرستی دونوں ایک ہی چیز ہے۔ مولانا روم رحؒ نے مثنوی میں فرمایا ہے کہ جو لوگ بُت پرست تھے تو ان کی بُت پرستی کا منشا بھی نفس پرستی ہی تھا۔ اس لئے صوفیائے کرام نے انسان کے پندار کو بھی بُت ہی

فرمایا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

تا در تو ز پندار تو ہستی باقی است
می داں بیقیں کہ بت پرستی باقی است
گفتی بُت پندار شکستم رستم
آں بُت کہ ز پندار شکستی باقی است

جب تک کہ تمھارے اندر پندار کا کچھ بھی شائبہ موجود ہے تو یقیناً یہ سمجھ لو کہ بُت پرستی باقی ہے اور اگر تم یہ کہو کہ میں نے اپنے پندار کو ختم کر دیا ہے اور اب اس سے نجات پا گیا تو جس پندار کے بُت کو تم نے پندار کے ساتھ توڑا تو پندار کا بُت تو اب بھی موجود ہے۔ وہ کب فنا ہوا۔

اس نفس پرستی کا شکار بنی اسرائیل رہے جس کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کی ہدایت سے فائدہ نہ اُٹھا سکے بلکہ ہمیشہ ان کی مخالفت اور اپنے نفس کی متابعت ہی کرتے رہے جیساکہ قرآن شریف میں ان کے متعلق ایک جگہ ارشاد ہے کہ وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْھُمْ وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ اِخْرَاجُھُمْ یعنی اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کر کرا کے رہا کرا دیتے ہو حالانکہ یہ بات ہے کہ تم ان کا ترکِ وطن کرا دینا نیز ممنوع ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس باب میں ان پر تین حکم واجب تھے۔ اوّل قتل نہ کرنا۔ دوئم جلا وطن نہ کرنا۔ سوم اپنی قوم میں سے کسی کو گرفتار دیکھیں تو روپیہ خرچ کر کے چھڑا دینا۔ سو ان لوگوں نے حکم اوّل و دوئم کو تو ضائع کر دیا تھا اور سوئم کا اہتمام کیا کرتے تھے اور وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ سہل اور نفس کے موافق تھا اس لئے اس پر عمل تھا ورنہ خُدا کا حکم تو سب چیزوں کا تھا۔ یہی نفس پرستی تھی۔

لفظ اُسرٰی پر صاحب تفسیر روح المعانی لکھتے ہیں کہ قیدیوں کی چند قسمیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ:۔

کوئی شخص ہوا و ہوس کا قیدی ہو یعنی اسیر النفس ہو تو اس کے خلاصی کا طریقہ یہ ہے کہ ہدایت کی باتوں کی جانب اس کی رہنمائی کی جائے اور اس کو بھی اس قید سے چھڑایا جائے۔ پس جس طرح سے کہ اس ظاہری قیدی کو چھڑاتے ہیں

ثواب ملتا ہے اسی طرح سے اس اسیر النفس کو بھی اس کے نفس سے رہائی دلانے میں ثواب ملتا ہے بزرگان دین کا بس یہی کام ہے کہ یہ حضرات ہوئی کے قیدی کو نفس کی قید سے چھڑاتے ہیں اور جس کو یہ اس کے نفس کی قید سے رہائی دلا دیتے ہیں تو نفس سے چھوٹنے کے بعد تو یہ شخص ان کا غلام ہی ہو جاتا ہے کیونکہ اس وقت اس کو محسوس ہوتا ہے کہ میں کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میرے احباب مجھے ایسے ایسے خطوط لکھتے ہیں کہ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر میں ان سے جان بھی مانگوں تو ان کو اس میں بھی عذر نہ ہوگا۔ اور آپ کے سامنے تو مسلمانوں کی تاریخ موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضؓ کو نفس سے چھڑایا تو وہ آپ پر ایسے فدا ہوئے کہ کیا کوئی کسی پر فدا ہوگا اور اس کے بعد ان کی زندگی کا نقشہ ہی کچھ اور ہوگیا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بیان فرمایا ہے ارشاد ہے کہ:۔

اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ٥

تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا اس کو یاد کرو جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہوگئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو بیان کرتا ہے تاکہ تم لوگ ہدایت پاؤ۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر تمام عرب اور عجم پر جو احسان فرمایا ہے اس پر امتنان فرما رہے ہیں کیونکہ واقعی آپ کی تشریف آوری سے پہلے وہ لوگ اخوۃ اور دوستی کا نام تک نہیں جانتے تھے بلکہ سب کے سب آپس میں دشمن تھے اور دشمنی بھی ایسی تھی جو کہ اپنی انتہا تک پہنچ چکی تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو بھائی بھائی بنا دیا پھر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو زندگی کا کیسا کچھ لطف حاصل ہوا ہوگا کیونکہ سب سے بری چیز جو عیش دنیا کو مکدر اور کرکرا کر دیتی ہے وہ آپس کی عداوت ہے مگر آج ہم

ہر جگہ یہی دیکھ رہے ہیں اور کچھ نہیں کہہ سکتے بس ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔

میرے پاس آنے جانے والوں میں دو بھائی تھے ان میں باہم سخت عداوت تھی۔ میں نے ہر چند چاہا کہ ان دونوں میں صلح کرادوں مگر میں اس میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ ویسے آپس میں ملتے تو خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتے لیکن عداوت اور بغض قلب میں گھر چکا تھا اس لئے جب مجھ سے کہتے تو ایک ہی بات کو بار بار کہے چلے جاتے میں نے ان کے حالات کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ بس اسلم یہی ہے کہ ان کے درمیان میں پڑا ہی نہ جائے یہ لوگ تو ماننے والے نہیں خواہ مخواہ بات چھیڑ کر جذبات کو اُبھارنا اور عداوت کو تازہ کرنا ہے اس لئے مناسب سکوت ہی ہے۔

سیدنا حضرت آدم جب جنت سے گیہوں کھانے کی وجہ سے دُنیا میں بھیجے گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ یعنی جاؤ نیچے اُترو تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہوں گے۔ گویا ایک ظاہری سزا تو یہ ہے کہ جنت سے باہر جاؤ اور آسمان سے نیچے اُتر کر زمین پر جاکر رہو اور دوسری سزائے باطنی یہ ہے کہ تم میں آپس میں عداوت رہے گی جس کی وجہ سے لطف زندگی بہت کچھ کم ہو جائے گا۔ حضرتؒ نے بیان القرآن میں یہی تفسیر فرمائی ہے۔

تو دیکھئے عداوت کو لطف زندگی ختم کرنے والا فرمایا اور آج ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اسی میں لطفِ زندگی سمجھ رہے ہیں۔ اب آپ لوگ یہ تو سُن رہے ہیں مگر بہت سے لوگ آپ ہی میں سے دل میں یہ کہتے ہوں گے کہ تم پُرانے خیال کے آدمی ہو تم کیا جانو جو مزا کہ عداوت میں ہے اس کو تم سمجھ بھی نہیں سکتے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو پھانس کر تماشہ نہ دیکھا تو زندگی کا لطف ہی کیا حاصل ہوا چنانچہ آج عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ کسی شخص کو پھانس دیتے ہیں اور دور سے اس کا تماشا دیکھتے ہیں اور اس پر ہنستے ہیں جس طرح سے کہ میں نے خود دیکھا کہ ایک بچے کو بھڑ نے کاٹ لیا تھا وہ غریب تکلیف کی وجہ سے رو رہا تھا اور کود اُچھل رہا تھا اور گھر کے سب لوگ اس پر ہنس رہے تھے اور اس کا تماشہ دیکھ رہے تھے میں خفا ہوا کہ یہ کیا بداخلاقی اور سنگ دلی ہے کہ ایک شخص تو مصیبت میں مبتلا ہے اور دوسرے لوگ یہ تو نہیں کرتے کہ اس پر کوئی دوا لگا دیں جس سے اس کو سکون ہو اور اس پر ہنس

رہے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسے شکاری جال میں کسی پرندہ وغیرہ کو پھنسا لیتا ہے شکار تو جال میں پھڑپھڑاتا ہے اور چیختا ہے اور شکاری خوش ہے کہ وہ کامیاب ہوگیا۔

یہ احساس کا فقدان ہے اور محبت کے خاتمہ کی دلیل ہے حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ مومن اُلفت و محبت کا گھر ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:۔

فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا نفع جو اہل عرب کو پہنچا وہ یہ تھا کہ سب لوگ بھائی بھائی ہوگئے جس کی وجہ سے انھیں لُطف زندگی کی دولت حاصل ہوئی ورنہ اس سے قبل ان کی زندگی بالکل بے امن زندگی تھی کسی کو کسی کی طرف سے اطمینان نصیب نہیں تھا کوئی شخص اگر کسی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کی وجہ سے قبیلہ در قبیلہ عداوت برسہا برس تک چلتی رہتی تھی پس سب سے بڑا احسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عرب پر اور اس کے واسطہ سے تمام عجم پر یہ ہوا کہ لوگ اپنی جان مال، عزت اور آبرو میں مامون ہوگئے اور سب کو اطمینان کُلّی نصیب ہوگیا۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو جو اِن چیزوں سے مامون فرما دیا تو کیا یہ فیض آپ کا کچھ کم فیض تھا؟ اور یہ تو آپ کا اُمت پر دنیوی احسان ہوا کہ آپ ہی نے لوگوں کو عداوت کی قباحت اور اس کے اسباب پر اطلاع فرمائی اور پھر آپ نے اس کا علاج بھی بتایا جس کی وجہ سے ان کی برسہا برس کی عداوت مبدل بہ صداقت و اُلفت اور مودت و محبت ہوگئی مخلوق کے آپس کے تعلقات دُرست ہوگئے۔ چنانچہ عداوت کے جو اسباب ہیں ان کا ہی نام اخلاق رزیلہ ہے اور مودت کے جو اسباب ہیں ان کا نام اخلاق حمیدہ ہے اور جس طرح سے کہ اخلاق رزیلہ کا نتیجہ دُشمنی اور عداوت ہے اسی طرح سے اخلاق حمیدہ کا ثمرہ اُلفت و مودت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اخلاق حسنہ سے روشناس فرمایا تو ان کی آنکھیں کُھل گئیں اور سب کے سب اخلاق حمیدہ کے ساتھ متصف ہوگئے اور سب کو ایک دوسرے سے اخوۃ کا تعلق ہوگیا اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا۔ (سُنو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے بھائی بھائی ہوگئے)۔

الغرض یہ احسان تو دُنیوی ہوا اور دینی احسان یہ ہوا کہ لوگ اپنی بد اخلاقیوں کی وجہ سے جہنم کے گڑھے کے بالکل کنارے پہنچ چکے تھے آپ نے ان کو اس میں گرنے سے بچالیا

حاصل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو انسان کو اللہ تعالیٰ سے ملا دیا یعنی خالق کے تعلق کو درست فرمادیا اسی طرح سے دوسری جانب انسانوں کے آپس کے تعلقات بھی درست فرمائے کیونکہ انسان جو سچ پوچھئے تو جانوروں سے بھی بدتر تھا انسان سے جانور کو اتنا توحش نہ تھا جتنا کہ انسان سے انسان کو تھا۔ انسان کی وقعت گاجر اور مولی سے بھی کم ہوگئی تھی کسی انسان کا قتل کر دینا ان کے نزدیک معمولی سی بات تھی۔

روح المعانی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اہل عرب کا یہ حال تھا کہ وہ سب کے سب آپس کی عداوت اور دشمنی میں ہلاک تھے اور کوئی دو شخص بھی ان میں باہم ایک دل نہ تھے لیکن اللہ نے جب فضل فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو سارے اہل عرب مانند ایک نفس کے ہوگئے۔ یا تو دو آدمیوں میں اتفاق نہ تھا یا کل کے کل عرب یک دل اور مثل ایک نفس کے ہوگئے سبحان اللہ یہ محض حق تعالیٰ کے فضل سے ہوا۔ ورنہ اتنی بڑی تبدیلی کسی کے بس کی بات نہ تھی اسی کو فرمایا لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ یعنی اگر آپ زمین بھر کی چیزیں خرچ فرمادیتے تو ان کی عداوت کو ختم نہ کر سکتے تھے کیونکہ ان کی عداوت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور روپیہ پیسہ کا یہ کام نہیں کہ وہ قلبی الفت پیدا کر سکے اور دو دلوں کو جوڑ سکے اور مودت تو وہی ہے جو قلب اور قالب دونوں سے ہو البتہ یہ قوت اخلاق میں ہے کہ اس کے ذریعہ سے قلب اور قالب دونوں تابع ہو جاتے ہیں مال میں یہ طاقت نہیں کہ وہ دل کو بھی جھکا سکے بس اس سے ازیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی کا قالب تابع ہو جائیگا مگر وہ بھی ظاہری طور سے لیکن اس کے لئے یہ تو ضروری نہیں کہ قلب بھی تابع ہو جائے اور یہاں اللہ تعالیٰ کا فضل کچھ ایسا شامل حال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو اخلاق سکھلائے تو اس کی وجہ سے سب لوگوں میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کا میل ہوگیا قالب بھی باہم متحد ہوگئے اور قلوب بھی سب متفق ہوگئے۔

اس جگہ ایک بات اور سمجھ لیجئے وہ یہ کہ اتفاق کئی وجوہ سے ہوتا ہے مثلاً یہاں آپ سب لوگ جمع ہیں اور میری باتیں سن رہے ہیں تو اس مقصد میں تو سب اتفاق رکھتے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ دوسری اغراض کی وجہ سے آپ لوگ باہم مختلف بھی ہوں

باقی حضرات صحابہ میں جو اتفاق تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں جو غرض ایک کے قلب میں تھی وہی دوسرے کا بھی مقصود تھا اس لئے نااتفاقی کا وہاں کہاں گذر ہو سکتا تھا نااتفاقی جو ہوتی ہے وہ اغراض کے اختلاف سے ہوتی ہے اور وہاں اغراض میں سب متفق تھے اس لئے محبت اور مودت آگئی اور عداوت قلب سے نکل گئی۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس آیۃ سے عداوت کی مذمت اور قدح اور محبت و مودت کی مدح نہیں نکلی؟ کیا اس سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ عداوت زمانۂ جہالت اور ظلمت کی چیز ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غائت باہم اُلفت و محبت کا پیدا فرمانا تھا۔ مگر آج اس مضمون کو بیان کیجئے تو سُننے والوں پر اس کا کوئی اثر نہیں سُننے سے پہلے جیسے تھے سُننے کے بعد بھی ویسے ہی رہتے ہیں صرف واہ واہ کرتے ہیں لیکن حالات میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں اور اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ جلسہ کامیاب رہا۔ میں کہتا ہوں کہ جلسہ تو آپ ہی لوگ تھے جو بیٹھے ہوئے سُن رہے تھے ان کو تو میں کامیاب دیکھتا نہیں ہاں بیچارے جس عالم نے کھڑے ہو کر اتنی دیر تک آپ کے سامنے تقریر کی۔ اگر اس کی نیت درست ہے تو وہ البتہ کامیاب رہا کہ ' بر رسولاں بلاغ باشد و بس' لیکن وہ تو قائم ہے جالس نہیں پھر یہ کیوں کہتے ہیں کہ جلسہ کامیاب رہا۔ کیا کامیابی اسی کا نام ہے؟ جو لوگ اس میں شریک ہوں ان میں سے کسی کی حالت نہ بدلے اور جلسہ کامیاب ہو جائے۔

دیکھئے اب آپ لوگ اسی مضمون کو کیسا سُن رہے ہیں لیکن اس کا سُننا آسان نہیں ہے یوں زبان سے تو آپ بھی بہت زور دار لفظوں میں اس کی تائید کر دیں گے مگر کسی کی بات کو دل سے سُنا جائے اور عمل کرنے کے لئے سنا جائے اس زمانہ میں بڑا مشکل ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ؛ انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال ۔ یعنی کہنے والے کی بات کو دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے اس کی ذات کو نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے۔

مرد باید کہ گیرد اندر گوش
در نبشت ست پند بر دیوار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو صرف معاد یعنی امور آخرت ہی کی تعلیم نہیں فرمائی بلکہ آپ نے معاش یعنی دُنیوی زندگی گذارنے کا طور طریقہ بھی سکھلایا اور یہ اس لئے کہ انسان مدنی الطبع ہے اپنی ضروریات دنیوی کی تحصیل میں دوسروں کا محتاج ہے لہٰذا

بدون ابنائے جنس کی اعانت اور ان سے میل جول کے اس دنیا میں کسی کا کام چل ہی نہیں سکتا اور چونکہ سب سے زیادہ مضر چیز اس زندگی میں انسان کے لئے عداوت ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اسباب بھی بیان فرما دیئے اور ایسے ایسے قواعد اور قوانین مقرر فرمائے کہ ان پر عمل کرنے کے بعد عداوت باقی ہی نہیں رہ سکتی۔ اب آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ جب لوگوں کے قلوب ہی باہم ملے ہوئے نہ ہوں تو پھر یہ ہمارا اجتماع بھی کوئی اجتماع ہے اور جب آپس میں میل و محبت صداقت اور اخوۃ رہے گی تو باہم بغض و عداوت کی گنجائش ہی کب باقی رہ سکتی ہے کیونکہ عداوت ضد ہے صداقت کی اور بغض ضد ہے محبت کی جب قلوب میں محبت اور عمل میں صداقت آگئی تو پھر قلب میں بغض اور ظاہر میں عداوت کب باقی رہ سکتی ہے۔

سنئے حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ بنی الحکم آپ کے منبر پر چڑھ اتر رہے ہیں۔ بس صبح کو نہایت غصہ کی حالت میں اٹھے اور فرمایا کہ میں نے بنی الحکم کو دیکھا کہ میرے منبر پر اس طرح سے کود اچھل رہے ہیں جیسے بندر کودا کرتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ راوی الحدیث فرماتے ہیں کہ پھر اس دن سے میں نے آخر عمر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنستے نہیں دیکھا۔ یہ اس لئے ہوا ہوگا کہ آپ نے سمجھا کہ میرے بعد ان لوگوں کا اس پر قبضہ ہو جائے گا۔ اس غم میں پھر آپ کو کبھی ہنسی نہیں آئی دیکھا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے اختلاف اور ان کے شیرازہ منتشر ہونے کا کس قدر غم تھا۔ آج ہم کو اس کا بھی کچھ احساس نہیں رہ گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنی امت پر چھ چیزوں کا خوف کرتا ہوں۔

امرۃ الصبیان یعنی لڑکےؑ کا امیر ہوگا۔ سپاہیؑ کی زیادتی ہوگی اور رشوتؑ کی گرم بازاری ہوگی۔ قطعؑ رحمی عام ہو جائے گی۔ قتلؑ معمولی چیز ہو جائے گی۔ قرآنؑ شریف کو مزامیر بنا لیا جائے گا اور اس کے ساتھ گانا گایا جائے گا۔

اسی کو میں نے کہا تھا کہ ایک تو وہ قیدی ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ہتھکڑی اور پیر میں بیڑی ہو تو اس کو وہ کاٹ بھی سکتا ہے لیکن جو شخص کہ ہویٰ کا قیدی ہے اس کو اس قید سے چھڑانا بڑا مشکل ہے ظاہری قید والا تو ہو سکتا ہے کہ مظلوم بھی ہو لیکن اسیر النفس تو ظاہر ہی ہوتا ہے اب جو شخص اس اسیر کو اس کے قید سے نکالنے کی سعی کرتا ہے اور اس کو اس سے

چھڑاتا ہے بڑی ہمت والا ہے اب آپ خود خیال فرمائیے کہ جو اہل اللہ کہ نفس اور ہویٰ کی قید سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی قید میں کرتے ہیں ان کا کتنا بڑا احسان ہے اور ہوی (نفس) کے قیدی میں ایک فرق یہ ہے کہ نفس کا قیدی تو یہ چاہتا بھی ہے کہ اس قید سے نکل کر باہر ہو مگر اللہ تعالیٰ کا قیدی اس قید پر فخر کرتا ہے اور اس قید سے نکلنا نہیں چاہتا۔ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ

اسیرت نخواہد رہائی ز بند شکارش نجوید خلاص از کمند

یعنی تیرا قیدی قید اور بند سے رہائی نہیں چاہتا اور تیرا شکار کمند سے خلاصی نہیں طلب کرتا اسی کو حضرت حافظ فرماتے ہیں۔ ؎

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد کہ بستگان کمند تو رستگارانند

یعنی اے حافظ خدا کرے تم اس تابدار زلف سے خلاصی نہ پاؤ کیونکہ تیرے کمند کے جو قیدی ہیں وہ آزاد ہی ہیں یہ کمند وہ ہے جس میں رہنے کو انبیاء علیہم السلام اور اولیاء فخر کرتے ہیں اور خود کو اس میں قید ہی رکھنے پر خوش ہیں بعض قید اور بند ایسی ہی ہوتی ہے کہ خود قیدی اس پر فخر کرتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ حج کے موقع پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح فرمائے روایت میں ہے کہ ان میں سے ہر اونٹ آپ کی طرف گردن لپکا رہا تھا کہ آپ پہلے اس کو ذبح فرمائیں۔ سبحان اللہ کس قدر محبوبیت تھی آپ کی کہ انسان تو انسان جانور تک آپ سے اس درجہ محبت رکھتے تھے کہ ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ آپ پہلے اس کو ذبح کریں ؎

داغ جاتے تو ہیں مقتل میں یہ اول سب سے دیکھئے وار کرے وہ ستم آرا کس پر

کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سر خود نہادہ برکف بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

جنگل کے سب ہرن اپنے اپنے سروں کو ہتھیلی پر لئے ہوئے اس اُمید پر موجود ہیں کہ شاید کسی دن تو شکار کو آجائے۔

جب اونٹوں کا یہ حال تھا تو اس سے اندازہ کیجئے کہ صحابہؓ کی فدائیت کا کیا عالم رہا ہوگا ان حضرات کا تو تکیہ کلام ہی یہ لفظ تھا کہ فداک ابی وامی۔ ایک صحابی جہاد میں لڑ رہے تھے آپ ان سے فرمایا کہ ہاں مارو فداک ابی و امی۔ آپ کی زبان مبارک

سے اپنے متعلق یہ کلمات سُن کر وہ صحابی ذبح ہی تو ہو گئے ہوں گے۔ ساری عمر اس پر فخر فرماتے رہے کہ ہم لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فداک ابی و امی کہتے تھے اور حضورؐ نے مجھے یہ فرمایا غرض بعض قیدیں بلکہ بعضا ذبح ایسا ہوتا ہے کہ خود مذبوح ذابح کا احسان مند ہوتا ہے اور قیدی اس قید ہی پر فخر کرتا ہے۔

ہم تڑپنے سے چھٹیں گے تو ہماری فکر سے
ذبح کر احساں ترا مانیں گے اے صیاد ہم

افسوس کہ جن دو دولتوں کی جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا تھا آج ہم دونوں سے محروم ہیں یعنی نہ تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہمارا تعلق درست ہے اور نہ آپس ہی میں کچھ اُلفت و محبت ہے۔

بزرگان دین نے فرمایا ہے کہ بہت زیادہ دوستی اور عداوت دونوں چیزوں سے دور رہو کیونکہ دُشمنی تو قلب کا ناس کر ہی دیتی ہے دوستی سے بھی آدمی کو نقصان پہنچتا ہے اس لئے کہ یہ لوگ بھی سارا وقت لے لیتے ہیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ

خود چہ جائے جنگ و جدلے نیک و بد　　　کایں دلم از صلحہا ہم می رسد

جس دل میں ایسے ایسے غیرے نتھوخیرے ہوں اس کو اللہ تعالیٰ کے تعلق اور اس کی یاد کی کہاں فرصت ہو سکتی ہے یہ لوگ نماز میں بھی عداوت ہی کا حساب لگاتے ہوں گے جس طرح سے کہ ایک عورت سودا بیچتی تھی اور صرف مغرب کی نماز پڑھتی تھی لوگوں نے اس سے پوچھا کہ بڑی بی یہ تم صرف ایک ہی وقت کی نماز کیوں پڑھتی ہو اس نے کہا کہ دن بھر سودا بیچتی ہوں تو اس کا سارا حساب نماز میں ہی یاد آتا ہے اس لئے ایک وقت کی پڑھ لیتی ہوں۔

الغرض دوستی جو زیادہ ہو وہ تو مضر ہے مگر دوستوں سے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچا ہے اور سچا دوست اگر ایک بھی مل جائے تو آدمی کو زندگی کا لطف حاصل ہو جائے دوست تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کے چہرے کو دیکھنے سے غم غلط ہو جاتا ہے۔

پہلے زمانہ کا واقعہ ہے اب کا نہیں کہ ایک صاحب اپنے دوست کے پاس رات کو گئے دروازہ پر دستک دی وہ ذرا دیر میں باہر نکلے لیکن نکلے بھی تو عجیب شان کے ساتھ بدن پر ہتھیار سجے ہوئے ایک غلام کے سر پر دسترخوان رکھے ہوئے، ہاتھ میں توڑے اشرفیوں کے لئے ہوئے اور پیچھے پیچھے ایک باندی ساتھ لئے ہوئے۔

ان دوست صاحب نے کہا کہ بھائی بہت دیر میں نکلے کیا بات ہے۔ کہنے لگے کہ تم ناوقت آئے مجھے تشویش ہوئی کہ کیا بات ہے۔ خیال ہوا کہ شاید کسی دشمن سے مقابلہ کی ضرورت ہو تو ہتھیار بند ہو کر آیا ہوں چلو تمہارے ساتھ چلوں اور اگر کھانے وغیرہ کی ضرورت ہو تو یہ خوان حاضر ہے کھاؤ اور نقدی کی کچھ ضرورت ہو تو یہ توڑے اشرفیوں کے موجود ہیں اس میں سے جتنا چاہو لے لو اور یہ بھی خیال ہوا کہ شائد رات کی تنہائی سے تم متوحش ہوتے ہو تو یہ باندی تمہاری ملک ہے اس کو لے جاؤ۔ یہ سب سُن کر انھوں نے کہا کہ نہیں بھائی مجھے ان سب چیزوں میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے میں تو صرف دیکھنے آیا تھا تمہاری صورت دیکھ لی تسلی ہو گئی جاؤ گھر جاؤ میں بھی واپس جاتا ہوں۔ السلام علیکم۔

دیکھا آپ نے کبھی ایسے ایسے بھی دوست ہوتے تھے اس میں لطف زندگی ہے یا جیسے تعلقات ہم لوگوں نے اس زمانہ میں کر رکھے ہیں اس میں راحت ہے۔ میرے خیال میں تو سب سے زیادہ فرحت آدمی کو اپنے کسی مخلص دوست سے ملاقات کے وقت ہی حاصل ہوتی ہوگی دلی دوست سے ملاقات کے وقت آدمی قلب میں ایک قسم کی قوت محسوس کرتا

ایک شخص بہت بیمار تھا طبیب سے اس کی دوستی تھی جب طبیب اس کو دیکھنے کے لئے آیا تو یہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور یہ تو واقعی دیکھا جاتا ہے کہ بعض دفعہ کسی سے ملنے سے مرض بالکل جاتا رہتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کیا وجہ ہے؟ بات یہ ہے کہ اس کی ملاقات کی وجہ سے قلب میں ایک قوت آجاتی ہے جو مرض کو دفع کر دیتی ہے تو جس طرح سے دوستی سبب ہے قلب کی قوت کا اسی طرح دشمنی سبب ہے قلب کے ضعف کا۔ آپ جب چاہئے تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ دل میں عداوت اور دشمنی کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آدمی تنہا ہو اور کوئی اس کا ساتھی نہ ہو اور قلب ان سب سے خالی ہو اور اس میں مودت اور محبت ہو تو آدمی اپنے اندر ایک قوت محسوس کرتا ہے۔

میں کہنے پر مجبور ہوں مجھے معاف کیجئے گا کہ اس زمانہ میں اخلاق خراب ہو گئے ہیں موافقت کی جانب طبیعت نہیں چلتی اور مخالفت کی طرف خوب چلتی ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ آپ کے یہ گھر والے آپ کے فریق ہوتے ہیں بیٹا ہے تو وہ باپ کا فریق ہوتا ہے یہ دوسروں کے تو ہوتے ہیں مگر گھر والوں کے نہیں ہوتے دوستوں کے

ہوتے ہیں مگر آپ کے نہیں ہوتے۔ آپ جن کی خاطر مرتے ہیں مشقت اُٹھاتے ہیں وہی آپ کے نہیں ہوتے۔ ؎

میں نے دُنیا چھوڑ دی جن کے لئے ساری دُنیا کے ہوئے میرے سوا

بات یہ ہے کہ قلب آزاد ہو گئے ہیں اخلاق خراب ہو چکے ہیں طبیعتوں میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ ظاہر کو تو لوگ درست بھی کر لیتے ہیں لیکن باطن کی درستگی کی طرف اصلا التفات نہیں ہے اس کی فکر نہیں کہ قلب میں کیا کیا امراض گھس گئے ہیں بس انھیں چیزوں نے گھن کی طرح قلب کا ناس مار رکھا ہے اور وہ امراض کیا ہیں سُنئے ایک شاعر کہتا ہے کہ ؎

كُلُّ الْعَدَاوَةِ قَدْ تُرْجٰی اِمَاتَتُهَا
اِلَّا عَدَاوَةَ مَنْ عَادَاكَ مِنْ حَسَدٍ

یعنی ہر قسم کی عداوت کے ختم ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے بجز اس عداوت کے جس کا منشا حسد ہو۔ ؎

وَعَيْنُ الرِّضَا عَنْ كُلِّ عَيْبٍ كَلِيْلَةٌ
وَلٰكِنَّ عَيْنَ السُّخْطِ تُبْدِیْ مُسَاوِيَا

یعنی رضا اور دوستی کی آنکھ تو ہر عیب کی طرف سے اندھی ہوتی ہے لیکن ناراضی کی آنکھ عیبوں کو ظاہر کرتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ بزرگوں نے جو یہ فرمایا ہے تو کیا یوں ہی فرمایا ہے؟ ان حضرات نے ان چیزوں کو اور ان لوگوں کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے تب یہ فرمایا ہے۔

ایک شخص نے مجھے خط لکھا ہے کہ ایک صاحب نے عورت کے سر کے بال کاٹ کر اس کو گھر سے نکال دیا۔ مجھے یہ سُن کر بیحد تکلیف ہوئی اتنی تکلیف کہ میں ٹوپی اُتار کر ٹہلنے لگا جیسے کوئی مضطرب ٹہلتا ہے اور میں نے کہا کہ اگر مجھے ایسی بات نہ لکھتے تو اچھا تھا اور میں نے خیال کیا کہ جب اس واقعہ سے محض سُن کر میرا یہ حال ہے تو اس گھر کا کیا حال ہوگا جس میں کہ یہ واقعہ ہوا ہے آج کل انھیں حالات کی وجہ سے لوگوں کا گھر دوزخ کا نمونہ ہو رہا ہے اور اس سے نکلنے کی کوشش تو بعد کی چیز ہے اس کو سمجھا بھی نہیں جاتا۔

اب آخر میں کنز العمال سے ترک خصومت اور جدال کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد نقل کرتا ہوں جس کا ہر وقت پیش نظر رکھنا اخوت کے قیام اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے کیونکہ اخوت اسی وقت باقی رہ سکتی ہے جب کہ انسان عداوت اور اسباب عداوت سے اجتناب کرے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:۔

ایاکم و معادات الرجال فانھم لا یخلون من ضربین من عاقل یمکر بکم او جاھل یعجل بکم بما لیس فیکم۔ واعلموا انہ الکلام ذکر والجواب انثیٰ و حیث ما اجتمع الزوجان فلا بد من انتاج ثم انشا یقول ؎

سلیم العرض من حذر الجوابا
و من داری الرجال فقد اصابا
و من ھاب الرجال تھیبوہ
و من حقر الرجال فلن یھابا

اپنے آپ کو لوگوں کی دشمنی سے بچاؤ اس لئے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں یا تو عاقل ہوگا تو تمہارے ساتھ خفیہ تدبیر کرے گا یا جاہل ہوگا تو ایسی چیز کے کہدینے میں جلدی کرے گا جس سے تم بری ہوگے اور یہ جان لو کہ کلام گویا ایک نر ہے اور اس کا جواب مادہ ہے اور جہاں کہیں نر مادہ جمع ہو جائیں تو بچہ کا ہونا ضروری ہو جاتا ہے (اور یہاں سوال و جواب کا نتیجہ یہی عداوت ہے)

پھر آپ نے یہ اشعار پڑھے ؎

آبرو اس شخص کی محفوظ رہتی ہے جو جاہل کی بات کے جواب دینے سے احتراز کرے۔ اور جس شخص نے لوگوں سے مدارات کا معاملہ کیا اس نے نیک کام کیا اور جو شخص دوسروں کا لحاظ کرتا ہے تو دوسرے لوگ بھی اس سے ڈرتے ہیں۔ اور جو شخص دوسرے لوگوں کی تحقیر کرتا ہے تو اس سے بھی ڈرا نہیں جاتا یعنی اس کی بھی بے رغبتی ہوتی ہے۔

بیان اخوت کے مناسب صراط مستقیم سے ایک مضمون نقل کرتا ہوں جو اصلاح کے لئے نہایت ضروری ہے

"افادہ"

ہر مسلمان را از دو چیز پرہیز واجتناب لازم است اول کبر یعنی تکبر کہ آدمی خود را بہتر و بلند تر داند و مدام تعلی و بزرگی خود جوید چہ ایں خصلت قبیح انساں را بہ کبر می رساند ازیں جہت اقبح است از دیگر اعمال و خصائل۔

ہر انسان کو ان دو چیزوں سے اجتناب اور پرہیز ضروری ہے اول کبر یعنی یہ کہ آدمی اپنے کو دوسروں سے بہتر اور بالاتر سمجھے اور ہمیشہ اپنے لئے بزرگی اور بڑائی کی ہی فکر میں لگا رہے۔ اس کا ترک اس لئے ضروری ہے کہ یہ چیزیں انسان کو متکبر بنا دیتی ہیں اور تکبر خدا ہی کو زیبا ہے) اس لئے اور دوسرے اعمال وخصائل سے یہ زیادہ قبیح ہے۔

در حدیث شریف است لایدخل النار احد فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من ایمان ولایدخل الجنۃ احد فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من کبر۔ دویم افساد وخرابی انداختن درمیان جماعتے از مسلمین و ایں مراتب بسیار دارد و باعتبار عموم وشمول امکنہ و ازمنہ۔ افساد اہل یک خانہ است و افساد اہل یک شہر است و افساد اہل اقلیم وافساد اہل چند اقلیم و ہمچنیں افساد یک قرن یا دو قرن یا زیادہ ازاں۔ و اعلائے آں افسادی است کہ تا مرو

حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص کے قلب میں رائی کے برابر ایمان ہوگا وہ دوزخ میں نہ جائے گا۔ اسی طرح آیا ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر کبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا دوم مسلمانوں کی جماعت میں فساد اور اختلاف واقع کرنا یہ بھی بہت بڑا ہے اور اس سے بھی اجتناب لازم ہے اور جگہ یا زمانہ کے عام اور شامل ہونے کے اعتبار سے اس افساد کے بہت سے مراتب ہیں۔ مثلاً صرف ایک گھر کا فساد یا ایک شہر کا فساد یا ایک اقلیم میں رہنے والوں کا فساد یا چند اقلیم میں بسنے والوں کا فساد (یہ تو مکان کے لحاظ سے ہوا) اور زمان کے لحاظ سے) مثلاً ایک قرن یا دو قرن یا اس سے زیادہ زمانہ تک کا فساد اور ان سب میں بڑا وہ فساد ہے جس میں ایک زمانہ گذر جائے اور عرصہ دراز تک وہ باقی رہے مثلاً

و دہور از قرن متطاولہ باقی است مثل افساد بلوائیان شہادت حضرت عثمان رضؓ کہ تمام قرون ایں امت را اثر آں افساد محیط شدہ و اول افسادیست کہ دریں امت پیدا گشتہ۔

و افساد را انواع بسیار است گاہی قتل می بود گاہے اہانت و گاہے تجسس عیوب و گاہی مشورت بد دادن و ایں امور ہم بہ نسبت اشخاص در معنی افساد متبدل می شود مثلاً کشتن رئیس یک محلہ کہ موجب انتظام امور معاش و معاد بود مرتبہ دارد و قبح کشتن بادشاہ عادل ضابط کہ بموجب برہمی امور خلائق باشد افسادیست کہ قبح آں بہزار ہا مراتب زائد از قبح اول است۔

ہمچنیں کشتن قیم مسجدیکہ چند کس از مسلمین بسببش در مسجد بنابر نماز جمع می شوند قبح است و کشتن عالمے باکمال کہ حلال مشکلات و مرجع خاص و عام خلائق بودہ مصداق امام اعظم وقت و بخاری عہد و غزالی زماں گشتہ باشد قبحی و شناعتی دارد کہ پایاں آں نیست و بر کشتن قیاس باید کرد اہانت و تجسس عیوب را۔

و ہر قدر افساد سخت تر برہمی ایمان

وہ فساد جو بلوائیوں نے حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے موقع پر کیا تھا جس کے اثر نے اس امت کے تمام زمانہ کا احاطہ کرلیا ہے اور وہی سب سے پہلا فساد ہے جو اس اُمت میں پیدا ہوا۔

(پھر یہ سمجھو کہ)

فساد کے بہت سے طریقے ہیں کبھی قتل اس کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کبھی کسی کی اہانت ہی سبب فتنہ ہوجاتا ہے اور کبھی عیوب کی تفتیش اور تجسس اور کبھی کسی کو غلط مشورہ دے دینا بھی منشار فساد بن جاتا ہے اور یہ سب چیزیں بھی مختلف لوگوں کے اعتبار سے فساد کے مختلف درجات اختیار کرلیتی ہیں مثلاً محلہ کے کسی ایسے رئیس کا قتل جو لوگوں کے معاش اور معاد کے انتظام کا ذریعہ تھا بُرائی میں ایک مرتبہ رکھتا ہے لیکن کسی ایسے عادل منتظم بادشاہ کا قتل جو کہ مخلوق کے امور کے برہمی کا باعث ہو ظاہر ہے کہ ایک ایسا فساد ہے کہ جس کا قبح پہلے کے قبح سے ہزار درجہ زائد ہے۔

اسی طرح سے کسی مسجد کے منتظم کو مار ڈالنا جس کی وجہ سے انتظام مسجد درست تھا لوگ نماز کے لئے جمع ہوتے تھے نہایت بُری بات ہے لیکن کسی عالم باکمال کو جو کہ لوگوں کی مشکلات کو حل کرتا ہو اور مرجع خلائق خاص و عام ہو اور مصداق اس کا ہو کہ اس کو وقت کا امام اعظم اور بخاری وقت کہا جائے اور وہ غزالی زماں بھی ہو ایسے شخص کو مار ڈالنا یہ اس درجہ قبیح اور مذموم ہے کہ اس کی کچھ انتہا ہی نہیں ہے اور قتل کرنے ہی پر اہانت اور تجسس عیوب کو بھی قیاس کرنا چاہئے اور جس قدر کہ فساد سخت تر

بیشتر و سبب افزونی قبح ایں کار زشت
آں است کہ از افساد اتلاف حقوق
ناس و تخم گناہاں کثیر کہ تا مدتہا باقی ماند
می شود و آں قدر و بال آں بر مفسد
فتنہ انگیز تراکم می شود کہ در غضب الٰہی
گرفتار شدہ بانجام بد و خاتمہ سوء از دُنیا
میرود و مایوس از مغفرت و رحمت الٰہی
می گردد۔ و از ظلم ہم احتراز لازم است
کہ فی الحقیقت منشاء ظلم یا کبر ست
یا افساد پس در ظلم شعبہ کبر خواہد بود یا شعبہ
از افساد و اجتناب از کبر و افساد تمام نخواہد شد
مگر باجتناب از ظلم در حدیث شریف است۔ الا
اخبرکم بافضل من درجۃ الصیام
والصدقۃ والصلوٰۃ قالوا بلیٰ قال
اصلاح ذات البین وافساد
ذات البین ھی الحالقۃ
(صراط مستقیم صہ)

ہوگا اسی قدر برہمی ایمان زیادہ ہوگی اور اس امر قبیح کے
سبب سے زیادہ شنیع ہونے کا سبب یہ ہے کہ فتنہ و فساد
سے لوگوں کی حق تلفیاں ہوتی ہیں نیز بہت سے ایسے
گناہوں کی تخم ریزی ہوتی ہے جو زمانہ دراز تک باقی رہتے
ہیں اور ان سب کا وبال اس مفسد فتنہ انگیز پر اسی
طرح سے مسلسل پڑتا رہتا ہے کہ وہ غضب الٰہی میں گرفتار
ہوکر انجام بد اور سوء خاتمہ سے دوچار ہوکر دُنیا سے جاتا
ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت سے بالکل مایوس
ہوجاتا ہے اور ظلم کرنے سے بھی احتراز کرنا چاہئے کیونکہ درحقیقت
اس کا بھی منشا یا تو کبر ہوتا ہے یا فساد پس ہر ظلم میں
یا تو شعبہ کبر کا ہوگا یا فساد کا اور کبر اور فساد سے کامل
طور سے بچاؤ ہو نہیں سکتا بجز اس کے کہ ظلم ہی سے بچا جائے
حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا کہ کیا میں
تم کو ایسی چیز نہ بتلاؤں جو درجہ میں نماز روزہ اور صدقہ سے
بھی بڑھ کر ہو صحابہؓ نے عرض کیا بیشک فرمائیے آپ نے فرمایا
کہ لوگوں کے باہمی نزاعات کی اصلاح کر دینا اور یہ فرمایا کہ
لوگوں میں آپس میں فساد ڈالنا یہ تو دین کو مونڈنے والی
چیز ہے۔ بس اب آخر میں اس دُعا پر ختم کرتا ہوں۔

اللّٰھم بارک لنا فی اسماعنا وابصارنا وقلوبنا وازواجنا وذریاتنا وتُب علینا
انک انت التواب الرحیم۔

(ختم شد)

نصیحت

"خود را معطل و مہمل نگذارند کارِ عقبیٰ بسازند۔ و اگر
نتوانند کارِ دنیا از دست ندہند۔" *

یعنی منجملہ نصائح کے ایک نصیحت یہ فرماتے ہیں کہ اپنے کو معطل اور مہمل نہ چھوڑیں بلکہ آخرت کا اور دین کا کام کریں اور اگر یہ نہ کرسکیں تو دنیا کا کام ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ دنیا ہی کا کام کریں یعنی کوئی ہنر یا پیشہ ہی سیکھیں تاکہ دنیا ہی کی جانب سے مطمئن ہوجائیں باقی یہ کہ آدمی نہ دین کا ہو نہ دنیا کا یہ شخص نکما ناکارہ اور بطال ہے یہ صفت عند الشرع منکر ہے۔ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ

إِنِّي لَأَكْرَهُ أَنْ أَرَى أَحَدَكُمْ سَبَهْلَلًا لَا فِي عَمَلِ دُنْيَا وَلَا فِي عَمَلِ آخِرَةٍ

(التیسیر المہذب ص۹۳)

یعنی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں تم میں کسی شخص کو سبہلل دیکھنا پسند نہیں کرتا اور سبہلل ہونا یہ ہے کہ آدمی نہ دین کا کام کرے نہ دنیا کا۔

یہی میں لوگوں سے کہتا تھا کہ بھائی تم سے اگر دین نہیں پڑتا تو دنیا ہی کما لو۔ دنیا کی جانب سے جب مطمئن رہوگے تو دین بھی حاصل کرلوگے۔ ورنہ جب تمھارا ہوش و حواس اور عقل و فکر ہی درست نہ رہے گی تو تم دین بھی نہ اختیار کرسکوگے۔ چنانچہ آج جن لوگوں کو دنیا کی طرف سے فارغ دیکھتا ہوں انھیں کو دین کے کام میں بھی لگا ہوا دیکھ رہا ہوں اور جس کی دنیا تباہ ہے اُسکا دین اس سے زیادہ برباد ہے۔ یہ امر مشاہد ہے اس لئے شاہ صاحبؒ کی یہ نصیحت بہت پسند آئی۔ ضرورت ہے کہ لوگ اس کو برابر پیش نظر رکھیں۔ اور حرزِ جان بنائیں۔

قال اللہ تعالیٰ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

(اے ایمان والو! اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ)

بفحوائے ارشاد رب العباد رسالہ

تعلیم وتربیتِ اولاد

(از افادات)

مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا ومرشدنا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ

سرورق احمد حسین لکھنوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعلیم وتربیت اولاد

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

اما بعد۔ فقد قال اللہ تعالیٰ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا ؕ

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو آگ (یعنی دوزخ) سے بچاؤ۔

قال ابوبکر جصاص رازی فی تفسیرہ مطلب۔ یجب علینا تعلیم اولادنا واھلینا۔ روی عن علیؓ فی قولہ تعالیٰ قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ قال علموا انفسکم واھلیکم الخیر۔ وقال الحسنؒ تعلمھم و تامرھم وتنھاھم۔ قال ابوبکرؒ وھذا یدل علی ان علینا تعلیم اولادنا واھلینا الدین والخیر ومالا یستغنی عنہ من الادب وھو مثل قولہ تعالیٰ وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَ اصْطَبِرْ عَلَیْھَا ؕ

حضرت ابوبکر جصاص رازیؒ اپنی تفسیر احکام القرآن میں اس کے متعلق یہ عنوان قائم فرماتے ہیں کہ:۔

"بیان اس کا کہ ہمارے ذمہ اپنی اولاد اور اپنے اہل وعیال کی تعلیم واجب ہے" اور اس کے تحت لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے آیۃ شریفہ قوا انفسکم الایۃ کی تفسیر میں منقول ہے کہ اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو خیر (یعنی علم اور ہر قسم کی بھلائی) سکھلاؤ اور حضرت حسنؒ[1] فرماتے ہیں کہ ان کو علم سکھاؤ، نیکیوں کا حکم کرو اور برائیوں سے انھیں منع کرو۔ آگے ابوبکر رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہمارے ذمہ لازم ہے کہ ہم اپنی اولاد کو اور اپنے اہل وعیال کو دین، علم اور ہر بھلی بات اور ان تمام آداب کی تعلیم دیں جو ان کے لئے ضروری ہیں۔ اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہیے

[1] اس سے مراد حضرت حسن بصریؒ ہیں۔

اور خود بھی اس کے پابند رہئیے۔

ونحو قوله تعالى للنبي صلى الله عليه وسلم وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ۔

نیز ایسا ہی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمانا کہ آپ اپنے نزدیک کے کنبہ کو ڈرائیے۔

فكلما قرب منا هو أحرى في لزومنا تعليمهم وامرهم بطاعة الله تعالى

لہٰذا ہم سے جو جسقدر زیادہ قریب ہے وہ زیادہ مستحق ہے کہ ہم اسکو تعلیم دیں اور اللہ تعالیٰ کی طاعت کا اس کو حکم کریں۔

ويشهد له قول النبي صلى الله عليه وسلم كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته ومعلوم ان الراعي كما عليه حفظ من استرعى رحمايته والتماس مصالحه فكذالك عليه تاديبه وتعليمه وقال عليه السلام فالرجل راع على اهله وهو مسئول عنهم والامير راع على رعيته وهو مسئول عنهم +

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اس پر شاہد ہے کہ "تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت (ماتحت) کا سوال ہوگا۔ اور یہ بات معلوم ہی ہے کہ راعی کے ذمہ جس طرح سے ماتحتوں کی حفاظت اور حمایت ضروری ہے اور ان کی مصالح کا بندوبست لازم ہے اسی طرح سے اسکے ذمہ ان کو تعلیم دینا اور ادب سکھانا بھی واجب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ انسان اپنے اہل کیلئے راعی ہے اور اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا۔ (مطلب ہے کہ اولاد ہر شخص کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اب اسکے درست رکھنے کی کوشش کرنا تو امانت کا حق ادا کرنا ہے اور اس میں غفلت کرنا خیانت ہے، اور اسی خیانت کی بازپرس حق تعالیٰ کے یہاں ہوگی کہ تم نے اس امانت کو کیوں ضائع اور برباد کیا۔ تمہاری اس خیانت سے جس جس کی عاقبت خراب ہوگی اس کے تم ذمہ دار ہو) اور امیر (یعنی بادشاہ) اپنی رعایا کا راعی ہے۔ اس سے ان کے متعلق سوال کیا جائیگا۔

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح راعی میں پیر اور استاد بھی داخل ہیں اور اہل میں مریدین اور طلبہ داخل ہیں یعنی پیر سے مریدین کی بابت سوال ہوگا اور استاد طالبعلموں کا ذمہ دار ہے اس سے ان کے بارے میں پوچھ ہوگی کیونکہ ایک دوسری روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته کا عام اور کلی حکم بیان فرمانے کے بعد اس کی متعدد جزئیات بھی بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ شیخین کی ایک حدیث میں ہے۔

عن عبد الله بن عمر رض قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته

حضرت عبد اللہ ابن عمر رض فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے کہ ہر شخص راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔

الامام راع ومسئول عن رعیته والرجل راع فی اھله وھو مسئول عن رعیته والمرأۃ راعیۃٌ فی بیت زوجھا ومسئولۃ عن رعیتھا۔

چنانچہ امام بھی راعی ہے اور اس سے اپنی رعیت کے متعلق سوال ہوگا۔ اور آدمی اپنے اہل وعیال کا راعی ہے اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے مکان میں راعیہ ہے لہذا اس سے اس کے متعلق سوال ہوگا۔

والخادم راع فی مال سیدہ ومسئول عن رعیته قال وحسبت ان قد قال الرجل راع فی مال ابیه وھو مسئول عن رعیته وکلکم راع ومسئول عن رعیته۔

(رواہ البخاری ومسلم)

(الادب النبوی ص۶۵)

خادم اپنے سید اور مالک کے مال میں راعی ہے اس سے اس کے بارے میں پوچھ ہوگی۔ راوی کہتے ہیں کہ خیال ہوتا ہے کہ آپ نے شاید یہ بھی فرمایا کہ انسان راعی ہے۔ اپنے باپ کے مال میں اور اس سے اسکے متعلق بازپرس ہوگی اور تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اس سے اپنی رعیت (ماتحت) کے بارے میں سوال ہوگا۔

آگے پھر ابوبکر رازی کا قول نقل کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ :۔

وحدثنا عبد الباقی بسندہ عن سالم عن ابیه عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال ما نحل والد ولداً خیراً من ادب حسن۔

ہم سے عبدالباقی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سالم سے اور وہ اپنے والد سے اور وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ کسی باپ نے اپنے بیٹے کو حسن ادب سے بڑھ کر کوئی عطیہ نہیں دیا۔

میں کہتا ہوں کہ آج مال وجائداد کو تو سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور علم وادب کی کوئی قدر نہیں ہے۔ اگر کسی باپ نے اپنی اولاد کے لئے مال ومتاع نہیں چھوڑا تو گویا اس نے اس پر ظلم کیا۔ چاہے اس نے علم وادب اور تہذیب اخلاق سے ان کو کتنا ہی آراستہ کیوں نہ کر دیا ہو۔

یہ آیت اور یہ حدیث اس خیال کی تردید کرتی ہیں۔

وحدثنا عبد الباقی بسند اٰخر عن عطاء عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم حق الولد علی والدہ ان یحسن اسمه ویحسن ادبه۔

نیز عبدالباقی دوسری سند سے حضرت عطاءؒ سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ والد پر اولاد کا یہ حق ہے کہ اس کا نام اچھا رکھے اور اس کو حسن ادب سکھلائے۔

آج کتنے لوگ ہیں جن کا اس پر عمل ہے؟ حالانکہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین پر اولاد کے بھی کچھ حقوق ہیں لوگ ان کی ادائیگی میں تو کوتاہی کرتے ہیں اور پھر شکایت اس کی ہے کہ ہماری اولاد نافرمان ہے۔ اس پر ایک واقعہ سنئے!

"حضرت عمرؓ کے دربار میں ایک باپ نے اپنے بیٹے پر دعوی کیا کہ یہ میرے حقوق ادا نہیں کرتا۔ حضرت عمرؓ نے لڑکے سے دریافت کیا۔ اس نے کہا اے امیر المومنین کیا باپ ہی کا سارا حق اولاد پر ہے یا اولاد کا بھی باپ پر کچھ حق ہے؟

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اولاد کا بھی باپ کے ذمہ حق ہے۔ کہا میں ان حقوق کو سننا چاہتا ہوں، فرمایا اولاد کا حق باپ پر یہ ہے کہ اولاد حاصل کرنے کے لئے شریف عورت تجویز کرے اور جب اولاد پیدا ہو ان کا نام اچھا رکھے اور جب ان کے ہوش درست ہو جائیں ان کو تہذیب اور تعلیم دین دے۔ لڑکے نے کہا کہ میرے باپ نے ان حقوق میں سے ایک حق بھی ادا نہیں کیا۔ کیونکہ اس نے ایسی باندی کو میری ماں بنایا ہے جو آوارہ گردتھی اور جب میں پیدا ہوا تو میرا نام جُعَل رکھا (جس کے معنی ہیں گوہ کا کیڑا) اور مجھے دین کا ایک حرف نہیں سکھلایا۔ مجھے دینی تعلیم سے بالکل کورا رکھا۔ یہ سنکر حضرت عمرؓ کو باپ پر بہت غصہ آیا اور اسکو دھمکایا اور یہ کہہ کر مقدمہ خارج کر دیا کہ جاؤ پہلے تم اپنے ظلم کی مکافات کرو اس کے بعد لڑکے کے ظلم کی فریاد کرنا۔" انتہی۔

دیکھئے اس واقعہ سے یہ نکلا کہ جب باپ اس طرح سے حق تلفی کرے تو پھر بیٹا اگر اس کی نافرمانی کرے تو اس پر الزام نہیں ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کل اولاد جو والدین کی نافرمان ہوتی ہے تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالی نے ان کے بھی حقوق والدین کے ذمہ رکھے تھے جس کی ادائیگی میں ان لوگوں سے کوتاہی ہوتی ہے تو جب یہ اللہ تعالی کے مقرر کردہ حقوق ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالی بھی اس کی دنیوی سزا اور عذاب یہ دیتے ہیں کہ ان کی اولاد کو ان کا نافرمان بنا دیتے ہیں۔ ع

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

اور یہ عین عدل ہے کیونکہ جب انھوں نے اس کے حقوق نہیں ادا کئے تو اولاد سے کیوں مطالبہ ہے اور جب وہ بھی ان کے حقوق ادا نہیں کرتے تو بھناتے کیوں ہیں؟

آگے پھر امام رازیؒ کا قول نقل کرتا ہوں سنئے:۔

فرماتے ہیں کہ۔

محمد بن عبد الرحمن عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا بلغ اولادکم سبع سنین فعلموھم الصلوۃ واذا بلغوا عشر سنین فاضربوھم علیھا وفرقوا بینھم فی المضاجع +

سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہاری اولاد سات برس کی ہوجائے تو اس کو نماز سکھلاؤ اور جب دس برس کی ہوجائے تو ان کو (ترک) نماز پر مارو اور سونے میں باہم انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کردو یعنی الگ الگ سلاؤ۔

(احکام القرآن ج ۳ ص ۴۶۷)

ابوداؤد شریف میں یہی حدیث ان لفظوں سے آئی ہے :۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہٖ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مروا اولادکم بالصلوۃ وھم ابناء سبع سنین واضربوا ھم علیھا وھم ابناء عشر وفرقوا بینھم فی المضاجع - قال صاحب بذل المجھود ای فرقوا بین الاخ والاخت مثلاً فی المضاجع لئلا یقعوا فیما لا ینبغی لان بلوغ العشر مظنۃ الشھوۃ

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اولاد کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم کرو اور دس برس کے ہوجائیں تو اس پر ان کو مارو اور اب سے علیحدہ بستر پر سلایا کرو (یعنی بھائی کو بہن سے، لڑکے کو ماں سے۔ لڑکی کو باپ سے بلکہ بھائی کو بھی دوسرے بھائی سے الگ سلاؤ تاکہ کسی نامناسب حال میں نہ واقع ہوجائیں اس لئے کہ دس سال کی عمر میں شہوت پیدا ہوجایا کرتی ہے)۔

(بذل المجھود ص ۲۷۸ ج ۱)

نیز حدیث شریف میں یہ جو فرمایا کہ واضربوھم علیھا یعنی دس سال کی عمر میں نماز پر انھیں مارو تو اس کے متعلق علما فرماتے ہیں کہ علیھا کے معنی علی ترکھا کے ہیں یعنی نماز کے ترک کرنے پر انھیں مارو۔

ایک مرتبہ مجھے یہ خیال ہوا کہ حدیث میں تو ترک کا لفظ آیا نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ترکھا بھی تو فرما سکتے تھے پھر آخر اس کے ترک میں کیا نکتہ ہے۔ اس سلسلہ میں مجمع البحار دیکھا تو اس میں ضرب کا صلہ جب علی آتا ہے تو اس کی مثال بیان کی ہے کہ :۔

یضربوننا علی الشھادۃ والعھد لوگ ہم کو شہادت اور عہد پر مارتے تھے۔ اس

ای یأدبوننا ویأمروننا بالکف عنہا والاحتیاط فیہا وعدم استعمالہا (ص ۲۰۳ ج ۲)	کا مطلب یہ تھا کہ ہم کو ادب سکھلاتے تھے اور ہم کو اس سے رکنے کا اور اس باب میں احتیاط سے کام لینے کا اور ان کو نہ استعمال کرنے کا حکم فرماتے تھے۔

اس استعمال کے دیکھنے سے واضربوھم علیہا کا مفہوم خوب واضح ہوگیا کہ یہاں بھی مراد یہ ہے کہ نماز کے باب میں اہتمام پیدا کرنے کی خاطر ان کو مارا جاسکتا ہے۔ اب خواہ ان سے ترک نماز کا صدور ہو یا تاخیر کے وہ مرتکب ہوں یا اسکو جلدی جلدی ادا کرتے ہوں۔ غرض کہ ان کے جس فعل سے بھی قلت اہتمام پایا جائے گا اس پر تنبیہ کیجائیگی تاکہ ابھی سے طبیعت میں اس کی عظمت اور اس کا احترام و اہتمام پیدا ہو۔

دیکھئے اس حدیث میں جس طرح سے کہ اولاد کے لئے تعلیم و تربیت کا حکم مذکور ہے اسی طرح سے یہ بھی بیان فرمایا گیا ہے کہ یہ فریضہ اولیاء پر عائد ہوتا ہے اور وہی اس کے مکلف ہیں۔ اس میں تدریج کی بھی رعایت فرمائی گئی ہے اور اس کے حدود بھی ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ پس اب تو یہ مسئلہ گویا منصوص ہوگیا۔ اب اپنی طرف سے خیال و عقل کی گنجائش اس میں باقی نہیں رہ گئی مسلمان کا کام منصوص پر ایمان و ایقان اور ان سے انحراف نہ کرنا ہے کوئی مسلمان اس سے انحراف کیسے کرسکتا ہے۔ اگر انحراف اعتقادی ہے تب تو اس زمرہ ہی سے خارج ہوجائیگا اور اگر صرف عملی انحراف ہے تب بھی دین سے بہت دور ہے۔ یہ مسئلہ آج کا نہیں ہے بہت قدیم ہے زمانۂ نبوت میں بھی اس کی ضرورت و اہمیت کا لحاظ و احساس کرکے حضرتِ نبوت سے اس کی تعلیم کی گئی اور اس پر امت نے ایمان کامل اور عمل کامل اختیار کیا چنانچہ ہر ہر گھر میں دین اور دینی تعلیم رائج ہوگئی گویا ہر گھر مدرسہ ہوگیا اسوجہ سے ترک تعلیم سے جو اثرات بد ہوتے اس کے ضرر سے محفوظ رہے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دھلوی رح حجۃ اللہ البالغہ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ :-

اعلم ان اللہ تعالیٰ انشاء بعد عصر التابعین نشأ من حملۃ العلم انجازا لما وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیث قال یحمل ھذا	اللہ تعالیٰ نے حضرات تابعینؒ کے بعد حاملین علم کی ایک نئی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدہ کو پورا کرنے کے لئے پیدا فرمائی۔ کیونکہ آپ نے فرمایا تھا کہ اس علم (دین) کو متدین اسلاف سے عادل اخلاف حاصل کرتے

العلم من کل خلف عدولہ تاخذوا عمن اجتمعوا معہ منہم صفۃ الوضوء والغسل والصلوۃ والحج والنکاح والبیوع وسائر مایکون وقوعہ۔ ص ۱۴۴

رہیں گے۔ لہذا عام لوگ ان اخلاف عدول میں سے جسکے ساتھ جمع ہوئے یعنی جسکی بھی صحبت پائی اسی سے وضو اور غسل کا طریقہ، نماز و حج کے مسائل اور نکاح و بیوع کے احکام اور جو جو امور کثیر الوقوع تھے ان سب کی تفاصیل معلوم کیں۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ اسلاف میں ترویج[1] علم کا یہی طریقہ تھا کہ لوگ جس ماحول میں رہتے تھے اور ان کے گرد و پیش جو مجمع ہوتا تھا اسی سے علم دین یعنی نماز و طہارت وغیرہ کے مسائل سیکھتے تھے۔ ایک اور مقام پر تو تصریح فرمادی ہے کہ لوگ اپنے آباء اور شہر کے معلمین سے دین سیکھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

وکان من خبر العامۃ انہم کانوا فی المسائل الاجتماعیۃ التی لا اختلاف فیہا بین المسلمین او جمہور المجتہدین لا یقلدون الا صاحب الشرع وکانوا یتعلمون صفۃ الوضوء والغسل والصلوۃ والزکاۃ ونحو ذلک من آبائہم او معلمی بلدانہم فیمشون حسب ذلک۔

عوام کی یہ حالت تھی کہ وہ لوگ متفق علیہا مسائل میں بھی جن میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہ تھا اور سب مجتہدین کے نزدیک وہ مسلم تھے ان میں تو صرف شارع کی تقلید کرتے تھے اور طریقۂ وضو اور غسل اور نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام اور مسائل اپنے باپ دادا سے یعنی (گھر ہی سے) سیکھتے تھے۔ یا شہر کے معلمین حضرات سے سیکھ کر اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔

(حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۳ ج ۱)

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ لوگ ابتدائی دینی تعلیم اپنے اپنے گھر ہی سیکھتے تھے یا شہر میں وہی لوگ کسی معلم کا انتظام کر دیتے یا کوئی اللہ کا بندہ از خود تعلیم کے لئے تیار ہو جاتا تو اس کے پاس جاکر ہی لوگ دین سیکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح و تعلیم محض علماء ہی کے ذمہ نہیں ہے بلکہ والدین اور معلمین کے ذمہ بھی ہے کہ بچوں کو دینی تعلیم دیں۔ میں کہتا ہوں کہ معلمین سے زیادہ ذمہ داری والدین اور اولیاء پر ہے۔ اگر یہ لوگ تعلیم و تربیت نہ کریں گے تو گنہگار ہوں گے اور جسطرح

[1] علم پھیلانا۔

سے خود عمل نہ کرنے سے فاسق ہوں گے۔ اسی طرح اولاد کی تعلیم و تربیت جوان پر فرض کی گئی ہے نہ کرنے سے فاسق گردانے جائیں گے۔

اسی کو میں نے کہا کہ امت نے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ اب کس قدر افسوس کی بات ہے کہ استطاعت تو اتنی قلت: نہ کیا جائے اور اپنی ذمہ داری کو محسوس نہ کیا جائے اور اپنی ذمہ داری سے قطع نظر کر کے اس کو صرف علماء کے سر منڈھا جائے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ؏

خود فراموشی کند تہمت دہد استاد را

کا یہی مصداق ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے امت بے گانہ ہو گی تو اس کا کہاں ٹھکانا ہو گا؟ ؎

کسانیکہ زیں راہ برگشتہ اند
برفتند و بسیار سرگشتہ اند

نیز اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوا کہ سات برس میں اولاد کو نماز کا حکم کرنا چاہیے اور دس برس کی عمر میں نماز نہ پڑھنے پر ان کو مارنا چاہیے۔ حالانکہ ان پر نماز دس برس کی عمر میں بھی فرض نہیں ہوتی لیکن یہ شریعت کا اہتمام اور حسن انتظام ہے کہ فرض کے ادائیگی کی عادت ڈالنے کے لئے اولیاء پر واجب کر دیا تاکہ فرض ہونے کے بعد پھر ان سے نہ چھوٹنے پائے۔

اور اس حدیث میں تو صرف نماز ہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے لیکن فقہاء لکھتے ہیں کہ روزہ کا بھی یہی حکم ہے۔

نیز اور دوسری اچھی چیزوں سے بھی اس عمر سے اس کو مالوف کیا جائے گا اور بری باتوں سے روکا جائیگا چنانچہ نور الایضاح میں ہے کہ:۔

تؤمر بھا الاولاد بسبع سنین	اولاد کو نماز کا حکم کیا جائے گا جبکہ وہ سات برس کی ہو جائے
وتضرب علیھا بعشر بید لا بخشبۃ۔	اور اسکو مارا جائیگا جبکہ وہ دس برس کی ہو جائے لیکن صرف ہاتھ سے مارے لکڑی سے نہیں۔
(مراقی الفلاح ص۹۳)	

دیکھئے ترک نماز پر یہاں مارنے کا حکم ضرور ہے لیکن شریعت میں اس کے حدود بھی مقرر ہیں فقہاء کے کلام سے معلوم ہوا کہ ہاتھ سے مارے لکڑی وغیرہ سے نہ مارے لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ یا تو اولاد کی جانب سے بالکل غفلت ہی برتیں گے اور یا اس کی تربیت کرنے پر اتر آئینگے تو پھر چھڑی، ڈنڈا جو بھی

سامنے آجائے گا اس سے مارنا شروع کر دیں گے اور یہ نہ دیکھیں گے کہ اس کی ناک ٹوٹ گئی یا کان پھٹ گیا یا چہرہ زخمی ہو گیا۔ یہ صریح ظلم ہے اور اس کا مصداق ہے کہ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

بہر حال نور الایضاح کی عبارت سے تو معلوم ہوا کہ اولاد کو نماز کا حکم سات سال کی عمر میں کیا جائے گا اور دس برس میں اس پر اسکو مارا بھی جائے گا۔ اسکے تحت طحطاوی میں ہے کہ

قولہ تومر بھا الاولاد ذکوراً وانا ثاً والصوم کالصلوۃ وفی الدر انہ یؤمر بالصوم والصلوۃ وینھی عن شرب الخمر و تیألف الخیر و یعرض عن الشر والظاھر منہ ان ھذا واجب علی الولی۔

(طحطاوی ص۹۳)

اولاد کو نماز کا حکم کیا جائے گا خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ اور روزہ کا بھی حکم مثل نماز کے ہے اور در مختار میں ہے کہ بچوں کو نماز اور روزہ کا حکم کیا جائے گا اور شراب وغیرہ کے پینے سے روکا جائیگا اور خیر کی ان کو رغبت دلائی جائیگی اور برائیوں سے ان کو منع کیا جائے گا اور ظاہر یہ ہے کہ یہ سب چیزیں ولی پر واجب ہیں۔

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ یہ اولاد کی تعلیم و تربیت جو ولی پر واجب ہے تو اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں داخل ہیں یعنی جس طرح سے لڑکوں کی تعلیم و تربیت واجب ہے اسی طرح سے لڑکیوں کی بھی دینی تعلیم اور تربیت اولیاء کے ذمہ لازم ہے۔

اب لڑکوں کی جانب تو کسی قدر توجہ بھی ہے لیکن لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت کی جانب اصلاً توجہ نہیں کیجاتی۔ مردوں کو تو نیک لوگوں کے پاس اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے خیر کچھ باتیں معلوم بھی ہو جاتی ہیں لیکن عورتیں تو دین سے بالکل ہی جاہل ہوتی ہیں۔ اور جب یہ خود جاہل ہوں گی تو اپنے گود کے بچوں کو کیا خاک دینی تعلیم دے سکیں گی۔ اس لئے اس زمانہ میں ضرورت ہے کہ ان کے تعلیم طرف بھی خصوصی توجہ کیجائے اور لڑکیوں کو بھی دین و مذہب سے اوائل عمر ہی میں واقف کرایا جائے اس کے ترک سے جو مفاسد رونما ہوئے ہیں وہ ہر عاقل اور تجربہ کار پر مخفی نہیں۔

جب ولی کے ذمے واجب ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کو نماز و روزہ خیر و شر۔ جائز و ناجائز حلال و حرام کی تعلیم کرے تو ظاہر ہے کہ جس جگہ بھی ان امور کی تعلیم کیجائیگی وہ مدرسہ ہی ہوگا۔ خیر القرون میں اور اس کے بعد بھی بہت زمانہ تک مسلمانوں کا اس پر عمل رہا۔ چنانچہ ہر قسم کی فلاح و

بہبود ان کو حاصل تھی لیکن آج مسلمانوں نے اپنے اس مدرسہ ہی کو ختم کر دیا ہے اور وہ ساری باتیں جو کسی زمانہ میں بچے ماں کی گود سے اور والد کی تربیت سے سیکھ کر تب تعلیم کے لئے مدرسوں میں داخل ہوتے تھے۔ آج ان تمام امور کی تعلیم بھی مدارس میں اساتذہ کو بلکہ خانقاہوں میں مشائخ کو دینی پڑتی ہے۔ ہاں یہ کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں کیا ترتیب ہونی چاہیئے اور اس کا کیا طریقہ کار ہو تو اس کے متعلق احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ :-

"ضروری ہے کہ اوائل عمر میں سب سے پہلے بچوں کو اسلامی عقائد حفظ کرائے جائیں۔"

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ضروری عقائد کا ذکر کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت مولانا تھانوی نے تعلیم الدین میں ان کو مفصل بیان فرمایا ہے۔ ہم یہاں ان کو بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔ وھو ھذا

عقائد و تصدیقات

(۱) تمام عالم پہلے بالکل ناپید تھا پھر اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے موجود ہوا۔

(۲) اللہ ایک ہے وہ کسی کا محتاج نہیں نہ اس نے کسی کو جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا کوئی اس کے مقابل کا نہیں۔

(۳) وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

(۴) کوئی چیز اس کے مانند نہیں وہ سب سے نرالا ہے۔

(۵) وہ زندہ ہے ہر چیز پر اسکو قدرت ہے۔ کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ نہیں۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے، سنتا ہے وہ جو چاہے کرتا ہے کلام فرماتا ہے وہی پوجنے کے قابل ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اپنے بندوں پر مہربان ہے بادشاہ ہے وہ سب عیبوں سے پاک ہے۔ وہی اپنے بندوں کو سب آفتوں سے بچاتا ہے۔ وہی عزت والا ہے۔ بڑائی والا ہے، پیدا کرنے والا ہے، گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ زبردست ہے، بہت دینے والا ہے، روزی پہونچانے والا ہے، جس کی روزی چاہے تنگ کر دے، فراخ کر دے، جس کو چاہے پست کر دے، جسکو چاہے بلند کر دے، جسکو چاہے عزت دے، جسکو چاہے ذلت دے، انصاف والا ہے، بردبار اور برداشت والا ہے، خدمت کی قدردانی کرنے والا ہے، دعا قبول کرنے والا ہے، اس کا

ـــــــ ابتداء۔

کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، وہ سب کام بنانے والا ہے اسی نے سب کو پہلے پیدا کیا۔ وہی قیامت میں دوبارہ پیدا کرے گا، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے، اس کو نشانیوں اور صفتوں سے سب جانتے ہیں اور اس کی ذات کی باریکی کو کوئی نہیں جانتا، گنہگاروں کی توبہ قبول کرتا ہے جو سزا کے قابل ہیں ان کو سزا دیتا ہے، وہی ہدایت دیتا ہے، نہ وہ سوتا ہے نہ اونگھتا ہے۔ وہ تمام عالم کی حفاظت سے تھکتا نہیں۔ وہی سب چیزوں کو تھامے ہوئے ہیں، اسی طرح تمام صفتیں کمال کی اسکو حاصل ہیں۔

(۶) مخلوق کی صفتوں سے وہ پاک ہے اور قرآن وحدیث میں بعضی جگہ جو ایسی باتوں کی خبر دی گئی ہے یا تو ان کے معنی کو اللہ کے سپرد کردیں وہی اس کی حقیقت جانتا ہے اور ہم بے کھود کرید کئے ہوئے ایمان اور یقین کرلیتے ہیں اور یہی بہتر ہے اور یا کچھ مناسب معنیٰ اس کے لگائے جائیں جس سے وہ سمجھ میں آجائے۔

(۷) عالم میں جو کچھ بھلا برا ہوتا ہے سب کو اللہ تعالیٰ اس کے ہونے سے پہلے ہمیشہ سے جانتا ہے اور اپنے جاننے کے موافق اسکو پیدا کرتا ہے۔ تقدیر اسی کا نام ہے اور بری باتوں کے پیدا کرنے میں بہت بھید ہیں ان کو ہر کوئی نہیں جانتا۔

(۸) بندوں کو اللہ تعالیٰ نے سمجھ اور ارادہ دیا ہے جس سے وہ گناہ اور ثواب کا کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں مگر بندوں کو کسی کام کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں ہے، گناہ کے کام سے اللہ تعالیٰ ناراض اور ثواب کے کام سے خوش ہوتے ہیں۔

(۹) اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ایسے کسی کام کا حکم نہیں کیا جو بندوں سے نہ ہوسکے۔

(۱۰) کوئی چیز خدا کے ذمہ ضروری نہیں وہ جو کچھ مہربانی کرے اس کا فضل ہے۔

(۱۱) بہت سے پیغمبر اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے بندوں کو سیدھی راہ بتلانے آئے اور وہ سب گناہوں سے پاک ہیں، گنتی ان کی پوری طرح تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ ان کی سچائی بتلانے کے لئے ان کے ہاتھوں ایسی نئی نئی مشکل باتیں ظاہر کیں جو اور لوگ ظاہر نہیں کرسکتے ایسی باتوں کو معجزہ کہتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام تھے اور سب کے بعد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی درمیان میں ہوئے ان میں بعضے بہت مشہور ہوئے مثلاً حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد

علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام۔ حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت الیسع علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت ذوالکفل علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام حضرت ہود علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام،

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

(۱۲) پیغمبروں میں بعضوں کا رتبہ بعضوں سے بڑا ہے۔ سب میں زیادہ مرتبہ ہمارے پیغمبر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور آپ کے بعد کوئی نیا پیغمبر نہیں آسکتا، قیامت تک جتنے آدمی اور جن ہوں گے آپ سب کے پیغمبر ہیں۔

(۱۳) ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جاگتے میں جسم کے ساتھ مکہ سے بیت المقدس میں اور وہاں سے ساتوں آسمانوں پر اور وہاں سے جہاں تک اللہ کو منظور ہوا پہنچایا اور پھر مکے میں پہنچا دیا اس کو معراج کہتے ہیں۔

(۱۴) اللہ تعالیٰ نے کچھ مخلوقات نور سے پیدا کر کے ان کو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ کیا ہے۔ انکو فرشتہ کہتے ہیں ان کا مرد یا عورت ہونا کچھ نہیں تبلایا گیا۔ بہت سے کام ان کے سپرد ہیں وہ کبھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے۔ ان میں چار فرشتے بہت مشہور ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام حضرت عزرائیل علیہ السلام۔

(۱۵) اللہ تعالیٰ نے کچھ مخلوقات آگ سے پیدا کر کے ان کو ہماری نظروں سے پوشیدہ کیا ہے ان کو جن کہتے ہیں ان میں نیک و بد سب طرح کے ہوتے ہیں ان کے اولاد بھی ہوتی ہے ان سب میں زیادہ مشہور شریر ابلیس شیطان ہے۔

(۱۶) مسلمان جب خوب عبادت کرتا ہے اور گناہوں سے بچتا ہے اور دنیا سے محبت نہیں رکھتا اور پیغمبر صاحب کی ہر طرح تابعداری کرتا ہے تو وہ اللہ کا دوست اور پیارا ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کو ولی کہتے ہیں۔ اس شخص سے ایسی باتیں ظہور میں آتی ہیں جو اور لوگوں سے نہیں ہو سکتیں ایسی باتوں کو کرامت کہتے ہیں۔

(۱۷) ولی کتنے ہی بڑے درجے کو پہنچ جائے مگر نبی کے برابر نہیں ہو سکتا۔

(۱۸) خدا کا کیسا ہی پیارا ہو جائے مگر جب تک ہوش و حواس درست ہیں شرع کا پابند رہنا فرض ہے، نماز روزہ اور کوئی عبادت معاف نہیں ہوتی جو گناہ کی باتیں ہیں وہ اس کے لئے درست نہیں ہو جاتیں۔

(۱۹) جو شخص شرع کے خلاف ہو وہ خدا کا دوست نہیں ہو سکتا اگر اس کے ہاتھوں سے کوئی اچنبھے کی بات دکھلائی دے تو یا وہ جادو ہے یا نفسانی اور شیطانی دھندا ہے اس سے اعتقاد درست نہیں

(۲۰) ولی لوگوں کو بعضی باتیں بھید کی سوتے یا جاگتے میں معلوم ہو جاتی ہیں اس کو کشف اور الہام کہتے ہیں اگر وہ شرع کے موافق ہے قبول ہے اور اگر خلاف ہے تو رد ہے۔

(۲۱) اللہ اور رسول نے دین کی سب باتیں قرآن و حدیث میں بندوں کو بتلا دیں، اب کوئی نئی بات نکالنا دین میں درست نہیں ایسی نئی بات کو بدعت کہتے ہیں۔ بدعت بہت بڑا گناہ ہے البتہ بعض باریک باتیں دین کی جو ہر ایک کے سمجھ میں نہیں آتیں پچھلے اگلے عالموں نے اپنے علم کے زور سے قرآن و حدیث سے سمجھ کر دوسروں کو بتلا دیں ایسے لوگ مجتہد کہلاتے ہیں۔ مجتہد بہت ہوئے چار ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ۔ امام شافعیؒ امام مالکؒ۔ امام احمدؒ جس مجتہد سے زیادہ اعتقاد ہو اس کی پیروی کرے۔

ہندوستان میں ابو حنیفہ کی پیروی کرنے والے زیادہ ہیں وہ حنفی کہلاتے ہیں (چنانچہ ہملوگ بھی امام اعظم کے پیرو یعنی حنفی ہیں۔ اسی طرح نفس کے سنوارنے کے طریقے قرآن و حدیث کے موافق ولی لوگوں نے اپنے دل کی روشنی سے سمجھ کر بتلائے ایسے لوگ شیخ کہلاتے ہیں۔ شیخ بہت ہوئے مگر ان میں چار زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ حضرت غوث الاعظم عبدالقادر جیلانیؒ۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ۔ جس مجتہد اور شیخ سے اعتقاد ہو اس کی پیروی کر کے دوسروں کو برا سمجھنا درست نہیں اور، پیروی مجتہد اور شیخ کی اسی وقت تک ہے جب تک ان کی بات خدا و رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو اور اگر ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہو اس میں پیروی نہیں ہے۔

(۲۲) اللہ تعالیٰ نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں آسمانوں سے جبرئیلؑ کی معرفت بہت سے پیغمبروں پر اتاریں تاکہ وہ اپنی اپنی امتوں کو دین کی باتیں بتلائیں۔ ان میں چار کتابیں بہت مشہور ہیں۔ توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی، زبور حضرت داؤد علیہ السلام کو،

انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام، قرآن مجید ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور قرآن مجید آخری کتاب ہے۔ اب کوئی کتاب آسمان سے نہ آئے گی قیامت تک قرآن شریف ہی کا حکم چلتا رہے گا۔ دوسری کتابوں کو گمراہ لوگوں نے بہت کچھ بدل ڈالا مگر قرآن مجید کی نگہبانی اور حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے اسکو کوئی نہیں بدل سکتا۔

(۲۳) ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جس جس مسلمان نے دیکھا اسکو صحابیؓ کہتے ہیں ان کی بڑی بڑی بزرگیاں آئی ہیں ان سب سے محبت اور اچھا گمان رکھنا چاہیئے۔ اگر کوئی لڑائی جھگڑا ان کا سننے میں آئے تو اسکو بھول چوک سمجھے ان کی برائی نہ کرے۔ ان میں سب سے بڑھ کر چار صحابی ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ پیغمبر صاحب کے بعد ان کی جگہ بیٹھے اور دین کا بندوبست کیا۔ اس لئے یہ اول خلیفہ کہلاتے ہیں۔ تمام امت میں یہ سب سے بہتر ہیں ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دوسرے خلیفہ ہیں۔ ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ تیسرے خلیفہ ہیں ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ یہ چوتھے خلیفہ ہیں۔

(۲۴) پیغمبر صاحب کی اولاد اور بیبیاں سب تعظیم کے لائق ہیں۔ اولاد میں سب سے بڑا رتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا اور بیبیوں میں حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہے۔

(۲۵) ایمان جب درست ہوتا ہے کہ اللہ و رسول کو سب باتوں میں سچا سمجھے اور ان کو مان لے اللہ و رسول کی کسی بات میں بھی شک کرنا یا اسکو جھٹلانا یا اس میں عیب نکالنا یا اس کے ساتھ مذاق اڑانا ان سب باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے

(۲۶) قرآن و حدیث کے کھلے کھلے مطلب کا نہ ماننا اور ایچ پیچ کر کے اپنے مطلب بنانے کو معنی گڑھنا بددینی کی بات ہے۔

(۲۷) گناہ کو حلال سمجھنے سے ایمان جاتا رہتا ہے

(۲۸) گناہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو جب تک اس کو برا سمجھے اس سے ایمان نہیں جاتا البتہ کمزور ہو جاتا ہے۔

(۲۹) اللہ تعالیٰ سے نڈر ہو جانا یا ناامید ہو جانا کفر ہے۔

(۳۰) کسی سے غیب کی باتیں پوچھنا اور اس کا یقین کرنا کفر ہے۔ البتہ نبیوں کو وحی سے اور ولیوں کو کشف و الہام سے اور عام لوگوں کو نشانیوں سے کوئی بات معلوم ہو سکتی ہے۔

(۳۱) کسی کا نام لیکر کافر کہنا یا لعنت کرنا بڑا گناہ ہے ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظالموں پر لعنت جھوٹوں پر لعنت مگر جن کا نام لیکر اللہ و رسول نے لعنت کی ہے یا ان کے کفر کی خبر دی ہے۔ ان کو کافر ملعون کہنا گناہ نہیں۔

(۳۲) جب آدمی مرجاتا ہے اگر گاڑا جاوے تو گاڑنے کے بعد اور اگر نہ گاڑا جائے تو جس حال میں ہو اس کے پاس دو فرشتے جن میں ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں۔ آکر پوچھتے ہیں کہ تیرا پروردگار کون ہے، تیرا دین کیا ہے، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پوچھتے ہیں کہ یہ کون ہیں۔ اگر مردہ ایماندار ہوا تو ٹھیک ٹھیک جواب دیتا ہے پھر اس کے لئے سب طرح کا چین ہے اور نہیں تو وہ سب باتوں میں یہی کہتا ہے کہ مجھے خبر نہیں، پھر اس پر بڑی سختی ہوتی ہے اور بعضوں کو اللہ تعالیٰ اس بات سے معاف کردیتا ہے مگر یہ باتیں مردے کو معلوم ہوتی ہیں ہم لوگ نہیں دیکھتے، جیسے سوتا ہوا آدمی خواب میں سب کچھ دیکھتا ہے اور جاگتا ہوا آدمی اس کے پاس بیٹھا ہوا بے خبر ہے۔

(۳۳) مردے کے لئے دعا کرنے سے کچھ خیر خیرات دیکر بخشنے سے اس کو ثواب پہنچتا ہے اور اس سے اسکو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔

(۳۴) اللہ و رسول نے جتنی نشانیاں قیامت کی تبلائی ہیں سب ضروری ہونے والی ہیں۔ حضرت مہدی رضؓ ظاہر ہوں گے اور خوب انصاف سے بادشاہی کریں گے، کانا دجال نکلے گا اور دنیا میں بہت فساد مچائے گا، اس کے مار ڈالنے کے واسطے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے اور اسکو مار ڈالیں گے، یاجوج و ماجوج بڑے زبردست آدمی ہیں وہ تمام زمین پر پھیل پڑیں گے پھر وہ خدا کے قہر سے ہلاک ہوں گے، ایک عجیب طور کا جانور زمین سے نکلیگا اور آدمیوں سے باتیں کرے گا مغرب کی طرف سے آفتاب نکلے گا، قرآن مجید اٹھ جائے گا اور چند روز میں تمام مسلمان مرجائیں گے اور تمام دنیا کافروں سے بھر جائیگی اور بہت سی باتیں ہوں گی۔

(۳۵) جب ساری نشانیاں پوری ہوجائیں گی اب قیامت کا سامان شروع ہوگا۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام خدا کے حکم سے صور پھونکیں گے یہ صور ایک بہت بڑی سینگ کی شکل کی چیز ہے، اس صور کے پھونکنے سے تمام زمین و آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے، تمام مخلوقات مرجائیں گی اور جو مرچکے ہیں ان کی روحیں بیہوش ہوجائیں گی، مگر

اللہ تعالیٰ کو جن کا بچانا منظور ہے وہ اپنے حال پر رہیں گے۔ ایک مدت اسی کیفیت پر گذر جائے گی۔

(۳۶) پھر جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا کہ تمام عالم دوبارہ پیدا ہوجائے دوسری بار صور پھونکا جائیگا اس سے پھر سارا عالم موجود ہوجائے گا، مردے زندہ ہوجائیں گے، اور قیامت کے میدان میں سب اکٹھے ہوں گے اور وہاں کی تکلیفوں سے گھبرا کر سب پیغمبروں کے پاس سفارش کرانے جائیں گے، آخر ہمارے پیغمبر صاحبؐ سفارش کریں گے سب بھلے بُرے عمل تولے جائیں گے، ان کا حساب ہوگا مگر بعضے بدون حساب جنت میں جائیں گے، نیکیوں کا نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں اور بدیوں کا بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو حوض کوثر کا پانی پلائیں گے جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، پل صراط پر چلنا ہوگا جو نیک لوگ ہیں وہ اس سے پار ہوکر بہشت میں پہنچ جاویں گے، جو بد ہیں وہ اس پر سے دوزخ میں گر پڑینگے۔

(۳۷) دوزخ پیدا ہوچکی ہے اور اس میں سانپ بچھو اور طرح طرح کا عذاب ہے، دوزخیوں میں سے جن میں ذرا بھی ایمان ہوگا وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت کر پیغمبروں اور بزرگوں کی سفارش سے نکلکر بہشت میں داخل ہوں گے خواہ کتنے ہی بڑے گنہگار ہوں اور جو کافر و مشرک ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور اُن کو موت بھی نہ آئے گی۔

(۳۸) بہشت بھی پیدا ہوچکی ہے اور اس میں طرح طرح کے چین اور نعمتیں ہیں، بہشتیوں کو کسی طرح کا ڈر اور غم نہ ہوگا اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ اس سے نکلیں گے اور نہ وہاں مرینگے۔

(۳۹) اللہ کو اختیار ہے کہ چھوٹے گناہ پر سزا دیدے یا بڑے گناہ کو محض اپنی مہربانی سے معاف کردے اور بالکل اس پر سزا نہ دے۔

(۴۰) جن لوگوں کا نام لیکر اللہ و رسول نے بہشتی ہونا بتلا دیا ہے ان کے سوا کسی کے بہشتی ہونے کا یقینی حکم نہیں لگا سکتے، البتہ اچھی نشانیاں دیکھ کر اچھا گمان رکھنا اور اللہ کی رحمت سے امید رکھنا ضروری ہے۔

(۴۱) بہشت میں سب سے بڑی نعمت اللہ کا دیدار ہے جو بہشتیوں کو نصیب ہوگا۔ اسکی لذت کے سامنے تمام نعمتیں ہیچ معلوم ہوں گی۔

(۴۲) دنیا میں جاگتے ہوئے ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو کسی نے نہیں دیکھا اور نہ کوئی دیکھ سکتا ہے۔
(۴۳) عمر بھر کوئی کیسا ہی بھلا برا ہو مگر جس حالت پر خاتمہ ہوتا ہے اسی کے موافق جزا و سزا ہوتی ہے

ان عقائد کو ابتدائی عمر میں بچوں کو زبانی یاد کرا دیا جائے پھر آہستہ آہستہ اسکی کسی قدر توضیح اور تشریح بیان کیجائے۔ پس ابتدا تو حفظ ہی سے ہوگی۔ پھر اس کا فہم ہوگا پھر اس کا اعتقاد ہوگا یعنی ایقان و تصدیق ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کا کچھ فضل ایسا ہے کہ یہ چیزیں بچوں کے ذہن میں یونہی صرف بتانے ہی سے آجاتی ہے اسپر کسی دلیل و برہان کے پیش کرنے کی حاجت نہیں پڑتی اور اس امر کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے جبکہ دیکھا جاتا ہے کہ عوام کے جو عقائد ہوتے ہیں انکی ابتدا بھی محض تلقین و تقلید ہی سے ہوتی ہے

مگر ہاں یہ بات ہے کہ وہ اعتقاد جو محض تقلید سے حاصل ہوتا ہے وہ خالی از ضعف بھی نہیں ہوتا یعنی یہ کہ اگر اس کے خلاف کوئی بات بتلائی جائے تو پہلی بات ہٹکر دوسری بات اس کے ذہن میں آجائیگی لہذا اس تقلیدی عقیدے کی تقویت کی ضرورت ہے تاکہ یہ عقائد بچوں اور عوام کے قلوب میں خوب اچھی طرح سے راسخ ہو جائیں اور ان میں ضعف اور تزلزل نہ رہجائے۔

تو سنئے کہ اس کا طریقہ بحث و مناظرہ کرنا اور علم کلام کا پڑھنا نہیں ہے بلکہ طریقہ اس کا یہ ہے کہ تلاوت قرآن میں مشغول ہو اس کی تفسیر سنے حدیث شریف خود پڑھے یا دوسروں سے سنے اور اس کا مطلب علمائے سے معلوم کرے اسی طرح سے اور دیگر اسلامی عبادات میں لگ جائے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روز بروز اس کا عقیدہ پختہ ہوجائے گا کیونکہ قرآن و حدیث میں بھی یہی سب باتیں مستحکم دلیل کے ساتھ برابر آتی رہیں گی اور یہ انکو سن سن کر ان سے متاثر ہوتا جائیگا۔ نیز اس کی عبادت کا نور اسپر چمکیگا اس سے بھی قلب کا عقیدہ مستحکم اور مضبوط ہوتا رہے گا اور اس کا موثر اور آسان طریقہ صالحین کی صحبت اور ان کی ہم نشینی ہے اس کی وجہ سے ان کے اخلاق اور ان کی رفتار و گفتار جس سے سراسر خشیت خداوندی، تواضع اور مسکنت ٹپکتی ہوتی ہے اس کی نظر سے گذریں گے تو ان امور کا اس پر بھی اثر ہوگا۔

پس وہ زبانی تلقین تو بمنزلہ قلب میں بیج ڈالنے کے ہوگی اور یہ سارے اسباب مانند سینچنے کے اور اسکی نگہداشت کرنے کے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ پھر اس کے بعد ایمان کا پودا قوی اور بلند ہی ہوتا جائیگا اور ایک ایسے مستحکم درخت کی طرح ہو جائے گا جس کی جڑیں تو زمین

میں مضبوطی کے ساتھ قائم ہوں گی اور اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہوں گی۔
بچوں کا نشو و نما جب اس طرح اسلامی عقائد پر ہوگا تو بعد میں وہ دنیا کے جس شعبہ میں بھی مشغول ہوں گے، دوسرے باطل خیالات ان اسلامی عقائد پر غالب نہ آسکیں گے اور آخرت میں ان کا اہل حق کے عقائد ہی پر ہونا شمار کیا جائیگا۔ اس لئے کہ شریعت نے عرب جیسے تند خو اور ناواقف لوگوں کو ظاہر عقائد میں تصدیق جازم سے زائد کا مکلف نہیں بنایا تھا چنانچہ بحث و تفتیش کا ان کو اصلا مکلف نہیں کیا گیا چنانچہ آدمی جب چاہتا ہے کہ آخرت کا راستہ چلے اور توفیق الہی اس کا ساتھ دیتی ہے اور وہ عمل و تقویٰ کو اختیار کرتا ہے نفس کو خواہشات سے روکتا ہے، ریاضت و مجاہدہ اختیار کرتا ہے تو انہیں عقائد کی برکت سے اسکے لئے ہدایت کا باب کھل جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اپنے نور سے منور فرمادیتے ہیں۔ (احیاء)
یہ عقائد کی تصحیح اس لئے مقدم ہے کہ یہ نہایت ہی اہم اور مہتم بالشان چیز ہے۔ چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے مہمات مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تصحیح عقائد بھی تھا۔
حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی تفہیمات میں لکھتے ہیں کہ جن امور کے قائم کرنے کی دعوت حضرات انبیاء علیہم السلام نے دی ہے ان میں بڑے بڑے امور تین ہیں۔ ایک تو مبداء اور معاد جزا و سزا کے متعلق عقائد کی تصحیح کرنا اور اس فن کی اشاعت کی کفالت علمائے امت میں سے اہل اصول یعنی حضرات متکلمین نے فرمائی اللہ تعالیٰ ان حضرات کی سعی کو مشکور فرمائے۔ دوسرے طاعات مقربہ میں عمل کی تصحیح کرنا نیز سنت کے مطابق ضروری ضروری طرق انتفاع کا بیان کرنا اور اس فن کی کفالت فقہاء امت نے فرمائی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو ہدایت بخشی اور بہت سے فرقوں نے اپنی کجی کو درست کر لیا اور تیسرے اخلاص اور احسان کی تصحیح اور یہی دونوں اس دین حنیفی کی اصل ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا ہے۔
اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ تیسری قسم جملہ مقاصد شرعیہ میں سب سے اوق ہے از روے ماخذ کے اور سب سے زیادہ گہری ہے از روئے اصل کے اور تمام شرائع کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے روح جسم کے مقابلہ میں اور معنی الفاظ کے مقابلہ میں اور اس فن کی کفالت فرمائی ہے حضرات صوفیہ صافیہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے چنانچہ یہ حضرات پہلے خود مہتدی ہوئے اور پھر

ہادی بنے۔ پہلے خود ہدایت حاصل کی اور پھر دوسروں کی ہدایت کی۔ خود پیا اور دوسروں کو پلایا اور سعادت قصوی پر فائز ہوئے اور بڑے حصے کو سمیٹا۔ پس اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے ان کی خوبی اور کیا ہی عام ہے ان کا نفع اور کیسا تام ہے ان کا نورؒ۔

(تفہیمات الٰہیہ)

یہ گفتگو تعلیم میں ترتیب اور طریقہ کار سے متعلق تو درمیان میں آ گئی اور میں بیان یہ کر رہا تھا کہ یہ تو منصوص ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت اولیاء کے ذمہ واجب ہے۔ چنانچہ اب اولیا اپنی اس ذمہ داری کو خود تو نہ محسوس کریں بلکہ اسکو علماء کے سر ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ نص اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ علماء کے ذمہ اپنے وعظ و تبلیغ کے ذریعہ احکام دین کا پہونچانا زیادہ سے زیادہ مستحب ہے۔ مگر اولیاء پر تو واجب ہے اب اسکو خواہ وہ خود کریں یا خود نہیں کر سکتے تو کسی معلم کے ذریعہ اولاد کی تعلیم و تربیت کرائیں۔ بہرحال اس کا انتظام انھیں کے ذمہ لازم ہے۔

اور یہ لزوم لفظ قوا سے مفہوم ہوا اس لئے کہ یہ امر ہے اور امر وجوب کیلئے آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد قوا انفسکم و اھلیکم ناراً میں تو اصل ذکر اس کا ہے کہ اپنے نفسوں کو اور اپنی اولاد اور اپنے متعلقین کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ یہ آیتہ اس مضمون میں تو نص ہے یعنی اسی کے بیان کے لئے چلائی گئی ہے۔ باقی حضرت حسن رضؓ اور حضرت علی رضؓ سے اسکی تفسیر علم کے ساتھ جو آئی ہے تو وہ اس لئے کہ یہی علم طریق[5] وقایہ ہے۔ کیونکہ دوزخ سے ہم اپنے نفس کو اور متعلقین کو جو بچا سکتے ہیں تو اس کا طریقہ علم ہی ہے۔ یعنی یہ کہ اوامر و نواہی کا خود بھی علم سیکھیں اور اس کے مطابق عمل کریں اور اپنے نفس کو درست کریں اور اسی طرح سے اپنے اہل و عیال کو بھی علم سکھلائیں اور اس پر عمل کرائیں۔ یہی دوزخ سے بچانے کا طریقہ ہے کیونکہ یوں تو دوزخ سے بچانا غیر اختیاری ہے لیکن اس کا یہ طریق اختیاری ہے۔

اسی بات کو دوسرے لفظوں میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں اپنے نفس کی تکمیل کا اور اپنے اہل و عیال کے نفوس کی تکمیل کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ کیونکہ نفس کی تکمیل علم و عمل ہی سے ہوا کرتی ہے علم سے جہالت دور ہوتی ہے۔ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ رسوم باطلہ کا ابطال ہوتا ہے۔ چنانچہ

[5] دوزخ سے بچانے کا طریقہ ۱۲

مشاہدہ ہے کہ آج جو قومیں پستی اور تنزل میں ہیں ان کو علم سے کوئی حصہ نہیں ملا ہے لہٰذا وہ اپنے باپ دادا کے اخلاق و عادات اختیار کئے ہوئے ہیں اور یہی آباؤ اجداد کے رسوم ہی ان کی راہ مارے رہتے ہیں اس لئے کہ اصلاح کا ذریعہ تو علم تھا اور یہ لوگ اس سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔

ترقی کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب علم ہے۔ اب علم خواہ دنیا کا ہو یا دین کا۔ اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جن قوموں میں کچھ تھوڑا بہت علم ہے ان کو ترقی اور فلاح سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملا ہے اور جن لوگوں میں علم نہیں ہے وہ پہلے کی طرح اب بھی تنزل اور قعر مذلت ہی میں ہیں۔

اسی کو ہم دوسرے لفظوں میں یہ کہتے ہیں کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ہمکو جبری تعلیم کا حکم دیا تھا کیونکہ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا یہ نص قطعی ہے اس میں اپنی اور اپنی اولاد اور اپنے متعلقین کی تعلیم کا وجوب نکل رہا ہے اور آج متمدن قومیں جس نظریہ کے ماتحت لوگوں میں علم عام کرنا چاہتی ہیں (یعنی یہی تاکہ لوگ لڑائی جھگڑے، فتنے فساد سے نکل کر مہذب اور شائستہ ہو جائیں) تو ہماری شریعت میں آج سے بہت پہلے یہ حکم آچکا ہے کہ:۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا کیونکہ اس میں جہنم سے بچانے کا حکم ہے اور اس کا ذریعہ تعلیم ہی ہے۔ خدا تعالیٰ نے جس طرح سے ہم پر یہ فضل فرمایا کہ ہماری ہدایت کے لئے نبی بھیجا اور اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اسی طرح سے یہ کتنا بڑا فضل فرمایا کہ ہم کو تعلیم کا بھی حکم فرمایا کہ ہم اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال کی تعلیم کریں اور ان سب کو درست کریں اور کس قدر کام سہل فرمادیا ہے کہ ہر شخص کو اپنے اہل و عیال کی تعلیم کا مکلف کیا کیونکہ ایک شخص کے لئے صرف اپنے اہل و عیال کی تعلیم کیا دشوار ہے۔ لوگ اس ارشاد پر تو عمل نہیں کرتے اور سب کی تعلیم کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ آج مسلمان اسی ایک حکم پر عمل کر کے دیکھیں کہ ساری قوم کو فلاح ہوتی ہے یا نہیں؟

اس مقام پر ایک ضروری بات یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آیت قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا میں اولاد و متعلقین کی تعلیم و تربیت کا جو حکم ہے تو یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں اس میں کچھ دشواریاں بھی پیش آتی ہیں جسکی وجہ سے لوگوں کے لئے یہ ایک مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اسی آیت میں اس کا حل بھی بیان فرمادیا گیا ہے وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اھلیکم کا ذکر بعد میں فرمایا ہے اور اس سے پہلے قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ فرمایا ہے تو ذکر میں اَنْفُسَکُمْ کو مقدم فرما کر اس امر کی جانب اشارہ فرمایا ہے کہ یہ تقدم ذکری (جسکو تقدم وضعی بھی کہا جاتا ہے) اس لئے ہے کہ طبعاً بھی یہی مقدم ہے۔

پس وضع کو طبع کے موافق لایا گیا ہے۔ جس طرح سے کہ خود اپنے نفوس وجود میں مقدم ہوتے ہیں اپنے اہل وغیرہ کے وجود پر اس طرح سے تعلیم میں بھی یہی ترتیب ہونی چاہیئے کہ انسان پہلے اپنے نفس کو تعلیم دے اور اس کی اصلاح کرے۔ پھر اس کے بعد اپنے اولاد کی تعلیم و تربیت کرے تب اسکو اس میں آسانی ہوگی۔ چنانچہ دیکھا بھی جاتا ہے کہ جسکو خود اپنی اصلاح کی فکر ہے اسکو اپنی اولاد اور متعلقین کی تعلیم و تربیت کی بھی فکر ہے اور وہ اس کے لئے آسان بھی ہے اور جس کو ان کی فکر نہیں یا جس پر ان کی تعلیم شاق ہے تو اسی لئے کہ اسکو خود اپنی فکر نہیں ہوگی۔ اگر اپنی اصلاح کی فکر ہوتی تو اس پر تعلیم اولاد اور ان کی تربیت دشوار نہ ہوتی بلکہ سہل ہو جاتی اس طرح الحمد للہ کہ اس مشکل کا حل بھی یہیں سے نکل آیا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بیان فرمایا ہے کہ:۔

تقویم الغیر مرتب علی تقویمہ	دوسروں کی درستگی مرتب ہوتی ہے خود اپنی اصلاح پر
نفسہ فلیبدأ بنفسہ ثم بمن	لہذا پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرنی چاہیئے پھر دوسروں کی۔
یعول ۔	

فرماتے ہیں کہ دوسروں کی اصلاح اپنی اصلاح پر مرتب ہوتی ہے لہذا چاہئے کہ انسان اصلاح پہلے اپنے نفس سے شروع کرے پھر اس کے بعد اپنے متعلقین کی اصلاح کرے۔

دیکھئے امام کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ اصلاح میں بھی مراتب ہیں یعنی دوسروں کی اصلاح مرتب ہوتی ہے اپنے نفس کی اصلاح پر پس اپنی اصلاح مقدم ہے دوسروں کی اصلاح پر لہذا اسی شخص سے دوسروں کی اصلاح ہو سکتی ہے جو پہلے اپنی اصلاح کر چکا ہو اور جس شخص کی خود اپنی اصلاح نہیں ہوئی اس سے دوسرے کی بھی اصلاح مشکل ہے۔

صاحب روح المعانی نے ایک موقع پر باب الاشارۃ فی الآیات میں لکھا ہے کہ آیت سے نکلا کہ اپنا نفس چونکہ سب سے زیادہ اپنے سے قریب ہے لہذا اصلاح کا کام اسی سے شروع کرنا چاہیئے۔

اور اس مقام پر یہ اشعار لائے ہیں ؎

اِبْدَأْ بِنَفْسِكَ فَانْهَهَا عَنْ غَيِّهَا	فَاِذَا انْتَهَتْ عَنْهُ فَاَنْتَ حَكِيْمٌ
اصلاح اپنے نفس سے شروع کرو یعنی پہلے اسکو اسکی برائیوں سے روکو ۔	جب وہ اس سے رک جائے تب تم حکیم ہوگے
فَهُنَاكَ يُسْمَعُ مَا تَقُوْلُ وَيُقْتَدٰى	بِالْقَوْلِ مِنْكَ وَيَنْفَعُ التَّعْلِيْمُ

یعنی اس وقت تو جو بات تم دوسروں سے کہو گے وہ سنی جائیگی اور تمہارے نصیحت کی اتباع کیجائیگی اور اب تمہاری تعلیم نفع دے گی

میں کہتا ہوں کہ اپنے نفس سے ابتدا کرنے کو علماء آیات سے اشارۃً نکالتے ہیں۔ حالانکہ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ میں تو آیت کا مدلول ہی یہ ہے کہ اپنے نفس سے اصلاح کی ابتدا کرو۔ (کیونکہ یہاں تو اَنْفُسَكُمْ کا لفظ ہی موجود ہے اور اَهْلِيْكُمْ سے مقدم بھی ہے) لہذا ان اشعار کو اس آیتہ کی تفسیر میں لانا زیادہ چسپاں اور موقع کے مناسب ہے۔

(راقم کہتا ہے کہ صاحب رُوح نے تو یہاں دو ہی شعر نقل کئے ہیں۔ ناظرین کی تنشیط طبع کے لئے ہم اس سلسلہ کے دو شعر اور لکھتے ہیں جو الترغیب والترھیب للمنذری کے باب الترھیب من ان یعلم ولا یعمل بعلمہ کے حاشیہ میں مذکور ہیں۔ وھو ہذا :-

يَا اَيُّهَا الرَّجُلُ الْمُعَلِّمُ غَيْرَهٗ ۔۔۔ هَلَّا لِنَفْسِكَ كَانَ ذَا التَّعْلِيْمُ (یعنی ہذا)

اے وہ شخص جو دوسروں کو تعلیم دینے کیلئے چلا ہے خود اپنے آپ کو تعلیم کیوں نہیں دیتا۔

تَصِفُ الدَّوَاءَ لِذِي السِّقَامِ وَذِي الضَّنَا ۔۔۔ كَيْمَا يَصِحُّ بِهٖ وَاَنْتَ سَقِيْمُ

تو دوسرے بیماروں اور مریضوں کیلئے تو نسخے بیان کرتا ہے تاکہ وہ استعمال کر کے تندرست ہو جائیں درحالیکہ تو خود مریض ہے

اور پھر اس کے بعد یہ اشعار ہیں :-

اِبْدَأْ بِنَفْسِكَ فَانْهَهَا عَنْ غَيِّهَا ۔۔۔ فَاِذَا انْتَهَتْ عَنْهُ فَاَنْتَ حَكِيْمُ

پہلے اپنے سے اصلاح کا کام شروع کرو اور اپنے نفس کو برائیوں سے بچاؤ جب وہ بچ جائے تب تم حکیم ہو جاؤ گے۔

فَهُنَاكَ يُقْبَلُ مَا وَعَظْتَ وَيُقْتَدٰى ۔۔۔ بِالْعِلْمِ مِنْكَ وَيَنْفَعُ التَّعْلِيْمُ

یعنی اب اس وقت تمہاری نصیحت قبول کی جائے گی اور تمہارے علم کا اتباع کیا جائے گا اور تمہاری تعلیم نافع ہوگی۔

اسی سلسلہ میں ایک اور بات یہ سمجھئے کہ بعض نیک لوگ جو اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت دینی ہی اصول پر دینا چاہتے ہیں تو کبھی دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اولاد بھی ٹھیک نہیں ہوتی تو اسکے کچھ اسباب ہیں مثلاً ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ آپ تو ان کو دینی تعلیم پر لے چلنا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کی تعلیم کے خلاف کوئی دوسرا بھی ان کو تعلیم دیتا رہتا ہے یعنی ان کے کچھ دوست واحباب ہوتے ہیں جن کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے ان لوگوں کا اس پر پورا پورا اثر ہوتا ہے اور وہ درست نہیں ہوتے۔ آپ یہ سوچ سوچکر پریشان ہوتے ہیں کہ میری تربیت کا یہ اثر کیوں نہیں قبول کر رہا ہے آخر وہ قبول کس طرح کرے ان کے دل میں تو گھر کوئی اور کئے ہوتا ہے۔

یا اس کی وجہ کبھی یہ ہوتی ہے کہ ابتداء عمر میں پہلے خود باپ بھی اپنی اصلاح نہیں کئے ہوتا اور بد عمل رہتا ہے تو بعد میں گو وہ تائب ہو کر اپنے کو درست کرلیتا ہے لیکن اس کی پہلی زندگی اس کی اولاد کے سامنے رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ اس سے بدعقیدہ ہو چکے ہوتے ہیں اور ان کی یہ بدعقیدگی ان کے توبہ کے بعد تک قائم رہتی ہے اس لئے والدین کی تعلیم و تربیت کا کچھ بھی اثر قبول نہیں کرتے۔ لہٰذا انسان کو اپنی اولاد کی جانب سے بھی ہمیشہ کھٹکنا ہی چاہئیے کیونکہ اکثر یہ لوگ اپنے ماں باپ کے معتقد نہیں ہوتے لیکن جھوٹا سچا اعتبار قائم کر کے وہ ان سے اپنی اغراض پوری کرانے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

میں اپنی طرف سے اگر یہ سب باتیں کہتا تو ہر شخص کو اس پر کلام کرنے اور اعتراض کرنے کا حق تھا لیکن میں تو صرف اللہ تعالیٰ کے کلام کی شرح ایک اتنے بڑے مفسر کی تفسیر سے نقل کرتا ہوں۔ اگر لوگوں کو راہ دکھانا ہی چاہتے ہیں تو قرآن و حدیث سے کیوں نہیں دکھاتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک حق بات اگر کوئی شخص کہہ رہا ہے تو اسکو کیوں نہیں مانا جاتا کیا صرف اس لئے کہ اس کی بات کو کمتر اور اس شخص کو غیر معروف سمجھ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے حالانکہ وہ جو کچھ بیان کر رہا ہے قرآن و حدیث سے بیان کر رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب یہ طریقہ اللہ و رسول کا موجود ہے تو پھر ہر شخص جو آجکل تعلیم تعلیم پکار رہا ہے اس پر کیوں نہیں آتا ہمارے پاس کیا نہیں ہے؟ ہمارے پاس سب کچھ ہے جب ہمارے دین کی تکمیل ہو چکی تو سب چیز اس میں مکمل ہو چکی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم نے سب کچھ فراموش کر دیا ہے اور فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ کے مصداق ہو گئے ہیں۔

یہ بات اگر کسی کو ناگوار اور تلخ معلوم ہو تو وہ مجھے معاف کرے لیکن میں جو بات اس وقت کہنا چاہتا ہوں وہ حق ہے اور بالکل صحیح ہے مسلمانوں کی بربادی ان کے گھر سے ہے باہر کے لوگ تو ان کو ملتے ہیں گھر کے لوگ نہیں مانتے۔ باہر ان کی تعلیم لوگ جاری کرتے ہیں۔ گھر کے لوگ نہیں کرتے۔ ہر شخص کا قریب قریب یہی حال ہے۔ چنانچہ علم بھی آج دوسروں ہی کے لئے پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔ اپنے گھر والوں کے لئے اور اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے گھر والوں سے تو ٹھیک طور سے بیان بھی نہیں کیا جاتا۔

چنانچہ اسی کے نتیجہ میں دیکھا جاتا ہے کہ جب اپنے گھر کی اصلاح نہیں کی جاتی اور اپنے اہل وعیال کی تعلیم و تربیت سے غفلت برتی جاتی ہے تو وہی اولاد سمجھ دار ہو کر والدین کے لئے

اسی دنیا میں وبال جان اور سوہان روح ہو جاتی ہے چنانچہ ایسے ایسے واقعات سنے جاتے ہیں کہ نالائق اولاد کی کسی حرکت (مثلاً چوری وغیرہ) کے سبب والدین بلکہ کبھی تو پوری قوم کو انتہائی ذلت اٹھانی پڑتی ہے حتیٰ کہ بعض تو اسکو نہ برداشت کر کے زہر وغیرہ تک کھا لیتے ہیں۔ تو یہ روزِ بد دیکھنا اسی کا ثمرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد۔ فالرجل راع علی اھلہ پر اصلا توجہ نہیں کی گئی۔

آج مسلمانوں کی زیادہ تر ضیق اور پریشانی خود اپنے گھر سے ہے کہ ان کی اولاد ٹھیک نہیں ہے اور اگر کوئی باپ کچھ احساس والا ہے تو اس کے لئے تو یہ دنیا ہی جہنم ہو جاتی ہے۔ بڑھاپے میں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے کا وقت ہوتا ہے اسکو اولاد کی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ ہمارے بعد ان کا کیا حشر ہو گا۔ اور اگر اولاد ٹھیک ہو اور ان سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں تو مرنے کا بھی لطف ہو کہ ان سب کی طرف سے بے فکر ہو کر خالص توجہ اللہ تعالیٰ کی جانب ہو جائے۔

اب بھلا بتلائیے کہ عوام کی اصلاح ہو تو کیسے ہو۔ جب کہ اصل طریقہ ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ خدا اور رسول کے بتلائے ہوئے طریقہ کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ عقل جسکو کہتی ہے اسکو چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہر شخص بس اندھا دھند کام کر رہا ہے۔ علیٰ وجہ البصیرت کام کرنے والے بہت کم ہیں۔ یا یوں کہئے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں کام کرنے والے بہت کم ہیں۔ مفسرین نے اس آیتہ کے متعلق جو کچھ کلام کر دیا ہے وہ بہت کافی ووافی تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کا وہ بیان بھی آجکل کے لوگوں کے لئے کافی نہ ہوتا کیونکہ آجکل کے لوگوں کے سامنے جب تک بہت سے الفاظ نہ بیان کئے جائیں بات ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ چنانچہ میں نے اتنا بیان کر دیا ہے اور اگر کسی کو میرے یہ الفاظ بھی کافی نہ ہوں کم معلوم ہوں تو وہ اپنی طرف سے اور الفاظ بڑھالے۔

باقی اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو اتنا ہی ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا جو نہ تو کوئی پوری سورت ہے اور نہ کوئی لمبی آیتہ ہے بلکہ آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ بس اسی پر کلام کو ختم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرما دیں۔

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَبَارِكْ لَنَا فِيْٓ اَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

فتنۂ اموال واولاد

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ۔ یعنی اے ایمان والو تمھاری بعض بیویاں اور اولاد تمھارے دشمن ہیں، سو تم ان سے ہوشیار رہو۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ اِنَّمَاۤ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ تمھارے اموال اور اولاد بس تمھارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ازواج واولاد کو عدو فرمایا ہے اور ان سے حذر کرنے اور ہوشیار رہنے کا امر فرمایا ہے۔ بخلاف مال کے کہ اسکو فتنہ فرمایا، عدو نہیں۔ یہ اسلئے کہ مال تو کوئی صاحب اختیار شئی نہیں ہے کہ عداوت کر سکے۔ ہاں اسکے ذریعہ سے خود صاحب مال طغیان میں پڑجاتا ہے اور مال کے حاصل کرنے میں حلال وحرام جائز وناجائز کی تمیز نہیں کرتا اور اللہ کی محبت پر اسکی محبت کو ترجیح دیتا ہے۔ بخلاف اولاد کے کہ وہ صاحب اختیار ہیں۔ مقابلہ اور مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں تو ان سے بچنا اور احتراز کرنا مشکل امر ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے چوکنے وہوشیار رہنے اور حذر کرنے کا امر فرمایا جیسا کہ ھُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْھُمْ میں منافقین سے حذر کا امر فرمایا ہے۔

علماء نے فرمایا ہے کہ انکی عداوت یہی ہے کہ یہ لوگ انسان کو طاعات اور امور آخرت کے کرنے سے مانع ہوجاتے ہیں نیز کبھی یہ لوگ اسکو اپنے دنیوی نفع کیلئے کسب حرام اور ارتکاب معاصی پر مجبور کردیتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ میری امت پر ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ انسان کی ہلاکت اپنے بیوی بچوں کے ہاتھوں ہوگی اسطور پر کہ وہ لوگ اسکو فقر وتنگدستی پر عار دلائیں گے اور یہ شخص اسکی وجہ سے بری راہ کسب کی اختیار کریگا اور خود کو ہلاک کرے گا یا کبھی ایسا بھی ہوگا کہ بدون انکے مطالبہ کے خود انسان ہی کو اپنے بال بچوں کی محبت آمادہ کریگی کہ وہ اسکے سامنے بھی نیز اسکے مرنے کے بعد بھی خوش عیشی کی زندگی بسر کریں۔ بس انکی خاطر مال جمع کرنے کے چکر میں پڑ کر خود کو ہلاک کرے گا۔

آیت کا شان نزول بھی اسی قسم کا ایک واقعہ ہوا تھا ترمذی وغیرہ نے ابن عباسؓ سے روایت نقل کیا ہے کہ مکہ کی ایک قوم مسلمان ہوئی اور انھوں نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں (دین حاصل کرنے کے لئے) حاضر ہوں اور چندے قیام کریں مگر بیوی بچوں نے انکو اپنے سے الگ نہیں ہونے دیا۔ بالآخر جب کچھ دنوں کے بعد یہ لوگ حاضر خدمت اقدس ہوئے تو دیکھا کہ اور ساتھی دین میں ان سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں اس پر ان لوگوں نے چاہا کہ اپنے بیوی بچوں کو سزا دیں تو آیت نازل ہوئی جس کا حاصل یہ تھا کہ بلاشبہ بعض دفعہ یہ لوگ دینی دشمن ثابت ہوتے ہیں لہذا ان سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ تاہم اس دفعہ انکو معاف کردو کہ منشا اسکا ہم سے عداوت نہ تھی بلکہ تم سے محبت تھی اور ہمارے نزدیک محبت کی قدر ہے لہذا تم انکو تو معاف کردو اور ان کی محبت سے ہماری محبت کا سبق حاصل کرو۔ (از ناقل)

سعادتِ حقیقیہ

اور

وصیتِ نبویہ

از افادات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سعادتِ حقیقیہ

اور اُسکے حاصل کرنے کا طریقہ

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

صاحب مشکوٰۃ نے احمدؒ ابو داؤدؒ ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالہ سے ایک حدیث نقل کی ہے وہ یہ کہ حضرت عرباض بن ساریہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہمکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور اسکے بعد آپ نے وعظ فرمایا، وعظ ایسا بلیغ[1] اور موثر[2] تھا کہ اسکی وجہ سے سامعین[3] کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور انکے قلوب دہل گئے۔ یہ منظر دیکھکر ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ تو وداعی[4] وعظ معلوم ہوتا ہے لہٰذا آپ ہم لوگوں کو کچھ وصیت[5] فرمایئے آپ نے فرمایا کہ میں تم کو اللہ تعالیٰ کے تقویٰ اور اپنے امیر کی سمع و طاعت[6] کی اگرچہ وہ عبد حبشی ہی کیوں نہ ہو وصیت کرتا ہوں اور یہ اسلئے کہ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہیگا تو وہ اختلافات کثیرہ دیکھے گا لہٰذا اسوقت میری سنت اور خلفاء راشدین و مہدیین[7] کی سنت کو لازم پکڑنا اور اسی سے تمسک کرنا اور اسکو دانتوں سے مضبوط پکڑے رہنا اور محدثات[8] امور سے خود کو بچانا اس لئے کہ ہر محدث بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

یہ تو اصل حدیث کا مضمون ہوا اب دیکھئے علماء اسکی شرح میں کیا فرماتے ہیں۔ صاحب مرقاۃ نے بعض محققین سے نقل کیا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص میری وصیت کو قبول کریگا یعنی اللہ کے تقویٰ کو لازم پکڑے گا اور اس پر جو شخص والی مقرر کیا جائے اسکی اطاعت کریگا اور شر و فتنہ کو برانگیختہ[9] نہیں کریگا تو میرے بعد جو اختلافات اور کثرت آرا[10] اور فتن[11] وغیرہ پیش آئینگے تو یہ شخص ان حالات میں بھی امن ہی سے رہیگا۔

علامہ سید جمال الدین رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ حاصل اس ارشاد کا یہ ہوا کہ میری اس وصیت کو سنو اور اس پر عمل کرو۔ کیونکہ میرے بعد بڑے بڑے فتنے پیش آنے والے ہیں جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ اسوقت ان سے خلاصی[12] کی سبیل[13] بجز میری اس نصیحت پر عمل کرنے کے اور کوئی نہ ہوگی۔

میں کہتا ہوں کہ شاید اسی لئے حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تَمَسَّکُوْا بِہَا فرمانے کے بعد وَعَضُّوْا عَلَیْہَا بِالنَّوَاجِذِ بھی ارشاد فرمایا ہے کیونکہ اسکے سوا تخلص[14] نہ ہوگا یعنی فتن سے

[1] جامع
[2] اثر کرنیوالا
[3] سننے والے
[4] رخصت کرنے والا
[5] موثر نصیحت
[6] بات سننا اور حکم ماننا
[7] ہدایت پانے والے
[8] نئی نئی باتوں سے
[9] ابھارنا
[10] رایوں کی کثرت
[11] فتنہ کی جمع یعنی فساد
[12] نجات
[13] صورت
[14] چھٹکارا

محفوظ رہنے کا ذریعہ بجز اتباع سنت کے اور کچھ نہ ہوگا۔

یہاں ایک بات اور سمجھئے کہ جس طرح سے فتن سے حفاظت کا سبب اتباع سنت ہے اسی طرح بعض دوسرے امور سے اجتناب کرنا بھی ضروری ہے ورنہ تو متبع سنت ہونے کے باوجود آدمی کبھی فتنہ میں پڑ جاتا ہے۔ بس یوں کہنا چاہئے کہ سنت کی تکمیل ہی ان امور کی رعایت کے بغیر نہیں ہوسکتی اس لحاظ سے وہ بھی گویا اتباع سنت ہی کا جزو ہے۔ اسی کو صاحب مرقاۃ لکھتے ہیں کہ کَانَ تَحْصِیْلُ السَّعَادَاتِ الْحَقِیْقِیَّۃِ بَعْدَ مُجَانَبَۃِ کُلِّ صَاحِبٍ یُفْسِدُ الْوَقْتَ وَکُلِّ سَبَبٍ مُفْتِنٍ لِلْقَلْبِ مَنُوْطٌ بِاِتِّبَاعِ السُّنَّۃِ یعنی ہر اس ساتھی سے جو وقت کو برباد کرنیوالا ہو اور ہر اس سبب سے جو قلب کو مفتون کرنیوالا ہو، دوری اختیار کرنے کے بعد سعادت حقیقیہ کا حاصل کرنا اتباع سنت کیساتھ وابستہ ہے یعنی جب اتباع سنت کیجائیگی تب ہی وہ سعادت حاصل ہوسکے گی

میں کہتا ہوں کہ یہ بالکل صحیح ہے کہ سعادت حقیقیہ یعنی فلاح دارین اور وہ بھی صوری اور رسمی نہیں بلکہ حقیقی کامیابی اور کامل سعادت موقوف ہے اتباع سنت پر۔ اسی لئے آپؐ نے ان صحابی کی درخواست پر ایسی وصیت فرمائی جو قیامت تک کے لوگوں کے حق میں سعادت حقیقیہ کی تحصیل کیلئے بمنزلہ کلید کے تھی یعنی آپؐ نے یہ فرمایا کہ تم کو دو چیزوں کی وصیت کرتا ہوں۔ ایک اللہ تعالیٰ کا تقویٰ۔ دوسری اپنے امیر کی سمع و طاعت اختیار کرنا یعنی اسکا حکم سننا اور اسکی اطاعت کرنا اور ان دونوں امور کا تعلق سعادت دارین سے اس طرح پر ہے کہ جب آدمی میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ ہوگا تو اسکی وجہ سے محرمات شرعیہ سے اجتناب کریگا اور مامورات کو ادا کریگا۔ اللہ تعالیٰ سے محبت اور نسبت حاصل کریگا۔ جسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا، اسکا قرب اور اسکی جنت اس کو ملیگی ان سب امور کا فلاحِ آخرت سے تعلق ظاہر ہے۔

اسی طرح سے جب امام وقت اور اپنے امیر کے ساتھ سمع و طاعت کے طور پر پیش آئیگا تو انجام اسکا یہ ہوگا کہ دنیا میں امن و امان قائم رہیگا۔ کیونکہ اگر امام کی طاعت نہ کی گئی تو امیر چونکہ با اختیار اور صاحب اقتدار ہوتا ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ وہ اسکی وجہ سے سختی کا برتاؤ کرے مثلاً قید و بند میں اسے رکھدے جس کا فتنہ ہونا اور فلاح کے خلاف ہونا ظاہر ہے اور ایسی زندگی کو جو فتنہ و فساد سے پُر ہو کوئی احمق بھی فلاح والی زندگی نہیں کہہ سکتا۔

پھر یہ کہ سمع و طاعت کا حکم بھی اسلئے فرمایا کہ عالم کا نظام اسی سمع و طاعت پر قائم ہے اور اسی کی وجہ سے باقی رہیگا۔ ورنہ اگر بات میں کوتاہی کی گئی یعنی سمع و طاعت کو درمیان سے نکال

دیا گیا تو اولاد والدین کی نافرمان ہوجائیگی۔ رعایا بادشاہ کے خلاف کرنے ہی کو فخر سمجھے گی۔ طلباء اساتذہ کا مقابلہ اور ان سے مطالبہ کرینگے اور عجب نہیں کہ ایک مرید بھی پیر ہی سے مطالبہ کرنے لگ جائے ان امور کا فتنہ و فساد ہونا ظاہر ہے۔ بلکہ اس زمانے میں تو مشاہد بھی ہے۔ چنانچہ ان حالات کے ساتھ جیسی کچھ فلاحِ دنیا آج لوگوں کو میسر ہے معلوم ہے۔

نیز اگر سمع و طاعت پر عمل نہ کیا جائے تو اس کے اثرات متعدی ہوتے چلے جائیں گے چنانچہ آج اگر آپ اپنے اکابر کو نہ مانئے گا اور انکا احترام فوت کیجئے گا تو کل کو آپکے اصاغر بھی آپکو نہ مانیں گے اور اسمیں کوئی شبہ بھی نہیں۔ ع۔ ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے۔

امت کے یہ سارے حالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھے اسلئے آپؐ نے شفقةً علی الامة و رحمةً علیہم ایسی وصیت فرمائی جو کہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ چنانچہ اہل سعادت کیلئے سعادات حقیقیہ تک پہونچنے کا یہی ذریعہ ہے، اور ہر زمانہ میں صلحائے امت نے اسے سمجھا ہے اور علماء ربانی اور مشائخ حقانی نے لوگوں کو اسے سمجھایا ہے۔

سعادت حقیقیہ کی تحصیل مطلوب ہے۔ اسی کے لئے حضرات انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے اور انکی نیابت میں اولیاء نے بھی یہی کام کیا اور لوگوں کو بتایا کہ دو چیزیں ہیں سعادت اور شقاوت، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ اور فرماتے ہیں وَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ۔ آخرت میں اہل سعادات کا مقام جنت ہے اور اہل شقاوت کا ٹھکانا دوزخ ہے اور دنیا میں اہل شقاوت کا نصیب معصیت ہے اور اہل سعادت کا حصہ طاعت اور اتباع سنت ہے۔

شریعت نے سعادت کی مقصودیت کو جب بیان کیا تو اسکے ساتھ ہی ساتھ اسکے حصول کا طریقہ بھی بتایا جیسا کہ حدیث شریف اور اسکی شرح میں آپ نے ملاحظ فرمایا۔

باقی صاحب مرقات نے یہ جو فرمایا کہ سعادات حقیقیہ کی تحصیل اتباع سنت کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ صحیح ہے مگر کب؟ جبکہ اس سے پہلے دو چیزوں کا اور اہتمام رکھا جائے۔ ایک تو یہ کہ ہر اس صاحب (ساتھی اور ہمنشین) سے دوری اختیار کیجائے جو اسکے وقت کو فاسد کردے۔ اور دوسرے یہ کہ ہر اس سبب سے اجتناب کیا جائے جو اسکے قلب کو مفتون کرنے والا ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں یعنی ساتھی جو وقت کو فاسد کرنے والا ہو وہ بھی منجملہ ان اسباب کے ایک سبب ہے جو قلب کو مفتون کرتا ہے بلکہ سب سے بڑا سبب ہے پس

فتنہ و فساد
دوسروں تک بھی پہنچے
بڑوں
آب زر
اہل سعادت
شفقت اور رحم
ٹھکانا
سبب
قلب کو مفتون کرنے والا

جس طرح سے کہ یہ وقت کو فاسد کرتا ہے اسی طرح سے قلب کو بھی مفتون کرنے والا ہے اسطرح سے جو اسباب کہ مُفتِنِ[1] قلب ہوں گے ضروری ہے کہ وہ وقت کے فاسد کرنے والے بھی ہوں پس اسبابِ مشوشہ[2] قلب میں سے صاحب و مصاحب[3] بھی ہیں۔ اس لئے اس سے مجانبۃ[4] اور احتراز تحصیل سعادت کے لئے اہم مہمات[5] سے ہے اور یہ عین اتباع سنت ہے۔

اور یوں تو اسباب مشوشہ[6] قلب بہت ہیں مبتلی بہ اسکو سمجھتا ہے منجملہ ان کے کسی سے عداوت و دشمنی یا بہت زیادہ تعلق اور دوستی بھی ہے۔

آدمی کسی کی عداوت کیوجہ سے اپنا بہت نقصان کرلیتا ہے۔ مال کا نقصان۔ وقت کا نقصان۔ قلب کا نقصان بلکہ تن بدن تک کا نقصان کرلیتا ہے جیسا مقدمہ بازوں کے حالات میں اسکا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح سے کسی سے تعلق اور دوستی جو دین کے لئے نہ ہو وہ بھی انسان کے وقت کو بچپن میں برباد کردیتی ہے اور اگر کوئی شخص کسی فاجر فاسق کی صحبت میں پڑ گیا تب تو وقت اور مال کے ضیاع[7] کے علاوہ قلب و دین کا بھی ضیاع ہوجاتا ہے۔

چنانچہ آپ کے یہ نوجوان جو بگڑتے ہیں تو کس طرح سے؟ کیا مولوی لوگ انکو خراب کردیتے ہیں؟ نہیں بلکہ اپنی بری صحبت اور خراب ماحول کیوجہ سے خراب ہوتے ہیں بد دینوں کی صحبت کیوجہ سے دین سے آزاد ہوجاتے ہیں۔ اخلاق سے آزاد ہوجاتے ہیں حتی کہ انسانیت سے آزاد ہوجاتے ہیں۔ اور بعضوں کا حال تو اسقدر ناگفتہ[8] بہ ہوجاتا ہے کہ وہ ایسی حالت کو پہنچ جاتے ہیں کہ زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ دین تو برباد کیا ہی تھا دنیا کا بھی کوئی لطف انھیں حاصل نہیں ہوپاتا۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَالِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ۔

آپ سے پوچھتا ہوں یہ کس وجہ سے ہوتا ہے؟ اسی چیز کی وجہ سے جس پر یہ حضرات تنبیہ[9] فرمارہے ہیں کہ اتباع سنت سے پہلے اسکا اہتمام کرو کہ بری صحبت کیوجہ سے تمہارا وقت اور تمہارا قلب فاسد اور مفتون[10] نہ ہونے پائے۔

وقت کو فساد سے بچانا شرعاً مطلوب ہے اس لئے کہ یہی وقت سعادات حقیقہ کے حاصل کرنے کا ظرف[11] ہے۔ اسی کے اندر آدمی ترقی کرتا ہے اور مراتب دین کے ہوں یا دنیا کے حاصل کرتا ہے۔ تمام کمالات وقت ہی کی قدر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس کو کمال کے تحصیل کی فکر ہے اسکو وقت کی بھی قدر ہوگی اور جو وقت کا ناقدرا ہے وہ کمالات سے

[1] فتنہ میں ڈالنے والا
[2] پریشانی میں ڈالنے والا
[3] دوست و ساتھی
[4] دوری
[5] نہایت ضروری
[6] تشویش میں ڈالنے والا
[11] محل

بھی عاری[۱] ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ و رسول نے بھی وقت کی قدر کو پہچنوایا ہے اور اپنے اپنے زمانہ میں مشائخ نے بلکہ تمام عقلاء نے اسکا اہتمام کیا ہے۔

ایک بزرگ جا رہے تھے دیکھا کہ ایک شخص بیکار بیٹھا ہوا ہے انھوں اسکو سلام نہیں کیا اور گذر گئے پھر جب واپس ہوئے تو دیکھا کہ انگلی سے زمین کرید رہا ہے انھوں نے اسکو سلام کیا لوگوں نے دریافت کیا کہ حضرت پہلی بار سلام نہ کرنے اور دوسری بار میں سلام کرنے میں کیا راز تھا سمجھ میں نہیں آیا۔ فرمایا بات یہ ہے کہ پہلی دفعہ وہ خالی بیٹھا ہوا تھا چونکہ کوئی مشغلہ[۲] نہیں تھا اس لئے شیطان اس سے زیادہ قریب تھا لیکن بعد میں جب وہ زمین کریدنے کے شغل میں لگ گیا تو گو وہ مشغلہ بھی لغو تھا تاہم اس کی مشغولی کی وجہ سے شیطان اس سے زیادہ دور ہو گیا تھا اسلئے میں نے اسکو سلام کیا۔

دیکھا آپنے بیکاری اہل طریق کے نزدیک اسدرجہ مضر اور معیوب[۳] چیز ہے۔ اسی لئے میں ان نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ تم سے اگر دین نہیں سنبھلتا[۴] تو دنیا ہی کما کر دکھلاؤ۔ میں اس نوجوان کو بھی دیکھکر خوش ہوتا ہوں جسے دیکھتا ہوں کہ دنیا ہی کے کام میں ہوشیار ہے۔ کیونکہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کی طرف سے آسودہ[۵] اور مطمئن رہے گا تو دین بھی پختہ رہیگا ورنہ اسکے دین کا بھی اعتبار نہیں۔ ؎

پراگندہ روزی پراگندہ دل

ایسے لوگوں کو جنھیں دنیا ہی کمائی آجائے اور اپنے معاش[۶] کیجانب سے وہ مطمئن ہوں غنیمت سمجھتا ہوں۔ زیادہ ضیق[۷] ایسے لوگوں کو دیکھکر ہوتی ہے جو دین میں بھی کچے[۸] اور دنیا کے اعتبار سے بھی ناکارہ ہوتے ہیں۔ جنکی وجہ سے والدین پر بار اور كَلًّا[۹] عَلَى النَّاسِ کے مصداق ہوتے ہیں۔ انکو صرف کھانے اور سونے سے مطلب، نہ یہ وقت کی قدر کو جانتے ہیں نہ اپنے ہی کو پہچانتے ہیں جسکا انجام یہ ہوتا ہے کہ بالکل مہمل[۱۰] ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر اگر خدانخواستہ کسی کا ساتھ پکڑ لیا تو اور بھی تباہ ہوئے رات ہوئی سنیما چلے گئے، رات کو جاگے تو دن بھر پڑ کر سوئے۔ اب ظاہر ہے کہ جنکے لیل و نہار کے یہ مشاغل ہوں وہ کیا کمال حاصل کر سکتے ہیں

حضرت مولانا[۱۱] سے سنا فرماتے تھے کہ یورپ میں انگریزوں نے قانون بنا دیا ہے کہ طلبہ سیاست میں حصہ نہیں۔ سنا آپ نے جہاں سے لوگوں نے سیاست سیکھی ہے وہاں کا یہ حال ہے کہ طلبہ کے لئے سیاسیات میں شرکت کو پسند نہیں کیا گیا۔ یہ اس لئے کہ عقلمند لوگ ہیں جانتے تھے کہ تحصیل علم کے زمانے میں اگر دوسری جانب مشغولی ہوگی تو علم سے رہ جائیں گے اور اپنا تمام وقت انھیں سب لغویات[۱۲] میں صائع کر لیں گے

البتہ تو ہم ہوتے ہی ہیں مدرسہ میں باتیں انھیں کوئی سکھاتا نہیں اور جہاں اس قسم کی باتیں سکھلائی جاتی ہیں وہاں یہ لوگ جاتے نہیں۔

بہر حال وقت چونکہ ظرف اور محل ہے اسی کے اندر کمالات کی تحصیل کیجاتی ہے۔ اسی میں اعمال صالحہ ادا کیے جاتے اسلئے اسکا تحفظ اور اسکو ضیاع سے بچانا بہت ضروری ہوا۔ اسی لئے اتباع سنت سے پہلے اسکے اہتمام کو بیان فرمایا کیونکہ بدون اسکے سعادات حقیقیہ کی تحصیل ناممکن ہے۔

آگے صاحب مرقاۃ نے اتباع سنت کی جو تشریح فرمائی ہے اور اسپر جو آثار مرتب ہوتے ہیں انکی جو توضیح فرمائی ہے وہ بہت ہی خوب ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

لِاَنَّ تَحْصِیْلَ السَّعَادَاتِ الْحَقِیْقِیَّۃِ ... مَنُوْطٌ بِاِتِّبَاعِ السُّنَّۃِ بِاَنْ یَّمْتَثِلَ الْاَمْرَ عَلٰی مُشَاھَدَۃِ الْاِخْلَاصِ وَیُعَظِّمُ النَّھْیَ عَلٰی مُشَاھَدَۃِ الْخَوْفِ۔

یعنی اتباع کا مطلب یہ ہے کہ اوامر شرعیہ کا امتثال خلوص کے مشاہدہ کے ساتھ کرے اور منہیات سے اجتناب اس طرح سے کرے کہ اسکے اندر خوف کا مشاہدہ کیا جائے یعنی ممنوعات شرعیہ سے ایسا ڈرے گویا کہ اسکے ارتکاب پر جو عذاب وسزا مقرر ہے اسکو دیکھ رہا ہے۔ آگے اور ترقی کرکے فرماتے ہیں کہ:۔

بَلْ بِاِقْتِفَاءِ آثَارِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ جَمِیْعِ مَوَارِدِہٖ وَمَصَادِرِہٖ وَحَرَکَاتِہٖ وَسَکَنَاتِہٖ وَیَقْظَتِہٖ وَمَنَامِہٖ حَتّٰی یُلْجِمَ النَّفْسَ بِلِجَامِ الشَّرِیْعَۃِ وَیَتَجَلّٰی فِی الْقَلْبِ حَقَائِقُ الْحَقِیْقَۃِ بِتَصْقِیْلِہٖ مِنْ مَّفَاتِحِ الْاَخْلَاقِ وَتَنْوِیْرِہٖ بِاَنْوَارِ الذِّکْرِ وَالْمَعْرِفَۃِ وَالْوِفَاقِ وَتَعْدِیْلِہٖ بِاِجْرَاءِ جَمِیْعِ حَرَکَاتِ الْجَوَارِحِ عَلٰی قَانُوْنِ الْعَدْلِ حَتّٰی یَحْدُثَ فِیْہِ ھَیْئَۃٌ عَادِلَۃٌ مَسْنُوْنَۃٌ مِنْ آثَارِ الْفَضْلِ یَسْتَعِدُّ بِقَبُوْلِ الْمَعَارِفِ وَالْحَقَائِقِ وَیَصْلِحُ اَنْ یَّنْفُخَ فِیْہِ رُوْحُ اللّٰہِ الْمَخْصُوْصِ بِسُلَّاکِ اَحْسَنِ الطَّرَائِقِ۔

(مرقات ص ۲۳ ج ۱)

یعنی اتباع سنت سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ بس اوامر کو بجالائے بلکہ یہ ہے کہ اسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی ایک فکر اور دھن پیدا ہوجائے۔ چنانچہ آپ کے جملہ

حرکات و سکنات حتی کہ نوم و بیداری سب ہی چیزوں میں آپ کا اتباع کرے یہاں تک کہ اپنے نفس کو گویا شریعت کی لگام ہی پہنا دے تاکہ وہ اسی کے اشارہ پر چلے اور اسی کے اشارہ پر رکے، اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قلب اعلیٰ اخلاق کی قلعی سے مصقّل ہوکر اور ذکر و معرفت کے نور سے منوّر ہوکر بالکل مجلّیٰ ہو جاتا ہے اور پھر اسکے بعد (بفحوائے حدیث اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ) تمام جوارح قانون عدل (یعنی شریعت) پر عمل کرنے لگتے ہیں اور قلب کے ساتھ ساتھ وہ بھی عادل ہو جاتے ہیں پھر اسکی وجہ سے انسان کے قلب میں ایک ہیئۃ عادلہ مسنونہ پیدا جاتی ہے (جسکو نسبت بھی کہا جاتا ہے) اور یہ فضل الٰہی کے آثار میں سے ایک اثر ہوتا ہے۔ اس ہیئت اور نسبت کے اندر معارف و حقائق کے قبول کرنیکی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس امر کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ اب اسکے اندر اللہ تعالیٰ کی وہ روح پھونک دی جائے جو کہ مخصوص ہے ان حضرات کے ساتھ جو احسن طریق سے راہ کو طے کرنے والے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جس طرح سے قانون عدل پر چلنے کیوجہ سے قلب میں ایک ہیئۃ عادلہ مسنونہ پیدا ہو جاتی اور وہ ہر قسم کی صلاح کیلئے مثمر ہوتی ہے اسی طرح سے اسکے برخلاف قانون غیر عادلہ پر چلنے کیوجہ سے بھی انسان کے قلب میں ایک ہیئۃ غیر عادلہ غیر مسنونہ پیدا ہو جاتی ہے جس کے ثمرات میں سے فتنہ و فساد۔ نزاع و خلاف وغیرہ امور ہیں جیسا کہ ہم اس زمانہ میں اسکا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ طالب علم ہیں اور شاگرد ہیں مگر اپنے اساتذہ ہی سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ مطالبہ بڑوں کو چھوٹوں سے کرنا چاہیئے۔ علم کا مطالبہ۔ عمل کا مطالبہ۔ اخلاق کا مطالبہ۔ مگر دیکھا یہ جا رہا ہے کہ اسکے بجائے الٹے اصاغر ہی اکابر سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ سب اسلئے ہو رہا ہے کہ انکے قلب میں ہیئت عادلہ مسنونہ موجود ہے۔ یا یہ اس چیز کا پتہ دیتی ہے کہ قلوب فاسد اور خراب ہو چکے ہیں اور ان میں ہیئۃ غیر عادلہ غیر مسنونہ پیدا ہو گئی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غرض کہ سعادت حقیقیہ کی تحصیل موقوف ہے اتباع سنت پر اسکو چاہے یوں کہہ لیجئے کہ عافیت دارین کی تحصیل موقوف ہے اتباع سنت پر آدمی اتباع سنت کا اہتمام کریگا تب ہی اسکو روحانی جسمانی صحت و عافیت اور قلب کی حیات نصیب ہوگی آگے فرماتے ہیں کہ یہ سعادت اتباع سنت کے ذریعہ اسوقت حاصل ہوگی جبکہ ایسے شخص کی مصاحبت سے اپنے کو دور رکھے جو وقت کو برباد کرنیوالا ہو اور ان تمام اسباب کے اختیار کرنے سے احتراز کرے جن سے قلب میں تشویش و انتشار پیدا ہو اسی کو فرماتے ہیں کہ ؎

تا توانی دور شو از یار بد | یار بد بدتر بود از مار بد

ترجمہ۔ جہاں تک ہوسکے برے ساتھی سے دور رہو کیونکہ برا ساتھی بدترین سانپ سے بھی بڑھکر مضر اور مہلک ہے۔

جس طرح سے کہ نیک صحبت کی فضیلت آئی ہے اور بعض حالات میں وہ خلوت و تنہائی سے بہتر ہے جیسا کہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے لکھا ہے کہ اَلْعُزْلَةُ خَيْرٌ مِّنَ الْجَلِيْسِ السَّوْءِ وَالْجَلِيْسُ الصَّالِحُ خَيْرٌ مِّنَ الْعُزْلَةِ اسی طرح سے بری صحبت سے بچنے کی بھی ضرورت ہے علماء نے عزلت اور اختلاط پر مفصل گفتگو فرمائی ہے۔ مطلقاً اسی کو اچھا نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس مسئلہ میں تفصیل ہے بعض حالات میں عزلت کو ترجیح ہوگی یعنی جبکہ کوئی جلیس صالح نہ میسر ہو اور اگر صالح ہمنشین مل جائے تو پھر عزلت کو ترجیح کیا معنیٰ جائز بھی نہ ہوگی۔ اسکا ترک کرنا اور صحبت نیک میں جاکر علم و عمل حاصل کرنا واجب ہوگا۔ چنانچہ علماء جس طرح سے یہ فرماتے ہیں کہ ؎

(حاشیہ: تنہائی — برے لوگوں سے — جلیس صالح — یعنی نیک ہمنشین — ترک کرنا چھوڑنا)

تا توانی دور شو از یار بد | یار بد بدتر بود از مار بد

ترجمہ۔ جہاں تک ہوسکے برے ساتھی سے دور رہو کیونکہ برا ساتھی بدترین سانپ سے بھی بڑھکر مضر اور مہلک ہے اسی طرح سے وہ حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ ؎

یک زمانہ صحبتت با اولیاء | بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

یعنی تھوڑی دیر بھی تمہارا اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھنا سو سال کی ریا سے خالی عبادت سے بڑھکر ہے۔

باقی حدیث شریف میں برے ساتھی سے جو پناہ مانگی گئی ہے وہ بھی بالکل صحیح ہے ایسا اختلاط
عوام اور اپنے صاحب سے دوری واجب ہے کیونکہ ؎

مار بہ تنہا ہمیں بر جاں زند یار بد بر جاں و بر ایماں زند

یعنی موذی سانپ صرف جان ہی کو نقصان پہونچاتا ہے مگر برا ساتھی جان و ایمان دونوں
کے حق میں زہر قاتل ہے۔ اسلئے اس سے بچنا بہت ضروری ہے۔ اسلئے کہ جتنی بری عادتیں انسان
میں پیدا ہوتی ہیں یار بد سے پیدا ہوتی ہیں۔ بری عادتیں ماں کے پیٹ سے لیکر کوئی نہیں آتا جس طرح سے
کہ نیک صحبت نیکی سکھلاتی ہے لوگ اسکی وجہ سے بڑے بڑے کمالات سے متصف ہو جاتے ہیں
اسی طرح سے بری صحبت بڑی بڑی برائی آدمی میں پیدا کر دیتی ہے۔ اسلئے بچوں کو اس سے بچایا
جاتا ہے کیونکہ اسمیں پڑ کر وہ بالکل ہی ناس ہو جاتے ہیں۔ برا ساتھی قلب کو مفتون کر دیتا ہے اور
اسکی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور وقت تو برباد ہو ہی جاتا ہے یوں ہی تجارت و زراعت
اسی طرح سے اور دیگر اسباب بھی آدمی کے قلب کو فاسد اور خراب کر دیتے ہیں مگر اس سے زیادہ
بربادی صاحب سوء کیوجہ سے ہوتی ہے۔ انسان میں ایک خصلت نہیں ہوتی مگر کسی برے کا ساتھ
پکڑ لیتا ہے جسکی وجہ سے اسکے اندر بھی وہ عادت پیدا ہو جاتی ہے۔

(حاشیہ: ۱ خراب ۲ بڑا شریر ۳ دھوکا دینے والا)

ہمارے پاس جو لوگ آتے ہیں وہ ہم کو بھلواتے ہیں ہم پابند ہیں کہ انکو وقت دیں صحیح صحیح
چیزیں بتلائیں اور یہ لوگ اسکے پابند نہیں کہ ہماری باتوں کو سنیں اور اسپر عمل کریں۔ بات یہ ہے کہ قلب
تو انکا دنیا میں مفتون ہو چکا ہے قلب کو مفتون کرنیوالا اسکے صحیح راستہ کو ختم کرنیوالا اور اسکو معاصی میں
مبتلا کر دینے والا رذائل میں مبتلا کر دینے والا یہی ساتھی ہے اور اسکو اور دیگر اسباب مثلاً تجارت و
زراعت وغیرہ سے بڑھکر مفسد اسلئے کہتا ہوں کہ اور سب چیزیں انسان کے تابع ہوتی ہیں انسان
اگر انکے فساد سے بچنا چاہے تو بچ سکتا ہے اگر کسی کا ساتھ پکڑ لیا تو اسکی دوستی کیوجہ سے ایک گھنٹہ دو گھنٹہ
ایک دن دو دن اسی طرح ہوتے ہوتے انسان اپنی کل عمر ہی برباد کر لیتا ہے۔ ہم ایک جگہ رہتے تھے
دیکھتے تھے کہ لوگ جہاں رہتے تھے وہاں کے بھی نہیں تھے ایک وقت میں ایک جگہ سب لوگ جمع
ہوتے تھے اور ایران کی توران کی ہانکتے تھے اور آپسمیں کہتے تھے کہ جب تک یہاں جمع نہیں ہو لیتے
چین نہیں پڑتا۔ لوگ یہاں بھی آتے ہیں اور اگر مجھے سکھاتے ہیں میں کہتا ہوں کہ آؤ سکھاؤں میں
بھی لوگوں کو دیکھ چکا ہوں۔ لوگ چاہیں کہ اپنی باتیں ہمکو سکھا دیں تو سکھا نہیں سکتے۔
ہم جب آپکو فساد سے بچائیں تو آپ کے حالات پر گفتگو کرنے کی ہمت کریں، ورنہ اگر ہم

آپ کے سامنے آپ کے حالات ہی پیش کرسکیں گے تو آپکی اصلاح کیا کریں گے چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ جنکا احترام نہیں کرنا چاہیئے یعنی جس نے ان دیہاتیوں کے مال و جائداد کو ہضم کرلیا اور لوگوں کو آپس میں لڑوادیا اسی کے لئے یہ لوگ چادریں بچھاتے تھے اور تکیہ رکھتے تھے اس شخص کا نام ہماری زبان میں پٹواری ہے چنانچہ عالم دین کی لوگ اتنی وقعت نہیں کرتے جتنی کہ پٹواری کی کرتے تھے۔ اور یہ بھی دیکھتا تھا کہ پیٹھ پیچھے اسے گالی بھی دیتے تھے۔ ایک طرف احترام تو ایسا جیسے عالم دین کا اور دوسری طرف اس کو گالی دینا جس طرح سے کہ علماء کے ساتھ انکا یہ معاملہ تھا کہ انکی برائی اور غیبت اور شکایت کرتے تھے۔ میرے متعلق سب یہ چاہتے تھے کہ میرے یہاں آکر بیٹھے اور جن مشاغل میں ہم لوگ رہتے ہیں اسی میں یہ بھی ملوث ہو جائے۔ یہ چاہتے تھے کہ عالم بھی ہمارے تابع ہو کر رہے۔

ایک دفعہ مجھ سے سب لوگوں نے کہا کچھ بیان کردو۔ میں نے کہا اچھا اور یہ سوچا کہ جن حالات میں یہ لوگ مبتلا ہیں اس پر کچھ کلام کروں۔ میں نے کہا کہ نماز کیلئے آپ لوگ کمیٹی کمیٹا بناتے ہیں مگر خود آپ ہی لوگ نہیں پڑھتے۔ اور دیکھتا ہوں کہ آپ لوگ جس سے خوش رہتے ہیں یا کوئی بڑا آدمی ہوتا ہے تو اسکو تو معاف کر دیتے ہیں اور جس سے ناخوش ہوتے ہیں یا کوئی غریب آدمی ہو تو اس پر جرمانہ مقرر کر دیتے ہیں یہ کیسا ہے؟ میں نے یہ بھی کہا کہ دین کمیٹی کمیٹا کا نام نہیں اس میں اسکے لئے آدمی کے قلب کو درست کیا جاتا ہے۔ جب میں نے اس قسم کی باتیں بیان کیں تو سمجھے اور اور کہا ہاں ٹھیک تو کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہی تو تمہارا مرض ہے اور اصلاح کے ضمن میں فساد ہے۔ دین کی پیروی کے لئے ایسے ہی لوگوں کو راہنما بنانا چاہتے ہو۔ میں نے یہ بھی کہا کہ تم لوگوں میں دنیا کی محبت آگئی ہے اور دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے گڑ کہ جس میں بہت سے چیونٹے آکر گرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ گرتے تو ہیں اسے کھانے کے لئے لیکن مر کر ہی نکلتے ہیں۔ بس یہی حال تمہارا ہے کہ دنیا کی محبت میں اس بری طرح لت پت ہو اور گرتے ہو کھانے کے لئے اور مر کر ہی شاید نکل سکو۔ اس طرح سے مثال دیکر انکے حال کو سمجھایا تو اسکو لوگوں نے پسند کیا۔

کام جب قاعدے سے کیا جاتا ہے تب ہی وہ دنیا میں بھی مفید ہوتا ہے اور آخرت میں بھی مقبول ہوتا ہے حدیث شریف میں ہے کہ مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے مقاتلہ کرے وہ مقبول ہے اور تمکو دیکھ رہا ہوں کہ کام طریقہ سے کرنا تو درکنار تم اپنے ہی آدمی کو زیر کرنا چاہتے ہو۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ دین کے

کام کو دین کیطرح سے کرو ۔ تب سب کی سمجھ میں آیا کہ ہاں جی بات بالکل ٹھیک ہے ۔ میں نے کہا اد ئیں سب کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہو؟

یہ کہہ رہا ہوں کہ سب سے زیادہ مفسد اور سب سے زیادہ قلب کو فتنہ میں ڈالنے والا برا ساتھی ہے جو کہ خود اپنے وقت کو خراب اور قلب کو فاسد کر چکا ہوتا ہے اسلئے دوسرے کے وقت کو بھی فاسد کئے رہتا ہے کیونکہ وقت کی حفاظت صاحب وقت کرتا ہے اور جس کو اپنے وقت کی نکر نہ ہو اسکو ضائع کرتا ہو گا وہ تو دوسرے کے وقت کیلئے اضیع ہوگا ۔ نیک لوگ اپنے وقت کی بہت قدر کرتے ہیں چنانچہ صوفی کے متعلق کہا ہی جاتا ہے کہ وہ ابن الوقت ہوتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا یعنی بیشک نماز مومنین پر وقت وقت سے فرض کی گئی ۔ جس طرح سے اسکا تعلق وقت سے ہوتا ہے اسی طرح سے صاحب اوقات سے بھی ہوتا ہے ۔ اب صوفی کو چاہے ابن الوقت کہہ لیجئے یا ابو الوقت کہہ لیجئے دونوں کا حاصل ایک ہے نماز کے موقت ہونے کو وہی پسند کریگا جس کو خود وقت کی قدر ہوگی ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں وقت اور زمانہ کی قسم کھائی ہے ۔ فرماتے ہیں وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ترجمہ ۔ قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو پابندی کی فہمائش کرتے رہے ۔ حدیث میں ہے کہ جنت حسرت اور افسوس کی جگہ نہیں ہے وہاں کسی قسم کا افسوس نہ ہوگا ہاں مگر جو وقت کہ دنیا میں غفلت میں گذرا ہوگا اس کی حسرت ضرور ہوگی کہ کاش اسے غفلت میں نہ گذارے ہوتے اور اسمیں اللہ اللہ کیے ہوتے ۔ وقت کے متعلق علماء نے بہت بیان کیا ہے چنانچہ اتباع سنت کے بارے میں جو کہا گیا ہے تو سب سے زیادہ سنتیں وہی ہیں جو وقت کے ساتھ موقت ہیں ۔ اور یہ جو کہا کہ ایسے سبب سے بھی احتراز کرنے جو قلب کو فتنہ میں ڈالدے اور سب سے بڑا سبب برا ساتھی ہے کیونکہ جو شخص خدا سے غافل ہے اسکی صحبت میں آپ بھی غافل ہو جائیں گے ۔ انسان میں غفلت یونہی بلا وجہ نہیں پیدا ہو جاتی بلکہ جب وہ اسباب غفلت اختیار کرتا ہے تب ہی اسکا قلب غافل ہوتا ہے ۔ مسلمانوں نے اللہ و رسول کی اطاعت میں رہتے ہوئے دنیا کے بھی کام کئے ہیں زراعت و تجارت بھی کی ہے لیکن قلب خدا سے متعلق تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انکی تعریف میں یہ آیت نازل فرمائی رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ یعنی ایسے اللہ والے لوگ کہ انکے قلب کو تجارت اور خرید فروخت

۱۔ زیادہ فتنہ کا سبب برا ساتھی
۲۔ وقت کا پابند
۳۔ وقت کا عادی ہونا
۴۔ وقت کی قدر کرنا
۵۔ دوسرے کی اصلاح

اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز کے پڑھنے سے نہیں روکتی۔

یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ سعادت حقیقی یعنی حیات روحانی اور احکام کی پابندی یہ سب اچھی ہی صحبت سے حاصل ہوتی ہیں کوئی اچھا آدمی مل جاتا ہے اور آدمی اسکا دامن پکڑ لیتا ہے تو پھر کامیاب ہوجاتا ہے۔ اسی لئے جتنا اہتمام اچھے ساتھی کا ہے کسی دوسری چیز کا نہیں۔ حضرات صحابہؓ فرمایا کرتے تھے اِجلِسْ بِنَا نُؤْمِنْ سَاعَةً آؤ ہمارے پاس بیٹھو تاکہ باہم ایمان تازہ کریں اسی سے معلوم ہوا کہ یہ حضرات بھی کسی صالح کی صحبت کو سبب ترقیٔ ایمان سمجھتے تھے اور جلیس صالح کی تلاش میں رہتے تھے۔ ترمذی میں حدیث ہے حضرت حریثؓ بن قبیصہ فرماتے ہیں کہ میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوا تو میں نے یہ دعا کی کہ یا اللہ مجھے کوئی جلیس صالح عطا فرما چنانچہ کہتے ہیں کہ میری ملاقات حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی میں نے ان سے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ کوئی جلیس صالح مجھے عطا فرما تو آپ مجھے ملے ہیں لہٰذا مجھے کوئی ایسی حدیث سنائیے جسے آپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو شاید اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس سے نفع عطا فرمائے۔ چنانچہ انھوں نے یہ حدیث سنائی، فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قیامت کے دن بندوں کے اعمال میں سب سے پہلے جسکا حساب ہوگا وہ نماز ہوگی اگر یہ درست ہوگئی تو وہ شخص کامیاب ہوگیا اور جسکا نماز کا حساب صاف نہ ہوا تو پھر وہ خائب خاسر ہوا۔ پھر اگر اسکے فریضہ میں کچھ کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھو میرے بندے کے پاس کوئی نفل عبادت بھی ہے اگر ہوئی تو اس سے اسکے فریضہ کی تکمیل کردی جائیگی پھر اسکے بقیہ اعمال بھی اسی طریقہ پر پیش ہونگے۔

دیکھا آپ نے جو زمانہ کہ خیریت کا تھا اسمیں بھی لوگ کہیں جاتے تھے تو مصاحبت کے لئے کسی صالح کو پہلے تلاش کرتے تھے یہ اس لئے کہ سمجھتے تھے کہ تمام بھلائیوں کی اصل جلیس صالح ہے اور ہر قسم کی برائیوں کا سرچشمہ جلیس سوء ہے میں کہتا ہوں کہ بری صحبت سے بچنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ آدمی نیک صحبت اختیار کرے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

دیدنِ دانا عبادت ایں بود فتح ابواب سعادت ایں بود

ترجمہ۔ فرماتے ہیں کہ کسی دانا کا دیکھنا عبادت ہے بلکہ ہر سعادت کیلئے فتح باب ہے۔

اب اس زمانہ میں ان سب باتوں کو تو کوئی سنتا سناتا نہیں تاہم ہم یہ گفتگو کرتے ہیں کہ شاید کوئی ٹھیک ہی ہوجائے اور کام پر لگ جائے۔ ابھی اس دفعہ الہ آباد میں ایک صاحب نے جو ڈپٹی رہ چکے ہیں کہا کہ جب آپ فلاں جگہ آئے تھے اسی وقت سے آپ سے تعلق ہوا اور آپکی تذکیر

کے مطابق میں نے اسی وقت سے قضائے عمری پڑھنا شروع کردی آج حضرت کو اطلاع دیتا ہوں کہ الحمدللہ گزشتہ سال کی نماز کی قضا سے سبکدوش ہوگیا۔ تو دیکھئے ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ان باتوں سے اثر بھی لے لیتا ہے اب جس طرح سے نیک صحبت سے اثر ہوتا ہے بری صحبت سے بھی ہوتا ہے اور زیادہ ہوتا ہے اور جلد ہوتا ہے اس لیے میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ اس سے بچو اور اپنے لڑکوں کو اس سے بچاؤ، مگر نہیں سنتے۔

سنت اور دین ایک ہی ہے۔ ایسے فتنہ کے زمانہ میں فتنہ پر گفتگو کرنا اور لوگوں کو یہ بتانا کہ یہ دین ہے، اور یہ دین نہیں ہے یہ آسان کام نہیں ہے یوں ایک دو گھنٹہ تقریر کردینا آسان ہے مگر دین کو سمجھا دینا آسان نہیں ہے۔ خاصکر نوجوان طبقہ کو جنکے مزاج میں آزادی ہوتی ہے انکو دین کا پابند کردینا بہت مشکل ہے لیکن کوئی صالح شخص ہوتو وہ انکو دین کی، وقت کی اور جسم کی حفاظت کی طرف متوجہ کردیگا۔ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ وقت اور دین برباد کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا جسم اور اپنی صحت بھی برباد کردیتے چنانچہ جب اپنے آپ کو بالکل برباد کردیتے ہیں تب انکی آنکھ کھلتی ہے اور ایسے وقت میں بزرگوں کے یہاں پہونچتے ہیں کہ معاملہ اختیار سے باہر ہوجاتا ہے ورنہ تو اگر کچھ بھی پہلے ان حضرات کے یہاں پہونچ جائیں تو باوجود حکیم و ڈاکٹر کے عاجز رہنے کے یہ حضرات سنبھال لیتے ہیں لیکن آدمی جب اپنے کو بالکل ختم ہی کردے تو پھر اسکا کیا علاج؟

اب ان باتوں کا سمجھانا بھی مشکل ہے عمل کرنا اور دوسروں سے کرانا تو مشکل ہے ہی مگر لوگوں کو یہ بتانا کہ یہ دیانت ہے اور یہ تقویٰ ہے یہ بھی مشکل ہے۔

آج عوام الناس کو دیکھتا ہوں کہ وہ ہم لوگوں کے پاس آتے ہیں چنانچہ انکی آمدورفت سے انکی طلب کا اندازہ ہوتا ہے اب یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم انکے قلب میں حیات پیدا کریں اور انکو کام پر لگائیں۔ مومن کے قلب میں حیات ہوتی ہے اسی کو ابھارا جاتا ہے۔ چنانچہ میں تو کہتا ہوں کہ عوام کی حالت دین کے اعتبار سے ہم سے اچھی ہے بہت سی خصلتوں سے بچے رہتے ہیں۔ اگر انکو دین سکھایا جائے تو بہت اعلیٰ حالات انکے ہوجائیں یہ دین کے بہت مشتاق ہوتے ہیں انکے اندر خوف بھی ہوتا ہے۔ . . . . . . میں ایک جگہ تھا تو ایک وکیل صاحب نے ایک موقع پر بہت عمدہ بات کہی، میں لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے انکی اس سست رفتاری پر کچھ خفا ہورہا تھا پھر انھوں نے کہا کہ آپکے تشریف لانے کے بعد سے ہم لوگوں کو بہت نفع ہوا یہاں ایک دینی ماحول پیدا ہوگیا یوں یہاں مسجد بھی تھی، مدرسہ بھی تھا، نمازی بھی تھے لیکن دینی روح

ہم میں نہیں تھی میں نے انکے اس قول کی تحسین کی کہ ٹھیک کہا ۔ چنانچہ میں نے بھی محسوس کیا کہ لوگوں کو نفع ہے ۔ بعضے لوگ میرے یہاں آتے تھے تو بیان کرتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں جاتے ہو وہ تو فلاں جماعت کے ہیں، کہتے تھے کہ ہم نے یہ جواب دیا کہ کسی جماعت کے ہوں قرآن پڑھتے ہیں اور اسکا مطلب بتلاتے ہیں ۔ حدیث پڑھتے ہیں اور اسکے معنے بتاتے ہیں بزرگوں کے حالات اور ملفوظات سناتے ہیں ۔ اور لوگوں کی طرح نہیں ہیں ۔ میں نے کہا سچ کہتے ہو واقعی میرا موجودہ کسی جماعت سے تعلق نہیں ہے بس اہل سنت والجماعت ہوں میرا طریقہ قرآن وحدیث کا طریقہ ہے ۔

کبھی کبھی میں یہ بھی کہہ دیا کرتا ہوں کہ یہ جلسہ وعظ نہیں ہے کہ جہاں آپ لوگ دھواں دھار اور مسلسل تقریر کی توقع رکھیں، چنانچہ میں مسلسل گفتگو نہیں کرتا اور یہ اس لئے کہ دین سمجھانا چاہتا ہوں حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کلام یہی آتا ہے کہ یَتَکَلَّمُ بِکَلَامٍ فَصْلٍ یعنی آپ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرمایا کرتے تھے تسلسل اور روانی کے ساتھ جب تقریر کی جاتی ہے وہ کچھ زیادہ نافع نہیں ہوتی اور مسلسل مضمون قلب میں بیٹھتا بھی نہیں اور آہستہ آہستہ کلام جو کیا جاتا ہے تو وہ قلب میں اترتا چلا جاتا ہے اور نفس میں جاگزیں ہوتا جاتا ہے ۔ میرا یہ طریقہ شروع ہی سے رہا ہے اور دیکھا کہ لوگ جب اس سے مانوس ہو گئے ہیں تو دوسرے کلام کو پسند نہیں کیا ہے اور یہ طریقہ میں نے سوچ سمجھ کر کتاب وسنت کی روشنی میں اختیار کیا ہے اور اس کا نفع بھی بیّن طور پر دیکھ رہا ہوں جس سے میں نے سمجھا کہ یہ طریقہ بہتر اور زیادہ نافع ہے اللہ تعالیٰ اسکو قبول فرمائے ۔

فرمایا کہ بڑے لوگ اسکے مکلف ہیں کہ اصول دین پر عمل کریں۔ عالم میں بہت اختلاف ہوگیا ہے۔ بڑے فتنہ کا زمانہ ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے بعد جو زندہ رہے گا اختلافات کثیرہ دیکھے گا اور اسکی وجہ بھی آپ نے بیان فرمائی کہ آرا کا تشعب ہوگا یعنی ہر ایک کی رائے دوسرے سے مختلف ہوگی اور لطف یہ کہ ہر شخص اپنی رائے کو صحیح سمجھے گا۔ اس زمانہ میں رائے تو اب رہی نہیں، لوگ سب چیزوں کو ختم کرچکے ہیں، مگر یہ چھٹ بھیا لوگ اپنی رائے کے آگے کسی دوسرے کی رائے ماننے کیلئے تیار نہیں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر تمھیں ایک دن کے لئے سلطنت دیدیجائے تو چلا نہ سکوگے مگر رائے دینے کے لئے تیار، اور ایسے لوگ یہاں بھی آجاتے ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر چاہو کہ یہاں سے کوئی مرتبہ پاجاؤ تو یہ نہیں ہوگا۔ ہاں یہ یہ کہتا ہوں کہ جب تم خود رائے رکھتے ہو اور مستقل ہو ہمارا اتباع نہیں کرنا چاہتے تو ہمارے سرپرست ہوجاؤ۔ جب اس طرح سے کہتا ہوں تب سمجھتے ہیں کہ ہم کو سمجھتے ہیں۔

ایک مولوی صاحب ایک اور صاحب کے یہاں گئے وہ انکے آنے سے خوش ہوئے اور ان سے کہا کہ اسوقت تو آپ لوگ ہیں مگر رفتار زمانہ سے ایسا معلوم ہورہا ہے کہ بیس سال کے بعد کوئی مسئلہ تک بتانیوالا نہیں ملیگا۔ بالکل صحیح کہا آج یہی حال ہے۔ ساری چیزوں کو تو ان دنیادار لوگوں نے لے لیا ہے اب ان جگہوں کو بھی لے لینا چاہتے ہیں تاکہ اسکو بھی فاسد کردیں اور اسکا بھی ناس ماردیں۔

لوگوں میں رائے کا جو اختلاف ہوتا ہے اور اسکی وجہ سے باہم مخالفت پیدا ہوجاتی ہے تو اسکا سبب عُجب ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کی علامت میں سے ایک علامت اِعْجَابُ کُلِّ ذِیْ رَاْیٍ بِرَاْیِہٖ بھی ہے۔ یعنی ہر رائے والا اپنی رائے کو بڑا سمجھے گا اور اسکے مقابلہ میں دوسرے کی بات نہیں سُنے گا۔ اسی لئے اسکا علاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان

فرمایا۔ آدمی ایک شخص کو اپنا امیر بنالے اور اسکے آگے اپنی رائے کو چھوڑ دے اور سمع وطاعت اختیار کرے اس سے بڑھکر امن وسکون کی کوئی صورت نہیں۔

میں لوگوں کو یہی سمجھاتا تھا کہ اور دوسرے لوگ جو یہ سب کر رہے ہیں تو وہ کچھ عقل رکھتے ہیں تجربہ رکھتے ہیں، سمجھ رکھتے ہیں، تم انکی ریس کیوں کرتے ہو تمھیں تو دیکھتا ہوں کہ تمھارے اندر فہم ہے نہ عقل، تم سے اپنے گھر کا انتظام تو ہوتا نہیں یا تا سلطنت کے امور کو تم کیا سمجھوگے۔ پھر آپس کے اختلاف نے تمھیں الگ تھلگ کر رکھا ہے۔ ایک صاحب میرے پاس آتے تھے پھر انھوں نے آنا چھوڑ دیا پھر اسکے بعد ایک دن آئے تو میں نے کہا بہت دنوں کے بعد تشریف لائے کہنے لگے جی ہاں نظریئے کا اختلاف ہے۔ یہ حال ہے لوگوں کا کہ آتے بھی ہیں اور نظریہ الگ رکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حالات کے پیش نظر وصیت فرمائی تھی کہ اللہ تعالےٰ کا تقویٰ اختیار کرنا اور امام کے ساتھ سمع وطاعت کے ساتھ رہنا اگرچہ وہ عبد حبشی ہی کیوں نہو حدیث کی تعلیم تو یہ ہے کہ شریعت نے حقوق کی تقسیم کردی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَ لَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا وَ لَمْ یُبَجِّلْ عَالِمِیْنَا فَلَیْسَ مِنَّا یعنی جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے اور ہمارے علماء کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یہ طریقہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور یہ سب چیزیں کتابوں میں موجود ہیں اور اہل مدارس بھی اسکو پڑھتے پڑھاتے ہیں لیکن عمل کے وقت یہ اور عوام دونوں برابر ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے ایک مدرسہ سے مجھے لکھا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ نظم کس طرح چلائیں؟ میں نے سوچا انھیں کیا لکھوں، جی میں تو آیا کہ لکھدوں کہ انھیں چھوٹوں کو دیدو کہ لو چلاؤ۔ اب میں آپ لوگوں کو کتاب سے یہ حدیث سنا رہا ہوں اور اگر اس کام کو آپ لوگوں کے ہی حوالہ کردوں کہ لو یہ عربی میں ہے اسکو سنا کر لوگوں کو سمجھاؤ، تو آپ سے پوچھتا ہوں یہ کیسا ہے؟ بس اسی طرح یہ لوگ چاہتے ہیں چھُٹ بھیّوں کو دیدیا جائے کہ لو یہ چلاؤ۔

آج یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں ہمارا بھی ان سے ایک مطالبہ ہے کہ آپ لوگ نفس کو شریعت کی لگام پہنا دیجئے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اتباع سنت کو ہر امر میں لازم پکڑے اور علماء نے اسکا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قانون عدل پر عمل کرے یہاں تک کہ نفس کو شریعت کی لگام پہنا دے۔

یہ پہلے کے لوگ فرما رہے ہیں ہم نہیں کہہ رہے ہیں۔ آپ کا جی چاہے مانیئے جی چاہے نہ مانیئے علماء نے ہر زمانہ میں شریعت کی عظمت اور اسکے احترام کے لئے فرمایا ہے بلکہ اپنے عمل سے بھی کر کے دکھایا ہے حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اقطاب میں تھے بڑے بڑے علماء اور بادشاہ انکے معتقد تھے۔ ایک مرتبہ دہلی سے محتسب کا حکم پہونچا کہ سماع نہ سنو ورنہ ہم آتے ہیں اگر حضرت چاہتے تو بادشاہ کو لکھ دیتے اور محتسب کا حکم منسوخ کرا لیتے لیکن حضرت نے ایسا نہیں کیا بلکہ سماع ہی سننا چھوڑ دیا۔ شہر کے لوگ ہنسنے لگے کہ شیخ نے محتسب کے کوڑے کے ڈر سے سماع ترک کر دیا لوگوں نے حضرت سے اسکو بیان کیا، فرمایا بھائی میں مسلمان میرے باپ دادا مسلمان میں نے شریعت کا ایک حکم سنا اسکو مان لیا اسمیں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ میں نے اس واقعہ کو حکیم اجمیری صاحب کے سامنے بھی بیان کیا تھا اور ان سے کہا کہ دیکھئے آپ کے جد امجد ایسے تھے سنکر بہت متاثر ہوئے میں نے کہا کہ حضرت شیخ کے سارے کمالات ایک طرف اور انکا یہ ایک واقعہ احترام شرع کا ایک طرف۔ یہی ایک کمال انکا سارے کمالات سے بڑھکر ہے۔

ایک بات اور یاد آگئی تو کہتا ہوں، ہر وقت نہیں یاد پڑتی، اسوقت یاد آگئی۔ پانی پت کے ایک حاکم کی سواری جارہی تھی جو کہ شاہ دہلی کی طرف سے وہاں کا گورنر مقرر تھا، ایک کوتوال آگے آگے ہٹو بچو، ہٹو بچو کہتا ہوا راستہ صاف کرتا ہوا چلتا تھا حضرت قلندر صاحب قدس سرہ کا کوئی خادم بھی سڑک پر جارہا تھا وہ کسی خاص دھن میں تھا کہ اس نے یہ آواز نہیں سنی۔ کوتوال نے بڑھکر اسکے منھ پر ایک طمانچہ مارا اس نے قلندر صاحب سے آکر شکایت کر دی حضرت کو غصہ آگیا فوراً شاہ دہلی کے نام پروانہ لکھکر روانہ فرمایا کہ

> "شحنۂ دہلی را اعلام آنکہ بیں دریدہ بیش بریدہ ناحق طمانچہ بررو کشیدہ کہ آہش بآسمان رسیدہ۔ بجائے او دیگرے فرستاد ورنہ بجائے تو دیگرے خواہم فرستاد"
>
> یعنی حاکم دہلی کو مطلع کرتا ہوں کہ یہاں تیرے کوتوال نے جو بیس دریدہ بیش بریدہ ہے میرے آدمی کے منھ پر بلا وجہ ایک طمانچہ مار دیا ہے کہ اسکی آہ آسمان تک پہنچی ہے لہذا میں تجھ سے کہتا ہوں کہ یا تو اسکو فوراً معزول کر کے اسکی جگہ پہ دوسرا حاکم بھیج ورنہ تیری جگہ پر دوسرے کو مقرر کرتا ہوں۔

بادشاہ کے پاس جب یہ تحریر پہنچی تو اسے پڑھکر لرز گیا اور فوراً ایک شخص کو پانی پت حضرت قلندر صاحب کے پاس معذرت نامہ لکھکر بھیجا اور اس کوتوال کے نام پروانہ معزولی روانہ کر دیا۔

دیکھئے جب آپ کے بزرگ موجود تھے تو انکا ایسا دبدبہ تھا اب ہم لوگوں میں سنت پر عمل نہیں ہے اسلئے نہ ویسی بزرگی ہے نہ ویسے درجات جب لوگوں کا عمل شریعت پر تھا تو لوگوں کے قلوب میں بھی انکی عظمت اور عزت تھی۔ اب جب سے اتباع سنت میں کمی ہوگئی ہے نہ بڑوں کا احترام باقی رہ گیا ہے نہ علماء کی عزت باقی ہے۔ شریعت نے سب کے حقوق تقسیم کردیئے تھے بڑوں کو حکم دیا کہ وہ چھوٹوں پر رحم کریں اور چھوٹوں کو یہ حکم کہ بڑوں کی تعظیم کریں اور سب کو یہ حکم دیا کہ عالم دین کی تبجیل کریں۔ اب یہی نہیں ہے کہ چھوٹوں نے تعظیم و تکریم کرنا کم کردیا ہے بلکہ ادھر بھی معاملہ ایسا ہی ہے یعنی بڑوں کی بھی شفقت اور رحمت کی نظر چھوٹوں پر کم ہوگئی ہے۔ رحم کے معانی صرف کھانے پینے ہی کے انتظام کے نہیں ہیں بلکہ تعلیم و تربیت اور تنبیہ و تادیب بھی اسمیں داخل ہے۔ سب سے بڑی چیز ادب ہی ہے۔ پس بڑوں کو جو رحم کرنیکا حکم ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ انکے کھانے پینے پہننے رہنے کا بھی انتظام کریں اور اسکے ساتھ ساتھ دیگر ضروریات کا بھی لحاظ رکھیں اور چھوٹوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ بڑوں کی توقیر کریں۔ یہ کل تین ہی تو طبقے ہیں چھوٹے، بڑے اور علماء و مشائخ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک کے حقوق دوسروں کو بتلا دیئے یعنی ارشاد فرمایا کہ چھوٹوں پر رحم کیا جائے اور بڑوں کی توقیر کیجائے اور عالم کی تبجیل کی جائے۔

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی ایک تعلیم پر آجاؤ تو کام بنجائے تم عالم کی تبجیل کرو تو پھر وہ تم سے خفا کیوں ہوگا تمہاری تو تعریف کریگا کہ بڑے اچھے آدمی ہیں بڑوں کی تعظیم و توقیر کے بڑے بڑے واقعات علماء نے بیان فرمائے ہیں اور کتابوں میں لکھدیئے ہیں۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ سے سنا ایک ڈپٹی صاحب اجلاس پر کام کر رہے تھے بہت دنوں گھر خط نہیں لکھا تھا والدین پریشان تھے چنانچہ انکے والد صاحب پوچھتے پوچھتے انکے اجلاس پر پہنچے اور وہیں پکڑ کر انھیں ٹپکا اور جوتے سے مارنے لگے لوگ دوڑے اور چاہا کہ ان بڑے میاں کو سرزنش کریں، ڈپٹی صاحب نے کہا رہنے دو یہ میرے والد بزرگوار ہیں۔ اس واقعہ کی وجہ سے انکی بڑی شہرت ہوئی کہ بڑا شریف آدمی ہے۔ حکام میں انکی اور زیادہ عزت بڑھ گئی اسی طرح حضرت فرماتے تھے کہ دہلی میں وائسرائے کا ایک میر منشی تھا وائسرائے کے ساتھ ٹم ٹم میں کہیں جا رہا تھا ایک ننگے شخص کو دیکھا کہ سڑک پر پڑا ہوا ہے اس نے ٹم ٹم روک کر اس سے جا کر ملاقات کی اور اس سے لپٹ گیا۔ وائسرائے نے پوچھا کہ "ول" یہ کون ہے؟ کہا حضور یہ میرا باپ ہے جہاز کے سفر میں گیا ہوا تھا جہاز طوفان میں آگیا اسکا سامان وغیرہ سب غائب ہوگیا

اسی طرح سے اسکی جان بچی اور یہ ساحل پر آگیا۔ یہ سنکر وائسرائے نے اپنا دوشالہ دیا کہا کر اسے اڑھا دو یہ تمھارا باپ ہے تو ہمارا بھی باپ ہے۔ اس واقعہ کی شہرت تمام شہر میں ہو گئی کہ بہت شریف آدمی ہے۔ حضرت جب اس واقعہ کو بیان فرماتے تھے تو سامعین پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

یہ واقعات میں آپکو اس پر سنا رہا ہوں کہ لوگوں نے بڑوں کی توقیر کی ہے تو اسکی وجہ سے انھیں عزت اور مرتبہ ملا۔ پس عزت حاصل کرنیکا طریقہ اللہ و رسول کے فرمانے کے مطابق یہی ہے کہ آدمی اپنی حیثیت کو اور دوسروں کے مرتبہ کو پہچانے۔ اور میں جو یہ بیان کر رہا ہوں یہ حدود ہیں جو خدا کی طرف سے مقرر ہیں ان حدود کی اگر لوگ رعایت کریں تو نہایت امن کے ساتھ زندگی گذار سکتے ہیں جس طرح سے کہ اختلاف کے وقت کا حکم بتایا کہ تقویٰ اللہ اختیار کرے اور اپنے امیر کے ساتھ سمع و طاعت کا معاملہ رکھے تو اسکی وجہ سے سعادت دارین حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فتنے بھی بہت ہو گئے ہیں پہلے بھی بہت ہوئے لیکن جن لوگوں نے اس حدیث پر عمل کیا وہ ہر زمانہ میں اچھے ہی رہے۔ سب سے بڑی چیز دین میں خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں اور ان کی حفاظت کرنا نہایت ضروری ہے۔ گر فرق مراتب نکنی زندیقی۔

ذی رائے لوگ اپنی اپنی رائے پیش کر سکتے ہیں اب مجلس شوریٰ ان کے رائے مشورہ کو ماننے یا نہ ماننے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں کر سکتے کہ منتظمین کو اپنی رائے کو قبول کرنے پر مجبور کریں اور ان سے مطالبہ کریں کہ ہماری رائے مانو۔

اگر کوئی چھوٹا ہے تو اسے چھوٹا ہو کر رہنا چاہئے اور بڑا ہے تو بڑا ہو کر رہنا چاہئے اگر کوئی عالم ہے تو اسکو عالم کی حیثیت سے رہنا چاہئے اور دوسرے لوگوں کو اسکی یہ جہت تسلیم کرنی چاہئے اب ہر ایک کو اسکے درجہ پر رکھئے پھر دیکھئے کہ کیا آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سنت کو اگر آپ جاری کرلیں تو اسکے برکات دیکھیں گے۔ اس زمانہ میں ادب ہی تو اٹھ گیا ہے اور پہلے زمانہ میں اسی کا بڑا لحاظ کیا جاتا تھا۔ اسکا اہتمام ہوتا تھا کہ علم اگر زیادہ نہیں حاصل ہوا ہے تو نہ سہی ادب اور تہذیب سکھانے پر زیادہ زور صرف کرتے تھے۔ اس پر ایک واقعہ یاد آیا۔ کتابوں میں لکھا ہوا ہے میں دکھلا سکتا ہوں ایک عالم تھے، بادشاہ کے بچوں کے استاد تھے، ایک دن وہ عالم صاحب بادشاہ سے ملنے تشریف لائے جیسے ہی جوتا اتار کر فرش پر قدم رکھا ان دونوں نے جھپٹ کر انکے جوتے اٹھائے اسی اثناء میں بادشاہ نے ان عالم صاحب کو طلب فرمایا وہ ڈر گئے سمجھے کہ ان لڑکوں کا میرا جوتا اٹھانا شاہی مزاج

کے خلاف ہوا بادشاہ نے شاید اسی پر تنبیہ فرمانے کے لئے یاد کیا ہے۔ لیکن جب بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو بہت ہی خوش ہوا اور دس ہزار درہم استاد صاحب کو اور دس دس ہزار ان دونوں بچوں کو انعام دیا اور ان سے کہا کہ آپ کے اس حسن تربیت کو دیکھکر اسوقت میرا دل باغ باغ ہوگیا آپ کا بڑا احسان ہے کہ آپ نے میرے بچوں کو ایسی تربیت دی۔ دیکھا آپ نے اخلاق کی اس زمانہ میں اتنی قدر تھی اور توقیر کبیر۔ اور تجلیل عالم پر ان لوگوں کا کتنا عمل تھا۔ میں کہتا ہوں کہ نیک اخلاق سے جنت تو آخرت میں ملے ہی گی اسکا اثر دنیا میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔

آج کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو حدود کی رعایت رکھنی چاہئے اور برے ساتھی اور قلب کو مفتون کر دینے والے اسباب سے دوری اختیار کرنی چاہئے۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ یہ نص ہے یعنی تقویٰ اور نیکی کے کاموں باہم ایک دوسرے کی اعانت کرو اور گناہ اور سرکشی کی باتوں پر ایک دوسرے کا تعاون مت کرو۔ یہ خدائی حکم ہے اسکے خلاف کروگے تو دنیوی راحت بھی نہیں ملے گی۔ اس زمانہ میں اخلاق کی اصلاح ایک اہم مسئلہ ہے مگر کوئی اگر جان ہی پر کھیل جائے تو کچھ لوگ تو اچھے ہو ہی جائینگے باقی اخلاق درست کرنے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ مشہور رہی ہے کہ انکی والدہ بہت ضعیفہ تھیں اور مکان پر سوائے انکے اور کوئی نہ تھا اسلئے حضور کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکے اور یہ کہلا بھیجا کہ آپکی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ خدمت اقدس میں ابھی حاضر ہو جاؤں مگر آپ ہی کا حکم ہے کہ والدہ کی خدمت کرنی چاہئے اسلئے آپکی محبت کو آپکے حکم پر ترجیح دیتا ہوں۔ چنانچہ والدہ کی خدمت کرتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہ کرسکے اسی واسطے صحابیت کے شرف سے بھی مشرف نہ ہوسکے۔ سبحان اللہ شریعت پر عمل اور طبیعت پر اسکو غالب کرنے کی اس سے بڑھکر اور کیا مثال ہوسکتی ہے۔

ایک بزرگ کے یہاں ایک صاحب گئے اور کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ اب میں گھر جانا چاہتا ہوں والدہ نے بس اتنے ہی دنوں کی اجازت دی تھی وہ بزرگ یہ سن کر بہت خوش ہوئے کیونکہ اس سے انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ لڑکا سعید معلوم ہوتا ہے ماں باپ کا مطیع اور فرماں بردار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نیچے تھے لوگوں نے بدون باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے انکی والدہ

پر شبہہ کیا چنانچہ ان سے یہ کہا کہ یَا اُخْتَ هَارُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا یعنی اے مریم تمہارا باپ تو برا آدمی نہیں تھا اور نہ تمہاری ماں ہی فاحشہ تھیں پھر یہ بچہ تم کہاں سے لائیں حضرت مریم علیہا السلام نے حضرت عیسیٰ کی طرف اشارہ فرما دیا کہ ان سے پوچھو قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا لوگوں نے کہا جو بچہ ابھی جھولے میں پڑا ہے اس سے ہم کیا پوچھیں اتنے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بول پڑے قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا فرمایا کہ میں عبداللہ ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی کتاب عطا فرمائی ہے اور مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے اور مجھے نماز و زکوٰۃ کا تاکیدی حکم فرمایا ہے جب تک میں زندہ ہوں انکی ادا کرتا رہوں اور مجھکو والدہ کی اطاعت اور فرماں برداری کی بھی بہت تاکید فرمائی ہے اور مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا ہے۔

چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صرف والدہ ہی تھیں اس لیے آپؑ نے صرف والدہ ہی کی اطاعت کے متعلق کہا اس سے معلوم ہوا کہ والدین کی اطاعت سعادت ہے اور انکی نافرمانی شقاوت ہے۔ میں کہتا ہوں اسی طرح سے اپنے بڑے کی اطاعت کرنا والدین ہوں یا استاد پیر ہوں یا والی وامیر ہوں ان سب کی اطاعت موجب سعادت ہے۔ اس مضمون کو ابھی بیان کروں گا اور تھوڑا تھوڑا بیان ہی کرتا رہونگا۔ آدمی فرشتہ نہیں ہے بشر ہے لہذا اُسے بشریت ہی کی راہ سے ترقی کرنی ہوگی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وصیت فرمائی اسمیں زور اخلاق کی درستی پر بھی دیا ہے۔ یہ اسی لیے کہ انسان جتنی ترقی اخلاق کی رو سے کر سکتا ہے دوسری راہ سے نہیں کر سکتا۔ کیونکہ عبادت میں فرشتے اس سے بہت آگے ہیں اور اخلاق میں ترقی کرنے کے لیے اسکو نفس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور عوارض بشریہ مانع ہوتے ہیں لہذا جب ان سب کا مقابلہ کر کے انسان اس راہ سے ترقی کر جاتا ہے تو اسکی یہ ترقی سب سے بڑھ جاتی ہے۔

میں نے شروع میں جو حدیث پڑھی تھی کہ مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا وَلَمْ يُجِلَّ عَالِمَنَا فَلَيْسَ مِنَّا۔ اس حدیث کا حاصل اخلاق کی تعلیم ہے۔ چنانچہ سب سے بڑی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن خلق کا اختیار کرنا ہے۔ اسمیں بڑوں کو تعلیم فرمایا کہ ہماری سنت اور ہمارا طریقہ یہ ہے کہ چھوٹوں پر رحم کیا جائے اور چھوٹوں سے یہ فرمایا کہ دیکھو ہمارا طریقہ یہ ہے کہ بڑوں کی تعظیم کیجائے اور عوام الناس کو بتایا کہ عالم کا احترام کرنا چاہئے۔ غرض ہر طبقہ کو اسکے مناسب خلق سکھلایا اور

الانسانی صفات

اس پر عمل نہ کرنے پر سخت دھمکی دی کہ اگر کوئی شخص اس خلق کے خلاف کریگا تو وہ ہم میں سے نہیں ہے یعنی ہمارے اخلاق پر نہیں ہے، ہماری سنت اور طریقہ پر نہیں ہے۔ یہ فرما کر گویا اسکا پتہ ہی کاٹ دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سخت مزاج تھے، شام کے ایک شخص نے لوگوں سے انکے متعلق پوچھا کہ انکا طریقہ بچوں کے ساتھ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا بچے تو آپ سے بہت مانوس ہیں جب آپکو دیکھ لیتے ہیں تو کوئی ہاتھ پکڑ لیتا ہے، کوئی کپڑے پکڑ کر کھینچ لیتا ہے، کوئی کندھوں پر چڑھ جاتا ہے۔ یہ سنکر اس نے کہا کہ پھر وہ بد اخلاق نہیں ورنہ بچے اسطرح سے انکے ساتھ معاملہ نہ کرتے۔ دیکھئے اس نے اسکو دلیل بنایا۔ آدمی میں جب خلق ہوتا ہے تو وہ چھوٹو پر رحم کرتا ہے۔ اسیطرح سے چھوٹوں کے جب اخلاق درست ہوتے ہیں پھر بڑوں کی تعظیم بھی انکے قلب میں پیدا ہو جاتی ہے

ایک بزرگ کہیں تشریف لے گئے اور جاتے وقت اپنے ایک دوسرے عزیز کو چھوڑ گئے اور اپنی سواری انکے حوالہ کر گئے اور انسے کہا کہ تم اسپر چلے آنا اور فلاں کو لیتے آنا (یہ صاحب ان بزرگ کے خادم تھے) ان صاحب نے یہ کیا کہ سواری کے اوپر عمدہ دوشالہ بچھایا اور ان خادم صاحب کو آگے بٹھایا اور خود پیچھے بیٹھے۔ اس خادم کو آگے بیٹھنے میں کچھ تکلف ہوا اور انھوں نے بہت اصرار کیا کہ آپ آگے بیٹھئے میں پیچھے بیٹھ جاؤنگا لیکن یہ نہ مانے اور یہی کہتے رہے کہ میاں صاحب مجھکو حکم دے گئے ہیں کہ انکو لیتے آنا اس لئے میں آپ کو نہایت عزت کے ساتھ لے چلونگا۔ دیکھا آپ نے یہ اخلاق تھے آپ کے اسلاف کے، اور میں کہتا ہوں کہ اتباع سنت میں سب سے بڑی چیز اخلاق ہی ہے۔ اب ہم لوگوں میں بھی چونکہ اخلاق نہیں رہے اسلئے اصاغر اور عوام کی جانب سے علماء کی تبجیل بھی باقی نہیں رہی ورنہ تو جب کوئی اللہ والا ہوتا تھا تو اسکی عظمت اور رعب کی وجہ سے شہر میں سناٹا ہو جاتا تھا مطالبہ کے کیا معنی؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا وقار ختم ہو چکا ہے۔

کتابوں میں لکھا ہوا ہے، ہماری تاریخ ہے کہ علماء کی عظمت انکے خلوص اور للہیت اور اتباع سنت کیوجہ سے عوام کے قلوب میں بادشاہ کی عظمت سے کم نہیں تھی۔ ایک دفعہ بادشاہ اپنے محل میں بیٹھا ہوا تھا کہ شہر کے اندر ایک شور سنائی دیا وہ گھبرا گیا کہ شاید کوئی غنیم چڑھ آیا ہے واقعہ کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضرت عبد اللہ ابن مبارکؒ کو چھینک آئی تھی اس پر انھوں نے الحمد للہ کہا جو لوگ سامنے موجود تھے انھوں نے انکے جواب میں یرحمک اللہ کہا انکا جواب سنکر انکے پاس کے لوگوں نے بھی یرحمک اللہ کہا اسی طرح پھر انکے بعد کے لوگوں نے کہا یوں سلسلہ بسلسلہ جواب کی آوازے

شہر گونج گیا۔ دیکھا آپ نے ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ لوگ عالم دین کی ایسی توقیر کرتے تھے اور یہ تو پہلے زمانہ کا حال تھا ابھی تھوڑے زمانہ کا واقعہ ہے حضرت مولانا تھانوی سفر فرما رہے تھے ریل میں مولانا الیاس صاحبؒ بھی ساتھ تھے اور میں بھی تھا ایک موقع پر حضرت مولانا الیاس صاحبؒ نے حضرت مولانا کا جوتہ اٹھا لیا فرمایا کہ ارے مولانا آپ نے یہ کیا کیا اجوتو یہ سر پر رکھنے کے لائق ہو گیا بہشتوں کیا؟ انکی اس تواضع کا حضرت مولاناؒ برابر ذکر فرماتے تھے۔

اسی طرح سے حضرتؒ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور لوگ کرسی پکڑا کرے جا رہے تھے۔ ایک طرف کا پایہ مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری نے پکڑ لیا حضرتؒ نے فرمایا کہ مولانا ایسطرح سے جنت میں بھی لے چلئے گا؟

یہ کہہ رہا ہوں کہ ادب و تواضع ایسی چیزیں ہیں کہ طریق میں جس کو جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے اور جس نے اپنے بڑوں کا جتنا ادب کیا ہے اتنا ہی بڑا وہ شخص ہوا ہے۔ ہمارے اسلاف نے تو تواضع کی انتہا کر دی۔ بڑوں سے تو کرتے ہی تھے غریب اور چھوٹے لوگوں سے نہایت تواضع سے پیش آتے تھے چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ان سے ملنے کے لئے ایک بڑے شخص آئے جن کے ساتھ بہت سے خدام وغیرہ تھے۔ حضرت مولانا نے انکے ٹھہرانے کا انتظام فرمایا اور لوگوں کو خدمت پر انکے لئے معمور کر دیا۔ انکے ساتھ انکا ایک بھنگی بھی تھا۔ حضرت نے اسکی خدمت خود اپنے ذمہ لی اس طرح پر سب لوگوں کو نہایت آرام اور احترام کے ساتھ رکھا اور اپنے لوگوں سے یہ اعلان فرما دیا کہ فلاں صاحب آ رہے ہیں خبردار خبردار کوئی صاحب ان سے سنت و بدعت کی بحث چھیڑ کر مناظرہ نہ فرمائیں۔ چنانچہ حضرت مولانا کے اس اخلاق کا ان پر بہت اثر ہوا اور انھوں نے حضرت سے اقرار کیا کہ حضرت اتباع سنت تو بس آپ لوگ کرتے ہیں اور ہم لوگ تو محض پیٹ کیلئے پیر ہیں۔

دیکھا آپ نے اخلاق میں بڑی قوت ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کے اخلاق کا کیا کہنا مشہور تھا کہ حضرت سے جو کوئی ایک بار مل لیتا تھا تو پھر وہ بچکر نہیں آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی تاثیر عطا فرمائی تھی کہ جو شخص ذرا دیر کے لئے بھی صحبت میں ایک بار بیٹھتا تھا بس وہ مسخر ہی ہو جاتا تھا۔

ابتدائی زمانہ میں وطن کے اطراف کے لوگ مجھ سے کچھ خفا رہتے تھے۔ انکے بچے آتے تھے تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہاں آئے جائیگا تو دنیا چھوٹ جائیگی بعض لڑکوں نے مجھ سے کہا کہ والد آنے سے

خفا ہوتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا بھائی یہاں آنا چاہتے ہو تو دگنی شقت کرو یعنی رات کو یہاں کا کام کرو اور دن کو گھر کا کام دیکھو۔ تمہارے والد تم سے ناراض نہیں ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا سے رہ جائیگا اسلئے تم دین کے ساتھ ساتھ دنیا بھی اوروں سے زیادہ کما کر دکھا دو۔ اس نے ایسا ہی کیا تو خوش ہو گئے پھر اگر اسکو از خود آنے میں دیر ہوتی تو تقاضا کر کے بھیجتے کہ اتنے دن ہو گیا مولانا کے یہاں نہیں گئے۔ میں تو ان لوگوں کی نبض پہچانتا ہوں انکی دنیا نہ چھوٹے اور اسکے ساتھ ساتھ کوئی آدمی بزرگ ہو جائے ولی ہو جائے تو انکا کیا نقصان ہے۔

یہ تمام باتیں میں نے اخلاق پر آپ کو سنائیں کہ آدمی کے اخلاق اچھے ہوتے ہیں تو سب لوگ اسکی عزت کرتے ہیں چنانچہ علماء نے یہ جو فرمایا ہے کہ سعادتِ حقیقیہ منوط ہے اتباع سنت کے ساتھ اس سنت کا سب سے اعلیٰ فرد اخلاق ہی کو سمجھتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ سعادتِ حقیقیہ جس اتباع سنت اور اتباع شریعت کے ساتھ منوط ہے اس سے مراد حقیقی اتباع ہے جو ظاہراً بھی ہو اور باطناً بھی ہو قالب سے بھی ہو قلب سے بھی ہو یہ نہیں کہ صرف ظاہراً اتباع کر لیا اور باطناً نہیں کیا۔ اس سے سعادتِ حقیقیہ نہیں حاصل ہو گی۔ اور میں یہ جو کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں فلاح دنیوی کے بھی حصول کا ذریعہ اتباع شریعت ہے اس سے مراد یہی اتباع حقیقی ہے اب لوگ یہ کرتے ہیں کہ فلاح و سعادت کو تو چاہتے ہیں حقیقی اور اتباع میں کافی سمجھتے ہیں ظاہری اور صوری اتباع کو اسی لئے فلاح نہیں ہوتی۔ کیونکہ فلاح حقیقی کا ترتب اتباع حقیقی پر ہوتا ہے۔

لیکن یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے وہ یہ کہ سعادت منوط ہے اتباع سنت پر اور اتباعِ سنت کا راستہ ترکِ اتباعِ نفس ہے۔ اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ سعادتِ حقیقیہ کا حصول نفس اور نفسانیت کے ترک پر موقوف ہے اسی کو میں یوں کہتا ہوں کہ ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

اصل قائل نے تو اس سے یہ مراد لیا تھا کہ میرے دیکھنے میں تو مصلحت کا رصرف یہ سمجھ میں آتی ہے کہ احباب اپنے تمام مشاغل ترک کر کے بس یار کو پکڑ لیں۔ میں کہتا ہوں کہ یار سے مراد یہاں اپنے نفس ہی کو لیجئے یعنی اگر دارین کی فلاح چاہتے ہو تو سب چیزوں سے صرف نظر کر کے بس اپنے نفس کو پکڑ لیں اور اسی کی اصلاح کریں اسکی وجہ سے ہر قسم کی خیر بلکہ فلاح دارین حاصل ہو جائیگی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰہَا یعنی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اس نے فلاح پائی۔ اور فرماتے ہیں وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَہَی النَّفْسَ عَنِ الْہَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ہِیَ الْمَاْوٰی۔ یعنی جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو جنت اسکا ٹھکانا ہوگا۔

فرماتے ہیں کہ سعادات حقیقیہ کی تحصیل منوط ہے اتباع سنت کے ساتھ یعنی حقیقی سعادت یعنی دینی و دنیاوی ظاہری و باطنی سعادت کے حاصل ہونے کا ذریعہ اتباع سنت ہے۔ آگے اتباع سنت کی تشریح فرماتے ہیں کہ اتباع سنت یہ ہے کہ اوامر کا امتثال کرے اخلاص کے ساتھ اور مناہی سے اجتناب کرے خوف کے ساتھ۔ اوامر اور منہیات پر عمل کرنا اتباع سنت ہے یعنی منہیات سے بچنا اور اوامر کا امتثال کرنا ان ہی دونوں پر اتباع سنت کا دار و مدار ہے لیکن اتباع سنت سعادتِ حقیقیہ کا مدار اسوقت ہوگی جبکہ اسکے ساتھ ساتھ دو چیزوں کا اور اہتمام کیا جائے، ایک تو یہ کہ ہر ایسے ساتھی سے مجانبت اور دوری اختیار کی جائے جو اسکے وقت کو فاسد کرے، دوسرے یہ کہ ہر ایسے علاقہ اور سبب سے احتراز کیا جائے جو اسکے قلب کو فتنہ میں ڈالدے۔

اسی کو میں نے بیان کیا تھا کہ دونوں ایک ہی چیز ہے اور ان میں سب سے زیادہ مضر اور مہلک برا ساتھی ہے۔ اس سے قلب بھی مفتون ہوتا ہے اور وقت بھی برباد ہوتا ہے کیونکہ یہ ایسا سبب ہے کہ قلب کو اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے پھر جس جانب قلب ہوگیا انسان کا سارا ہی وقت اسکی نذر ہوجائیگا۔ اس لئے آدمی اسکے بعد کسی کام کا رہ نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ سعادت حقیقیہ کیلئے جب اتباع سنت کو طریق گردانا تو یہ بھی بتا دیا کہ اس سے پہلے ان امور کا بھی اہتمام چاہئے ورنہ تو اگر قلب اور وقت کو نہ بچایا گیا اور وقت چلا گیا تو پھر سعادتِ حقیقیہ تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں آپ اسکو ڈھونڈھا کیجئے۔

انسان کے تمام جوارح اور اعضاء اسکے قلب کے تابع ہوتے ہیں چنانچہ جب قلب ہی کا ناس ہوجاتا ہے اور وہ فاسد ہوجاتا ہے تو پھر دیگر اعضاء بھی فاسد ہوجاتے ہیں اور انسان کا وقت بھی فاسد ہوجاتا ہے۔ اسلئے وقت کا لحاظ کرنا اور اسکو فساد سے بچانا بہت ضروری ہے یہی حالات ہوتے ہیں اسی میں کسی کو کوئی کامل ملجاتا ہے تو وہ اپنے وقت کی حفاظت کرکے کامیاب ہوجاتا ہے

اور کسی کا ساتھ کسی صاحب سوء اور برے مصاحب سے پڑجاتا ہے وہ اپنے کو بھی خراب کرلیتا ہے یہیں سے معلوم ہوا کہ جس طرح سے برے ساتھی کا ساتھ پکڑ کر آدمی برا ہوجاتا ہے اور اپنے وقت اور قلب کو فاسد اور خراب کرلیتا ہے اسی طرح سے کسی کو کوئی جلیس صالح مل جاتا ہے تو اسکی وجہ سے وہ اپنے قلب اور وقت کی حفاظت کرکے سعادت حقیقیہ کی راہ بھی اختیار کرلیتا ہے اور اسکا رخ ہدایت کیجانب ہوجاتا ہے۔ مجھ سے یہیں ایک صاحب نے کہا کہ فلاں جگہ چلو میں نے کہا کہ وہاں تو خود ہی اہل علم موجود ہیں اور باہر سے بھی علماء آتے جاتے رہتے ہیں پھر مجھے کیوں لیجانا چاہتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ بیشک وہاں اہل علم موجود ہیں لیکن اس لیے آپکو لے چلنا چاہتا ہوں تاکہ ان سب کا رخ درست ہوجائے۔

بہرحال میں وہاں گیا نہیں اس زمانہ میں کسی کا رخ درست کرنا آسان ہے؟ اور وہ بھی اہل علم کا؟ یہ میں نے آپکو اس پر سنایا کہ یہ صحیح ہے کہ نیک ساتھی کے رہنے سے اور اچھوں کی صحبت اختیار کرنیکی وجہ سے آدمی کا رخ درست ہوجاتا ہے جس طرح سے کہ برے ہمنشین کیوجہ سے رخ درست بھی ہوچکا ہو جب بھی ٹیڑھا ہوجاتا ہے اور علماء نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بری صحبت کا اثر جلد ہوتا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یار بد مار بد سے بھی بدتر ہوتا ہے۔

تاتوانی دور شو از یار بد　　　یار بد بدتر بود از مار بد

مار بد تنہا ہمیں بر جاں زند　　　یار بد بر جان و بر ایماں زند

یعنی جہانتک تم سے ہوسکے برے ساتھی سے دور رہو اسلئے کہ برا ساتھی زہریلے سانپ سے بھی زیادہ ہلک ہوتا ہے کیونکہ زہریلا سانپ تو بہت زیادہ یہ کریگا کہ جان لے لیگا اور برا ساتھی سبب ہلاکتِ جان و ایمان دونوں ہی ہوجاتا ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں آپکے بزرگ فرما رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی نکلا کہ جہاں تک ہوسکے آدمی نیک صحبت میں رہے یعنی جس طرح سے بری صحبت سے بچنے کی ضرورت ہے اسی طرح سے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی نیک صحبت اختیار کرے اور اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آدمی اپنے دین کی حفاظت کرے۔

وطن میں تھا' ایک بار ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ فلاں صاحب کا روپیہ چوری ہوگیا ہے میں نے صاحب مال کو بلایا اور ان پر خفا ہوا اور ان سے کہا کہ نکلو تم خانقاہ سے چلے ہو دین حاصل کرنے کے لیے اور تم سے دنیا کی حفاظت تو ہوتی نہیں پھر دین کا تحفظ کیا کرسکو گے دنیا کمانا آسان ہے لیکن مال کی حفاظت مشکل ہے اور اسکو اپنے مصرف پر صرف کرنا اور زیادہ مشکل ہے

گلستان میں شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص کے پاس مال تھا اسکی حفاظت کی فکر میں اسکو رات بھر نیند نہ آتی تھی اسنے یہ خیال کیا کہ یہ تو ایک بہت بڑی مصیبت ہے کہ میں مال کی حفاظت میں رات بھر جاگا کرتا ہوں اسلیئے اس نے نگہبانی کے لیۓ ایک ملازم رکھا اور یہ خیال کیا کہ آج رات کو اطمینان سے سوؤنگا۔ چنانچہ خوب سویا۔ اسی رات چوری ہوگئی تو اس نے کہا واللہ بدرقہ بُرد یعنی ساتھی لے گیا۔ خانقاہ میں بھی لوگوں نے مال مسروقہ کی تلاش شروع کی کسی نے اپنا تجربہ بیان کیا کہ فلاں موقع پر اسی طرح چوری ہوئی تھی مال غسل خانہ کی چھت پر ملا تھا چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا دیکھا گیا تو اسی پر تھا۔ لوگوں نے آکر مجھسے بتلایا کہ رقم مل گئی، ایک ڈاکٹر صاحب بھی ان دنوں ٹھہرے ہوئے تھے انھوں نے یہ کیا کہ سب لوگوں کی نبض دیکھنا شروع کیا تو جس نے چوری کی تھی اسکی نبض بہت سرعت کے ساتھ چل رہی تھی اسکو پکڑلیا اور میرے پاس لائے میں نے اس سے کہا کہ تم نے اگر چوری کی ہو تو سچ سچ بتاؤ معاف کردونگا اور اگر نہ بتاؤ گے تو سخت سزا دونگا چنانچہ اس نے اقرار کیا۔ یہ شخص جس بستی کا رہنے والا تھا وہاں کے بڑے لوگوں نے اسکی حرکات سے عاجز ہوکر اسکو میرے پاس رکھنا طے کیا میں نے یہ خیال کرکے منظور کرلیا کہ شاید صحبت بدل جانے پر ٹھیک ہو جائے چنانچہ ان لوگوں نے اسکی تنخواہ مقرر کردی کہ تنخواہ لے اور یہاں پڑا رہے اور اپنی اصلاح کرے مگر وہ خصلت اسکے اندر اس درجہ راسخ ہو چکی تھی کہ مجھ سے لوگوں نے کہا کہ مکان ہی سے یہ کہکر آیا تھا کہ فتحپور رہا جائیگا تو وہاں بھی یہ کام کیا جائیگا اور جب جمعہ کو گھر آیا جائے گا تو یہاں بھی کیا جائیگا۔ میں نے یہ خیال کرکے اسے رکھ لیا کہ اگر کسی مسلمان کی اصلاح ہو جائے اور اس کے ضرر سے دوسرے مسلمان مامون ومحفوظ رہیں تو کیا حرج ہے۔ لیکن وہ کرتا یہ تھا کہ اصلاح وغیرہ تو الگ رہی تنخواہ بھی لیتا تھا اور چوری بھی کرتا تھا۔ جو لوگ اسے تنخواہ دیتے تھے ان سے کہتا تھا ہم تم کو سمجھ لیں گے۔ میں نے سنا تو کہا ارے اب وہ کیا سمجھے گا اسکو تو خود سمجھا گیا ہے تم لوگ ڈرو مت کچھ کرے تو ہم سے کہنا۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ تعلیم وتربیت کا مسئلہ بہت ضروری ہے۔ حضرت عرباض بن ساریہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور پھر ہم لوگوں کی جانب رخ فرمالیا۔ ہمیں نہایت بلیغ وعظ فرمایا ایسا کہ جسے سنکر آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور ہم سب کے دل دہل گئے۔ یہ دیکھکر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کا یہ وعظ تو گویا رخصت کرنے والا وعظ معلوم ہوتا ہے لہٰذا ہمیں کچھ وصیت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا میں تم کو نصیحت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ

تیزی

کے تقویٰ کی، اور اپنے امیر کے لئے سمع وطاعت کی اگرچہ وہ عبد حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ پھر یہ فرمایا کہ یہ اسلئے کہہ رہا ہوں کہ جو شخص تم میں سے میرے بعد زندہ رہیگا تو وہ اختلاف کثیر دیکھے گا اسوقت بجز میری سنت کے اختیار کرنے کے اور کوئی سبیل نجات کی نہ ہوگی۔ اسلئے میری سنت اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کو اپنے اوپر لازم کرلینا اور انھیں سے تمسک کرنا۔ بلکہ اپنے دانتوں سے مضبوط پکڑ لینا اور اپنے کو محدثات امور یعنی بدعات سے بچانا۔ اس لئے کہ ہر محدث بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس وصیت میں آپؐ نے ایک تو تقویٰ اللہ کو فرمایا یہ تو خالق کا حق ہوا اور دوسرے سمع وطاعت کا حق فرمایا یعنی فتنہ سے امن کا ایک طریقہ یہ ہے کہ چھوٹا اپنے بڑے کی اطاعت کرے اور اسکا حکم مانے اسکا منقاد رہے خواہ وہ بڑا امام ہو یا امیر المومنین ہو یا سلطان وقت ہو اسی طرح سے باپ ہو کہ استاد ہو کہ اپنا شیخ ہو۔

اور آپ نے سمع وطاعت کے مفید ہونے کی وجہ بھی بیان فرمائی یعنی یہ کہ میرے بعد اختلافاتِ کثیرہ رونما ہونگے اور اس اختلاف کا سبب رائے کی کثرت ہوگی اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی معاملہ میں آراء مختلف ہوجائیں اور ہر شخص اپنی ہی رائے کو صحیح سمجھتا ہو تو پھر خلاف ونزاع اسکے لئے لازم وضروری ہے اسلئے خلاف ونزاع کو ختم کرنے کا بس واحد طریقہ وہی ہے جسکو لسان نبوت نے بایں الفاظ امت کو سکھلایا ہے کہ فَعَلَيْكُمْ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ وَإِنْ أُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ (الحدیث) میں آپ سے کہتا ہوں کہ دنیا کے تمام عقلاء بھی اگر جمع ہوجائیں تو اختلاف کے دور کرنیکا اس سے بہتر کوئی طریقہ تجویز نہیں کرسکتے۔ (اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق بخشیں)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

وصیت نبوی اور فلاح دارین

میں آپ کو ایک حدیث سُناتا ہوں جس میں فلاح دارین مضمر ہے۔ یہ حدیث احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی اور ابن ماجہ کی ہے۔ وھو ھذا

عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَوَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَاَنَّهَا هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا فَقَالَ أُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ كَانَ عَبْدًا حَبْشِيًّا فَاِنَّهٗ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ رواہ احمد وابوداؤد والترمذی وابن ماجہ

اس کا مطلب علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ جس نے میری وصیت قبول کی اور اللہ کے تقوے کا التزام کیا اور جو شخص کہ اس پر والی بنایا گیا اس کی طاعت کو قبول کریا اور فتن کو نہ اُبھارا وہ مامون رہیگا اختلاف کثیرہ سے اور فتن سے جو مختلف رایوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

یہ حدیث اُمّت کے لئے ایسے وقت میں سند ہے۔

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کو انکی اصلاح دنیا کے لئے ایک نظام مرحمت فرمایا ہے اور وہ ہے "اطاعت" یعنی ہر چھوٹے کو حکم دیا کہ وہ اپنے بڑے کی اطاعت کرے خواہ وہ حاکم وامیر ہو یا والدین یا اُستاد و پیر ہوں۔ کیونکہ اسی اطاعت پر نظام عالم کا قیام ہے اور اسی کے نہ ہونے کی وجہ سے فتنہ وفساد ہے۔ مگر آج دیکھا جاتا ہے کہ ہمارا اسی پر عمل نہیں ہے ہر چھوٹا اباد ہوکر چھوٹا ہے مگر اسی حال میں

وہ بڑا ہو گیا ہے اور ہر بڑا باوجودیکہ بڑا ہے مگر اسی حال میں چھوٹا بنا ہوا ہے۔ حالانکہ حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ فرق مراتب ضروری ہے یعنی چھوٹے کو چھوٹا ہو کر رہنا چاہئے۔ بڑے کو بڑا ہو کر رہنا چاہئے۔ باپ کو باپ سمجھنا چاہئے۔ اُستاد کو اُستاد کا مقام دیا جانا چاہئے اور پیر کو پیر کے درجہ پر رکھنا چاہئے۔

اسی مضمون کو ایک دوسری حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے کہ مَنْ لَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا وَلَمْ یُبَجِّلْ عَالِمَنَا فَلَیْسَ مِنَّا یعنی جس نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کیا اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہیں کی اور ہمارے عالم کی تعظیم نہیں کی وہ ہم میں سے نہیں ہے یعنی اس نے ہمارے طریق اور ہمارے دین کے خلاف کام کیا اس لئے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ باہم فرق مراتب ضروری ہے۔ صوفیا نے تو ایک مقولہ اور معنی کر کہا ہے لیکن اگر ہم اس کو یہاں بھی یہ کہیں کہ ع

گر فرق مراتب نکنی زندیقی

تو کچھ غلط نہ ہو گا۔ اللہ و رسول کے نزدیک ضروری ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے مرتبہ کا لحاظ کریں۔ اگر اس کا لحاظ نہ کیا گیا تو اس کا بالکل یقینی نتیجہ فساد ہے یعنی فساد دین اور اس سے پہلے فساد دنیا۔

اس لئے کہ فرق مراتب[1] اور حفظ[2] مدارج ہی میں دنیا کی فلاح ہے۔ چھوٹے، بڑوں کا ادب و احترام کریں اور بڑے، چھوٹوں کی رعایت نیز انکے ساتھ رحم و مہربانی کا برتاؤ کریں۔ اسی طرح سے عوام اپنے عالموں کی توقیر کریں اس طرح سے کسی کو کسی سے کوئی شکایت اور اپنے حق کا مطالبہ ہی نہ رہے تو ظاہر ہے کہ پھر دنیا میں ہر طرف امن ہی امن ہے۔

اور اطاعت جو آج نہیں ہو رہی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنے کو ذی رائے[4] سمجھتا ہے اور اپنی رائے پر معجب[5] ہے یعنی اسی کو سب سے بہتر سمجھتا ہے اور دوسرے کی بات ماننے اور اسکی اتباع کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اس لئے رایوں کی کثرت ہے اور اس کے سبب فتنوں کی بھی کثرت ہے۔

حدیث شریف میں اس کو یعنی اعجاب کل ذی رائے برأیہ کو علامت قیامت فرمایا گیا ہے نیز اس کو ثلاث موبقات[6] میں بھی شمار کر کے اسکو ان سب میں اشد کہا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رض اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مُنْجِیَاتٌ وَثَلٰثٌ مُھْلِکَاتٌ فَاَمَّا الْمُنْجِیَاتُ فَتَقْوَی اللّٰہِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَۃِ وَالْقَوْلِ بِالْحَقِّ فِی الرِّضَا وَالسُّخْطِ وَ الْقَصْدِ فِی الْغِنٰی وَالْفَقْرِ وَاَمَّا الْمُھْلِکَاتُ فَھَوًی مُتَّبَعٌ وَشُحٌّ مُطَاعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِہٖ وَھِیَ اَشَدُّھُنَّ (مشکوٰۃ شریف ص۴۳۵ ج ۲) یعنی حضرت ابوہریرہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ

---

[1] اپنے اپنے مرتبہ کا
[2] یاد رکھنا
[3] ادب و تعظیم
[4] سمجھ والا، رائے والا
[5] نازاں
[6] تین ہلاک کرنے والی چیزیں
[7] سخت

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں نجات دلانے والی ہیں اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں۔ منجیات یہ ہیں۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا سراً وعلانیۃً ہر حال میں اور حق بات کہنا حالت رضا میں بھی اور غضب میں بھی اور نفقہ میں میانہ روی اختیار کرنا حالت غنی میں بھی اور فقر میں بھی اور مہلکات یہ ہیں۔ خواہش جس کا اتباع کیا جائے۔ بخل جس کی اطاعت کی جائے اور انسان کا اپنے نفس کو (اپنی رائے کو) بڑا سمجھنا اور اس پر عجب کرنا۔ اور یہ تینوں میں سب سے بڑھ کر ہے۔

آج یہی زمانہ کا حال ہے۔ اسی کی کاٹ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مشورہ کا حکم دیا۔ چنانچہ فرمایا کہ مَا هَلَكَ قَوْمٌ عَنِ الْمَشُوْرَةِ یعنی کوئی قوم جو مشورہ سے کام کرتی ہو وہ ہلاک نہیں ہوتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشورہ کا حکم ہوا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ کیونکہ مشورہ کے بعد ہر شخص کا اعتماد اور اتکال اپنی رائے سے اٹھ جاتا ہے۔ اس طور پر جو چیز کہ سبب فساد بنتی وہ ختم ہو جاتی ہے اس طرح سے آپ نے اس کی بندش فرمادی اور رائے کے زہر کو مار دیا۔

پس اس حدیث میں تقویٰ اللہ کی وصیت فرما کر تو آپ نے ہماری آخرت بنادی اور سمع وطاعت کا حکم دے کر آپ نے فلاح دنیا کا سامان فرمادیا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ایسے وقت میں امت اس تعلیم نبوی کی جانب توجہ کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے اور اپنے اوپر جو شخص حاکم مقرر کیا جائے اس کی اطاعت کرے اگرچہ وہ عبدِ حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی امیر کے بارے میں حسب ونسب کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ جو شخص امیر مقرر ہو گیا اس کی اطاعت لازم ہو گئی۔

اسلام میں اطاعت کا مسئلہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ:۔

ہر آنکس کہ گردن بفرماں نہد
کسے برنیاید کہ فرماں دہد

یعنی جو شخص کسی دوسرے کے فرمان کے آگے گردن ڈال دیتا ہے تو بہت دن نہیں گذرتے کہ وہ اسی کی برکت سے فرمان دہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مشائخ فرماتے ہیں کہ جو قابل ہوتا ہے وہ ایک دن مقبول ہو جاتا ہے یعنی یہی قابلیت اس کو مقبولیت تک پہونچا دیتی ہے۔ اسی طرح سے جو طالب ہوتا ہے وہ کچھ ہی دنوں میں مطلوب ہو جاتا ہے اور جو مرید ہوتا ہے وہ عنقریب ہی مراد ہو جاتا ہے۔ یہ سب اطاعت ہی کے ثمرات ہیں اور طاعت ایمان کا ثمرہ ہے۔ جس قدر ایمان ہوگا اسی قدر اطاعت ہوگی۔ مومن کا خاص وصف جس کو اسکا طغرائے امتیاز کہنا چاہئے یہی طاعت ہے۔ حضرات صحابہ کرام اسی کے ساتھ متصف تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایک موقع پر سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا کہنے کو ان کی

مدح میں شمار فرمایا ہے اور قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ. یعنی اعتقاد رکھتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کے حق ہونے کا جو اُن کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے یعنی قرآن اور دوسرے مومنین بھی اسکا اعتقاد رکھتے ہیں سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں عقیدہ رکھنے میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں اور کسی کو نہ سمجھیں اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے آپکا ارشاد سنا اور اس کو خوشی سے مانا۔ ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف ہم سب کو لوٹنا ہے۔ (بیان القرآن)

اور یہ یہودیوں کا حال تھا کہ سنتے اور کہتے تھے کہ ہم نے سنا (یعنی کان سے) اور نافرمانی کی (یعنی دل سے) حالانکہ اصل سننا وہی ہے جو کان کے ساتھ ساتھ دل سے بھی ہو۔ یہود کا قول نقل فرمایا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَیًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ یعنی یہ لوگ یہودیوں میں سے ہیں کلام کو اسکے مواقع سے دوسری طرف پھیر دیتے ہیں اور یہ کلمات کہتے ہیں سمعنا وعصینا واسمع غَیْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا اس طور پر کہ اپنی زبانوں کو پھیر کر اور دین میں طعنہ زنی کی نیت سے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کے اس قول پر نکیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ یعنی اگر یہ لوگ بجائے سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا کے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہتے اور بجائے وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا کہتے تو یہ بات ان کے لئے بہتر ہوتی اور موقع کی بات تھی۔

ان تمام تصریحات سے معلوم ہوا کہ اطاعت کا شریعت میں کیا درجہ ہے۔

آخر میں ایک بات اور کہتا ہوں کہ میں نے یہ جو کہا کہ ہر شخص دوسرے کا حق پہچانے۔ چھوٹا بڑے کا حق پہچانے۔ شاگرد اُستاد کا حق پہچانے۔ بیٹا باپ کا حق پہچانے۔ مرید پیر کا حق پہچانے۔ محکوم حاکم کا حق پہچانے۔ رعایا بادشاہ کا حق پہچانے اور سب کا لحاظ رکھا جائے تو فلاح دنیا کا یہی ذریعہ ہے۔ تو اسکا مطلب یہ ہے کہ عام طبائع ایسی ہی ہوتی ہیں کہ اگر انکے حق کو ادا کیا جائے ان کے ساتھ سلوک کیا

مُلم طبیئیں

جائے تو وہ بھی احسان مانتے ہیں اور محسن کی قدر کرتے ہیں باقی ہو سکتا ہے کہ اسی دار دنیا میں کسی کو کوئی ایسا ساتھی مل جائے کہ جو خبیث النفس ہو اور اس پر کسی سلوک یا احسان کا کوئی اثر نہ ہوتا ہو جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث تفہیمات میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

وَاصْحَبِ النَّاسَ عَلٰى شَرِيْطَتَيْنِ اَحَدُهُمَا قَطْعُ الطَّمَعِ عَنْهُمْ وَعَمَّا فِيْ اَيْدِيْهِمْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مُوْصِلٌ اِلَيْكَ مِنْهُمْ مَا يَجُرُّ مِنْهُ وَلَمْ تَكُ تَرْقُبُهُ بِلَا عَزْمٍ مِنْكَ۔

وَثَانِيْهِمَا النَّصِيْحَةُ وَالْاِنْبِسَاطُ وَحُسْنُ الْخُلُقِ لِكُلِّ اَحَدٍ سَوَاءٌ الْمُتَمَوِّلُ وَالْفَقِيْرُ وَصَاحِبُ الْجَاهِ وَالْخَامِلُ مَعَ عِرْفَانِ مَنْزِلَةِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ وَكُلُّ مَنْ عَادَاكَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاِنَّمَا هُوَ خَبِيْثُ النَّفْسِ ظَالِمٌ۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ٥ (ص١٠٣ تفہیمات ٢٩)

یعنی لوگوں کے ساتھ دو شرطوں کی رعایت رکھتے ہوئے مصاحبت اختیار کرو ایک تو یہ کہ خود ان سے اور جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے مال وغیرہ اس سے اپنی طمع کو قطع کر لو اس لئے کہ اگر خدا کو منظور ہوگا تو اس مال سے کچھ حصہ تمہیں بھی مل جائے گا بدون تمہارے انتظار و عزم و ارادے کے (پھر جب ایسا ہے تو تمہیں طمع کرنے کی ضرورت؟)

دوسرے یہ کہ ہر شخص کے ساتھ نصیحت اور خیر خواہی انبساط[1] اور حسن خلق کا معاملہ رکھو خواہ وہ کوئی امیر شخص ہو یا غریب و فقیر ہو اور خواہ کوئی صاحب منصب[2] و جاہ ہو یا کوئی گمنام و گوشہ نشین ہو بس اسکا خیال رکھو کہ انہیں سے ہر ایک کا منصب پہچان کر اسکے مطابق اسکے ساتھ معاملہ کرو (بس جب تم نے اتنا کر لیا تو تم نے اسکا حق اور اپنا فریضہ ادا کر دیا) اب اسکے بعد بھی اگر کوئی شخص تم سے دشمنی اور عداوت کرتا ہے تو وہ خبیث النفس ہے اور عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہو جائیگا جنھوں نے ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی جگہ لوٹ کر ان کو جانا ہے۔

الغرض اللہ اور رسول نے جس طرح سے کہ اطاعت کی ضرورت اور اس کی اہمیت[3] کو بیان فرمایا ہے تاکہ لوگ اس کو اختیار کریں اور فلاح دارین حاصل کریں اسی طرح سے ایک اور رذیلہ ہے جو ہمارے درمیان بہت کثرت سے رائج ہے اور وہ بھی آپس کے اختلاف و نزاع[4] و بغض اور عداوت کا سبب بنتا ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکا بھی بیان کر دیا جائے کیونکہ جس طرح سے کہ فلاح عالم کا سبب وجوب اطاعت وانقیاد[5] ہے اسی طرح سے اس رذیلہ کا ترک بھی اصلاح معاشرت کا موجب ہے چنانچہ شریعت میں اس کی

حرمت وارد ہے اور ان دو خصلتوں کا نام غیبت اور نمیمہ[1] ہے نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور و معروف تالیف الاذکار میں ارقام فرماتے ہیں کہ :-

جانو کہ یہ دو خصلتیں رذائل میں سے قبیح ترین[2] رذیلہ ہیں اور لوگوں میں بہت زیادہ شائع و ذائع ہیں یہاں تک کہ انسانوں میں سے شاید ہی کوئی ان سے بچا ہو۔ لہٰذا لوگوں کو اس سے بچانے کے لئے اس پر بہت زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت ہے — سے پہلے غیبت کا بیان کرتا ہوں۔

غیبت اسے کہتے ہیں کہ تم اپنے بھائی کی کسی ایسی بات کا تذکرہ کرو جو اسے ناگوار ہو خواہ وہ گفتگو اس کے بدن سے متعلق ہو یا اس کے دین سے متعلق ہو یا اس کے اخلاص سے متعلق ہو یا اس کے مال سے متعلق ہو یا اس کی اولاد سے متعلق ہو یا اسکے والدین سے متعلق ہو یا اس کی بیوی سے متعلق ہو یا اس کے خادم سے متعلق ہو یا اس کے غلام سے متعلق ہو یا اس کے عمامہ اور پگڑی سے متعلق ہو، یا اس کے کپڑے سے متعلق ہو یا اس کی چال سے متعلق ہو یا اس کی حرکت سے متعلق ہو یا اس کی نشاط و خوشی سے متعلق ہو یا اس کی خوش طبعی سے متعلق ہو یا اس کی ترشروئی سے متعلق ہو یا اس کی طلاقت[3] لسانی سے متعلق ہو یا اس کے علاوہ کسی اور چیز سے متعلق ہو جو اس شخص سے تعلق رکھتی ہو پھر اس قسم کی بات بہرحال غیبت شمار ہوگی خواہ تم اس کو لفظوں سے کہو یا تحریر میں ادا کرو یا اشارہ وکنایہ سے کہو پھر خواہ آنکھ کے اشارے سے کہو یا ہاتھ اور سر وغیرہ کے اشارہ سے کہو۔

بہرحال بدن سے متعلق کسی چیز کے بیان سے غیبت ہونے کی مثال یہ ہے کہ مثلاً تم اس کو اندھا کہو یا لنگڑا کہو یا چندھا کہو یا گنجا کہو یا ناٹا اور ٹھنگنا کہو یا لمبا کہو یا کالا کہو یا اصغر کہو۔

اور دین سے متعلق کسی بات کا غیبت شمار ہونا یہ ہے کہ تم اسے فاسق کہو یا چور کہو یا خائن کہو یا ظالم کہو یا نماز میں سستی کرنے والا کہو یا نجاست سے بچنے میں کوتاہی کرنے والا کہو یا یہ کہو کہ اپنے والدین کا مطیع نہیں ہے یا یہ کہو کہ زکوٰۃ کو اپنے مصرف میں صرف نہیں کرتا یا یہ کہو کہ غیبت سے اجتناب نہیں کرتا (تو چونکہ یہ سارے کے سارے امور اس کو دین میں عیب نکالنے والے ہیں اس لئے یہ سب غیبت شمار ہوں گے۔)

بہرحال وہ دنیوی امور جن کا تذکرہ لوگوں برا معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ غیبت شمار ہوتے ہیں یہ ہے کہ مثلاً تم کسی کو بے ادب یا قلیل الادب کہدو یا یہ کہو کہ لوگوں کو اپنے سے کم سمجھتا ہے یا یہ کہدو کہ اپنے پر کسی کا حق نہیں سمجھتا یا یہ کہدو کہ بہت باتیں کرتا ہے یا یہ کہدو کہ بہت زیادہ کھانے والا ہے یا یہ کہدو کہ بہت زیادہ سونے والا ہے یا ناوقت سویا کرتا ہے یا یہ کہدو کہ دوسروں کی جگہ پر

[1] چغلخوری [2] بدترین [3] تیزی [illegible]

بیٹھتا ہے۔

بہرحال وہ امور جو کسی انسان کے والدین کے متعلق ہوں اور وہ اُسے بُرے معلوم ہوتے ہوں یہ کہ مثلاً کسی کو کوئی یوں کہے کہ تیرا باپ فاسق ہے یا تیرا باپ ہندی ہے یا تیرا باپ نبطی ہے یا حبشی ہے یا جوتا گانٹھنے والا ہے یا بزاز ہے یا کھٹیرا ہے یا بڑھئی ہے یا لوہار ہے یا کپڑا بننے والا ہے۔

بہرحال وہ اُمور جو کسی کے خلق سے متعلق ہوں جن کا تذکرہ اس کو بُرا لگے یہ ہیں کہ مثلاً کسی کو بدخلق کہدے یا متکبر کہدے یا جھگڑالو کہدے یا جبار کہدے یا عاجز کہدے یا بزدل کہدے یا غصیلا کہدے یا ترش رو ہو جانے والا کہدے یا نکلا ہوا کہدے وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال کپڑے سے متعلق عیوب یہ ہیں کہ مثلاً یہ کہدے کہ چوڑی آستین والے یا اسے لمبے دامن والے یا اتنے میلے کپڑے والے یا اسی کے مثل کوئی اور بات کہدی۔

یہ تفصیل تو کسی کے بدن دین۔ والدین۔ خلق اور کپڑے سے متعلق تھی باقی اور دوسری چیزوں مثلاً غلام و خادم وغیرہ کی مثالوں کو انھیں مذکورہ اُمور پر قیاس کر لو اور بس اتنا سمجھ لو کہ ضابطہ یہ ہے کہ ہر ایسی بات جو اسے ناگوار گذرے جب پس پشت کہی جائے گی غیبت شمار ہو گی۔

(کتاب النووی ص۲۲۰)

میں کہتا ہوں کہ غیبت کی جو تفصیل امام نوویؒ نے بیان فرمائی ہے اس کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ جرم سخت ہے اور لوگوں سے اس باب میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔

صاحب روح المعانی نے آیۃ کریمہ وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ای لَا يَذْكُرْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا بِمَا يَكْرَهُ فِي غَيْبَتِهٖ فَقَدْ قَالَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْغِيْبَةُ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ قِيْلَ اَفَرَاَيْتَ لَوْ كَانَ فِيْ اَخِيْ مَا اَقُوْلُ قَالَ اِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهٗ۔ (رواہ مسلم وابوداؤد ترمذی ونسائی)

یعنی پس پشت نہ تذکرہ کرے تم میں کا بعض دوسرے کا ایسے طریقہ پر جو اُسے بُرا لگے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا تم لوگ جانتے ہو غیبت کسے کہتے ہیں صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اسکا رسول زیادہ جاننے والا ہے۔ آپ نے فرمایا تمہارا ذکر کرنا اپنے بھائی کے متعلق ایسی چیزوں کا جو اُسے ناگوار ہو۔ عرض کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ باتیں ہوں جو میں کہہ رہا ہوں تب آپ نے فرمایا کہ اگر اس میں وہ بات ہے جو تم کہہ رہے ہو تب ہی تو تم نے اس کی غیبت اگر

اس کے اندر وہ بات نہ ہوئی جو تم نے کہی ہے پھر تو تم نے اس پر بہتان باندھا، آگے فرماتے ہیں کہ ذالمراد بما یکرہ اعم من ان یکون فی دینہ او دنیاہ او فی خلقہ او مالہ او ولدہ او زوجتہ او مملوکہ او خادمہ او لباسہ او غیر ذالک مما یتعلق بہ یعنی جس چیز کا ذکر انسان کو برا لگے وہی غیبت کہلائے گی عام اس سے کہ وہ اس کے دین سے متعلق ہو یا دنیا سے اور اس کے خلق سے متعلق ہو یا خلق یا مال سے متعلق ہو یا ولد و زوجہ سے اسی طرح سے مملوک اور خادم سے متعلق ہو یا لباس سے وغیرہ وغیرہ

پھر کچھ دور آگے چل کر لکھتے ہیں کہ لا یبعد ان یکون منھا ما ھو من الصغائر کالغیبۃ التی لا یتاذی بھا کثیرا نحو عیب الملبوس والدابۃ ومنھا ما لا ینبغی ان یتشکک فی انہ من اکبر الکبائر کغیبۃ الاولیاء والعلماء بالفاظ الفسق والفجور ونحوھا من الالفاظ الشنیعۃ الردیۃ او الاشبہ ان یکون حکم السکوت علیھا مع القدرۃ علی دفعھا حکمھا۔ یعنی بعید نہیں ہیں کہ جو چیزیں صغیرہ شمار ہوتی ہیں بعضی ان میں سے غیبت قرار دی جائیں مثلاً وہ غیبت جس سے انسان کو کچھ زیادہ ایذا نہیں ہوتی جیسے کسی کے کپڑے کا عیب بیان کر دیا کسی کی سواری کا عیب نکالدیا باقی بہت سی غیبتیں ایسی ہیں کہ شک نہیں کہ وہ اکبر الکبائر ہیں جیسے اولیاء و علماء کی غیبت اور وہ بھی نہایت برے الفاظ کے ساتھ مثلاً فسق و فجور کے ساتھ جیسے کسی کو فاسق و فاجر کہدیا یا اس کے مثل اور کوئی لفظ جس سے اس کو بہت زیادہ ایذا ہو بجتی ہو کہدیا اور صحیح قول یہ ہے کہ جو شخص کسی کی غیبت سنے اور اس کے دفع کرنے پر قادر ہونے کے باوجود خاموش رہے تو وہ بھی حکم میں غیبت کرنے والے کے ہی ہے۔ (روح المعانی ص۱۴۵ ج۲۶)

میں اطاعت کے متعلق بیان کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلق فیما بین المخلوق درست ہونے کے لئے اطاعت کا حکم اور سمع و طاعت کی وصیت فرمائی ہے اسی طرح سے بڑوں کو متوجہ کیا کہ وہ چھوٹوں پر رحم کیا کریں یہی میری سنت ہے اور حق تعالیٰ کا پسندیدہ راستہ ہے اور چھوٹوں اور بڑوں سب کو یہ حکم دیا کہ وہ علماء دین کی تعظیم و تکریم کریں اس لئے کہ انکا اکرام دین کا اکرام ہے اور ان کی اہانت کرنے والا شریعت کی اہانت کرنے والا ہے اس سے بڑھ کر دوسرا کوئی فساد نہیں کیسے اسلئے کہ ہر زمانہ میں عوام کو جو دین آیا ہے تو وہ خواص ہی کی وجہ سے تو جب کسی قوم کے عوام اپنے ہی خواص کے مخالف ہو جائیں گے اور ان کی عظمت انکے قلوب سے نکل جائے گی تو پھر ظاہر ہے کہ عوام کے اصلاح کی اور کیا صورت ہوگی۔ لہذا فرق مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے رحم و شفقت تعظیم و تکریم اور اطاعت و فرمانبرداری یہ سب کی سب نبوی تعلیمات ہیں جنکے مطابق اپنا عمل رکھنا ہر زمانہ میں بالخصوص اس زمانہ میں اشد ضروری ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

۱۔ اور جمالی عیب ۲۔ یعنی عیب ۳۔ بہ خلوق، تعلق

وسلم کا ایک ایک ارشاد ایسا ہے کہ اگر آج ہم اپنے عمل کو اس کے مطابق کریں تو اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمیں فلاحِ دین و فلاحِ دنیا دونوں حاصل ہو جائیں گی لیکن مشکل یہ ہے کہ اس زمانہ میں لوگ اپنی دشواریوں کا حل ایسے مقام سے طلب کرتے ہیں جہاں پر وہ موجود نہیں ہوتا اور جہاں پر حل موجود ہے یعنی کتاب و سنت ہماری اس کی جانب توجہ نہیں ہے۔

دیکھا جا رہا ہے کہ اسلام آج دنیا والوں کے نزدیک بالکل اجنبی اور غریب[۱] ہو کر رہ گیا ہے۔ یعنی تعلیماتِ اسلام کسمپرسی[۲] کی حالت میں ہیں اور حاملینِ سنت سے جو لوگ غیر مانوس ہو گئے ہیں اور اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی وہ آج ہمارے سامنے ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ بَدَأَ[۳] الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ غَرِیْبًا کَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ مِنْ اُمَّتِیْ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَنِ الْغُرَبَاءُ مِنْ اُمَّتِکَ قَالَ الَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ مَا اَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِیْ مِنْ سُنَّتِیْ یعنی آپ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام غربت کی حالت میں شروع ہوا اور پھر عنقریب لوگوں میں اجنبی اور غیر مانوس ہو جائے گا جس طرح سے کہ ابتداء میں تھا بس میری اُمت کے جو غرباء ہیں ان کے لئے خوشخبری ہے۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ آپ کی اُمت کے غرباء کون لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو میری اُن سنتوں کی اصلاح کرتے ہیں جسے میرے بعد لوگوں نے فاسد کر دیا ہے۔

اس حدیث کے تحت صاحبِ مدخل لکھتے ہیں کہ (اے لو) عارفین کے مضمون کو دیکھو اور جس کو رونا ہو وہ اپنے نفس پر روئے اور اہلِ اسلام کی غربت پر روئے اور عاملین بالسنۃ کی غربت یعنی ان کی کسمپرسی پر روئے۔ (بیاض حضرت والا ص۹۲)

عالمِ ربانی حقانی کا اللہ و رسول کے یہاں بڑا درجہ ہے باقی یہ کہ عالمِ ربانی کون ہے تو اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنئے۔ فرماتے ہیں کہ ہر عالم کے پاس مت بیٹھو، بجز اس عالم کے جو تمہیں پانچ چیزوں کے ترک کا حکم کرتا ہو اور پانچ چیزوں کے اختیار کرنے کا حکم کرتا ہو یعنی شک کے ترک کرنے کا حکم کرتا ہو اور یقین کے اختیار کرنے کا حکم کرتا ہو اسی طرح ریاء کے چھوڑنے کا حکم کرتا ہو اور اخلاص کے اختیار کرنے کا حکم کرتا ہو اور دنیا کی محبت سے نکال کر زہد کی جانب متوجہ کرتا ہو اور کبر اور رعونت سے نکال کر تواضع اور مسکنت کی جانب دعوت دیتا ہو اور عداوت و دشمنی سے نکال کر نصیحت کی جانب تم کو دعوت دیتا ہو۔ (فاتحۃ العلوم ص۱۱ بیاض جدید ص۹۰)

دیکھئے اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کو عالمِ حقانی کی معرفت کرا رہے ہیں

[۱] نامانوس
[۲] بیچارگی، بے بسی، بے کسی، ناقدری
[۳] بمعنی ابتداء ... [illegible]

ہیں اور وہ یہ کہ فرماتے ہیں کہ عالم ربانی کو اس کے کلام اور گفتگو سے پہچانو یعنی یہ دیکھو کہ وہ تمہیں یقین کی طرف اخلاص کی طرف زہد کی طرف اور تواضع کی طرف اور مودت اور نصیحت کی طرف دعوت دے رہا ہے یا نہیں۔ اسی طرح سے تمہیں شک سے ریا سے رغبت الی الدنیا سے اور کبر سے اور عداوت سے نکال رہا ہے یا نہیں۔ اگر اس کے کلام میں یہ سب ترغیبات و ترہیبات موجود ہیں تب تو سمجھو کہ وہ عالم ربانی ہے اس کی مصاحبت اختیار کرو ورنہ اس سے احتراز کرو اور یہ سمجھو کہ سب سے بڑی چیز جس کی وجہ سے علماء اپنے منصب سے ساقط ہو جاتے ہیں حب دنیا ہے۔

چنانچہ فاتحۃ العلوم میں ہے کہ جب علماء کے قلوب حب دنیا کی جانب مائل ہو جائیں یعنی وہ دنیا کو دین پر ترجیح دینے لگیں پس اس وقت اللہ تعالیٰ ان سے حکمت کے چشمے سلب کر لیتا ہے اور ان کے قلوب سے ہدایت کے چراغ کو بجھا دیتا ہے اس وقت تم جب ایسے عالم سے ملاقات کرو گے تو وہ تمہیں اپنے متعلق زبان سے یہ خبر دے گا کہ وہ اللہ سے ڈرتا ہے حالانکہ اس کے عمل میں کھلا ہوا فجور موجود ہوگا تو دیکھو گے کہ ایسے وقت میں زبانیں کیسی تر اور شاداب ہوں گی اور قلوب کیسے قحط زدہ اور خشک ہوں گے۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں عالموں کا یہ حال جس کو ہم نے ابھی بیان کیا ہے نہیں ہوا مگر اس وجہ سے کہ معلمین نے غیر اللہ کے لئے انھیں تعلیم دی اور متعلمین نے غیر اللہ کے لئے علم حاصل کیا (یعنی اخلاص سے دونوں عاری تھے نہ انھوں نے خدا کے لئے پڑھایا اور سکھایا۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور نہ انھوں نے خدا کے لئے پڑھا اور سیکھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیشک شیطان تم پر غالب ہو گیا ہے علم کے واسطے سے۔ عرض کیا گیا کہ یہ کیونکر یا رسول اللہ؟ فرمایا کہ وہ تم سے کہتا ہے کہ علم حاصل کرو اور عمل کی فکر نہ کرو جب تک کہ کل علم حاصل نہ کر لو چنانچہ اس کے اس کہنے کی وجہ سے انسان علم کا حریص ہو جاتا ہے اور برابر اس کی تحصیل میں کوشاں رہتا ہے اور عمل کو اپنے لئے ٹالتا رہتا ہے (یعنی یوں کہتا ہے کل کر لیں گے، پرسوں کر لیں گے یہی کہتا رہتا ہے) یہاں تک کہ مر بھی جاتا ہے اور عمل کی توفیق اس کو نہیں ہوتی۔ (فاتحۃ العلوم صہ۱۹)

میں نے شروع میں حضرت عرباض بن ساریہؓ کی حدیث نقل کی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک وصیت میں سمع و طاعت کا حکم فرمایا تھا چونکہ آپ کا یہ ارشاد اس وقت کے حال کے بالکل مناسب ہے اس لئے آپ کو بھی اسے ہی سنانا مقصود تھا اور نہ صرف سنانا ہی بلکہ میں بھی اپنے لوگوں کو اس کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے بعد پھر کسی کی وصیت کی حاجت باقی نہیں رہ جاتی تاہم اتباع سنت کے خیال سے اپنے لوگوں کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ کتاب و سنت کے جملہ احکام کا لحاظ اپنے عمل میں رکھیں بالخصوص ان دونوں حدیثوں (یعنی حدیث عرباض بن ساریہؓ اور حدیث من لم یرحم صغیرنا الخ) سے جو اطاعت و فرمانبرداری کا مضمون مفہوم ہوتا ہے اس کا خاص اہتمام کریں کیونکہ فلاح دین اور فلاح دنیا دونوں اسی سے وابستہ ہیں۔ دونوں حدیثوں کا ترجمہ یہ ہے:۔

حضرت عرباض بن ساریہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک روز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو نماز پڑھائی پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور نہایت بلیغ انداز میں زبردست وعظ فرمایا جس کی تاثیر سے لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہ پڑے اور غلبۂ خشیت کی وجہ سے ان کے قلوب ڈر گئے۔ پس ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کی یہ نصیحت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا آپ ہم لوگوں کو رخصت فرما رہے ہیں اور یہ آخری نصیحت ہے۔ لہذا ہم کو کچھ وصیت فرمائیے (تاکہ ہم اس کو سنیں اور سمجھیں اور عمل کریں) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں اللہ کے تقویٰ کی اور سمع و طاعت کی اگرچہ تم پر عبد حبشی والی مقرر کردیا جائے اور جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھیں گے اُس وقت تم لوگ میری سنت کو اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا اور اسی سے تمسک کرنا اور اس کو مضبوطی سے تھامے رہنا اور محدثات و بدعات سے بچنا اسلئے کہ ہر محدث بدعت ہے اور ہر بدعت ضلالت و گمراہی ہے۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۳۰)

دوسری حدیث کا ترجمہ یہ ہے:۔

کہ جس نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کیا اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہیں کی اور ہمارے عالموں کی تعظیم نہیں کی وہ ہم میں سے نہیں ہے یعنی اس نے ہمارے طریقہ اور ہمارے دین کے خلاف کام کیا اس لئے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

التماس از جامع

ناظرین سے گذارش ہے کہ اس مضمون کو بار بار پڑھیں اور اپنے احباب و متعلقین کو بھی سنائیں نہایت ہی ضروری اور مفید باتیں بیان فرمائی گئی ہیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس وصیتِ نبوی پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادیں۔ آمین

رسالۂ

جنّت

از افاضات

مصلح الامّت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

امابعد ۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حُفَّتِ الجَنَّۃُ بالمکارہ وحُفَّتِ النّارُ بالشہوات ــــــ (رواہ البخاری ومسلم) حدیث شریف میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا تو جبرئیلؑ سے فرمایا کہ جاؤ اس کو دیکھو، جبرئیلؑ گئے اور جنت کو نیز ان تمام چیزوں کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے اس میں مہیا فرما رکھی تھیں۔ واپس آکر عرض کیا کہ اے پروردگار! قسم ہے آپ کے عزت وجلال کی وہ تو ایسی جگہ ہے کہ جو شخص بھی اس کو سن پائے گا وہ اس میں بغیر داخل ہوئے رہے گا نہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو مکروہات کی باڑھ سے گھیر دیا اور پھر جبرئیلؑ سے فرمایا کہ اب تو جا کر دیکھو۔ جبرئیلؑ گئے اور دیکھ کر آئے اور عرض کیا کہ اے پروردگار! قسم ہے آپ کے عزت کی اب تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ شاید ہی اس میں کوئی داخل ہو سکے گا۔

دیکھئے حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ جس طرح سے دنیا میں کسی باغ کی حفاظت کے لئے اس کو خار اور جھاڑ اور جھنکار سے روندھ دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جنت کو مکروہات (یعنی نفس پر شاق ہونے والے احکام) سے گھیر دیا ہے اور اس کے داخلے کے لئے دشوار اور ناگوار اعمال کا دنیا میں انسان کا مکلف بنایا ہے۔ مثلاً نماز کے لئے سردی میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا تہجد کیلئے نرم اور گرم بستر کو چھوڑنا۔ فجر کی جماعت کے لئے اپنی میٹھی نیند کو قربان کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہی سب احکام شرعیہ اور عبادات شاقہ جو نفس کے خلاف اور ناگوار طبع ہوتی ہیں، جنت میں داخلہ کے لئے بمنزلہ باڑھ کے ہیں۔ پس جس کو جنت مطلوب ہے اس کے لئے ان خاروں پر گزرنا بھی ناگزیر ہے۔ اور یہ تو بالکل ظاہر بات ہے کہ راحت اور آرام تو سب ہی کو مطلوب ہوتا ہے عیش اور لذت کا کون شخص متمنی نہیں ہے لہٰذا چاہیئے تو یہ کہ جب آرام اور مزہ مرغوب ہے تو جن ذرائع اور طریقوں سے وہ آرام حاصل ہو سکتا ہے اس کی بھی تکلف کو گوارا کیا جائے تب ہی تو آرام کا لطف ہے

ورنہ بدون مشقت اٹھائے راحت میں کیا مزا؟

حدیث شریف میں ہے کہ جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو پھر بھی جنت بہت خالی رہے گی اور وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے پُر نہ ہونے کا شکوہ کرے گی اور کہے گی کہ مجھے بھر دیجئے اس پر اللہ تعالیٰ ایک مخلوق پیدا فرما دیں گے اور جنت کو اس سے بھر دیں گے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے اس حدیث کو سن کر عرض کیا کہ حضرت پھر تو یہ لوگ بڑے مزے میں ہوں گے کہ کچھ کرنا ورنا نہیں پڑا اور جنت ان کو یونہی مل گئی۔ مولانا نے فرمایا کہ اجی خاک مزا ان کو آئے گا" قدر نعمت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید" یعنی راحت کا مزہ تو وہ جانتا ہے جو پہلے مشقت اٹھا چکتا ہے۔ مزا تو انشاء اللہ تعالیٰ ہمیں آئے گا کہ دنیا میں تکلیفیں جھیلیں ہیں۔ مشقتیں برداشت کی ہیں اور سب سے آخر میں موت کی تکلیف برداشت کی ہے۔ پھر آخرت میں حساب کتاب کی۔ پھر پل صراط کی۔ غرض کہ مسلسل تکلیف ہی تکلیف میں رہے۔ لہٰذا جب ان سب منازل سے گزر کر جنت میں پہونچیں گے تو اس کا پورا لطف اور مزا ہم کو آئے جو جنت ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں رکھ دئے گئے۔ ان کو پتہ ہی نہیں کہ مصیبت اور مشقت ہوتی کیا ہے؟ اور جب اس کا علم نہیں تو راحت کا مزہ بھی وہ غریب کیا جان سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں آتا ہے کہ جنتی جب جنت میں داخل ہو جائیں گے تو وہاں کی راحت و آرام اور جنت اور اس کی نعمت کو دیکھ کر کہیں گے کہ:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ الَّذِیْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝

تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم سے رنج و غم دور کر دیا واقعی ہمارا رب بخشنے والا ہے قدر کرنے والا ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں نہ ہم کو کوئی کلفت پہونچے گی اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہونچے گی۔

یعنی دنیا کی تمام تکالیف سے خلاصی پانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے اور یوں کہیں گے اَلَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ تو اب اس کو یہ جنتی لوگ کیسے کہیں گے؟ کیونکہ انھوں نے تو حزن کبھی دیکھا ہی نہیں ہے نہ اس میں کبھی رہے پھر اس سے نکلنے کو کیسے کہہ سکتے ہیں اور اگر کہیں گے تو جھوٹ ہوگا اس لئے یہ لوگ نہ تو یہ کہہ سکیں گے اور نہ ان کو جنت کی اور اس کی نعمتوں کی قدر ہی ہوگی کیونکہ اس کے خلاف دوسری حالت میں کبھی رہے ہی نہیں اور اہل دنیا چونکہ

رہ چکے ہیں اس لئے ان کو قدر ہوگی۔ وبضدھا تتبین الاشیاء

جو شخص پہلے رنج و محن میں رہ چکا ہو اسی کو نعمت اور راحت کی قدر ہو سکتی ہے چنانچہ یہ دنیا دار الابتلاء ہے لہٰذا اس کے بعد ہی جنت کا بھی لطف ہے اور جس نے محنت و مشقت ابتلاء اور آزمائش کا نام بھی نہ سنا ہوگا ان کا برداشت کرنا تو الگ رہا وہ راحت و آرام کی قدر کیا جان سکتا ہے اور دنیا میں جس کا جتنا زیادہ ایمان ہوتا ہے اسی قدر ابتلاء اور آزمائش بھی اس کی زیادہ ہوتی ہے اور پھر اسی کے بقدر انسان آخرت میں راحت و لذت بھی دیکھے گا۔

حدیث شریف میں ہے کہ جنت چٹیل میدان ہے اور تم جو سبحان اللہ، الحمد للہ وغیرہ یہاں زبان سے کہتے ہو وہاں جاکر یہی درخت لگ جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے اعمال کا ثمرہ وہاں اس شکل میں دیکھیں گے اور آدمی کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ اسکے فلاں کلمہ کا بدلہ ہے مثلاً یہ سبحان اللہ کا عوض ہے اور یہ الحمد للہ کا ثمرہ ہے لہٰذا آپ بھی جب مرتبہ چاہتے ہیں تو پھر عمل سے نہ گھبرائیے اور راحت چاہتے ہیں تو مشقت برداشت کیجئے۔ مشقت پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

احیاء العلوم میں امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے معرفت سمعان نامی ایک راہب سے سیکھی اس طرح کہ میں ایک دن اس کے عبادت خانہ میں گیا اور اس سے پوچھا کہ تم اس جگہ کب سے مقیم ہو؟ اس نے کہا ستر ۷۰ سال سے، میں نے کہا کھاتے کیا ہو؟ اس نے کہا اے حنیفی! یعنی اے مسلم! اس سوال سے تیرا کیا مقصد ہے میں نے کہا کچھ نہیں صرف جاننا چاہتا ہوں، اس نے کہا کہ ہر شب میں صرف ایک چنا کھاتا ہوں، میں نے کہا تمھارے قلب میں ایسی کون سی قوت ہے جس کی وجہ سے تمھیں صرف ایک چنا روزانہ کفایت کر جاتا ہے؟ کہا جب تم نے پوچھا ہے تو سنو! وہ دیکھو تمھیں سامنے کوئی بستی نظر آرہی ہے؟ کہا ہاں، کہا اس بستی کے لوگ میرے بہت معتقد ہیں چنانچہ سال بھر میں ایک دن وہ سب یہاں آتے ہیں اور میرے اس گرجے کو لیپ پوت کر خوب آراستہ و پیراستہ کرتے ہیں پھر اس کے گرد طواف کرتے ہیں اور اس دن میری بہت ہی زیادہ تعظیم و تکریم کرتے ہیں جس سے مجھے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تو جب میرا نفس عبادت میں کسلمند ہوتا ہے تو میں اس کو اسی ایک گھڑی کی عزت اور خوشی کی یاد دلاتا ہوں بس پھر وہ چست ہو کر عبادت میں لگ جاتا ہے۔

پس میں تو صرف اپنی اسی ایک گھڑی کی عزت کے خاطر سال بھر تک عبادت اور مجاہدہ کی مشقت برداشت کرتا ہوں لیکن اے حنیفی! تم مجھ جیسا نفس پرور نہ ہونا بلکہ صرف ایک گھڑی کی

مشقت اٹھالو تاکہ ابدالآباد کی راحت اور چین تمہیں نصیب ہو کیوں کہ اس دنیا کی یہ قلیل زندگی آخرت کی طویل مدت کے مقابلہ میں ایک ساعت اور ایک گھڑی ہی ہے بلکہ اس سے بھی کم کیونکہ یہ دنیا فانی ہے اور وہ باقی حضرت ابن ادہم کہتے ہیں کہ اس راہب کی اس بات نے بس میرے قلب کے رگ و ریشہ میں معرفت کو پیوست کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ یہ کافی ہے یا اور کچھ بتلاؤں ؟ میں نے کہا کہ ضرور بتلایئے۔ اس نے کہا کہ اچھا گرجے سے نیچے اترو میں اتر گیا تو اس نے اوپر سے ایک برتن لٹکایا جس میں بیس دانے چنے کے تھے اور مجھ سے کہا کہ اس سامنے والی بستی میں جاؤ ان لوگوں نے میرے اس لٹکانے کو دیکھ لیا ہے۔ جب بستی میں پہونچا تو سب عیسائی میرے گرد جمع ہو گئے اور کہا کہ اے حنیفی! بتاؤ ہمارے شیخ نے تمہاری طرف کیا چیز لٹکائی تھی ؟ میں نے کہا کہ اپنے کھانے کی چیز میں سے کچھ تھوڑا سا مجھے دیا ہے ان لوگوں نے کہا کہ آپ اس کو کیا کیجئے گا ہم لوگ اس تبرک کے زیادہ مستحق ہیں۔ پھر کہا کہ اچھا دام بتایئے میں نے کہا کہ بیس دینار لوں گا ان سب نے فوراً مجھے بیس دینار دیدیئے۔ میں اس کے بعد راہب کے پاس واپس آیا۔ اس نے کہا کہ اے حنیفی! تم نے ان دانوں کو کیا کیا ؟ میں نے کہا کہ اس بستی والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ کہا کس قیمت پر ؟ میں نے کہا بیس دینار کے عوض پر فروخت کیا ہے۔ اس نے کہا تم نے بڑی غلطی کی اگر تم ان سے بیس ہزار دینار بھی مانگتے تو وہ تمہیں دیدیتے۔ پھر کہا دیکھو یہ عزت تو اس شخص کی ہے جس کی تم پرستش بھی نہیں کرتے، اسی پر قیاس کر لو کہ اس ذات کی کیسی کچھ عزت ہوگی جس کی تم عبادت بھی کرتے ہو لہٰذا اے حنیفی! بس اپنے رب کی جانب متوجہ ہو جاؤ اور ادھر ادھر کی آمد و رفت ترک کر دو۔

واقعی اس راہب نے خوب ہی بات کہی آج اگر ہم کو آخرت کے انعامات کا یقین ہو جائے اور ان کے مزے کا صحیح اندازہ ہو جائے تو سارے مجاہدات اور مشقتیں ہمارے لئے آسان ہو جائیں اور دنیا میں ان سب تکالیف اور مشقتوں سے دوچار ہونے کے بعد ہی آخرت کی نعمتوں کا لطف آئے گا حضرت مولانا تھانویؒ کبھی فرماتے تھے اور وہی اس قسم کی باتیں بھی کہہ دیتے تھے اور دوسرا کوئی ہوتا تو اپنے متعلق یہ کہتا بھی نہیں مگر بزرگوں میں تو نفس ہوتا نہیں اس لئے وہ صاف صاف کہہ دیا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ نفس اب کام کرنے سے جی چراتا ہے تو اس سے کہتا ہوں کہ کام کر لو گھر میں آج بہت عمدہ عمدہ کھانے پکے ہیں بس پھر وہ کام کرنے لگ جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ کھانا تو کچھ کام

کرنے کے بعد ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اب دیکھئے بزرگان دین تو یہ فرماتے ہیں اور آج کل ہمارے نوجوانوں کا یہ حال ہے کہ بالکل ہی نکما اور بطال رہنا انکو پسند ہے ان کے نزدیک کام اور محنت وغیرہ کوئی چیز نہیں بس بلا کام کئے ہوئے ہی ان کو کھانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ دنیا میں اس طرح سے پریشانیاں اور تکلیف اٹھا چکنے کے بعد جب جنت اور اس کی نعمت اس کو ملے گی تو اس کی قدر ہوگی۔ اب مومن کو چونکہ جنت اور درجات جنت محبوب و مطلوب اور مقصود ہیں اس لئے اس کی راہ و طلب میں جن تکالیف کا بھی سامنا پڑے مومن اس کو بھی بخوشی برداشت کرتا ہے بلکہ اس کو اس راہ کی تکلیف بھی اسی طرح محبوب ہوتی ہے جیسے خود جنت اور جو شخص اس سے گھبراتا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ طالب جنت ہی نہیں۔

جنت ایسی چیز نہیں ہے کہ کوئی اس کی رغبت اور خواہش نہ کرے مگر جو لوگ جنت کو مفت شفت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے تکالیف برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں بلکہ اس سے گھبراتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بوالہوس قرار دیتے ہیں اور ان کی اس حالت پر نکیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۤءُ وَالضَّرَّاۤءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔

کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں جا داخل ہو گئے حالانکہ تم کو ہنوز ان لوگوں سا کوئی عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے گزرے ہیں ان پر ایسی ایسی اور سختی واقع اور ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں کہ پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد کب تک یاد رکھو بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد نزدیک ہے۔

اسی قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ:۔

فيه اشارة الى ان الوصول الى الله تعالى والفوز بالكرامة عنده برفض الهوى واللذات ومكابدة الشدائد والرياضات كما قال عليه الصلوٰة والسلام حفت الجنة بالمكاره وحفت النار بالشهوات۔ (بیضاوی شریف ص۵۶)

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ تک پہنچنا اور ان کے نزدیک اکرام و عزت پانا صرف خواہشات اور لذائذ ہی کے ترک کرنے اور مشقتوں کے جھیلنے سے ممکن ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا ہے کہ جنت ناگواریوں سے اور دوزخ شہوات اور خواہشات سے گھیر دی گئی ہے۔

نیز ترمذی شریف باب الزہد میں یہ حدیث ہے کہ :۔ من خاف ادلج ومن ادلج

بلغ المنزل الا ان سلعۃ اللہ غالیۃ - الا ان سلعۃ اللہ ھی الجنۃ ۔ (ترمذی شریف)

جس کے دل میں ڈر ہوگا وہ منھ اندھیرے ہی سفر شروع کر دے گا اور جو ایسے وقت روانہ ہوگا وہی منزل پر بھی پہونچ سکے گا۔

یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کا سودا بڑا بیش قیمت ہے اور سن لو کہ اللہ کا وہ سودا جنت ہے۔ سبحان اللہ دیکھئے کیسے عجیب عنوان سے اللہ اور رسول نے مومنین کو جنت کا شوق دلایا ہے۔ جنت کی نعمتوں کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے۔

مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔

نہ تو کسی آنکھ نے انھیں دیکھا ہوگا اور نہ کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ کسی کے قلب میں ہی اُن کا تصور ہوا ہوگا۔ پس ایک تو جنت کی اشیا فی نفسہا عمدہ پھر اُس پر یہ کہ دنیا کے تعب و مشقت کے بعد جب وہ ملیں گے تو پھر اُن کی لذت کا کیا پوچھنا۔ اس کو پاکر یہ دنیا والے جس دل سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کی نعمت کا شکر ادا کریں گے جنت والی مخلوق ان لوگوں کا سا وہ دل کہاں سے لائے گی؟

غرض جیسا کہ میں نے ابھی حضرت مولانا کا قول نقل کیا ہے کہ کھانا کا مزہ تو کام کرنے کے بعد ہی ہے، اسی طرح سے سمجھئے کہ ہر اس خوشی میں لطف زیادہ حاصل ہوتا ہے جو غم کے بعد ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا عام طور پر آج یہ حال ہو گیا ہے کہ نفع میں شریک ہونا چاہتے ہیں مگر کمائی میں شرکت نہیں کرنا چاہتے اور یہ چیز کچھ دنیوی ہی امور کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ نیک لوگ بھی عمل سے گھبراتے ہیں۔ چنانچہ ولایت اور بزرگی سب کو اچھی لگتی ہے دوسروں کا ہاتھ چومنا کیسا اچھا معلوم ہوتا ہے مگر ہم اگر یہ کہیں کہ اس کو آپ بھی حاصل کیجئے تو کہتے ہیں کہ ارے صاحب اس کے لئے تو عمل اور مجاہدہ کرنا ہوگا سو آپ کے لئے چاہے آسان ہو ہمارے لئے بہت مشکل ہے اسی کو ایک حکیم شاعر نے کیا خوب کہا ہے، فرماتے ہیں کہ ؎

دین کا ادعا ہے خلق میں سہل	حق ہو راضی یہ بات مشکل ہے
اٰمَنُوْا میں تو سب کے آگے ہیں	عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مشکل ہے
چشم ظاہر جسے نہ دیکھ سکے	اس طرف التفات مشکل ہے
وصل ہو یا فراق ہو اکبر	جاگنا ساری رات مشکل ہے

غرض ولایت بھی اچھی چیز ہے۔ نہایت ہی عزیز ہے اور بہت ہی لذیذ ہے مگر جانتے بھی ہیں کہ اس سے پہلے کیا کرنا ہوتا ہے ؎

خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو   یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

اور اسی کے لئے کہا گیا ہے کہ ؎

سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر   تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر

اب اگر ولایت اچھی معلوم ہوتی ہے اور اس کو چاہتے ہو تو پھر اس کے لئے جس راہ سے گذرنا ہوتا ہے اس کو بھی چاہو اور اس کو حاصل کرو اور جانتے ہو وہ راہ کون سی ہے؟ وہ راہ تقویٰ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم و لا یحزنون ۝ الذین آمنوا وکانوا یتقون ۝

سن لو کہ اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ یہ لوگ غمگین ہوں گے اور یہ لوگ وہ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا۔

اور اسی کو اکبر آبادی مرحوم بھی اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں کہ ؎

اس عہد میں اے اکبر تم اس کو ولی سمجھے   تھوڑا سا بھی جس دل میں اللہ کا درد دیکھا
گردوں کے ستم دیکھے اجڑا ہوا گھر دیکھا   دیکھا تو نہ جاتا تھا ناچار مگر دیکھا
اب آنکھ اٹھا لے ایمان کی بربادی   اس بت کی نظر دیکھی اور اس کا اثر دیکھا
سمجھے ہی اچھی تھی تقریر میں جھگڑے تھے   ترک ہم نے کیا اس کو جس میں بھی شر دیکھا
دنیا کی یہ ذہنیت عقبیٰ کے وہ ہیں طالب   غافل نے ادھر دیکھا عاقل نے ادھر دیکھا

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہر آرام سے پہلے مشقت کا ہونا ضروری ہے اور رنج و محن کے بعد جو راحت ملتی ہے اسی میں لذت ہوتی ہے۔ تو وہ مکارہ پر بھی خوشی خوشی عمل کرتا ہے اور اسی سے اس کا طالب یا غیر طالب ہونا بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اب آپ لوگوں کو یہ سب باتیں کیسی اچھی لگتی ہوں گی مگر بس یہ جو عرض کر رہا ہوں کہ مرتبہ چاہتے ہو تو کچھ کام بھی کرنا ہوگا، یہ بھی سمجھ میں آتا ہے یا نہیں بات یہ ہے کہ آپ لوگ دینی مجالس میں آتے ہیں اور جو کچھ سنتے ہیں اس کا اثر بھی لیتے ہیں مگر جہاں اپنے اپنے گھر گئے اور کسی نے کان میں کچھ اور بات کہہ دی اور آپ پر دوسرا اثر ہو گیا۔ جیسے کہ ایک صاحب تھے وہ مسجد میں فجر کی نماز کے بعد ذرا کچھ دیر تک رہتے تھے اور اپنے

معمولات وغیرہ پورے کر کے تب گھر جاتے تھے تو بیوی بہت خفا ہوتی اور یہی کہتی کہ تم تو تمام دن مسجد ہی میں رہتے ہو دیکھا آپ نے وہ بیچارے گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے رک جاتے ہوں گے تو اتنا کہنے لگی کہ سارا دن مسجد میں گزار دیتے ہو اسی کو کہتا ہوں کہ جب آپ بھی یہ سب سنیں گے تو اس کا مقابلہ آسان نہیں ہوگا۔ یہ دنیا بھی دین کا پورا مقابل اور دیندار کے لئے مستقل آفت ہے

دنیائے دنی محل آفات بھی ہے ۔۔۔ فکر روزی مخل اوقات بھی ہے

طرہ پھر اُس پہ یہ کہ مرنا بھی ضرور ۔۔۔ جینا رہے آدمی تو اک بات بھی ہے

بڑے بڑے اس منزل میں فیل ہو گئے ہیں۔ حضرت حافظ ضامن صاحبؒ جو ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کے پیر بھائی تھے ان کے پاس ایک نوجوان آمد و رفت رکھتا تھا حافظؒ نے اس سے فرمایا ارے میاں یہاں کیا آتے ہو، بیوی تم سے لڑے گی اُس نے کہا حضرت بیوی کیا لڑ سکتی ہے اُسکی ایسی کی تیسی، لیکن کچھ دنوں کے بعد اُس نے واقعی آنا چھوڑ دیا۔ پھر بہت دنوں کے بعد ایک دن جنگل سے مویشیوں کو لے کر آ رہا تھا اُدھر سے حافظؒ صاحب جا رہے تھے راستہ میں ملاقات ہوگئی حضرت نے فرمایا السلام وعلیکم، لڑکا حضرت کو دیکھ کر ہنسا اور کہا کہ حضرت آپ ٹھیک فرماتے تھے وہی ہوا بیوی مجھے لڑی اور کہنے لگی سنو جی یا تو انھیں کے پاس آیا جایا کرو اور مجھ کو چھوڑ دو یا میرے پاس رہو۔ اس لئے حضرت آنے سے مجبور ہو گیا۔ اسی کو مولانا رومؒ نے لکھا ہے کہ اس راہ میں لوگوں کے پشتے لگے ہوئے ہیں کوئی یہاں گرا پڑا ہے، کوئی دو قدم آگے چل کر گر گیا، کوئی ذرا دور اور چلا اور گر گیا کوئی ذرا اور چلا اور گر گیا غرضیکہ یہاں سے لے کر وہاں تک اس راہ میں لوگوں کے پشتے کے پشتے لگے ہوئے اور بہت کم لوگ ایسے ہو اس راہ کو سلامت لے گئے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ ناقصین کی تعداد زیادہ ہے اور کاملین اور واصلین میں سے تو کوئی ہی کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہے۔ اس کو حضرت ضامن صاحبؒ سمجھتے تھے۔ اسی لئے اس سے کہا تھا کہ میرے پاس نہ آؤ یہ راہ دشوار ہے چل نہ سکو گے اور اگر خود ہمت بھی کر جاؤ گے تو یہ گھر والے نہ چلنے دیں گے مگر اُس کی سمجھ میں اس وقت نہ آیا۔

جانتے ہیں یہاں ان صاحبزادے سے کیا غلطی ہوئی؟ ان کو چاہئے تھا کہ جب حضرتؒ نے یہ فرمایا تھا کہ تمھاری بیوی تم سے لڑے گی تو یہ نہ کہتے کہ کیسے لڑے گی؟ اُس کی ایسی کی تیسی، اُس میں تو اپنے اوپر اتکال اور دعویٰ پایا گیا جو ایک بزرگ کے ارشاد کے مقابلہ میں تھا، بس یہیں سے یہ مارے گئے۔ ان کو یہ نہیں کہنا چاہئے تھا بلکہ کرتے یہ کہ حضرت ہی سے کہتے کہ حضرت واقعی میرے بس کا

نہیں ہے آپ کے پاس آتا ہی اس لئے ہوں کہ ایسے وقت میں آپ ہی مجھے سنبھالئے ورنہ میں تو ہلاک ہو جاؤں گا۔ نہایت ہی عاجزی سے یہ کہنا چاہئے تھا اس وقت حضرت یہی فرماتے کہ اچھا تو جب تم نے اپنے کو میرے حوالہ کیا تو میں نے بھی تمھارے معاملہ کو خدا کے حوالہ کیا بس اس کا کام بن جاتا۔ پھر اس کے بعد اب بیوی کی مجال تھی جو اس کو روک سکتی اور خدا کی راہ سے ہٹا دیتی۔ مگر اس وقت تو انھوں نے بڑے زور سے دعویٰ کر دیا اور بیوی کی ایسی تیسی کرنے لگے اور بعد میں اسی کے مُرید ہو گئے یہ کیا ہے؟ آدمی کو چاہئے کہ شیخ سے تو اپنا صاف صاف حال کہدے اور اپنا کچا چٹھا اس سے کہہ سناوے اور ان سے کہے کہ میں ان حالات میں مبتلا ہوں۔ اب آپ ہی مجھے سنبھالئے تو دیکھے وہ سنبھالتے ہیں یا نہیں؟ مگر اب ان سے بھی چوری کی جائے تو پھر کام کیسے چلے؟

جو لوگ اصلی ولایت چاہتے ہیں اور بزرگی کے سچے طالب ہوتے ہیں وہ ایسے تھوڑے ہی ہوتے ہیں وہ تو اس راہ میں سر و جان کی بازی لگا دیتے ہیں اور جب اپنے کو اس طرح سے خدا کی طلب میں پیش کرتے ہیں تو پھر خدائے تعالیٰ بھی اپنی راہ ان کے لئے آسان فرما دیتے ہیں ورنہ یہاں معاملہ اپنے بس اور اختیار کا نہیں ہے بزرگوں سے سنا ہے کہ ادھر ہی سے فضل ہو جائے تو ہزار برس کی راہ ایک پل میں قطع ہو جائے ورنہ اس طریق کے ایک ہی خار میں الجھ کر آدمی اپنی عمر ہی کھو دے پس جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سچے طالب ہیں وہ ولایت کے محبوب ہونے کی خاطر راہ کی سب مکارہ کو محبوب رکھتے ہیں اور دشواریاں پیش آنے کے وقت بجائے پریشان ہونے کے یہ کہتے ہیں ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

سچے طالب اور جھوٹے طالب میں یہی تو فرق ہوتا ہے کہ وہ تو دوست کی راہ کے مکروہات کو بھی دوست رکھتا ہے اور جب محبت کا نام لیتا ہے تو پھر مشقت کو بھی برداشت کرتا ہے اور جھوٹا شخص صرف دعویٰ ہی دعویٰ کرتا ہے اور امتحان کے وقت بھاگ نکلتا ہے اسی کو کسی نے کہا ہے ؎

وجائزة دعوی المحبة فی الھوی ولکن لا یخفی کلام المنافق

یعنی کسی کے عشق میں محبت کا دعویٰ تو ممکن ہے اور بہت آسان ہے لیکن منافق کی بات چھپتی نہیں معلوم ہی ہو جاتا ہے کہ کون محب صادق ہے اور کون محض مدعی اور اس کا علم امتحان کے وقت ہوتا ہے۔

آپ نے نہیں سنا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الاولیاء

ثم الامثل فالامثل یعنی آزمائش میں سب سے بڑھ کر انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں پھر اولیاء کرام اور پھر اس کے بعد جو جس درجہ کا ہوا اسی کے مطابق اس کی آزمائش ہوتی ہے۔ اور یہ اس لئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی ولایت بھی چونکہ بڑی ہوتی ہے اس لئے ان حضرات کی آزمائش بھی شدید ہوتی ہے پس ولایت اور بزرگی جو آپ کو اچھی طرح معلوم ہوتی ہے تو کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ جو لوگ ولی ہوتے وہ کیسے ہو جاتے ہیں ؎

خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

بہت دنوں تک خون دل پینا پڑتا ہے اور عرصۂ دراز تک لخت جگر کھانا پڑتا ہے تب جاکر کہیں ولایت ملتی ہے۔ جن لوگوں کو آج آپ بزرگ اور ولی کہتے ہیں جانتے بھی ہیں کہ انھوں نے کیسا کیسا مجاہدہ کیا ہے اور ایک مدت تک نفس سے جنگ کی تب یہ مرتبہ ملا ہے۔ اسی کو کہتا ہوں کہ آدمی نفع اور آمدنی میں تو شریک ہو اور کام اور کمائی میں شریک نہ ہو یہ کیسا ہے؟ ولایت پسند ہے مگر مجاہدہ سے بھاگتے ہیں۔ جنت پسند ہے لیکن مکارہ گوارہ نہیں۔ محبت مرغوب ہے مگر ابتلاء اور آزمائش سے بچنا چاہتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا یہی مخلص لوگ ہیں؟ محبت کا دعویٰ اور امتحان سے گھبرانا۔ اللہ تعالیٰ کے طریق کا تو کہنا ہی کیا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیوی محبوب بھی اپنے محب کا امتحان لیتے ہیں مثنوی میں مولانا رومؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی معشوق نے اپنے عاشق سے شب میں دو بجے ملاقات کا وعدہ کیا، عاشق صاحب برابر جاگتے رہے لیکن جب وقت قریب ہوا اور رات زیادہ ہوئی تو سو گئے۔ اسی کو اکبر الہ آبادی مرحوم نے کہا تھا کہ ؎

وصل ہو یا فراق ہو اکبرؔ جاگنا ساری رات مشکل ہے

حسب وعدہ جب دو بجے معشوق آیا تو ان کو سوتا ہوا پایا بہت ناگوار ہوئی کہ عشق کا دم بھرتا ہے اور اس کے ساتھ یہ غفلت اس کے بعد جواب میں اس نے یہ کیا اس کے سینہ پر کچھ بسکٹ اچھی مٹھائی اور دو ایک کھونے رکھ کر چلا گیا جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ملاقات کا وقت تو گزر چکا ہے اور محبوب کا پتہ نہیں ہے مگر کچھ چیزیں موجود ہیں ایک طرف اس کے نہ آنے کا افسوس بھی ہوا لیکن ان چیزوں کے موجود ہونے پر تعجب بھی تھا صبح کو کسی اہل بصیرت سے اپنے اس واقعہ کا ذکر کیا اُسنے کہا کہ کیا کسی شخص نے تمھارے پاس آنے کا وعدہ کیا تھا؟ کہا ہاں میرا ایک معشوق ہے اُس نے شب میں آنے کا وعدہ کیا تھا میں انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ وہ تو آیا نہیں، جب اٹھا تو یہ تمام چیزیں اپنے سینے پر موجود پائیں۔ اُس نے کہا نہیں وہ آیا تھا اور تم کو سوتا پاکر ناراض ہو کر چلا گیا اور زبانِ

اشارات میں کہہ گیا ہے کہ آپ ناحق عشق کا دم بھرتے ہیں ابھی آپ اس کوچہ میں طفل مکتب ہیں لہذا جسطرح کہ بچے مٹھائی وغیرہ کھاتے ہیں گھنگھنا بجاتے ہیں اسیطرح آپ بھی کیجئے اور آئے عشق کے دعویٰ سے باز آجائیے دیکھا آپ نے عشاق مجازی کا ان کے معشوق کی طرف سے اس طرح امتحان لیا جاتا ہے اب جو ناقص اور مدعی ہوتے ہیں وہ فیل ہو جاتے ہیں اسی کو میں نے کہا تھا کہ ؎

مولانا رومؒ نے عشق مجازی کا یہ واقعہ بیان کر کے عشاق حقیقی کو تنبیہ فرمائی ہے کہ محبت کا دم بھرنا تو آسان ہے مگر امتحان میں پورا اترنا مشکل ہے کیونکہ جو شخص دعویٰ میں سچا ہوتا ہے تو وہ اپنے دعویٰ کی دلیل بھی رکھتا ہے اور جو جھوٹا ہوتا ہے تو خود دلیل اس کی تکذیب کر دیتی ہے دنیا دار ابتلاء ہے یہاں ہر شخص کا امتحان ہو جاتا ہے۔ انبیا کا بھی اور اولیا کا بھی، باقی یہ حضرات چونکہ سچے ہوتے ہیں اسلئے امتحان میں پورے اترتے ہیں اور جو لوگ جھوٹے ہوتے ہیں اور محض مدعی ہوتے ہیں وہ بھاگ نکلتے ہیں ایک مرتبہ مجھے یہ خیال ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کا بھی ابتلا اور ان کی بھی آزمائش فرماتے ہیں حالانکہ وہ خاص الخاص بندے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے انتخاب سے ہوتے ہیں اور اولیا، تو اپنے کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں فنا ہی کر دیتے ہیں اور ان کی ہر مرضی پر راضی رہتے ہیں۔ پھر ان کی آزمائش کیوں ہوتی ہے؟ پھر اس کا جواب ذہن میں آیا کہ یہ آزمائش ان کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ جھوٹے لوگ اس میں نہ داخل ہو سکیں اور پھر یہ کہ ان حضرات کو اس ابتلا میں لذت بھی ملتی ہے کیونکہ ضرب الحبیب زبیب چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش کا واقعہ مشہور ہی ہے کہ آپ کے تمام جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے صرف زبان محفوظ تھی وہ بھی اس لئے کہ ناطق بذکر اللہ تھی۔ غرض آپ کی بیماری اس درجہ شدید تھی کہ سارے عزیز واقارب ہٹ گئے بجز آپ کی بیوی کے کہ وہ تو برابر آپ کی تیمارداری کرتی رہیں، ایسا سخت تو ابتلا تھا مگر اس میں آپ کو ایسی لذت ملتی تھی کہ اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اس طرح سے کہ صبح و شام ایک آواز حق تعالیٰ کی جانب سے آتی تھی کہ "ایوبؑ مزاج کیسا ہے" اب آپ خود خیال فرمائیے کہ جس محبوب نے مرض دیا ہو وہی مزاج پرسی بھی کرے تو ایک عاشق صادق کو اس میں کیسا کچھ لطف ملتا ہوگا۔ بالخصوص جب کہ یہ معاملہ محبوب حقیقی کی جانب سے ہو کسی نے خوب کہا ہے ؎

درد از یار است درماں نیز ہم دل فدائے یار شد جاں نیز ہم

معلوم ہوا کہ ان حضرات کا ابتلا، دوسروں کے اعتبار سے ہوتا ہے کہ وہ نہ گھس سکیں نہ کہ ان حضرات کے اعتبار سے کیونکہ یہ تو اس آزمائش سے خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور نہایت ہی مسرت کے ساتھ اس حال میں یہ کہتے ہیں ؎

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا — پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا، سر رکھ دیا
قطرۂ خونِ جگر سے کی تواضع عشق کی — سامنے مہمان کے جو تھا میسر رکھ دیا

کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

اگرچہ عشق میں آفت بھی ہے بلا بھی ہے — مگر بُرا نہیں یہ دَرد کچھ بھلا بھی ہے

پس اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نیک بندوں کی جو آزمائش ہوتی ہے اس میں گو ان حضرات کو کچھ جسمانی تکلیف ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ روحانی اور قلبی مسرت بھی حاصل ہوتی ہے علاوہ اس کے اللہ تعالیٰ کی ان مقبولین کی آزمائش میں اور نہ جانے کیا کیا مصالح ہوتی ہیں باقی اس سے ان حضرات کو رسوا کرنا مقصود نہیں ہوتا اس پر ایک واقعہ سنئے۔

ایک بزرگ کے اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ تھا کہ ان کو روزی مل جاتی تھی اور انھوں نے بھی اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا تھا کہ غیر کی جانب ہاتھ نہ بڑھاوں گا ایک دفعہ ایک باغ میں سیر کو گئے میوے درختوں پر لدے ہوئے تھے بس بھول کر ایک پھل کی جانب ہاتھ بڑھا ہی تو تھا پھل توڑا نہیں مگر ہاتھ تو پھیلا ہی دیا۔ اتفاق ایسا کہ اسی وقت پاس کے باغ میں کچھ ڈاکو ٹھہرے ہوئے تھے سپاہی آگئے ڈاکوؤں کے تعاقب میں دوڑے سامنے یہی بزرگ نظر پڑ گئے انھیں کو گرفتار کرلیا اور کوتوال کے پاس لے گئے اس نے بھی کچھ زیادہ تحقیق وغیرہ نہیں کی ان پر اسی چوری کا جرم عائد کرکے دونوں ہاتھ کاٹے جانیکا حکم دیدیا چنانچہ ایک ہاتھ کٹنے کے بعد دوسرا ہاتھ کٹنے ہی جارہا تھا کہ سامنے سے ایک سوار نہایت تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا آتا نظر پڑا اس نے دور ہی سے شور مچانا شروع کیا ہاں ہاں ان کا ہاتھ نہ کاٹنا یہ تو فلاں بزرگ ہیں جب کوتوال نے ان کا نام سُنا تو بہت گھبرایا اس لئے کہ اس اطراف میں تو وہ مُسلّم بزرگ تھے سب لوگ ان کا نام جانتے تھے اس نے کہا یہ بڑی بے ادبی ہوگئی میں نے ایک ہاتھ ان کا کٹوا دیا یہ خیال کرکے ان کے قدموں پر گر گیا اور بڑی لجاجت سے عرض کیا کہ حضرت معاف فرمادیجئے آپ کو پہچانا نہیں، فرمایا کہ بھائی تمہارا کوئی قصور ہے نہیں بلکہ میں نے ہی اپنے مالک سے بدعہدی کی ہے اس کے بدلہ میں تو سزاوار تو اس کا تھا کہ میرا سارا جسم ٹکڑے ٹکڑے کردیا جاتا اور یہ تو صرف ایک ہی کٹا ہے یہ بھی ان کا کرم ہے۔ چنانچہ اس کے بعد سے ایک ہاتھ پر پٹی باندھے رہتے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی جو ان سے اس ہاتھ کے کٹنے کی وجہ پوچھتا ایک دفعہ کسی نے پوچھا

تو فرمایا بھائی کچھ نہیں 'ید خنت فقطعت یعنی ایک ہاتھ تھا اس نے خیانت کی اس کے عوض میں کاٹ دیا گیا۔ یہ تو ان کی آزمائش تھی اب سنئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو رسوائی اور ذلت سے کس طرح بچاتے ہیں۔

یہ بزرگ کچھ ٹوکری وغیرہ بھی بنایا کرتے تھے تو تنہائی میں جب کام کرتے تو ان کی کرامت کی وجہ سے وہ کٹا ہوا ہاتھ بھی درست ہو جاتا تھا اور لوگوں کے سامنے کٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن وہ گھر کے اندر حسب معمول کام کر رہے تھے کہ اچانک ایک شخص بلا اجازت لئے ہوئے ان کے پاس اندر چلا گیا اور دیکھا کہ وہ دونوں ہاتھ سے کام کر رہے ہیں انھوں نے پہلے تو اس کو ڈانٹا کہ تم بغیر اجازت اندر کیوں آئے پھر فرمایا کہ اچھا خبردار اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنا مگر اس نے باہر جاکر شور مچا دیا کہ لوگو! ان بزرگ کی کرامت سنو ان کے تنہائی میں دونوں ہاتھ درست ہو جاتے ہیں یہ خبر ان بزرگ کو بھی ہو گئی کہ تمام لوگوں میں میری اس کرامت کا شہرہ ہو گیا ہے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ کہ آپ نے مجھے میرے جرم کی سزا دی پھر اس کرامت سے مجھے نوازا تو میں نے سوچا کہ چلو اچھا ہے میرا کوئی ہرج بھی نہیں ہے اور لوگ مجھے برا سمجھ کر اب سے میرا پیچھا چھوڑ دینگے لیکن پھر آپ نے اس کرامت کو بھی ظاہر فرما دیا اور اب لوگ اور بھی میرے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ اس میں کیا بھید ہے اس کو سمجھا دیئے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے الہام ہوا کہ اس تمہارے ہاتھ کٹنے کی وجہ سے چور سمجھنے لگے تھے یہ مجھے پسند نہیں ہوا کہ میرا کوئی ولی اور دوست ہو اور لوگ اس کو چور سمجھیں۔ اس لئے ہم نے اپنا آدمی تمہارے پاس خلوت میں بھیج کر اس کرامت کی تشہیر کرا دی تاکہ لوگوں کی نظروں میں تم رسوا اور ذلیل نہ ہو تم نے ہمارا جرم کیا تھا ہم اس کی سزا تم کو دی یہ ہمارا اور تمہارا معاملہ تھا لیکن ہم اس کو گوارہ نہیں کر سکتے کہ تم کو کوئی دوسرا کچھ کہے۔

دیکھا آپ نے، یہ فرمایا کہ ہم نے اپنا آدمی قصداً بھیجا ہی تھا تاکہ کرامت پر مطلع ہو اور باہر نکل کر اس کی خوب تشہیر کر دے۔

میں کہتا ہوں اسی طرح مشائخ کا معاملہ ہے کہ وہ مرید کو اللہ تعالیٰ کے لئے سزا بھی دیتے ہیں ان سے خفا بھی ہوتے ہیں ان کو نکالتے بھی ہیں مگر یہ نہیں چاہتے کہ دوسرا کوئی ان کو ذلیل اور حقیر سمجھے۔ علما نے فرمایا ہے کہ ؎

این بلائے دوست تطہیر شما است

یعنی دوست کی یہ تمام آزمائش تمہارے لئے بمنزلۂ پاکی کے ہے واقعی آدمی کے جتنا زیادہ بلا ہے ہوتا ہے اور کسی چیز سے نہیں ہوتا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کے لئے سب سے بڑا مانع مخلوق ہے

اور ملامت وغیرہ لئے کی جانب سے بہت دور ہٹ جاتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ جب یہی ملامت کرتی ہے تو پھر اس سے دل لگانا ٹھیک نہیں ہے۔ بس جہاں یہ خیال دل میں جما اور اس کا کام بنا چنانچہ اسی لئے اہل اللہ سے تعلق پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات مخلوق کے تعلق کو ختم فرما دیتے ہیں اور قلب کو اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ فرما دیتے ہیں اسی لئے خاقانی کہتے ہیں کہ ؎

پس از سی سال ایں معنیٰ محقق شد بہ خاقانی

کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملک سلیمانی

یعنی تیس سال کے بعد خاقانی کو یہ بات محقق ہوئی کہ تھوڑی دیر کی خدا کی یاد بھی سلیمان علیہ السلام کے تخت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کتنی بڑی تھی مگر فرماتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ ایک دفعہ سبحان اللہ یا الحمد للہ کہہ لینا نہ صرف اس سے بلکہ دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

بہ فراغ دل زمانے نظرے بہ ماہ روے

بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

یعنی تھوڑی سی دیر کے لئے فراغت قلبی کے ساتھ کسی ماہرو کی جانب ایک نظر کر لینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ چتر شاہی سر پر ہو اور تمام دن ہٹو اور بچو میں گزرے۔

حضرتؒ اس کو بہت پڑھتے تھے اور لوگوں کو اس پر وجد آجاتا تھا جس کسی کے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے وہ مزے سے آرام میں ہو جاتا ہے اور جس کی سمجھ میں نہیں آتی وہ بہت دنوں تک پریشان رہتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ دل میں بھلا کسی دوسری چیز کا خیال کیسے آسکتا ہے؟ اس کا تعلق تو جس سے ہے ہے۔ اصلی اور دلی تعلق ہونے کے بعد پھر کہیں کوئی چیز اس کو جنبش دے سکتی ہے۔ اور جب دلی تعلق نہیں ہوتا تو میاں ذرا سا چرکہ لگا اور بھاگ نکلے۔ اور صحیح تعلق کے بعد انسان کو دنیا کا کیسا ہی کچھ کام کیوں نہ کرنا پڑے وہ دل بیار او ردست بکار اور خلوت در انجمن کا مصداق ہوتا ہے۔ یعنی ہاتھ پاؤں سے اپنے دنیا کا کام کرتا ہے لیکن دل کو خدا ہی کی یاد میں لگائے رہتا ہے خلوت در انجمن اسی کا نام ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب آدمی کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو اس کے لئے تمام مکروہات اور مجاہدات کو برداشت کرتا ہے بلکہ اس کے لئے وہ تکلیف پھر تکلیف ہی نہیں رہ جاتی بلکہ عین راحت بن جاتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ؎

رنج، راحت شد چو شد مطلب بزرگ　　　تیائے گردِ گلہ چشم گرگ

یعنی جب مطلب بڑا ہوتا ہے تو پھر تکلیف بھی مبدل بہ راحت ہو جاتی ہے۔ دیکھو بھیڑیا جب بکریوں کے گلہ کا پیچھا کرتا ہے تو اس گلہ کے بھاگنے سے جو گرد اڑتی ہے وہ پیچھے آنے والے بھیڑیے کی آنکھ میں گرد نہیں رہ جاتی بلکہ سُرمہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے وہ اچھی طرح سے ان کا شکار کرتا اور خوب شکم سیر ہو جاتا ہے۔

سچا طالب بھی کہیں ہٹتا ہے اور جو ہٹ جائے تو سمجھے کہ وہ سچا نہیں ہے ایک شخص ایک بزرگ کے یہاں گیا مرید ہونے کے لئے انھوں نے فرمایا کہ بھائی پہلے استخارہ کر لو۔ اس نے کہا بہت اچھا کچھ دور جا کر پھر واپس آگیا ان بزرگ نے دریافت فرمایا استخارہ کر لیا۔ فرمایا کیا کر لیا؟ کہا کہ نفس سے میں نے پوچھا کہ بیعت ہونا چاہتے ہو، مجاہدہ کرنا ہوگا تو خواہ مخواہ کیوں یہ مصیبت مول لیتے ہو اس نے جواب دیا کہ ہاں مجاہدہ تو بیشک کرنا ہوگا لیکن خدا بھی تو ملے گا اس پر میں نے کہا کہ نہ ملا تب؟ تو اس نے یہ جواب دے دیا کہ ہاں خیر نہ ملے نہ سہی لیکن خدا کو یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ کسی نے اُسکو طلب کیا تھا یہی کیا کم ہے! یہ سن کر ان بزرگ نے فرمایا کہ بھائی تمھاری طرح تو کسی نے بھی استخارہ نہیں کیا۔ مگر یہ سب باتیں تو پہلے زمانہ کی ہیں اور اب اس زمانہ میں تو یہی رہ گیا ہے کہ ولایت تو پسند ہے مگر مجاہدہ پسند نہیں ہے وہ بیچارہ تو ولایت بھی نہیں چاہتا تھا صرف یہ چاہتا تھا کہ اللہ تعالےٰ کے طالبین کی فہرست میں میرا بھی نام لکھ لیا جائے بلا سے بزرگی ملے یا نہ ملے مگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ بزرگی بھی مل جائے اور کرنا دھرنا بھی کچھ نہ پڑے ؏

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

اس نام لکھانے پر ایک واقعہ یاد آیا سنئے فرماتے ہیں کہ ؎

چو یوسف شد بخوبی گرم بازار
شدندش مصریاں یکسر خریدار

جب یوسف علیہ السّلام کی حسن وجمال میں شہرت ہوئی تو تمام اہل مصر آپ کے خریدار ہو گئے۔

بہر چیزے کہ ہر کس دسترس داشت
در آں بازار بیع او ہوس داشت

جس کے پاس جو چیز موجود تھی اس کو لے کر مصر کے بازار میں آپ کو خریدنے کے لئے آیا۔

شنیدم کز غمش زالے بر آشفت
تنیدہ ریسمانی چند و می گفت

میں نے سنا کہ ایک بڑھیا کو بھی آپ کی خریداری کا خیال پیدا ہوا وہ بھی چند سوت لیکر بازار آئی اور کہتی یہ تھی کہ

ہمیں بس گرچہ من کاسد قماشم
کہ در سلک خریداراش باشم

اگرچہ میں پونجی کھوٹی رکھتی ہوں مگر اس لئے یہاں آئی ہوں تاکہ یوسفؑ کے خریداروں کے سلک میں تو منسلک ہو جاؤں۔

دیکھا آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے طالب سب اہل مصر تھے اور ان کے ساتھ ایک بڑھیا بھی تھی جو یہ جانتی تھی کہ مصر کے بازار میں یوسفؑ کو خریدنے کے لئے بڑے بڑے بادشاہ اور امراء موجود ہیں ظاہر ہے کہ ان کے مقابلہ میں اس بڑھیا کے ان سوتوں کی کیا حیثیت تھی مگر وہ اس خیال میں مگن تھی کہ یوسفؑ کو نہ خرید سکوں نہ سہی کم از کم اس کی وجہ سے ان کے خریداروں کی سلک میں تو منسلک ہو جاؤں گی اور ان کے طالبین اور محبین کی فہرست میں تو میرا نام درج ہو جائیگا یہی میرے لئے کیا کم ہے ؎

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ آدمی اگر خدا تعالیٰ تک نہ بھی پہنچ سکے مگر خدا کے طالبین میں اُسکا نام ہو جائے یہ کیا کم ہے؟ جس شخص کو طلب ہوگی وہ صبر نہیں کر سکتا اور اللہ تعالیٰ والوں ہی میں اپنے کو ڈال دیتا ہے۔ اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

خواب ناکی نیک ہم بر رہ خسپ
اللہ اللہ بر رہ اللہ خسپ

یعنی اگر تم سونا ہی چاہتے ہو تو راستہ کے کنارے پر سوؤ۔ اللہ اللہ، تم اللہ کے راستہ پر سوؤ

تا بود کہ سالکے بر تو زند
از خیالاتِ نعاسک بر کند

تاکہ شائد کوئی راہ گزر ادھر سے گزرے، تو تم کو نیند سے بیدار کر دے۔ ورنہ سوتے ہی رہ جاؤگے

پس جس طرح سے راستہ میں سونے کی وجہ سے کوئی راہرو اس کو جگا ہی دے گا اسی طرح سے جو شخص غافل ہو اس کو چاہئے کہ ذاکرین کی صحبت میں رہے کہ کبھی نہ کبھی ان کی برکت سے یہ بھی ذاکر ہو جائے گا دنیا میں اللہ والوں کے ساتھ جو رہا جاتا ہے تو اسی لئے کہ قلب سے غفلت دور ہو اور دل کچھ ادھر متوجہ ہو یعنی ترکِ دنیا کے لئے اور مراد اس سے ضروری دنیا کا ترک نہیں ہے کیونکہ بقدر ضرورت تو دنیا کی تحصیل لازم ہے اس سے کون منع کر سکتا ہے۔ منع تو اس دنیا سے کیا جاتا ہے جو خدا سے اور آخرت سے غافل کر دے۔ طلب دنیا میں اگر کسی یہ حال ہے تو بلاشبہ وہ قابل علاج ہے ۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دنیا اللہ تعالیٰ کے بھول جانے اور ان سے غفلت کا نام ہے نہ کہ کپڑے اور سامان چاندی سونا اور فرزند و زن کا۔ پس ہو سکتا ہے کہ کسی کے پاس یہ سب چیزیں موجود ہوں اور وہ دنیا دار نہ ہو اور جب قلب میں غفلت موجود ہے تو باوجودیکہ ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے پاس نہ ہو پھر بھی وہ دنیا دار ہی کہلائے گا۔

اللہ کے بندو! یہ کیا کر رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں، اس پر توجہ کرو ایک دن تو مرنا ہے ہی تو کچھ کر کے مرو اور کچھ یہاں سے لے کر جاؤ۔ اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق پیدا کرو پھر دنیا کی مجال ہے جو دل کے اندر گھس سکے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا کمانا چھوڑ دو، نہیں دنیا بھی کماؤ اور خوب کماؤ مگر اس کو دل میں جگہ نہ دو دل خدا کی یاد کی جگہ ہے دنیا کی جگہ نہیں دنیا کو صندوق میں رکھو جیب میں رکھو مگر دل سے باہر رکھو۔ اللہ تعالیٰ نے سارے اعضاء دو دو بنائے ہیں لیکن قلب ایک ہی بنایا ہے تو یہ اسلئے کہ وہ محبوب حقیقی کا جائے قیام ہے غیر کا نہیں حضرت حاجیؒ صاحب فرماتے ہیں کہ

اسکے غیر ہے خانۂ دل میں کیسے کہ خیالِ رخِ دلدار ہے دربان اپنا

اور کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب یہ دنیا چند روزہ ہے اور یہاں سے ہم سب کو جانا ہی ہے تو دل میں کچھ اس کی یاد اس کی محبت لے کر جاؤ یہ اچھا ہے یا دنیا سے یوں ہی خالی جانا یہ اچھا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

آرزوئے دیدِ جاناں بزم میں لائی مجھے　　　بزم سے میں آرزوئے دیدِ جاناں لے چلا

میں نے آپ کا بہت وقت لیا تاہم اس کا لحاظ ضرور رہا کہ کام کی باتیں بیان کی جائیں اور جو کچھ عرض کیا جائے بطور نصح کے اخلاص کے ساتھ عرض کر دیا جائے کیونکہ اس زمانے میں ہم میں اسی چیز کی بہت کمی ہو گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اسباب ہدایت زائد ہونے کے باوجود ظلمت اور گمراہی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ بقول اکبر ؎

انوار اس دور کے دل افروز ہیں کم　　　گویا کہ شبیں بہت ہیں اور روز ہیں کم

ہر چرب زباں نہیں ہے شمع اخلاص　　　جلنے والے بہت ہیں دل سوز ہیں کم

حاصل میری اس تمام گزارش کا یہ ہے کہ جب جنت پسند ہے تو مکارہ کیوں پسند نہیں ہیں جب کہ قاعدہ کی بات ہے کہ آرام میں لذت کچھ تکلیف ہی کے بعد ملا کرتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جنت میں پہلے دنیا کی روٹی کھلائی جائے گی تاکہ دنیا کی تمام نعمتوں کی لذت از سر نو تازہ ہو جائے اور اس کے بعد جب جنت کی نعمتیں کھائیں تو دونوں کا باہم تقابل آسان ہو۔

انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ نفع چاہتا ہے تو کام بھی کرے باقی نفع میں اور آمدنی میں تو شریک رہے اور محنت اور کام کے وقت دور رہے یہ مذہب ٹھیک نہیں اگرچہ آجکل بہت رائج ہے۔

ایک دفعہ حضرت مولاناؒ نے ملاقات کے وقت مجھ سے پوچھا کہ بھائی لوگ یہ تو نہیں کہتے کہ آمدنی میں شریک ہیں اور کسب میں نہیں، میں نے کہا نہیں ایسا خیال تو نہیں معلوم ہوتا میں نے کہنے کو تو حضرت سے کہہ دیا لیکن بعد میں اس پر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ بات یہی ہے جو حضرت فرما رہے ہیں یہ زمانہ ہی ایسا ہے کہ اگر اس زمانے میں کسی کو یہ خیال ہو جائے تو کچھ بعید نہیں ہے۔

بس میں نے حضرت کے اس ارشاد کو پلے باندھ لیا اور مجھے تو اس سے بہت نفع ہوا اسی لئے آج آپ لوگوں سے بھی یہ گفتگو کر رہا ہوں اور اب تو آنکھوں سے یہ دیکھ رہا ہوں کہ اکثر و بیشتر ہمارے گھریلو فسادات اور نزاعات کی بنا یہی مسئلہ بنا ہوا ہے ہر شخص دوسروں سے کچھ توقعات قائم کئے ہوئے ہے اور دوسروں ہی سے اپنے حقوق کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے اس کی فکر نہیں کہ ہمارے ذمہ بھی دوسروں کے کچھ حقوق ہیں یا نہیں، چنانچہ اسی حالت کے نتیجہ میں پھر غیبت بھی ہے دشمنی اور عداوت بھی ہے جس کی وجہ سے پوری قوم کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہے۔ اب اس کی سزا آخرت میں تو جو بھگتنا ہو گا وہ تو ہے ہی اس دنیا میں بھی مل رہی ہے وہ ہمارے اور آپ کے سامنے ہے کہ نہ باہم الفت ہے، نہ محبت ہے، نہ شوکت ہے۔ نہ طاقت ہے، نہ صحت ہے، نہ ہمت ہے اور کیونکہ یہ چیزیں

ہو سکتی ہیں جب کہ ہم نے راستہ ہی دوسرا اختیار کر رکھا ہے۔ بس اسی پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔
اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف فرمادے اور ہم سے راضی ہو جائے اور آخرت کے علاوہ اس دنیا میں بھی ہمیں نعمتوں سے نوازے۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

آپس میں موافق رہو طاقت ہے تو یہ ہے　　دیکھو نہ باہم عیب محبت ہے تو یہ ہے
صحت بھی ہو روزی بھی ہو، ہو دل کو بھی تسکین　　دنیا میں بشر کے لئے نعمت ہے تو یہ ہے

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ
وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ ۝

ازافادات

مصلح الامۃ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدمہ

ناظرین کرام۔ السلام علیکم۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے ارشادات میں سے ایک مضمون بعنوان اعتقاد وانکار "میرٹھ" سے ہم آپکی خدمت میں پیش کرچکے ہیں۔

آج کل حضرت والاؒ بمبئی والہ آباد میں مختلف مجالس میں اتباع سنت پر مسلسل بیان کررہے ہیں جو کہ "رسالہ معرفت" الہ آباد میں برابر "وصیۃ السنۃ" کے نام سے شائع ہورہا ہے۔ چونکہ اس سے سالکین راہ کو الحمد للہ بڑی آسانیاں نصیب ہورہی ہیں اور طریق پر صحیح روشنی پڑرہی ہے اس لئے نفع عام کیلئے حضرتؒ کا یہ ایک مضمون بعنوان "اتباع سنت" شائع کررہا ہوں اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ احقر کیلئے اور قارئین کیلئے نافع بنائیں۔ آمین۔

اس سلسلہ میں حضرت کا یہ ارشاد ناظرین کے نفع کیلئے نقل کررہا ہوں کہ

"جس شخص نے رسول اللہ صلعم کا راستہ نہیں اختیار کیا یعنی خدا تک پہونچنے کے لئے آپؐ کے طریقوں اور آپکی سنتوں کو ذریعہ نہیں بنایا تو وہ کبھی بھی اس درگاہ تک نہیں پہونچا اور پہونچنا تو بجائے خود رہا اس درگاہ کی گرد راہ کو بھی اس نے نہیں پایا۔ اسی لئے آپ کے سامنے سنت کا مضمون چھیڑا ہے تاکہ آپکو راستہ مل جائے کیونکہ یہی راہ ہے ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا   تواں یافت جز بر پئے مصطفےٰ

خلاف پیمبرؐ کسے رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید"

(معرفت حق۔ فروری سنہ ۷۰ء ص ۲۵)

(یکے از خدام)

مجلس

(دوشنبہ - ۱۰ جمادی الثانیہ ۱۳۸۶ھ)

میں اسوقت ایک مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ لوگ اسکو سنیں تو ہوش اڑ جائیں اور خصوصیت سے علماء کی توجہ اسکی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ ہم بشر ہیں فرشتہ نہیں ہیں۔ اور انبیا علیہم السلام بھی بشر ہیں۔ لہٰذا ہماری جملہ ترقیات بشریت کی راہ سے ہیں ملکیت سے نہیں۔ انسان کو ملکی قوت بھی دی گئی ہے اور بشری بھی مگر قوت ملکی بشری سے کم ہے۔ انسان کے اندر جو ملکیت ہے اسکے اوصاف میں سے خدا کا ذکر اور تسبیح و تقدیس ہے فرشتے ہر وقت اسی میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یُسَبِّحُوْنَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ اسی طرح انسان ان چیزوں کو بھی کرتا ہے یعنی ذکر و تسبیح و تہلیل بھی کرتا ہے اور تھکتا نہیں۔ یہ تو ملکیت کی شان ہوئی۔ چنانچہ صوفیہ کو جو احوال طاری ہوتے ہیں وہ اسی قبیل سے ہیں اسلئے کہ یہ بھی ملائکہ کی صفت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے کلام فرماتے ہیں تو بیہوش ہو جاتے ہیں اور پھر ہوش میں آنے کے بعد ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا؟ یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو کیفیت و احوال سے از خود رفتہ ہو جاتے ہیں۔ تو یہ بھی بڑی چیز ہے کہ بشر ہو کر ملکی اوصاف اختیار کرے، مگر میں اور چیز کو بیان کر رہا ہوں یعنی بشریت کو۔ اور یہ کہہ رہا ہوں کہ بشر حالت بشریت میں اوصاف بشریہ کے ساتھ متصف ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے اعلیٰ درجہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

بشریت کے لوازم میں سے کھانا، پینا، سونا، پیشاب، پاخانہ اور دوسری چیزیں ہیں۔ انبیا علیہم السلام نے انھیں چیزوں کو اعلیٰ درجہ کا قرب کا ذریعہ بنایا جنکو ہم نے اعلیٰ درجہ کی غفلت بنا لیا ہے۔ یہ کہہ رہا ہوں کہ یہی اوصاف بشریہ کھانا پینا اور سونا وغیرہ جو خاص بشریت اور موجب غفلت ہیں اور جنکا قرب میں کوئی دخل نہیں سمجھتے ہو انکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ درجہ کا ذکر بنا دیا واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آپ نے عین غفلت کو ذکر بنا دیا۔ سونا تو خیر غفلت ہے ہی کھانا بھی غفلت کا سبب ہوتا ہے اسلئے کہ جتنے بھی غافلین ہیں ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کا صدور اسی کھانے کے سبب ہوتا ہے

اگر کھانے میں کمی کریں تو ان سے معاصی کا صدور کم ہو۔ اور اگر ان اوصاف بشریہ کو سنت کے مطابق کرلیں تو اس سے غفلت دور ہو جائے۔ لیکن میں جو کہہ رہا ہوں یہ بات باوجود آسان اور سہل ہونے کے آپ لوگوں میں جلدی نہیں آویگی اس لئے کہ سنت سے بہت دور ہو چکے ہو، ہاں اگر کوئی چیز ایسی بتلادوں کہ اس سے دماغ پر اثر ہو جاوے اور بعض لوگ اس میں پاگل تک ہو جاویں تو البتہ سمجھیں گے کہ ہاں کوئی چیز ہے۔ بعضے اشغال وغیرہ ایسے ہیں کہ ان سے فائدہ کیا ہوگا لوگ پاگل ہو جاتے ہیں اگر میں اسکو نہیں بتاتا ہوں بلکہ یہ بتا رہا ہوں کہ اوصاف بشریت سے متصف ہونے کے وقت ہی میں قرب اور فرشتوں سے زیادہ قرب حاصل کر سکتے ہو۔

ان اوصاف بشریہ میں سے ایک کھانا ہے۔ اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھوئے یہ ایک سنت ہوئی پھر بسم اللہ پڑھے یہ دوسری سنت ہوئی۔ جب کھانا کھا چکے تو دعا پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ یہ تیسری سنت ہوئی ہو جب کھانا کھانے کے بعد یہ دعا پڑھتا ہے تو اسکا تعلق اللہ کے ساتھ کیسا کچھ ہوتا ہے اسکو وہی جانتا ہے اسلئے یہ کھانا نعمت ہے اور نعمت سے منعم کی معرفت ہوتی ہے اور یہ معرفت فعل قلب ہے لسان کا فعل نہیں چنانچہ بخاری میں ہے اِنَّ الْمَعْرِفَةَ فِعْلُ الْقَلْبِ (فتح الباری ص۵۲ ج ۱)۔

پس مومن جب نعمت کو استعمال کرتا ہے تو اس نعمت کے منعم کی معرفت اسکو ہوتی ہے۔ اور اسی معرفت میں وہ غرق ہو جاتا ہے اسکے بعد وہ صرف اسی قلب کی معرفت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ زبان سے بھی منعم کا شکر اس طرح ادا کرتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اور یہ ذکر لسانی اسی معرفت کا اثر ہوتا ہے اور اتنے ہی سے مومن بہت دور تک پہونچ جاتا ہے۔ اور منعم کی جو معرفت قلب میں حاصل ہوتی ہے زبان سے الحمد للہ کہنے کی وجہ سے اسمیں اور ترقی ہوتی ہے اور شکر کے طور پر جتنے کلمات مومن کہتا ہے وہ سب اسکے ایمان کی ترقی کے باعث اور ازدیاد ایمان کے موجب ہوتے ہیں

قلب میں جو چیز ہے یعنی معرفت جب وہ زور کرتی ہے تو زبان پر آتی ہے اور جب زبان سے کہتا ہے تو دل میں جاتی ہے زبان تائید کرتی ہے قلب کی اور قلب تائید کرتا ہے زبان کی دونوں ایک دوسرے سے ملکر ایمان کی ترقیات کے باعث ہوتے ہیں اور اسطرح

مومن کا ایمان بڑھتا رہتا ہے۔

اسکے لئے میں نے ایک مثال پیش کی تھی کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ مجھکو جب کوئی شخص ہدیہ دیتا ہے تو قلب اللہ تعالیٰ سے ایک نیا معاملہ کرلیتا ہے اور ایک نیا عہد باندھ لیتا ہے۔ میں نے کہا بھائی جبکی تو انکو ہدیہ زیادہ ملتا تھا اسواسطے کہ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ میں انکے پاس بھیجونگا تو یہ فوراً میری طرف رجوع ہو جائیں گے اور مجھ سے نیا عہد باندھ لیں گے۔ اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے دیا ہے یہ بیچارے ہدیہ پیش کرنے والے کیا دیتے۔ موحد یہی سمجھتا ہے کہ جو چیز بھی پہونچتی ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے پہونچتی ہے۔ سبحان اللہ خوب عہد ہے اور کیسا معاملہ ہے۔ ہم لوگ ذکر کرتے ہیں تب بھی قلب کا عہد اللہ تعالیٰ سے نہیں بندھتا اور انکو دیکھئے کہ ہدیہ پا رہے ہیں اور نیا عہد باندھ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ وہ بزرگ ہدیہ لینے کے وقت جو نیا معاملہ کرتے تھے تو اس لئے کہ روپیہ حاجات کے رفع کرنے کا ذریعہ ہے اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ نیا تعلق پیدا کرتے تھے ہم لوگوں کو ہدیہ ملتا نہیں تو کھانا تو دونوں وقت ملتا ہے۔ اسی کو کہتا ہوں کہ روپیہ اتنی مفید چیز نہیں ہے جتنا کہ کھانا اور پانی۔ روپیہ تو اگر بہت سا بھی پاس میں ہو تو زیادہ تر دوسروں کے ہی کام آتا ہے، ملازم کی تنخواہ، مکان کا کرایہ، اور دیگر امور میں صرف ہو جاتا ہے۔ البتہ جو کھانا ہم کھا لیتے ہیں اور جو پانی ہم پی لیتے ہیں وہی ہمارے کام آتا ہے اور اسی سے ہماری بشریت کا قیام ہے اس لئے کہ ہم اسکے محتاج ہیں اور برابر اسکو کرتے رہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے لئے روپیہ پیسہ سے زیادہ کارآمد کھانا اور پانی ہے اسلئے اسکو اگر اللہ کی طرف سے سمجھے اور اسکا شکر ادا کرے اور ہر کھانے کے وقت اللہ تعالیٰ سے نیا عہد باندھے تو اسی سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے۔ مگر اس کے اختیار کرنے میں نفس سے مجاہدہ کرنا ہوگا وہ بزرگ جو ہدیہ لینے کے وقت نیا عہد باندھتے تھے انکو یہ بات بہت دنوں میں حاصل ہوئی ہوگی اسی طرح آپ بھی کرتے رہیئے دل سے، اخلاص کے ساتھ اور ہر وقت کی سنت کو اس کے استحضار کے ساتھ کیجئے کرتے کرتے یہ چیز آپکو حاصل ہو جائیگی۔ ابتداء میں مجاہدہ کرنا ہوگا ورنہ جب کھانا کھانے بیٹھئے گا بھول جائیے گا۔ پہلے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نفس پر غصہ اور ترک سنت پر رنج و غم اختیار کیا جاتا ہے تب نفس سنت کی راہ پکڑتا ہے۔

میں نے ایک واقعہ بیان کیا تھا کہ ایک بزرگ تھے وہ کھانا کھاتے وقت ہاتھ دھونا کبھی

نہیں بھولتے تھے اور بسم اللہ کہنا بھول جاتے تھے اور کھانا کے بعد کی دعا پڑھتے تھے۔ اسی طرح جب پاخانہ جاتے تھے تو پہلے بایاں پیر داخل کرنا کبھی نہیں بھولتے تھے لیکن دعا پڑھنا بھول جاتے تھے اور نکلنے کے بعد کی دعا وہاں بھی یاد رہتی تھی اسکو ضرور پڑھتے تھے اس پر انھوں اپنے نفس سے سخت محاسبہ کیا کہ دو سنتوں میں سے ایک کو لیتا ہے اور دوسرے کو کیوں ترک کر دیتا ہے۔ جسطرح کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا سنت ہے اسی طرح بسم اللہ پڑھنا بھی سنت ہے بلکہ ہاتھ دھونے سے بڑھکر ہے۔ اسی طرح وہ بزرگ برابر اپنے نفس کو ملامت کرتے تھے کہ تم سے اور بڑی سنتوں پر کیا عمل ہوگا جب یہ چھوٹی چھوٹی سنتیں تم سے نہیں ہوتیں۔ غرض رنج کرنا اور غم اٹھانا اس راستہ میں مجاہدہ ہے اگر غم نہیں کروگے تو بدحالی ہمیشہ رہ جائیگی۔

اہل اللہ اپنی بدحالی سے بہت رنج وغم کرتے ہیں تب کہیں جاکر سنت اور فرض کو پکڑ پاتے ہیں۔ اسی طرح ہیں نے ایک حکایت بیان کی تھی کہ کچھ بزرگ لوگ کہیں کھانا کھا رہے تھے استنے میں ایک شخص آیا اور انکو سلام کیا ان لوگوں نے سلام کا جواب نہیں دیا بلکہ کھانے میں مشغول رہے جب کھانے سے فارغ ہوئے تو اس نے سوال کیا کہ میں نے آپ لوگوں کو سلام کیا آپ لوگوں نے میرے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا۔ انھوں نے کہا ہم صوفی لوگ ہیں ہمارا ہر کام اللہ کیلئے ہوتا ہے اور ہمارا کھانا بھی عبادت ہے اور عبادت میں مشغولی کے وقت نہ سلام کرنا چاہیئے اور نہ اسکا جواب دینا چاہیئے۔ جس طرح جب کوئی آدمی نماز یا ذکر کر رہا ہو تو ایسی حالت میں سلام کرنا اور اسکا جواب دینا نہیں چاہیئے

دیکھئے ان لوگوں نے کیسی عمدہ بات کہی کہ ہم لوگ صوفی ہیں ہمارا طریقہ غفلت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرنے کا نہیں اور جب ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں تو اسوقت ذاکر ہوتے ہیں۔ سبھی مسلمانوں کو یہ کرنا چاہیئے لیکن ابتو حال یہ ہے کہ نماز میں بھی ذکر نہیں ہوتا اور ان حضرات کا ذکر کھانے میں بھی ہوتا تھا۔ آپ خود غور کر لیجئے کہ آپ میں اور ان میں کتنا فرق ہے۔ کھانے پینے کے بعد پاخانہ کی نوبت آتی ہے اور کھانے سے بڑھکر اجابت کا ہو جانا اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اس لئے کہ اگر کھانا ہضم نہ ہو یا قبض ہو جائے اور پاخانہ نہ ہو تو سخت مصیبت ہو جاتی ہے اور جتنی بیماریاں ہیں وہ سب معدہ ہی سے ہوتی ہیں۔ اسکے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمائی ہے

کہ پاخانہ جانے سے پہلے یہ دعاء پڑھے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ اور پہلے بایاں پیر داخل کرے اور جب نکلے تو پہلے دایاں پیر نکالے اور یہ دعاء پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّیْ مَا یُؤْذِیْنِیْ وَاَبْقٰی عَلَیَّ مَا یَنْفَعُنِیْ تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے موذی چیز کو مجھ سے دور کردیا اور اس چیز کو مجھ پر باقی رکھا جو نفع دے۔ کھانے کے بعد جو دعاء پڑھی جاتی ہے اس سے کہیں بڑھکر یہ دعاء ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر یہ دعاء نہ فرماتے تو ہم لوگ کھانے کو تو نعمت سمجھتے مگر پاخانہ کے ہوجانے کو کون نعمت سمجھتا۔ یہ ہے بشریت کی راہ سے ترقی اسلئے کہ فرشتے نہ کھانے کو جانتے ہیں نہ پاخانے کو۔ تو اگر ہماری تعلیم کے لئے اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیجتے تو وہ ان سب چیزوں کو کیا بتلاتے اور انبیاء علیہم السلام چونکہ بشر ہوتے ہیں انکی ترقیات کھانے میں بھی ہوتی ہیں اور پیشاب پاخانہ کے ہونے میں بھی اور وہ اس سے اللہ تعالیٰ کا اعلیٰ درجہ کا قرب حاصل کرلیتے ہیں۔ پس ہمارے لئے بھی یہ چیزیں قرب کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اور سونے کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء تعلیم فرمائی اَللّٰھُمَّ اَنْتَ خَلَقْتَ نَفْسِیْ وَاَنْتَ تَوَفّٰھَا لَکَ مَمَاتُھَا وَمَحْیَاھَا اِنْ اَحْیَیْتَھَا فَاحْفَظْھَا بِمَا تَحْفَظُ بِہٖ عِبَادَکَ الصَّالِحِیْنَ وَاِنْ اَمَتَّھَا فَاغْفِرْلَھَا وَارْحَمْھَا اور اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی اَللّٰھُمَّ قِنِیْ عَذَابَکَ یَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَکَ۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی دعائیں ہیں اور جب سوکر اٹھے تو یہ دعاء پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ جب ان دعاؤں کو پڑھکر سوئے گا تو ذکر ہی پر نوم ہوئی اور جب اٹھتے ہی دعائیں پڑھیں گے تو بیداری بھی ذکر کے ساتھ ہوئی، پھر درمیانی وقت بھی ذکر ہی میں شمار ہوگا اور اسکا سونا بھی سنت کے ساتھ ہوا اس لئے کہ اسوقت کی سنت کا لحاظ کرکے اور دعاء پڑھکر تب سویا اور اسکی بیداری بھی سنت ہی کے ساتھ ہوئی تو درمیان میں جو وقت گذرا یہ سب سنت میں گذرا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا صحابہؓ اسقدر اہتمام کرتے تھے کہ کوئی سنت ان سے ترک نہ ہوتی تھی۔ ایک صحابی گورنر تھے جب کبھی کھانا کھاتے وقت کوئی چیز گرجاتی تھی تو اسے اٹھاکر صاف کرکے کھالیتے تھے یہ بھی سنت ہے، لوگوں نے ان سے کہا کہ حضرت آپ گورنر ہیں اور یہ عجمی لوگ ہیں اسکو ناپسند کرتے ہیں اپنی نظروں سے گرادینگے۔ انھوں نے فرمایا کہ چاہے کچھ ہو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت انکی خاطر نہیں چھوڑیں گے یہ لوگ ہم سے راضی ہوں یا راضی نہ ہوں۔ ہم اسلئے نہیں آئے ہیں کہ ان لوگوں میں رہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی سنت کو چھوڑ دیں ورنہ اسی طرح ایک ایک کر کے سب سنتیں ختم ہو جائینگی۔ لہٰذا اب بھی امت کو چاہیئے کہ ان سنن نبویہ کو اپنے عمل میں جاری کریں ورنہ صرف کتب احادیث میں یہ لکھی رہ جائیں گی اور امت ان کے برکات سے محروم ہی رہ جائیگی۔ اسی لئے اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا تھا کہ سنت کے اختیار کرنے میں نفس سے مجاہدہ کرنا ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سنتوں کو یاد کرنا ہوگا۔ اور یہ مجاہدہ کرنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اور نفس کو مارنا بھی سنت ہے۔ اسلئے طالبین اور سالکین کو چاہیئے کہ اپنے نفس کی شرارتوں پر خود غصہ کریں اور ترک سنت پر رنج و غم کریں۔ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ ریاضت میں اپنے نفس پر غصہ کرنا ضروری ہے اگر ایسا نہیں کیا جائیگا تو اصلاح نہیں ہوگی۔

اگر نفس نہ ہوتا تو آپ کی طلب اور آپکا مجاہدہ کیسے ثابت ہوتا اللہ تعالےٰ نے مجاہدہ ہی کیلئے نفس کو پیدا کیا ہے اور اس نفس کی نہیں معلوم کتنی خواہشات ہیں اور ہر ہر خواہش اللہ تعالےٰ سے روکنے والی ہے۔ اسلئے جو شخص اپنی ہر خواہش کا مقابلہ کریگا وہ اللہ تعالےٰ کے یہاں بڑا نمبر پاویگا۔ اللہ تعالےٰ کہیں گے کہ تم ہمارے دوست ہو اسلئے کہ تم نے اپنے نفس کو جو تمھارا دوست تھا ہماری خاطر چھوڑ دیا۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے جو نفس کو دیا ہے تو سب سے بڑی بشریت یہی ہے مگر اللہ والوں نے اسکو پورا مٹا کر ذلیل و خوار کر کے رام کر کے تابع کر کے چھوڑا۔ اللہ کے بندوں نے یہی کیا اور اپنی پوری سعی کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کیطرف رجوع ہوئے ہیں کہ یا اللہ یہ نفس بھی آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اسکی خواہشات بھی آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں اگر آپ ہی رُخ کو پھیر دیں تو یہ رام ہوسکتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسکے لئے یہ فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰهَا وَزَکِّهَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰهَا اَنْتَ وَلِیُّهَا وَمَوْلَاهَا۔ بس ہم کو بھی یہی طریق اختیار کرنا چاہیئے اور سنت کی راہ پکڑنا چاہیئے۔

مجلس

(یوم شنبہ ۔ ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۸۰ھ م ۵ فروری ۱۹۶۲ء ۔ الٰہ آباد)

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ کی یہ کتاب ہے جو بہت بڑے عالم اور بڑے درجہ کے صوفی ہیں اپنی اس کتاب میں سب مسائل بیان کیے ہیں انکا طرز یہ ہے کہ پہلے بطور کلی کے ایک بات بیان کرتے ہیں پھر اسکے تحت بہت سے مسائل لکھتے ہیں۔ چنانچہ پیر کے تلاش کرنے کا طریقہ اور پیر کی صفات کا بیان کیا ہے۔ بہت زبردست مضمون ہے۔ اسکے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

(مسئلہ) اگر کوئی شخص شیخ کی خدمت میں مدت تک حسن اعتقاد سے رہا اور اسکی صحبت میں تاثیر نہیں پائی تو اسپر واجب ہے کہ اسکو چھوڑ کر دوسرے شیخ کی تلاش کرے، ورنہ اسکا مقصود ومعبود وہ شیخ ہوگا نہ کہ خداوند تعالیٰ اور یہ شرک ہے۔

دیکھئے! قاضی صاحبؒ فرما رہے ہیں کہ یہ شرک ہے۔ یعنی یہ کہ شیخ کو پکڑے رہے اور اس سے فائدہ بھی نہیں پھر اسکو چھوڑتا بھی نہیں یہ عقیدہ کی غلطی ہے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مقصود شیخ ہوگیا ہے حالانکہ مقصود ومعبود محض خدا تعالیٰ ہیں۔ یہی شرک ہے۔ مشائخ کیلئے ضروری ہے کہ امت کے احوال سے واقف ہوں کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ نیز مشائخ کیلئے لازم ہے کہ وہ لوگوں کو بتلادیں کہ ہم مقصود نہیں ہیں بلکہ خدا مقصود ہے ورنہ قیامت میں پرسش ہو جائیگی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں آیا ہے کہ انکو اللہ تعالیٰ اپنے سامنے کھڑا کر کے پوچھیں گے کہ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۔ اس سوال سے حضرت عیسیٰ ایسے ڈر جائیں گے کہ تمام بدن سے خون کے فوارے نکلنے لگیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اس منصب پر ہیں قیامت میں ان سے پرسش ہوگی۔

آپ خود سوچئے کہ جو اللہ تعالیٰ تک پہونچانے کا ذریعہ ہو وہ خود مقصود ومعبود ہو جائے تو کتنی بُری بات ہے۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں جابجا ارشاد فرمایا ہے اور یہود ونصاریٰ کے اس حال پر نکیر فرمائی ہے چنانچہ انکے شرک کا حال بیان فرما کر یہ

فرماتے ہیں اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (یعنی انھوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اپنا رب لیا ہے) صحابہؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا اُن لوگوں نے رب بنا لیا تھا حالانکہ وہ تو اہل کتاب تھے تو آپ نے فرمایا کہ ہاں جس چیز کو ایکے علماء اپنی طرف سے حلال و حرام کہتے تھے اسکو یقین کرتے جاتے تھے چاہے خدا کے حکم کے خلاف ہی ہو یہ مطلب ہے رب بنا لینے کا۔ حلال و حرام قرار دینا یہ رب کی شان ہے (اور وہ لوگ خود ہی جس چیز کو حلال کر دیتے تھے اسکو عوام حلال سمجھتے تھے، اور جس چیز کو حرام کر دیتے تھے اسکو حرام سمجھتے تھے۔ ان کے عوام و خواص گمراہ تھے۔ اسلئے جب خدا کے فتوی کو چھوڑ دیا جائیگا تو پھر گمراہی دھری ہے۔ اور تحلیل و تحریم خدا کی طرف سے ہوتی ہے اسکو مخلوق کی طرف سے اعتقاد کرنے لگے تو یہی شرک ہے کیونکہ یہی رب بنانا ہے۔

اسکے بعد قاضی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ عزیزان رامیتنی پیر طریقہ نقشبندیہ فرماتے ہیں ؎

با ہر کہ نشستی و نشد جمع دلت ... وز تو نہ رسید صحبت آب و گلت

جس کے ساتھ تم بیٹھے اور تمہارا دل جمع نہیں ہوا یعنی خدا کیطرف جمع نہیں ہوا اور دل جمعی خدا کے ساتھ نہیں ہوئی اور مخلوق سے دل علٰحدہ نہیں ہوا (یہ حضرات صوفیہ کی خاص اصطلاح ہے مخلوق کا مجمع نہیں مراد ہے) اور تم سے آب و گل کی صحبت نہیں گئی (یعنی دنیا اور دنیا والوں سے انقطاع نہیں ہوا) ؎

زنہار ز صحبتش گریزاں می باش ... ورنہ نہ کند روح عزیزاں بحلت

خبردار اس کی صحبت سے بہت گریز کرو ورنہ عزیزاں کی روح تم کو معاف نہیں کریگی (مراد اس سے پورے سلسلہ کی روح ہے) یعنی اگر تم اسکی صحبت سے گریز نہ کروگے تو تمام اہلِ سلسلہ تم کو معاف نہیں کرینگے۔

(ترصیع الجواہر المکیہ) تصوف کی ایک عمدہ کتاب ہے اسکے بعض مقامات مجھکو بہت ہی پسند آئے مختصر سی عبارت میں فن کے بڑے بڑے مسائل کو محققانہ طور پر بیان فرمایا ہے۔ اسوقت انکی بیان کردہ چند تنبیہات پیش کرتا ہوں، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مولف نے ہر مسئلہ پر تنبیہ کا عنوان اسلئے اختیار فرمایا ہے کہ یہ بتلائیں کہ طریق میں یہ نہایت ضروری امور ہیں اور مصرح ہیں مگر لوگ اِنکی طرف سے غافل ہیں کیونکہ تنبیہ انھیں چیزوں پر کیجاتی ہے جن سے واقفیت تو ہو مگر تساہل کی بنا پر لوگ اسکو ترک کئے ہوں۔ چنانچہ

فرماتے ہیں کہ قد ذکرنا لک سابقاان فتح باب الغیب موقوف علی عمل الطاعات وترک المخالفات وتصفیۃ القلب من الاخلاق الذمیمۃ (ص۲۰ تنبیہ ہم) ہم نے تم سے ابھی سابق میں یہ بیان کیا ہے کہ غیب کا دروازہ کھلنا موقوف ہے۔ طاعات (یعنی عبادات کے کرنے اور مخالفات (یعنی معاصی) کے ترک کرنے اور قلب کے اخلاق رذیلہ کے تصفیہ کرنے پر یعنی سالک کیلئے (بلکہ مسلمانوں کیلئے) غیب کا دروازہ کھلنا اسپر موقوف ہے کہ وہ طاعات کریں اور مخالفات یعنی معاصی کو چھوڑدیں اور اپنے اخلاق رذیلہ کو دور کریں میں کہتا ہوں کہ یہ ترتیب تو انھوں نے بیان فرمائی ہے جو عین شریعت ہے طاعات پر عمل اور معاصی کا تزکیہ۔ باقی میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت میں باب غیب کی فتح صرف ایک ہی پر موقوف اور وہ ہے اخلاق ذمیمہ سے قلب کا تصفیہ جو تزکیہ ہے۔

چنانچہ انسان اپنے قلب کو جب رذائل سے پاک وصاف کرلیتا ہے تو اول فتح جو اسپر ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اسکو طاعات کی توفیق ہوجاتی ہے۔ مخالفات اور معاصی کا ترک اسکے لئے آسان ہوجاتا ہے۔ یہ اسلئے کہ فتح جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہے جب قلب پر نازل ہوجاتی ہے تو محال ہے کہ آدمی اسکے بعد پھر طاعات پر عمل نہ کرے یا مخالفت کا ارتکاب کرے۔ پس میرے نزدیک عمل طاعات اور ترک مخالفات یہ دونوں تصفیۂ قلب کے قرین نہیں بلکہ اسکے ثمرات ہیں۔

آگے مولف فرماتے ہیں کہ فاعلم الان ان العبادۃ شطر ان شطر الاکتساب لاطاعۃ وشطر الاجتناب للمعصیۃ التی فیھا الاخلاق الذمیمۃ وان شطر الاجتناب افضل واشرف للعبد من شطر الاکتساب فان ترک المضار مقدم علی جلب المنافع۔ یعنی تواب سنو کہ عبادت کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ طاعت کرنا ہے دوسرا حصہ معصیت سے بچنا ہے جن میں اخلاق ذمیمہ بھی شامل ہیں اور یہ سمجھ رکھو کہ ان دونوں حصوں میں سے اجتناب والا حصہ انسان کے حق میں اکتساب والے حصہ سے افضل واشرف ہے اسلئے کہ نقصان دہ چیزوں کو اپنے سے دور کرنا ہمیشہ اہم اور مقدم ہوا کرتا ہے مصالح اور منافع کے حصول سے۔

میں کہتا ہوں کہ صاحب ترصیع نے بات نہایت ہی عمدہ بیان فرمائی ہے بلاشبہ ترک معاصی اتیان طاعت سے مقدم اور ضروری شے ہے۔ اور میں اسکو آیت سے بھی موید کرسکتا ہوں

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّۃَ فَقَدْ فَازَ (جو شخص جہنم سے دور رکھا گیا ہے اور جنت میں داخل کردیا گیا تو بس وہ کامیاب ہوگیا)۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک جنت ہے اور ایک نار ہے۔ معاصی کا ارتکاب کرنیوالا نار میں جاتا ہے اور طاعات کرنے والا جنت کا مستحق ہوتا ہے مگر ان دونوں میں سے دوزخ سے بچنا زیادہ اہم و ضروری ہے۔ چنانچہ اسکو یہاں ذکر میں بھی مقدم رکھا گیا ہے کیونکہ دوزخ میں ایک منٹ کا قیام بھی ناقابل برداشت ہوگا۔ چنانچہ جتنے بھی انبیاء علیہم السلام تشریف لائے سب ہی نے دوزخ سے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے پناہ مانگی ہے اور انکے بعد حضرات اولیاء کرام بھی انھیں کے نقش قدم پر چلے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ اللہ تعالیٰ سے ان لفظوں میں دعا مانگتے ہیں کہ ؎

من نہ گویم کہ طاعتم بہ پذیر   قلم عفو بر گناہم کش

میں نہیں کہتا ہوں کہ آپ میری طاعت قبول کرلیجئے بلکہ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ بخشش کا قلم میرے گناہوں پر پھیر دیجئے یعنی انھیں معاف کرکے دوزخ سے مجھے بچا لیجئے۔ بس میرے لئے یہی کافی ہے مجھے جنت کے مراتب نہ ملیں نہ سہی دوزخ سے ضرور رہائی چاہتا ہوں۔ یہی مضمون ہے جسکو فرمایا گیا ہے کہ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّۃَ فَقَدْ فَازَ (جسکی دوزخ سے رہائی ہوکر بس جنت میں رسائی ہوگئی وہ کامیاب ہوگیا)۔

میں کہتا ہوں کہ ابھی بیان کرچکا ہوں کہ اصل چیز قلب سے رذائل تصفیہ ہے اور وہ ہوتا ہے معاصی کے ترک کرنے سے اور دوزخ میں پہونچانے والی چیز معصیت ہے اور طاعات کی جو توفیق ہوتی ہے وہ تصفیہ کے بعد ہی ہوتی ہے اس لئے تصفیہ یعنی تخلیہ کو تحلیہ سے مقدم ہونا ہی چاہیئے۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ آج اسی کے اہتمام میں کمی ہے۔ طاعت کیجانب تو کچھ توجہ ہے بھی مگر ترک معصیت کی جانب اصلا توجہ نہیں ہے۔ اسلئے اسکی اہمیت کو قلب میں پیدا کرنے کیلئے اور سالکین کو صحیح راہ پر لگانے کے لئے یہاں مصنف نے یہ عنوان بہت ہی خوب اختیار فرمایا یعنی یہ کہ عبادات میں سے اجتناب کا حصہ اکتساب کے حصہ سے افضل ہے اسلئے کہ دفع مضرت جلب منفعت سے اولیٰ اور اقدم ہوا کرتی ہے۔ آدمی کو نفع حاصل نہ ہو نہ سہی مگر نقصان سے خود کو بچا نا سکے لئے بہت ضروری ہے۔ آگے مولف نے صوفیہ کا عمل بھی اس کی تائید میں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ولذلک تری الاکتساب شان المبتدئین والاجتناب

ارباب البصائر اذ همتهم حفظ القلوب عن الميل لغيره تعالیٰ وحفظ البطون عن فضول الاطعمة وحفظ الالسن عن اللغو وحفظ الاعين عن النظر لما لا يعنى وهذا كله من ثمرة انصلاح القلب فيقدر اصلاح القلب ينصلح الجوارح اكتسابًا او اجتنابًا ۔ یعنی اجتناب کا پہلو چونکہ اکتساب سے افضل ہے یہی وجہ ہے کہ تم دیکھو گے کہ مبتدیوں کی توجہ طاعات کے اکتساب کی طرف زیادہ رہتی ہے اور جو حضرات کہ منتہی اور ارباب بصائر میں سے ہیں انکی تمام تر کوشش اسی جانب رہتی ہے کہ کوئی ظاہری یا باطنی معصیت نہ ہونے پائے ۔ چنانچہ انکا قصد بس یہ ہوتا ہے کہ اپنے قلوب کو غیر اللہ کیجانب میلان سے بچائیں اور اپنے بطون کو فضول کھانوں سے محفوظ رکھیں اور اپنی زبانوں کو لغو اور بیکار باتوں سے بچائیں اسی طرح اپنی آنکھوں کو ہر اس شئے کیجانب نظر کرنے سے باز رکھیں جسکے دیکھنے میں کوئی فائدہ نہیں ۔ آگے اسکی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ ان حضرات کو اپنے بطن، لسان اور نظر کی حفاظت کی جو توفیق ہوتی ہے تو یہ اسلئے کہ قلب انکا منصلح (یعنی اصلاح پذیر) ہو چکا ہوتا ہے اور اسی کی انصلاح یعنی اثر پذیر ہونے کا یہ ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے کہ دیگر تمام اعضاء اور جوارح بھی اصلاح کا اثر قبول کر لیتے ہیں ۔ قلب جس طرح سے مصلح ہوتا ہے منصلح بھی ہوتا ہے بلکہ سب سے پہلے انصلاح قلب ہی قبول کر لیتا ہے اسکے بعد دوسرے اعضاء کیونکہ متأثر صلاح نے فساد سے پہلے قلب ہوتا ہے ۔ چنانچہ نظر جو غلط محل میں پڑتی ہے تو اسکا داعیہ اور ارادہ پہلے قلب ہی میں ہوتا ہے آنکھ اسکا اتباع کر لیتی ہے ۔ اسی طرح سے آدمی اگر کسی ناجائز مقام پر جانا چاہتا ہے تو قدم اٹھنے سے پہلے اسکا تقاضہ قلب میں پیدا ہوتا ہے ۔ یہی حال صلاح کا ہے کہ منصلح پہلے قلب ہوتا ہے اور پھر اسکے انصلاح سے جوارح بھی منصلح ہو جاتے ہیں ۔ انصلاح باب انفعال سے ہے جسکی خاصیت ہے تاثر یعنی اثر قبول کرنا ۔ چنانچہ بولتے ہیں قطعتہ فانقطع یعنی میں نے اسکو کاٹا پس وہ کٹ گیا ۔ اسی طرح سے قلب خود منصلح ہو کر جب دوسرے اعضاء کی اصلاح کرتا ہے تو دیگر اعضاء بھی اسکی اصلاح قبول کرتے ہیں اور چونکہ انکا اثر قبول کرنا قلب کے اثر قبول کرنے کے بعد اور اسی کیوجہ سے ہوتا ہے اس لئے جس قدر کسی کا قلب صلاح حاصل کئے ہوتا ہے اس کے بقدر اعضاء بھی (طاعات کرنے کے اعتبار سے یا معاصی کے ترک کے اعتبار سے) صلاح پذیر ہوتے ہیں ۔

صاحب ترصیع کا یہ بیان بھی منجملہ ان بیانات کے ہے جو اس کتاب میں مجھے بہت پسند

ہیں ۔ ایسی باتیں (جن سے عبد کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے صحیح ہو) جو لوگ بیان کرتے ہیں وہ صاحبِ معاملہ کہلاتے ہیں ۔ اس قسم کی باتیں نہایت کام کی باتیں سمجھی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے لئے نہایت مفید ہوتی ہیں ۔

دیکھئے! کیسی عمدہ بات بیان فرمائی اور کیسے اچھے الفاظ میں اسکو ادا کیا ہے اور اصلاحِ قلب کا لفظ تو میں نے انھیں سے سنا، یوں مضمون تو مشہور حدیث کا ہے مگر اسکی شرح اس طریقہ سے کسی نے نہیں کی یہ چونکہ صوفی ہیں طریق کی باتوں کو کتاب وسنت سے مستنبط کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ فن کی باتوں کو جیسا یہ حضرات کتاب وسنت سے نکال لیتے اور ان نصوص کو جتنا یہ سمجھتے ہیں اتنا علماء ظاہر نہیں سمجھتے ۔

حدیث شریف میں ہے کہ ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب ۔ یعنی انسان کے بدن میں ایک لوتھڑا ہے جب تک وہ درست رہتا ہے تمام بدن درست رہتا ہے اور جب وہ فاسد ہوجاتا ہے تو تمام بدن ہی فاسد ہوجاتا ہے سن لو! وہ لوتھڑا یہی قلب ہے ۔ غرض جب قلب سب میں اصل ٹھہرا تو ارباب بصائر کے پیش نظر بھی یہی رہا، اور ان حضرات نے سب سے زیادہ اہتمام اس امر کا رکھا کہ غیر اللہ کیجانب میلان سے اپنے قلب کو بچایا جائے ۔ اسی طرح سے اپنے بطون کو فضول اطعمہ سے اور زبان کو لغو و لائل کلام سے اور آنکھ کو نامشروع محل میں استعمال سے باز رکھا جائے اور یہ سب کے سب امور اجتناب ہی کے قبیل کے ہیں ۔

گویا ان حضرات نے اکتساب سے زیادہ اہتمام اجتناب کا کیا ہے اور جو مبتدی ہوتے ہیں وہ اکتساب کے درپے رہتے ہیں اور اجتناب کو کچھ اہمیت نہیں دیتے ۔ اسکا منشار انکا نقص ہوتا ہے یہ اسلئے کہ اکتساب میں کچھ کرنا ہوتا ہے اور دوسروں کی نظر بھی اس پر پڑتی ہے کیونکہ وہ وجودی ہوتا ہے لہٰذا نفس میں اسکو اپنا حصہ لینے کا موقع ملتا ہے اور اسکو حظ آتا ہے اور مبتدی چونکہ ابھی حظِ نفس سے نکلا نہیں ہوتا ہے اسلئے اسکو اسی شق سے مناسبت ہوتی ہے اور منتہی کی نظر چونکہ اپنی جانب سے اور طاعات سے اٹھ چکی ہوتی ہے اور اسکے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی رہتی ہے اسلئے وہ عبادت سے زیادہ تقویٰ کا خیال رکھتا ہے یعنی اسکا خیال رکھتا ہے کہ محبوب کے خلاف منشار اور خلاف ادب کوئی حرکت نہ ہوجائے اس لئے اس کے شایانِ شان اجتناب ہے ۔

سالکین کو انکی اسی خامی پر تنبہ کرنے کیلئے آگے مولفؒ نے اسکے مناسب ایک دوسری تنبیہ فرمائی ہے جو بہت زیادہ قابل توجہ ہے۔ فرماتے ہیں تنبیہ الاعمال الصالحۃ انواع نوع الفرض ونوع الواجب ونوع المسنون الموکد ونوع المندوب وعلی المکلف ان یبدأ بالاھم فالاھم فان خالف ھذا الترتیب فھو جاھل مغرور کمن علیہ قضاء فوائت وھو مشتغل بالنفل او علیہ دین او زکوۃ مفروضۃ وھو مشتغل بالصدقۃ النافلۃ او ترک خدمۃ والدیہ وطاعتھا لفعل مستحب فکل ذلک غرور وعصیان یظلم بہ القلب وھذا الترتیب لایمکن القیام بہ علی الوجہ المطلوب الا بمعرفۃ المرشد الکامل او تعلم علم الفقہ ولذلک قالوا الصوفی عبارۃ عن العالم العامل بعلمہ۔ یعنی اعمال صالحہ کی چند قسمیں ہیں ایک قسم فرض ہے ایک واجب ایک سنت مؤکدہ ہے ایک مندوب ہے۔ لہٰذا مکلف پر لازم ہے کہ ان میں سے پہلے اہم کو لے پھر اسکے بعد جو اس سے کم درجہ کی ہو اسکو اختیار کرے۔ اب اگر اس نے اس ترتیب کیخلاف کیا یعنی غیر اہم کو لیا اور اہم کو ترک کر دیا تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ نہایت ہی جاہل ہے اور دھوکہ میں پڑا ہوا ہے۔ جیسے کسی شخص کے ذمہ قضا نمازیں باقی ہوں اور وہ انکو تو نہ ادا کرے اور نوافل ادا کرنے میں مشغول ہو جائے۔ اور دوسری مثال سنیئے یا کسی پر قرض ہے یا فرض زکوٰۃ اس کا باقی ہو اور وہ انکو ادا کرنے کے بجائے صدقات کی ادائیگی میں مشغول ہو جائے۔ تیسری مثال سنیئے یا والدین کی خدمت کو ترک کر دے اور انکی طاعت جو کہ اسکے ذمہ واجب ہے اسکا تو اہتمام نہ کرے اور کسی فعل مستحب میں اپنے کو لگائے رکھے۔ یا والدین کی خدمت وغیرہ جو کہ اہم امور ہیں انکی طرف سے غفلت برتے اور کسی امر مستحب میں جو اسکے نفس کے موافق ہو ان کی طاعت کے بہانے لگا رہے۔ یعنی یوں کہے مثلاً کہ والد صاحب نے یوں فرمایا ہے یا والدہ صاحبہ کی یہ خواہش ہے حالانکہ اس نے بڑے بڑے امور میں انکی خواہش اور انکے منشا کا ذرا بھی خیال نہیں کیا۔ پس یہ چیزیں غرور اور عصیان ہیں جنکی وجہ سے قلب میں ظلمت پیدا ہوتی ہے اور ان امور میں اہم جو ترتیب ہے اس پر عمل بدون مرشد کامل کی رہنمائی کے یا علم فقہ کے جانے ناممکن ہے اسی واسطے مشائخ نے فرمایا ہے کہ صوفی اسے کہتے ہیں جو عالم ہو اور اپنے علم پر عامل ہو۔

٭ اسی مضمون کو اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہے ؎

چشم ظاہر جسے : دیکھ سکے

اس طرف التفات مشکل ہے

ملفوظات

(۲۳ ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ)

ملفوظ: - فرمایا کہ علم حقیقتِ اشیاء کے انکشاف کا نام ہے اور یہ فرمایا کہ جب حقائقِ اشیا کا انکشاف ہوگا تو اس سے ہدایت ہوگی کیونکہ الفاظ کے ساتھ حال بھی مخاطب کے اندر داخل ہوتا ہے لہٰذا جس ناصح پر منکشف ہے وہ خود بھی تو متاثر ہوگا تو دوسرے میں بھی اثر ہوگا ورنہ جہل سے ہدایت کہاں ہوسکتی ہے۔

ملفوظ: - فرمایا کہ جس طرح کثرتِ مال موجبِ طغیان ہے اسی طرح کثرتِ عمل بعض اوقات موجبِ عُجب ہوتا ہے۔

ملفوظ: - فرمایا کہ اسلام اتباعِ شریعت، اور تقاضائے طبعی سے بے رخی کا نام ہے۔ اور اسلام کا حق ادا کرو احکام شرعیہ ادا کرکے اور عقل کو رہبر بنا کر۔

ایک خط

(جو متعلقہ حفظ از فتن ہے اور عام لوگوں کیلئے مفید ہو اسی کیساتھ برائے استفادہ عام پیش کیا جاتا ہے)

(ناقل)

مکرمی جناب ... . صاحب دام عنایتکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپکا خط اور جناب قاری ... . صاحب مدظلہٗ کا گرامی نامہ حضرت والا مدظلہٗ العالی کے ملاحظہ سے گذرا فرمایا کہ تم چاہو تو سید صاحب کو لکھدو اور انکا جی چاہے تو قاری صاحب کو لکھدیں کہ آپ نے یہ جو فرمایا ہے کہ "فتن نے قلوب کا ستیاناس بنا دیا کڑوی چیز شیریں اور شیریں تلخ معلوم ہورہی ہیں" یہ تو صحیح ہے۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جنکا یہی حال ہے اور ایسا حال انھیں لوگوں کا ہوتا ہے جو خود فتنہ میں پڑے ہوتے ہیں اور مفتون ہوتے ہیں۔ باقی اسی دنیا میں اسی فاسد ماحول میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک مولوی صاحب کا خط؎ جو ایک عربی مدرسہ کے مدرس اول ہیں، ارسال خدمت ہے اسکو ملاحظہ فرمائیے (نقل خط ہمرشتہ مکتوب ہذا ہے) ایسے لوگوں کو فتن سے چاہے کچھ ایذا پہونچ جائے اور کچھ ظاہری پریشانیاں اٹھانی پڑجائیں تو ہوسکتا ہے باقی یہ کہ انکے قلب ہی کا ستیاناس ہوجائے ایسا نہیں ہوسکتا ہے بلکہ یہ حضرات

؎ - یہ خط کتاب کے آخر میں غزل کے بعد ملاحظہ فرمائیے۔ جامعی۔

اسی فضا میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور فتن سے دور رہنے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی دعا کو سپر بناتے ہیں یعنی یہ کہتے ہیں اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ اور یہ کہ نَعُوْذُبِكَ مِنْ يَوْمِ السُّوْءِ وَمِنْ لَيْلَةِ السُّوْءِ وَمِنْ سَاعَةِ السُّوْءِ وَمِنْ صَاحِبِ السُّوْءِ یا اور انہیں کے مثل دعا اور استعاذوں کے ذریعہ فتن سے پناہ مانگتے ہوئے اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور اگر چہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب مخاطبین یا ان میں سے بعض طلب سے خالی ہوتے ہیں تو ان سے خطاب کرنے کو جی نہیں چاہتا جیسا کہ مولانا رومؒ مثنوی میں ایک مقام پر فرماتے ہیں ؂

گر ہزاراں طالبان و یک ملول	از رسالت باز می ماند رسول

لیکن جہاں یہ ہے وہیں دوسرے مقام پر مولانا رومؒ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ ؂

راز جز بارازداں انباز نیست	راز اندر گوشِ منکر راز نیست
لیک دعوت وارد ست از کردگار	با قبول و ناقبولِ او چہ کار
نوح نہ صد سال دعوت می نمود	دمبدم انکار قومش می فزود
ہیچ از گفتن عنان واپس کشید	ہیچ اندر غارِ خاموشی خزید
زانکہ از بانگ و علالائے سگاں	ہیچ واگردد ز راہے کارواں
یا شب مہتاب از غوغائے سگ	سست گردد بدر را در سیر تگ
مہ فشاند نور و سگ عو عو کند	ہر کسے بر خلقت خود می تند
ہر کسے در خدمتے داده قضا	در خور آں گوہرش در ابتلا

(مثنوی دفتر ششم ص)

حاصل یہ کہ آدمی اپنے ایمان کو درست کرلے اور اپنے اندر صدق و اخلاص پیدا کرے اور اپنے کام میں لگا رہے، یہ اسکا کام ہے اور حالات کو سازگار بنانا یہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

اور آپ سے کہتا ہوں کہ جب کسی کا یہ حال ہو جائے کہ تلخ شیریں اور شیریں تلخ معلوم ہونے لگے تو یہ امر دلیل ہے اسکی کہ اسکا مزاج اور مذاق فاسد ہو گیا ہے اسلئے اسکو علاج کی ضرورت ہے کیونکہ اصل یہی ہے کہ ذائقہ کو درست کیا جائے۔ پس جسطرح سے ظاہری ذائقہ جب خراب ہو جاتا ہے تو عمدہ عمدہ کھانا بھی بدمزہ اور لذیذ سے لذیذ مٹھائیاں بھی تلخ معلوم ہوتی ہیں تو اسکے لئے طبیب سے نسخہ لکھوا کر دوا استعمال کر کے اسکی اصلاح کیجاتی ہے، اسی طرح سے جب باطنی مذاق بگڑ جاتا ہے اور فاسد ہو جاتا ہے تو اس روحانی مرض کا بھی علاج کرانا ضروری ہوتا ہے اور اسکا مطب اہل اللہ کی صحبت ہے اور اسکے ذریعہ سے قلب میں ایمان پیوست کرنے کی ضرورت ہے۔ باقی یہ کام زبان اور تقریر کا نہیں ہے۔

ایک بات تو یہ ہوئی۔ اب دوسری بات سنیئے کہ اس فساد اخلاق اور فساد مزاج کے زمانے میں بھی کام اگر طریقہ اور سلیقہ سے کیا جائے گا تو نفع ہوگا۔ اس امر کے ثبوت کیلئے بعض احباب کے خطوط نقل کرتا ہوں۔ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی ابھی حال میں بمبئی تشریف لے گئے تھے واپسی پر انہوں نے جو خط لکھا اسمیں تحریر فرماتے ہیں:۔

۶ مارچ کو ایک عربی مدرسہ کے افتتاح کیلئے بمبئی گیا تھا حضرت والا کئی روز پہلے تشریف لیجا چکے تھے لیکن مجلسیں حضرات کے قیام کے فوائد و برکات کے ذکر سے معمور تھیں خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی بڑی اصلاح ہوئی نیز ان تجار اور اہل ثروت کی جو اس سے پہلے مسلک سے بعید اور متوحش تھے۔ میمنوں اور دوسرے تعلیم یافتہ حضرات کے اجتماع میں مجھے بھی کچھ عرض کرنے کا موقع ملا۔ الحمد للہ جناب والا کے قیام کے اثرات اس مرتبہ بہت محسوس کئے گئے اطال اللہ بقاءکم و متعنا بفیوضکم والسلام مع الاکرام۔

اسی طرح سے ایک اور صاحب اپنے ایک دوست کو امریکہ سے لکھتے ہیں:۔

معرفت حق کے دو پرچے ملے ارے...... بھائی کہہ نہیں سکتا کہ کیسی مسرت ہوئی ساری پڑھائی بند کردی اور دو دن مستقل رات میں کئی گھنٹے تک پڑھتا رہا اور سر دھنتا رہا حضرت کیلئے دل سے دعائیں نکلیں، اللہ تعالیٰ انکا سایہ ہم سب پر تادیر قائم رکھے اور انکے وجود کی برکت سے ہمارے اعمال سدھر جائیں۔ میں نے اپنے والدین کو بھی لکھا ہے کہ وہ جاکر حضرت والا کے یہاں حاضری دیں، وہ لوگ انشاء اللہ جائیں گے۔ ارے آپ لوگوں سے بھی کہتا ہوں کہ (حضرت کو) پکڑ لیجئے مضبوطی سے۔ حضرت والا یہاں میری بڑی نگرانی فرمارہے ہیں۔ کیسے لکھوں اور کیا لکھوں کہ یہ چیزیں لکھنے کی نہیں یعنی لکھی نہیں جاسکتیں اس کا تعلق میری حقیر رائے میں حال سے ہے۔ حضرت والا تک پہونچنے کیلئے کبھی کبھی دل بڑا بے چین ہوتا ہے ملاقات کیلئے جی چاہتا ہے کیسے اڑ کر پہنچوں۔ میرا سلام پہونچا ہے۔ دیوبند کیلئے اپیل پڑھی حضرت والا کی اپیل سر آنکھوں پر اللہ تعالیٰ نے دل میں خیال ڈالا کہ مدد کروں میں انشاء اللہ نیت کر رہا ہوں جو کچھ ہو سکے گا بھیجوں گا۔

اسی طرح ایک اور صاحب کا خط ملاحظہ فرمایئے اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔

"ایک صاحب کے یہاں "معرفت حق" پر نظر پڑی پڑھکر بہت خوشی ہوئی فوراً لکھ کر خریدار بن گیا اور پچھلے سارے پرچے منگوا لیئے۔ اس جریدہ کو پڑھکر مولانا صاحب سے

ملنے کا اشتیاق ہوا۔ ویسے پیری مریدی پر اب تک اعتقاد نہیں ہے مگر کسی عالم و متقی ولی اللہ کی صحبت سے استفادہ کا خواہشمند ہوں۔ بزرگوں فقیروں سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں پتہ نہیں کب اللہ انشراح صدر کر دے اور میں کسی مرشد کامل سے رشد و ہدایت پا سکوں۔ والسلام۔ (بازار گنج پٹنہ)

اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ ان دونوں باتوں میں آپنے کیا فرق دیکھا ایک جگہ تو مذاق ہی فاسد ہو گیا ہے اور لوگوں کو شیریں تلخ اور تلخ شیریں محسوس ہو رہا ہے اور ایک جماعت ہے کہ وہ کہیں سے دین کی خوشبو پا لیتی ہے تو اسکی روح بے چین ہو جاتی ہے۔ انھیں حالات کو دیکھتے ہوئے میں تو اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ کام آج بھی ہو سکتا ہے مگر طریقہ سے اور وہ طریقہ یہی ہے کہ اپنے اسلاف اور بزرگوں کی سیرت معلوم کیجائے اور اسکو برابر پیش نظر رکھا جائے۔ علماء اور مشائخ نے اس سلسلہ میں بڑی محنت و جانفشانی کی ہے کہ بزرگوں کے اقوال و اعمال و احوال کو کتابوں میں جمع کر دیا ہے تاکہ وہ اُنکی عدم موجودگی میں اُنکی نیابت کریں اور لوگ ان سے نفع اٹھائیں انکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فتنہ اور کوئی بد حالی ایسی نہیں ہے جسکا علاج ان حضرات نے نہ لکھدیا ہو۔ باقی ہم اسکو دیکھتے ہی کب ہیں ہم کو اپنے مشاغل ہی سے کب فرصت ہے۔ اب اسکا کیا علاج ؟

لہٰذا جب ان حضرات کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھایا جائے گا اور ان حضرات سے تلخ کو شیریں بنانا نہ سیکھا جائے گا تو مفتون ہی ہونا پڑے گا اور تلخیاں بھی برداشت کرنی پڑیں گی۔

والسلام۔ راقم جامی ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ

ملک کے مشہور ادیب اور ملک الشعراء جناب روشؔ صدیقی صاحب ماہ اپریل ۱۹۶۷ء کے اواخر میں حضرت مصلح الامۃ کیخدمت میں بمبئی میں حاضر ہوئے اور شریک مجلس ہوئے وہاں کے تأثرات اس حقیر سے بیان کئے کہ حضرت کے خون کا ایک ایک پاک قطرہ جو بنتا ہے امت کیخدمت میں صرف ہو رہا ہے۔ حضرت کی شفقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حضرت کو دیکھکر صحابہؓ یاد آتے ہیں۔

گزشتہ ہفتہ جناب روشؔ صاحب حقیر کے ساتھ حضرت مولانا تھانویؒ کے مزار اقدس

حاضر ہوئے اور وہاں دیر تک فاتحہ پڑھتے رہے اسکے بعد حضرت حافظ ضامن صاحبؒ کے مزار مبارک پر ہم لوگ گئے جو کہ بیری کے گنجان درختوں کے سایہ میں ہے، حافظ صاحبؒ کے یہاں حاضری پر روشؔ صاحب نے اپنے جذبات پر بہت قابو حاصل کیا کہتے تھے کہ آپ حضرات ساتھ نہ ہوتے اور شریعت کا پاس نہوتا تو شاید حضرت حافظ صاحبؒ کے مزار سے لپٹ کر خوب روتا ــــ اس تاثر کا حاصل مندرجہ ذیل غزل کا مقطع ہے ــــ زاں بعد ہم لوگ خانقاہ تھانہ بھون میں گئے اور حضرت حکیم الامتؒ کی سہ دری دیکھی جہاں سے حضرت مولانا تھانویؒ نے ۵۰ سال تک امت کی رہبری کی ہے اور ملفوظات وارشادات سے طالبین کو سیراب کیا ہے۔ ساتھ ہی حاجی صاحبؒ کا حجرہ بھی لگا ہوا ہے۔ وہاں بھی ہم لوگ تادیر باادب خاموش کھڑے رہے ــــ ان تاثرات کا نتیجہ اس غزل کا مطلع اور دوسرا شعر ہے ــــ تیسرا شعر دور حاضر کے سطحی نظریات کی عکاسی جناب روشؔ کے بہترین طرز میں کر رہا ہے اور چوتھا تغزل کی بہترین مثال ہے۔

(از ناقل)

(از جناب روشؔ صاحب صدیقی)

حاصلِ عمر خراباتِ مغاں کیا کہیئے ہوش آیا ہے تو آیا ہے کہاں کیا کہیئے

اے صنم خانۂ کونین، تقاضائے سکوت قصۂ شوخیٔ گفتارِ بتاں کیا کہیئے

علمِ حاضر کی کہانی سے خموشی ہی بھلی کچھ جو کہیئے تو بجز وہم گماں کیا کہیئے

لبِ جو، حلقۂ گل، موجِ صبا، کیفِ غزل اور مفہومِ حیاتِ گذراں کیا کہیئے

حق ادا ہو نہ سکا راہ کے کانٹوں کا روشؔ

ساتھ تھا قافلۂ گلبدناں کیا کہیئے

مکتوب

(ع۔ بی مدرسہ کے مدرس اوّل صاحب کا وہ خط جسکا ذکر صـ پر آیا ہے)

حال ۔ نماز کے خالص عبادت بننے کے متعلق حضرتؒ سے عرض کیا تھا حضرتؒ نے دعار فرمائی تھی اور یہ فرمایا تھا کہ اس خاص جزو کے متعلق مجھے بار بار یاد دلاتے رہنا اس ہدایت کے مطابق عرض ہے کہ نماز کی مقبولیت کے لئے جس خشوع اور توجہ الی اللہ کی حاجت ہے وہ مفقود پاتا ہوں اور اب یہ خلش بڑھتی جارہی ہے۔ شروع کرتے وقت تو کوشش کر کے تکبیر تحریمہ کہہ لی جاتی ہے اور کچھ دیر توجہ بھی رہتی ہے مگر دوام نہیں رہتا کبھی کبھی بار تجدید بھی کر لیتا ہوں پھر ذہن ہٹ جاتا ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے یہ الجھن ستا رہی ہے کہ امامت کی حالت میں اگر میری ہی نماز مکمل نہ ہوئی تو اسکا اثر مقتدیوں کی نماز پر بھی پڑے گا اور ان سب کی نمازوں کی بازپرس بھی امام ہی سے ہوگی۔ اس تصور سے بڑی وحشت ہوتی ہے کہ سیکڑوں مقتدیوں کا بوجھ کیسے برداشت ہوگا۔ چونکہ امامت بلا معاوضہ ہے اس لئے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ امامت ہی چھوڑ دوں مگر دقت یہ ہے کہ جس مسجد میں نماز پڑھتا ہوں کوئی موزوں شخص جو پابندی بھی کرے اور قبول بھی کرے نہیں ملتا۔ اسلئے الجھن ہے۔

اس سے آگے یہی الجھن ترجمۂ قرآن پاک میں حائل ہے کہ سب کچھ دوسروں کو سناتا ہے لیکن قرآن پر خود کتنا عمل ہے اور جب نہیں ہے تو پھر ان سارے سننے والوں کی ذمہ داری بھی میرے ہی سر ہے۔ اللہ تعالےٰ سے دعار کرتا ہوں اور تہجد کی تنہائی میں دعار کرتا ہوں اور حضرت اقدس کی ارشاد فرمودہ حدیث من تعارہ باللیل کو یاد کر کے اسوقت اللہ تعالےٰ سے عرض کرتا ہوں کہ وہ دین میں اور دینی امور میں مخلص بنا دے اور صرف اپنی رضا کیلئے یہ سارے کام مجھ سے لے لے۔

پھر بھی قلب کو اطمینان نہیں ہوتا کہ نہ معلوم کیا انجام ہوتا ہے۔ فکر بڑھتی جارہی ہے کہ کس طرح جواب دہی ہوگی۔ اس سے آگے یہی ذہنی تشویش مدرسہ کے سارے کاموں میں پاتا ہوں۔ یہاں بھی خلوص کی مانگ ہے اور اپنے پاس اسی پونجی کی کمی ہے۔

رحمتوں کی حدیثیں بھی پڑھتا ہوں اور رحمتوں کی آیتیں بھی مگر اب نظر آتا ہے کہ عمر بھر

ہیں کوئی عمل قابلِ قبول ادا نہیں ہوا۔'

کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسلئے حضرت ہی کی رہبری کا محتاج ہوں، پورے الحاح کیساتھ درخواست ہے کہ حضرت اقدس رہبری فرمائیں اور دعا بھی ضرور فرمائیں اور بار بار کہ اللہ تعالیٰ نماز درست کر دے۔

خادم کو یقین ہے کہ اگر نماز درست ہو جائے اور جس درجہ کا خشوع وخلوص (کم سے کم) مطلوب ہے اگر اتنا عطا ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ نماز ڈھنگ کی بلکہ قابلِ قبول ہو جائیگی بلکہ پوری زندگی میں انشاء اللہ خلوص نصیب ہو جائے گا

خادم کو یقین ہے کہ جس شفقت سے حضرت اقدس نے خادم کو نیک راہ پر لگانے کی کوشش فرمائی ہے اسی شفقت و مرحمت سے اسوقت بھی ضرور نوازیں گے۔

تحقیق - آپ کے مجموعی حالات سے بہت خوش ہوا کیونکہ اب تک تو یہ سمجھتا تھا کہ آپکو ظاہری علوم سے دلچسپی اور مناسبت ہے باطن کیجانب کچھ زیادہ توجہ نہیں ہے۔ لیکن آپکے ان حالات سے معلوم ہوا کہ اسکی (درستی) کی بھی فکر پیدا ہو گئی ہے تو سنئے!

اس راہ میں اعمال واخلاص موجب قربِ الٰہی ہوتے ہیں اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق کے لئے کیسے اعمال و اخلاق اختیار کرنے چاہئیں، سالکین راہ کیلئے ایک مشکل چیز ہے۔ دیکھئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اعمال پسندیدہ اور اعمال برگزیدہ اختیار فرماتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ تضرع وزاری بدرگاہ واہب العطیات بھی کرتے ہیں جیسا کہ آپکی ادعیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اِهْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ اِنَّهٗ لَا يَهْدِیْ لِصَالِحِهَا وَلَا يَصْرِفُ سَيِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ دیکھئے باوجودیکہ آپ اولوالعزم پیغمبر ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام کے سردار ہیں آپکی عبادت آپکے اعمال صالحہ آپ کے اخلاق اور پھر انہیں آپکی حسنِ نیت، آپکا ارادہ آپکا صدق عزم ان سب چیزوں کا تو پوچھنا ہی کیا ہے اسکے باوجود آپ اللہ تعالےٰ ہی سے ہدایت طلب فرما رہے ہیں۔ اعمال واخلاقِ حسنہ کی اور برے اعمال اور برے اخلاق سے صرف یعنی ہٹنے اور بچنے کو اُدھر ہی سے طلب فرما رہے ہیں۔ یہی اصل ہے اس راستہ کی کہ بندہ تضرع وزاری کو اپنی خو بنالے۔ پھر اسکے بعد ادھر سے جب ہدایت توفیق، حسنِ نیت، قوتِ عبادت اور طاقتِ اجتنابِ معاصی یہ سب امور عطا ہوتے ہیں تب ہی اسکا کام بنتا ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ سے سوال فرمایا تو اب طریقہ مسنون ہوگیا ہے۔ لہٰذا سالکین راہ کیلئے بھی ضروری ہوگا کہ وہ بھی اگر کسی عمل صالح کو کرنا چاہتے ہیں یا کسی سیئہ سے بچنا چاہتے ہیں تو وہ بھی یہی طریقہ اختیار کریں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کو اپنا وظیفہ بنائیں اور اس کے ذریعہ اللہ تعالےٰ ہی سے توفیق طلب کریں۔

اسی طرح سے ایک اور دعا میں آپ فرماتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ التَّوْفِیْقَ لِمَحَابِّكَ مِنَ الْاَعْمَالِ وَصِدْقَ التَّوَکُّلِ عَلَیْكَ وَحُسْنَ الظَّنِّ بِكَ اس میں پسندیدہ اعمال کی توفیق، صدق توکل اور حسن ظن کی دعا آپ اللہ تعالیٰ ہی سے فرما رہے ہیں

ان ادعیہ میں غور فرمایئے اور انکا خصوصی ورد رکھیئے ______ ایک اور دعا میں فرماتے ہیں جو دین دنیا دونوں کیلئے جامع ہے اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا مِنْ فَضْلِكَ وَلَا تَحْرِمْنَا رِزْقَكَ وَبَارِكْ لَنَا فِیْمَا رَزَقْتَنَا وَاجْعَلْ غِنَاءَ نَا فِیْٓ اَنْفُسِنَا وَاجْعَلْ رَغْبَتَنَا فِیْمَا عِنْدَكَ۔

آپ تو عالم ہیں اسکے ایک ایک لفظ پر غور فرمایئے اور دیکھئے کہ کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو دنیوی پریشانیوں سے بچنے کا طریقہ سکھلایا اور دنیا کے سوال کے وقت بھی آخرت کو بھولنے نہیں دیا۔

اور سنیئے! ایک دعا میں فرماتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِمَّنْ تَوَکَّلَ عَلَیْكَ فَکَفَیْتَہٗ وَ سْتَھْدَاكَ فَھَدَیْتَہٗ وَاسْتَنْصَرَكَ فَنَصَرْتَہٗ اس سے بھی معلوم ہوا کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرلیتا ہے تو اللہ تعالےٰ اسکو کافی ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے الیس اللہ بکاف عبدہٗ۔

پس جب اللہ تعالیٰ ہی کسی کی کفایت فرمائیں تو اسکو ہدایت دیدیں، نصرت دیدیں اور جو چاہیں عطا فرمادیں انکے لئے کیا مشکل ہے۔

حضرت رفاعیؒ فرماتے ہیں کہ نعمت عافیت کی بڑی قدر کرو جس کی حقیقت یہ ہے کہ سانس بدون تکلیف کے آتی رہے۔ رزق بدون مشقت کے ملتا رہے۔ اور عمل صالح بدون ریا کے ہوتا رہے

سبحان اللہ نہایت عمدہ تعریف فرمائی ہے۔ آج اوّل کو تو عافیت سمجھا جاتا ہے

لیکن رزق بدون مشقت کے ملتا رہے فرما رہے ہیں کہ یہ بھی عافیت ہے۔ اب اگر رزق ہی نہ ملے یا بڑی مشقت کے بعد ملے تو عافیت نہیں۔ اور یہ کہ عمل اخلاص کے ساتھ ہوتا رہے اسکو تو کوئی عافیت سمجھتا ہی نہیں، حالانکہ حضرت رفاعی اسکو بھی عافیت کا جزو فرما رہے ہیں یعنی اگر اعمال صالحہ ہو ہی نہیں یا اگر عمل ہو تو مگر اس میں خلوص نہ ہو تو بھی عافیت باقی نہیں ہے۔

آپ کے خط سے جس فکر و غم کے قلب میں پیدا ہو جانے کا اندازہ ہوا طریق میں وہ مقصود اور مطلوب ہے اور جس قدر یہ فکر بڑھتی جائیگی راستہ جلد کھلنے کی امید ہے۔ باقی اطمینان کو جو آپ نے لکھا ہے تو اطمینان کی جگہ تو آخرت ہے۔ دنیا میں اطمینان کہاں ؟ یہاں تو بین الخوف والرجا ہی رہنا ہے۔ اسی کو اہل طریق یوں فرماتے ہیں کہ ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش تا دم آخر دمے فارغ مباش
تا دمے آخر دمے آخر بُوَد کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(ترجمہ) اس راہ میں (یعنی طلب خدا کے راستہ میں) تو ہر وقت تراش و خراش ہی جاری رہنا چاہیئے اور آخر وقت تک انسان کو فارغ اور مطمئن نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جب آخری وقت کی بھی آخری گھڑی آئے اس وقت ہی تجھ پر اللہ تعالےٰ کی عنایت متوجہ ہو جائے اور اسمیں انکی جو بھی مصلحت ہو وہ جانیں تم کو تو ہمہ وقت مستعد اور تیار ہی رہنا چاہیئے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی)

آپ شب کو کچھ کام کر لیتے ہیں، دن کا وقت بھی خاصا طویل ہوتا ہے اسلئے تھوڑا سا وقت اس میں سے بھی ذکر و فکر کے لئے نکال لیجئے انشاء اللہ تعالیٰ نفع ہوگا۔

والسلام

ختم شد

حصہ دوم